خطبات حکیم الاسلام

Muştaka

نعمان پبلشنگ کمپنی
یوسف مارکیٹ ۔ غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار
لاہور ○ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبات حکیم الاسلام

جلد پنجم

افادات

از

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ
سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

ناشر
نعمان پبلشنگ کمپنی
یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون : 7241703 فیکس :

نام کتاب خطبات حکیم الاسلام جلد پنجم

ازافادات قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کمپوزنگ دارالنشر یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون :7356963

کمپوزر دلدار حسین ۔ طاہر انور

ڈیزائنگ حافظ محمد احمد چوہدری

ترتیب جدید نعمان پبلشنگ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون نمبر7241703 فیکس نمبر

قیمت ....

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ حنفیہ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:7241703

☆ مکتبہ حنفیہ عقب فائر بگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ فون پی پی :215507

☆ مکتبہ صدیقیہ نور محل روڈ بہاولپور فون :0621-875998

☆ مکتبہ مدنیہ ۷ اردو بازار لاہور فون :

☆ مکتبہ العارفی متصل جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد فون پی پی :717811

☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

☆ مکتبہ مکیہ 22 علامہ اقبال روڈ لاہور فون :6374594

☆ مکی دارالکتب یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ رحمیہ چونگی نمبر2 اڈہ بازار اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد

☆ عزیز کتاب گھر بیراج روڈ سکھر

☆ کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ا

سٹاکسٹ ایجنسی شمالی علاقہ جات

☆ مکتبہ المیزان القرآن رزمک اڈہ میرانشاہ صوبہ سرحد

فہرست مضامین خطبات حکیم الاسلام جلد پنجم

شانِ بعثت

"حق تعالیٰ شانہ کی رحمت عرش پر چھائی ہوئی ہے۔ اور رحمت کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت کا سامان کر دیا انبیاء علیہم السلام وہ ہدایت لیکر آئے۔ انبیاء علیہم السلام کا بھیجا جانا خود مستقل ایک انعام نکلا۔ اس سے بڑھکر عالم میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہ آئیں۔ آدمی بننا میسر نہیں ہو سکتا"۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا اَمَّا بَعْدُ

حرفِ آغاز

بزرگانِ محترم!

اس وقت میں نے نبی کریم ﷺ کی تین حدیثیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں۔ ان تینوں احادیث میں تین بنیادی مقاصد ارشاد فرمائے گئے ہیں۔۔۔ پہلی حدیث میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کی شان بیان فرمائی گئی ہے۔ کہ آپ کس رنگ کے ساتھ مبعوث کئے گئے۔ کون سی شان لے کر آپ دنیا میں تشریف لائے۔۔۔ تو ایک بعثت کی شان اور اس کی صفت کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ دوسری دو روایتوں میں آپ کی بعثت کی غرض و غایت بیان فرمائی گئی ہے کہ آپ کو کیوں مبعوث کیا گیا اور وہ کیا مقاصد تھے جن کو لے کر آپ دنیا میں تشریف لائے۔

اس تقریر کا موضوع دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلا جز شانِ بعثت کہ آپ کا رنگ کیا ہے؟

دوسرا جزیہ کہ آپ کی بعثت کے کیا مقاصد متعین تھے؟ وہ جبھی صحیح طور پر سامنے آ سکیں گے جب ان کی اصل اور بنیاد پر روشنی ڈالی جائے اس واسطے ابتداء میں بطور تمہید کے میں چند کلمات گزارش کروں گا اس کے بعد احادیث کی تفسیر ان کا موضوع اور ان کا معنی انشاء اللہ واضح ہو جائیں گے۔

کلمات تمہید

حق تعالیٰ شانہٗ سارے کمالات کا سر چشمہ ہیں۔ ساری برکات اور ساری نعمتیں انہی کی ذات میں ہیں۔ انہوں نے دنیا میں تمام نعمتوں کو بھیجا۔ حق تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں۔ ایک جلالی صفات ہیں اور ایک جمالی۔ جلالی صفات جیسے شان قہر، شان غضب، شان انتقام یہ تمام جلالی صفات کہلاتی ہیں۔۔۔ اور جمالی صفات جیسے رزاقی، انعام واکرام اور تربیت۔ یہ تمام جمالی شانیں کہلاتی ہیں، غرض صفات خداوندی دو نوع میں منقسم ہیں۔ ایک جلالی شانیں اور ایک جمالی شانیں ہیں۔

جمالی شانوں کا سر چشمہ رحمت ہے۔ اور جلالی شانوں کا سر چشمہ غضب ہے تو ساری صفات مل کر دو نوع میں آجاتی ہیں، ایک رحمت کے نیچے ایک غضب کے نیچے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ:

"میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے"۔

حدیث میں ہے کہ عرش عظیم کے اوپر اللہ نے ایک لوح رکھی ہوئی ہے جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے، اس پر ان رحمتی سبقت غضبی میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے، جب رحمت اور غضب کا مقابلہ ہوتا ہے تو رحمت آگے آگے چلتی ہے اور غضب پیچھے رہ جاتا ہے، تو عرش عظیم کے اوپر بطور دستاویز کے لکھ کر رکھ دیا ہے۔

تخت شاہی

عرش عظیم وہ تخت شاہی ہے۔ احکام خداوندی جس سے جاری ہوتے ہیں جس کو فرمایا گیا:

ثم استوی علی العرش یدبر الامر.

"کہ تمام امور کی تدبیر عرش سے ہوتی ہے۔ اس لئے عرش تخت شاہی ہے اور ساری کائنات اس کے نیچے"۔

اس کائنات کو دیکھا جائے یہ زمین، آسمان، جنتیں ان سب سے اوپر جا کر عرش کا سلسلہ ہے تو مخلوقات عرش تک جا کے ختم ہو جاتی ہیں۔ عرش کے اوپر کسی مخلوق کا وجود نہیں ہے، بجز اس تختی کے جو اوپر رکھی گئی ہے، جس پر لکھ دیا گیا ہے کہ۔

دستاویز رحمت

ان رحمتی سبقت غضبی.

صرف اس مخلوق کے سوا اوپر تجلیات ربانی ہیں۔ اور صفات الہیہ کا وہ مرکز ہے تو عرش گویا یہ تخت خداوندی ہے جس سے دنیا میں تدبیر امر ہوتی ہے اور احکام

چلتے ہیں۔اس عرش پر رحمت کو غالب کر دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام احکام میں رحمت کا غلبہ ہے۔ اور اللہ نے اپنے بندوں سے جو تعلق قائم فرمایا ہے وہ شان رحمت سے قائم کیا ہے، اگر کہیں شان غضب سے تعلق قائم کرتے تو مخلوق کا وجود باقی نہ رہتا۔ مخلوق پامال ہو جاتی غضب اور قہر کے سامنے کیا چیز ٹھہر سکتی تھی تو بندوں سے جو رشتہ قائم فرمایا وہ صفت رحمت سے قائم فرمایا صفت غضب سے نہیں۔

غضب تو تنبیہ کرنے اور سزا دینے کے لئے ایک وقتی چیز ہے لیکن دوامی چیز جو تمام باتوں پر چھائی ہوئی ہے وہ رحمت کی شان ہے۔اسی واسطے فرمایا گیا:

الرحمن علی العرش استوٰی.

"رحمٰن عرش کے اوپر چھا گیا"۔ اور عرش ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور عرش کے اوپر رحمٰن چھایا ہوا ہے یعنی ساری کائنات کے اوپر رحمت کا غالب ہے، یہ نہیں فرمایا کہ:

الجبار علی العرش استوی.

یا **القهار علی العرش استوی.** اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کائنات پر غضب چھایا ہوا ہے، اگر غضب چھایا ہوا ہوتا تو کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہتا بلکہ **الرحمن علی العرش استوی** رحمٰن عرش کے اوپر چھایا ہوا ہے یعنی صف رحمت عرش کے اوپر چھا گئی۔اور عرش ساری کائنات کے اوپر چھایا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرش پوری کائنات پر اس طرح سے ہے جس طرح ایک قبہ ہوتا ہے جس طرح خوان بنا کر اس کو آپ خوان پوش سے ڈھانپ دیں اور وہ سارے خوان پر چھا جائے۔اس طرح سے پوری کائنات پر مثل قبہ کے چھایا ہوا ہے اور اس پر رحمت چھا گئی ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ رحمت ساری کائنات پر چھا گئی ہے۔ تو رحمٰن عرش پر چھا گیا اور عرش کے اوپر دستاویز لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے۔

محل عرش

پھر عرش کو کس چیز پر قائم کیا؟

حدیث میں بھی موجود ہے اور قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے:

وکان عرشه علی الماء

"عرش کو پانی کے اوپر قائم کیا ہے"۔

حدیث میں ہے کہ وہ ایک عظیم سمندر ہے، جس کی ایک ایک موج زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے اس سمندر پر عرش قائم ہے اگر رحمت کو مجسم بنایا جائے تو پانی کی شکل اختیار کرے گا۔جس طرح غضب کو اگر جسم دیا جائے تو وہ آگ کی صورت بن جائے گا۔

جب کوئی شخص مہربان ہوتا ہے۔اور رحم و کرم کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص پانی پانی ہو گیا۔ یعنی اس پر شان رحمت غالب آ گئی۔اور محبت غالب آ گئی اور اگر کوئی غضب ناک ہوتا ہے اور غصہ میں ہو تو کہتے ہیں فلاں آدمی آگ بگولہ ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غضب کو آگ

سے مناسبت ہے اور رحمت کو پانی سے نسبت ہے تو عرش کو اللہ تعالیٰ نے پانی کے اوپر قائم فرمایا۔ اگر آگ پر قائم فرماتے تو معلوم ہوتا کہ غضب زمین ہے اس کے اوپر عرش کو قائم کیا۔ پانی کے اوپر قائم کیا اور پانی شانِ رحمت کی صورت مثالی ہے تو گویا عرش کے نیچے بھی رحمت ہے اور اوپر بھی رحمت ہے عرش پانی پر قائم ہے اور پانی شانِ رحمت کی صورت ہے۔ تو عرش رحمت کے اوپر قائم ہوا۔ عرش پر رحمٰن چھا گیا یعنی صفت رحمت چھائی ہوئی ہے، عرش کے اوپر تختی لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے تو دستاویز بھی رحمت کی ہے گویا عرش کے اوپر بھی رحمت نیچے بھی رحمت۔

قیامت میں غلبۂ رحمت

حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اپنی شانِ رحمت سے سو رحمتیں عالموں کے لئے پیدا فرمائیں۔ جن میں ایک رحمت اس دنیا میں اتاری ہے۔ اس رحمت کا اثر ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں پر رحم کھاتے ہیں جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں۔ دوست دوست پر رحم کرتا ہے۔ عزیز عزیزوں پر رحم و کرم کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک رحمت کا اثر ہے، اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی مخلوق پر رحم و کرم فرماتا ہے۔ رزق دے رہا ہے بارشیں آ رہی ہیں نعمتیں مل رہی ہیں۔ یہ سب رحمت کا اثر ہے، ننانویں رحمتیں جو ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ اپنے عرش کے نیچے چھپا کر رکھی ہوئی ہیں۔ قیامت کے دن ایمان والوں پر وہ رحمتیں کی جائیں گی تو اندازہ کیا جائے کہ قیامت کے دن کتنی رحمتیں ہوں گی جب ایک ہی رحمت کا اثر یہ ہے جو پوری دنیا میں نمایاں ہے تو ان ننانوے رحمتوں کے آثار کیا ہوں گے جو قیامت کے دن ایمان والوں پر کی جائیں گی۔۔۔۔ جہلوں پر مغفرت کی جائی گی۔ ذرا ذرا سے بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نجات دی جائے گی۔ گنہ گاروں پر شفقتیں کی جائیں گی تو ننانویں رحمتیں وہاں کام آئیں گی۔۔۔ تو حاصل یہ نکلا کہ عرش کے اوپر بھی رحمت، نیچے بھی رحمت، پانی رحمت کی صورت مثالی اور ننانویں رحمتیں عرش کے نیچے چھپائی ہوئی ہیں۔ تو عرش گویا رحمت سے ڈھانپا ہوا ہے۔ اوپر سے نیچے تک رحمت ہی رحمت چھائی ہوئی ہے۔ اور الرحمن علی العرش استوی اور اللہ شانِ رحمت سے عرش کے اوپر چھا گیا ہے تو ساری کائنات پر رحمت غالب ہے۔

شانِ رحمت کا اثر

اور اس شانِ رحمت کا اثر شانِ ہدایت ہے، اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی تو بندوں کی ہدایت کا سامان کیا۔ بندوں کے لئے راہنمائی فرمائی کہ خیر کی طرف چلیں اور شر سے بچیں۔ بھلائی کی طرف آئیں اور برائی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

یہ اسی شانِ رحمت کا اثر ہے، اگر بندوں کے اوپر رحمت و شفقت نہ ہو تو بھلائی کی طرف راہنمائی کیوں کریں؟۔۔۔ اگر کسی سے دشمنی کا تعلق ہو تو دشمن کو کون اچھا راستہ دکھلاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ کسی جہنم میں جائے جلدی سے ہلاک ہو۔ جب دشمن ہی ٹھہرا دوست کو راہنمائی کی جاتی ہے کہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہو۔ ماں باپ اپنے بچے کے دست کی راہنمائی کرتے ہیں کہ بیٹا یہ کام

مت کرو۔ یہ تمہارے لئے بھلائی کی بات ہے اور یہ برائی کی بات ہے۔ یہ رحمت و شفقت ہی کا اثر ہوتا ہے اگر استاد کو طالب علموں سے دشمنی ہو جائے وہ طالب علموں پر کیوں محنت کرے گا؟ نہ کتاب پڑھائے گا نہ راہنمائی کرے گا نہ مسائل بتائے گا تو شفقت اور رحمت کا اثر ہوتا ہے۔ جو راہنمائی کی جاتی ہے۔ سب سے بڑا رحمت کا ظہور ہدایت ہے کہ سیدھی اور بھلائی کی راہ بتلادی جائے۔

سب سے بڑی دعاء

اسی شان ہدایت کے تحت حق تعالیٰ شانہ نے انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ وہ اللہ کی ہدایت ہیں جو اسباب کے ذیل میں نمایاں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا ہدایت کرنا۔ یہ اللہ کا ہدایت کرنا ہے۔ یہ اس کی رحمت کا ظہور ہے۔ تو ہدایت سب سے بڑی چیز ہے

سورہ فاتحہ جس کو قرآن عظیم فرمایا گیا ہے اور نماز کی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے اس سورہ کا نام سورۃ المسئلہ بھی ہے، یعنی سوال کرنے کی سورت۔ اس میں سوال کیا گیا ہے؟

اھدنا الصراط المستقیم

"ہدایت دیدیجئے سیدھے راستہ کی"۔

یہ ہے سب سے بڑی دعاء جو سورہ فاتحہ میں منگوائی گئی ہے۔

سورہ فاتحہ کی ابتدا میں حق تعالیٰ شانہ کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ وہ رب العلمین ہے۔ رحمٰن و رحیم ہے۔ ملک یوم الدین ہے معبود ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔۔۔ آگے بندگی کی شان فرمائی گئی ہے کہ بندہ کا کام یہ ہے کہ معبود کے آگے جھکے ' بھیک مانگے ' سوال کی دعا یہ بتلائی گئی کہ اھدنا الصراط المستقیم ۔ گویا بندے مکلف اور مامور کئے گئے ہیں کہ پانچوں نمازوں میں یہ دعا کریں۔ جب فاتحہ پڑھیں گے یہ دعا آئے گی۔ فرائض کے بعد سنتیں پڑھے تو پھر فاتحہ کے ذریعہ یہ دعا مانگے۔ نفلیں پڑھے یا تہجد پڑھے یہ دعا مانگے غرض جتنی نمازیں فرض، واجب، سنت اور نفل، یہ دعا سب میں لازم ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی اہم دعا ہے، ہدایت کا مانگنا کوئی بہت اہم چیز ہے۔

بظاہر ایک سوال ہوتا ہے کہ فاتحہ جس کو سورۃ المسئلہ کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی ذرا اونچی دعا منگوائی جاتی کہ یا اللہ! ہمیں جنت عطا کر دیجئے ' یا اللہ ہم سے راضی ہو جایئے اپنی رضا عطا کر دیجئے ہمیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دیدیجئے یہ تو معمولی سی دعا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ساری دعاؤں کی جڑ بنیاد یہی دعاء ہے اس واسطے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیدھا راستہ دکھلا دیجئے تو جب سیدھا راستہ مل گیا تو آدمی اس پر چل پڑا۔ رضا خود بخود حاصل ہوگئی۔ بے راہ رو کو رضا حاصل نہیں ہوتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی ' بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی ' بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر چل پڑے تو عرش کے سائے میں بھی جگہ خود بخود مل گئی۔ اگر آدمی بدراہ ہوگا۔ عرش کا سایہ نہیں ملے گا تو جتنی بڑی سے بڑی دعا ہو سکتی تھی، اور جتنا بڑے سے بڑا مقصد ہو سکتا تھا وہ سب اس دعا سے حل ہوتا ہے اصل میں ہدایت ہے، ہدایت ہوگئی تو رضا بھی ملی جنت بھی ملی عرش کا سایہ بھی ملا اور انبیاء علیہم

السلام کی مرافقت بھی ملی۔۔۔ ساری نعمتیں دستیاب ہو گئیں۔۔۔ اور اگر خدانخواستہ ہدایت نہ ملے تو نہ جنت نہ عرش اگر آدمی ضلالت اور گمراہی پر ہو تو کہیں سے کوئی نعمت دستیاب نہیں ہو سکتی۔۔۔ اس سے اندازہ ہوا کہ سب سے بڑی نعمت ہدایت ہے۔ اس لئے سورہ فاتحہ میں دعا منگوائی گئی کہ ہدایت کی دعا مانگو کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلا دیجئے دل کی کلیں درست ہو گئیں' دل کا راستہ درست ہو گیا' تو دنیا و آخرت کی ہر نعمت مل گئی۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله. الاوهی القلب.

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو صنوبری شکل کا ہے' اگر وہ درست ہے تو سارا انسان درست ہے اگر وہ غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور وہ گوشت کا لوتھڑا "دل" ہے اگر دل درست ہے تو سارا انسان درست ہے اور اگر دل خراب تو سارا انسان خراب ہے۔۔۔ اور دل کب درست ہوتا ہے جب دل کی کلیں درست ہوں' دل کا راستہ درست ہو دل میں ہدایت موجود ہو' دل میں ضلالت اور گمراہی موجود نہ ہو' تب دل درست ہوتا ہے' تو سارے انسان کی درستگی قلب کی ہدایت پر موقوف نکلی۔۔۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کوئی بہت بڑی عظیم نعمت ہے اس لئے یہاں دعا منگوائی گئی کہ:

اهدنا الصراط المستقیم.

"ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے دیجئے"۔

اور وہ صراط مستقیم کونسا ہے؟

صراط الذین انعمت علیهم.

"جن پر آپ نے انعام کیا ان کا راستہ"۔

اور وہ کون ہیں جن پر انعام کیا گیا؟

وہ انبیاء علیہم السلام' صدیقین' شہداء اور صلحاء ہیں تو ان کا راستہ مطلوب ہے۔

غیر المغضوب علیهم ولا الضالین.

جن پر آپ کا غضب و قہر نازل ہوا ان کا اور گمراہوں کا راستہ ہمیں نہیں چاہئے۔ ان کا راستہ چاہئے جن پر آپ کا انعام ہوا وہ آپ کی رحمت کے نیچے ہیں۔

تو سب سے بڑی دعا جو فاتحہ میں منگوائی گئی وہ ہدایت کی دعا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت اتنی بڑی نعمت ہے کہ ساری نعمتیں اس کے تابع ہیں اور ضلالت سب سے بڑی گمراہی ہے کہ ساری مصیبتیں اس کے تابع ہیں۔ اس لئے فاتحہ جو قرآن کریم کا خلاصہ ہے اس میں ہدایت کی دعا رکھی گئی جو فاتحہ کا خلاصہ ہے' تو سارے قرآن کا خلاصہ ہدایت نکلی۔

نعمت عظمی

اسی واسطے سورہ بقرہ سے جب قرآن کریم کا آغاز کیا گیا اور کہا گیا کہ:

ذالِك الكتب لا ريب فيه

" وہ کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا نہیں "۔

اس کی شان یہ فرمائی گئی کہ :

هدى للمتقين.

" یہ کتاب متقین کے لئے ہدایت ہے "۔

یہ تو سب سے بڑی نعمت کتاب اللہ ہے کتاب اللہ کی سب سے بڑی نعمت جو بنیاد ہے وہ ہدایت ہے۔۔۔ تو فاتحہ میں ہدایت مانگی گئی ہے۔۔۔ حق تعالیٰ شانہ کی رحمت عرش پر چھائی ہوئی ہے۔

اور رحمت کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت کا سامان کر دیا۔ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام وہ ہدایت لے کر آئے۔ انبیاء علیہم السلام کا بھیجا جانا خود مستقل ایک انعام نکلا۔ اس سے بڑھ کر عالم میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہ آئیں آدمی کو آدمی بنا میسر نہیں ہو سکتا' انسان کو انسان انبیاء علیہم السلام نے بنایا ہے۔ ورنہ انسان تو۔۔۔ گھوڑوں اور ڈنگروں کا ایک مجموعہ ہے' جو آپس میں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ایک دوسرے کے درپے آزار ہوتا ہے۔۔۔ جانور' جانور کے ساتھ وہ بدسلوکی نہیں کرتا جو انسان انسان کے ساتھ کرتا ہے' تو انسان اگر انسانیت پر نہ آئے تو سب سے بڑا درندہ یہ ہے۔ سب سے خونخوار غضبناک بھی یہ ہے اس کو جو جانور کی حد سے نکال کر انسانیت میں داخل کیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام ہی نے تو کیا ہے' انہی کی تعلیمات کا تو اثر ہے کہ آدمی آدمی بنتا ہے' جب ان کی تعلیمات کسی جگہ ختم ہو جاتی ہیں' وہیں انسان گھوڑوں اور ڈنگروں میں شامل ہو جاتے ہیں' جہاں تعلیمات آئیں وہیں آدمیت آجاتی ہے' تو آدمی کی آدمیت ہدایت پر موقوف ہے۔ اور ہدایت انبیاء علیہم السلام کے آنے پر موقوف ہے۔ تو نبیوں کا آنا ایک عظیم نعمت نکلی۔۔۔۔۔ اور کل انبیاء علیہم السلام میں سے بھی سب سے بڑی نعمت جناب رسول ﷺ کا مبعوث ہونا ہے کہ آپ خاتم النبین ہیں۔۔۔ افضل الانبیاء ہیں۔ اور افضل البشر ہیں۔

نبی الانبیاء (ﷺ)

حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کا فیض بھی درحقیقت نبوّت محمدیؐ سے چلا' حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ :

انا نبی الانبیاء.

"میں نبیوں کا نبی ہوں"۔

اور انبیاء امتوں کے نبی ہیں۔۔۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں' انبیاء کرام سے عہد لیا گیا :

واذ اخذ الله ميثاق النبين لما اتيتكم من كتب و حكمة ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم لتومنن به ولتنصرنه.

"یاد کرو اس وقت جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب وہ رسول عظیم الشان آئے جن کو بھیجنا

ہے۔ اور تمہیں میں نبوت اور کتاب دیدوں اور پھر وہ رسول آئیں تو تم اس کے اوپر ایمان لاؤ۔ اور اس کی مدد کرو۔ اگر تم میں سے کوئی اس کا زمانہ پائے تو خود مدد کرے۔ ورنہ اپنی اقوام کو ہدایت کرو کہ وہ خاتم النبیین کی مدد کریں''۔

اس نبی کی کیا شان ہو گی؟ مصدق لما معکم ۔۔۔ وہ رسول عظیم جو کچھ تمہیں عمل دیا گیا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہو گا۔

جامع الہدایات

تصدیق، اس کی دلیل ہوتی ہے کہ جس چیز کی وہ تصدیق کرتا ہے وہ اس کے اندر موجود ہے۔ جس علم کی تصدیق کرتا ہے وہ اس کے اندر موجود ہے، جس عمل کی تصدیق کوئی کریگا تو پہلے اس کا عمل ہونا چاہئے۔ جاہل تصدیق نہیں کر سکتا، عالم تصدیق کرے گا تو سارے انبیاء علیہم اسلام کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ جو علم سارے انبیاء کو دیا گیا تھا وہ علم اس نبی عظیم میں موجود ہو گا تو آپ تمام علوم انبیاء کے جامع ہونگے۔ اس لئے آپ سارے انبیاء کی تصدیق کریں گے، جو کچھ جسے ملا ہے، یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے پاس حق موجود ہو۔ وہ علم اس کے پاس موجود ہے تو جناب نبی کریم ﷺ خاتم النبین اور جامع العلوم بنائے گئے تو اگر انبیاء کا دنیا میں آنا رحمت ہے تو خاتم النبیین کا آنا سب سے زیادہ رحمت ہے۔ جو جامع ترین نعمت لے کر آئے۔۔۔ اگر اور انبیاء علیہم السلام مختلف رنگوں کی ہدایت لے کر آئیں تو آپ ساری ہدایتوں کا مجموعہ بن کر آئے۔ تو خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ آپ جامع الہدایات ہیں۔ جامع العلوم اور جامع الکمالات ہیں تو ایک ایک کمال کا آنا اگر نعمت اور رحمت ہے تو سارے کمالات کے مجموعے کا آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔۔۔ تو جناب رسول اللہ ﷺ کا آنا نعمت ہو گئی اور سب سے بڑی نعمت آپ کی بعثت ہو گئی۔

افضل الشئون

اس لئے آپ کی جو شان ہو گی وہ ساری شانوں سے افضل ہو گی۔ جب آپ خاتم ہیں تو خاتم الشئون بھی ہونگے، ساری شانیں بھی آپ پر ختم ہوں گی، تو جامع ترین آپ کی شان ہونی چاہئے۔

تمام انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے کمالات کا مظہر بن کر آئے ہیں، نبی کریم ﷺ جامع الکمالات ہیں اس لئے حق تعالیٰ شانہ، کے کمالات کا مظہر اتم ہیں تو حق تعالیٰ شانہ، کی شانیں جس قوت اور کمال کے ساتھ آپ میں آئی ہیں، دوسروں میں نہیں آئیں۔

شانِ نبوی ﷺ میں غلبہ رحمت

ابھی آپ نے سنا کہ حق تعالیٰ شانہ، کی شان یہ ہے کہ ان کی تمام صفات دو نوع میں ہیں۔ صفات جمال اور صفات جلال۔ صفات جمال کا منشاء رحمت ہے اور صفات جلال کا منشا غضب ہے۔ اور رحمت اللہ کے غضب پر غالب ہے۔ تو جو اللہ کا سب سے بڑا مظہر اتم ہے اس میں بھی رحمت ہی

غالب ہونی چاہیئے اس لئے آپ کی شان فرمائی گئی کہ:

وما ارسلنٰك الا رحمة اللعلمين.

جیسے اللہ کے ہاں شان رحمت غالب ہے تو خاتم النبیین میں بھی ساری شانیں ہیں مگر سب پر جو شان غالب ہے تو وہ رحمت کی شان ہے آپ کو رحمت مجسم بنا کر بھیجا گیا آپ فرماتے ہیں کہ:

انا رحمة مهداة.

میں ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ کے مخلوق کو دی گئی ہوں۔ یعنی میں اللہ کا ایک ہدیہ ہوں جو مخلوق کو عطا کیا گیا' ایک تحفہ ہے جو اللہ نے نبی آدم کے لئے بھیجا ہے۔ اور وہ میں ہو۔ اور میں کون ہوں؟ رحمة مهداة ایک رحمت مجسم ہوں جس کو بطور ہدیہ کے عطا کیا گیا۔ تو اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے عظیم ہدیہ بھیجا۔ وہ ہدیہ رحمت ہے۔

تو جیسے حق تعالیٰ شانہ' فرماتے ہیں کہ میری شانوں میں رحمت کی شان غالب ہے یہی بات نبی کریم ﷺ میں بھی ہے کہ آپ پر شان رحمت کا غلبہ ہے۔ شان غضب غالب نہیں ہے۔ جب آپ حق تعالیٰ شانہ' کے نمائندے اور مظہر ہیں۔ تو شان غضب بھی موجود ہے۔ اس غضب کا اثر یہ ہے کہ آپ کی شریعت میں حدود بھی ہیں۔ قصاص بھی ہیں۔ کفارات بھی ہیں۔ تعزیرات اور سزائیں بھی ہیں۔ جہاد بھی ہے۔ جو شان غضب کا مظہر ہیں۔۔۔ مگر ان سب کے اندر بھی اگر غلبہ ہے تو شان رحمت کا غلبہ ہے۔ غضب بھی چلتا ہے تو بھی رحمت ہی سے چلتا ہے۔

اگر باپ بچے کو مارتا بھی ہے۔ اس کا منشاء دوشمنی نہیں ہوتی۔ محبت منشا ہوتی ہے۔ محبت ہی سے مارتا ہے تاکہ اس کو ہدایت ہو حق تعالیٰ شانہ' بھی اگر کسی فرد یا قوم پر غضب فرماتے ہیں اس کا منشا رحمت ہوتا ہے۔۔۔ تو نبی کریم ﷺ بھی اگر کسی پر غضب یا غصہ فرمائیں اس کا منشا بھی رحمت ہی ہے ہدایت اور تنبیہ اس کا منشا ہوتی ہے۔ تو غضب کا منشا بھی فی الحقیقت رحمت ہے تو رحمت غالب آگئی۔ کہیں بلاواسطہ رحمت کا ظہور ہے۔ کہیں غضب کے واسطہ سے رحمت کا ظہور ہے غضب میں بھی سو رحمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ دشمنی چھپی ہوئی نہیں۔ تو اللہ اپنی کائنات پر اور مخلوق پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے۔ اس کے غصہ میں بھی ہزاروں رحمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ تو آپ غصہ بھی فرمائیں گے تو اس کا منشاء رحمت اور محبت ہی ہو گا۔۔۔ تو آپ شان رحمت اور رحمت مجسم بن کر آئے ہیں۔

صحابہؓ میں شان رحمت

اسی لئے آپ کی شریعت میں رحمت کا غلبہ ہے۔ ایک ایک حکم کے اندر رحمت کا غلبہ ہے' ہر ہر حکم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شفقت ٹپکی پڑتی ہے۔ بندوں کو ہدایت دے رہے ہیں۔ اس میں بھی شان رحمت کا غلبہ ہے۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ جیسے رحمت مجسم ہیں تو تمام صحابہؓ کی تربیت شان رحمت سے ہی فرمائی۔ اس لئے صحابہؓ کی شان یہ فرمائی گئی کہ:

اشداء على الكفار رحماء بينهم. رحمت اور کرم ان کے اندر مخفی ہے' رحمت و کرم کے اندر رچا ہوا ہے اگر کفار پر شدت ہے تو ان کی ذوات پر نہیں ان کے کفر پر ہے۔ رحمت وہاں بھی چھپی

ہوئی ہے کہ کسی طرح وہ بھی ایمان قبول کرلیں کسی طرح یہ ہدایت پر آجائیں۔

رحیم اُمّت

صحابہ میں بھی اَجل صحابہؓ اور افضل صحابہؓ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔۔۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا کہ انبیاء کے بعد اگر کوئی شخصیت ساری کائنات پر افضل ہے تو وہ صدیق اکبرؓ ہیں اور صدیق اکبرؓ کی شان فرمائی گئی:

ارحم امتی بامتی ابوبکر

"صدیق اکبرؓ پر رحمت کا غلبہ ہے"۔

حدیث میں واقعات آتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ جب اپنے مکان سے مسجد نبوی کی طرف چلتے تھے گویا دربار خلافت میں پہنچتے تھے تو رحمت کا غلبہ اس درجہ تھا۔ اور اس درجہ مخلوق اس رحمت سے آپ کی طرف متوجہ ہوتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں بچے آپ کے پیچھے ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یاا با اے باپ اور کوئی کہتا کہ اے چچا' اور صدیق اکبرؓ ہیں کہ کسی بچے کو کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ کسی کو گود میں لئے ہوئے ہیں۔ کسی کے سر پر ہاتھ ہے۔ بیسیوں بچے پیچھے پیچھے ہیں اور امیر المومنین دربار خلافت میں جا رہے ہیں۔

ارحم امتی بامتی ابوبکر۔

سب سے رحیم القلب اور سب سے زیادہ شفیق صدیق اکبرؓ کو فرمایا گیا تو اللہ کے یہاں شان رحمت غالب ہے تو سب سے بڑے نائب اور اللہ کے وزیر اعظم جناب نبی کریم ﷺ ہیں' ان کو رحمت مجسم فرمایا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتوں میں جو سب سے زیادہ باکمال ہیں اس کو ارحم کہا گیا کہ سب سے زیادہ رحیم ہیں۔ تو رحمت اوپر سے لے کر نیچے تک چھائی ہوئی ہے اور رحمت کا ایک سلسلہ چلا جو پہلے انبیاء میں آیا۔ اکمل ترین حضور ﷺ میں آیا سارے صحابہؓ میں آیا کہ رحماء بینھم اکمل ترین صدیق اکبرؓ میں آیا۔ غرض رحمت غالب ہے اور رحمت کا سرچشمہ وہ فی الحقیقت ہدایت ہے۔ تو سارے صحابہ ﷺ ہادی ہیں۔

طبقہ صحابہؓ کی تقدیس

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ:

اصحابی کالنجوم بالیھم اقتدیتم اھتدیتم

"میرے تمام صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں جس کی روشنی میں راستہ طے کرو گے ہدایت پا جاؤ گے"۔

والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

سابقین اولین مہاجرین ہوں یا انصار ہوں اور جو بعد میں ان کے ساتھ ملتے گئے ان سب کے مجموعے کو کہا کہ اللہ ان سب سے راضی وہ اللہ سے راضی تو اللہ طبقہ سے راضی۔ افراد کا نام نہیں لیا کہ صدیق اکبرؓ سے راضی یا فاروق اعظم سے راضی۔

مِنَ الْمُھَاجِرِینَ وَالْاَنصارِ وَالَّذِینَ اتَّبعو ھُمْ۔

مہاجرین اولین ہوں، انصار اولین ہوں یا بعد میں ان کے ساتھ لاحق ہونے والے ہوں۔ سب کو کہا گیا اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی جس طبقے میں طبقے کی حیثیت سے کھوٹ ہو۔ اللہ کبھی ان سے راضی نہیں ہو سکتا۔ رضا کا اعلان دلیل ہے کہ طبقے میں کھوٹ نہیں۔ طبقہ بہت مقدس ہے۔

دوامی رضا کا اعلان

پھر رضا کا اعلان کوئی ہنگامی اور وقتی نہیں۔ یہ رضامندی کا اعلان قرآن میں کیا گیا۔ اور قرآن قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اس کا حاصل یہ کہ کوئی دقیقہ بیچ میں ایسا نہیں گزرے گا کہ اللہ صحابہؓ سے ناراض ہو۔ جو رضا ابتدا میں ہے وہی وسط میں ہے، وہ انتہا میں ہے۔ قیامت تک وہ رضا باقی رہیگی اور قیامت کے بعد بھی رہے گی۔ قیامت کے بعد قرآن اسی طرح موجود ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں حافظ سے کہا جائے گا کہ:

رتل وارتق.

قرآن پڑھتا جا۔ اور جہاں تک تیری طاقت میں ہے ترقی کرتا جا۔ تو وہاں بھی تلاوت ترقیات کا ذریعہ بنے گی۔ قرآن قیامت تک ختم نہیں ہوگا اس کے بعد بھی قرآن ہی کا دور حکومت ہے، جنت میں بھی قرآن ذریعہ ترقی بنتا جائے گا۔ اور جب تک قرآن ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ --- کا نعرہ موجود ہے تو مطلب یہ نکلا کہ اب جب صحابہؓ (نزول قرآن کریم کے وقت) موجود ہیں۔ اب بھی ہم ان سے راضی، ان کی وفات کے بعد بھی ان سے راضی یعنی ابدالاباد تک ان سے راضی ہیں۔ تو جس طبقے کے بارے میں رضا کا اعلان کیا جائے کہ علی الاطلاق ہم ان سے راضی ہیں اور وہ علی الاطلاق ہم سے راضی تو وہ طبقہ یقیناً بحیثیت طبقے کے مقدس ہے۔ یہ نہیں کہ ایک دو فرد مقدس ہیں۔ باقی میں معاذ اللہ، معاذ اللہ کچھ کھوٹ ہے پورا طبقہ مقدس ہے۔

کتب سابقہ میں شان صحابہؓ کا ذکر

پھر یہ کتب سابقہ میں حضور ﷺ کے صحابہؓ کی شان بیان کی گئی۔ تورات میں بیان کی گئی --- حدیث میں ہے کہ صحابہؓ کی شانیں اور صفات دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام نے خواہش کی اور کہا کہ اے پروردگار! یہ امت مجھے عطا کر دیجئے، فرمایا گیا کہ امت محمد ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پھر امت ہی میں مجھے داخل کر دیجئے۔

تو گویا ایسی شان بیان کی گئی کہ انبیاء نے تمنا ئیں کیں کہ اس امت کے ذیل میں ہمیں شمار کر لیا جائے۔ تو اس امت میں سب سے زیادہ مقدس طبقہ صحابہؓ کا ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ کتب سابقہ میں بھی اس طبقہ کے مقدس ہونے کی شہادت دی گئی اور قرآن میں شہادت دی گئی تو ازل سے ان کا تقدس چلا اور ابد تک چلتا رہا۔ تو اول سے لے کر اخیر تک یہ طبقہ مقدس ہے --- اور طبقات کے تو افراد کا نام لے کر مقدس کہا گیا ہے یا بلا نام کے۔ اور اس پورے طبقے کی تقدیس کر دی گئی۔

اصنافِ صحابہؓ کی تقدیس

پھر اس طبقے کے نام لے لے کر قرآن کریم نے الگ تقدیس کی :

لقد رضی الله عن المومنین ابیا یعونك تحت الشجرة.
اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جن سے آپ نے شجرۃ الرضوان کی بیعت لی ہے۔ حدیبیہ میں بیٹھ کر بیعت لی ان سے اللہ راضی۔

وہ ڈیڑھ ہزار کے قریب صحابہؓ ہیں۔ تو ایک صنف بتلائی گئی۔ اس پر پھر رضا کا اعلان کیا گیا۔۔۔ تو مجموعہ سے رضا کا اعلان اور اسکی اصناف سے رضا کا اعلان۔ اصحاب بدرؓ سے رضا کا اعلان؛ اصحاب احد سے رضا مندی کا اعلان پھر پورے رضا کے نیچے آجاتے ہیں۔ پورے صحابہ کی تقدیس و تقدس کا قرآن کریم اعلان کر رہا ہے۔ اور شہادت دے رہا ہے۔ یہ اللہ کی شہادت ہے اصل اور مضبوط ترین شہادت ہے تو طبقہ صحابہؓ کو بحیثیت طبقہ مقدس قرار دے دیا گیا۔

مقاماتِ صحابہؓ کی تقدیس

پھر ان کے اعمال کی تقدیس الگ کی گئی ان کے اخلاق کی تقدیس الگ کی گئی۔ پھر ان کے مقت کو مقدس الگ بتلایا گیا۔
ایک موقع پر فرمایا گیا :

محمد رسول الله والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم. جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں۔ ان کی شان یہ ہے کہ کفر کے بارے میں شدید ہیں اور ایمان اور مومن کے بارے میں رحیم اور رقیق القلب ہیں یہ ان کے مقامات کو سراہا گیا کہ ان کے قلبی مقامات میں سے دو مقام یہ ہیں کہ ایمان کے رو برو ذائل اور مظبوط اور کفر کے بارے میں بہت شدید ہیں۔ کفر کا چھوٹے سے چھوٹا جزیہ بھی آجائے۔ اس کے سامنے جھک نہیں سکتے کفر کی ہر چیز کو رد کریں گے 'کفر کی چیز سے رضامندی کا اعلان نہیں کر سکتے' تو یہ ان کے قلبی مقامات کو سراہا گیا آگے فرمایا گیا :

اعمالِ صحابہؓ کی تقدیس

تراهم رکعا سجدا یبتغون فضلا من الله ورضوانا. پہلے قلبی مقامات تھے۔ اب بتلاتے ہیں کہ عمل کیا ہے ؟
جب دیکھو رکوع اور سجود میں ہیں۔ اللہ کی رضا اور اس کے فضل کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب دیکھو عبادت اور طاعت میں ہیں :

سیما هم فی وجوههم من اثر السجود جب کوئی ظرف بھر جاتا ہے تو بھر کر چھلکنے لگتا ہے۔ بھر کر وہ شی اس کے اوپر آجاتی ہے۔۔۔ تو اس درجہ صحابہ کے قلوب میں ایمان بھر

دیکھا ہے۔ جھلک کر ان کی پیشانیوں پر نمایاں ہو گیا۔ سجدے کے آثار ان کی پیشانیوں پر ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کی پیشانی ہر وقت اللہ کے سامنے جھکی رہتی ہے۔ ہر وقت یہ حق تعالیٰ کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔۔۔ یہ تو عمل بتلا دیا گیا۔

ذالك مثلهم فى التوراة و مثلهم فى الانجيل. ان کی شانیں توراۃ و انجیل میں بیان کر دی گئی ہیں۔۔۔ پہلے سے انبیاء انہیں سراہتے ہوئے آرہے ہیں۔۔۔ انبیاء علیہم السلام نے ان کو الگ سراہا۔ خاتم الانبیاء علیہ السلام نے ان کو الگ سراہا۔ حق تعالیٰ نے قرآن میں الگ سراہا اور دوامی رضا کا اعلان کر دیا کہ یہ طبقہ یقیناً کھوٹ سے بری ہے۔ نیتوں کی خرابی سے بری ہے۔

خطاء فکری

کوئی اجتہادی خطا اور غلطی ہو جائے وہ ہو سکتی ہے۔ خطاء اجتہادی تو انبیا سے بھی ممکن ہے۔ وہ فکری خطا ہوتی ہے اس کو معصیت نہیں کہتے فرق اتنا ہے کہ نبی اگر خطا اجتہادی کرتے ہیں تو حق تعالیٰ انہیں فوراً صواب تک پہنچا دیتے ہیں۔ غیر نبی اگر خطا اجتہادی کرے وہ اس کے اوپر باقی رہ سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ صواب پر آئے۔۔۔ مگر اس کی خطا پر بھی ایسے اجر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فکر کی خطا ہوتی ہے۔ نیت اور ارادے کی خطا نہیں ہوتی۔ صورت عمل کی خطا ہوتی ہے۔۔۔ تو انبیاء علیہم السلام کی نیتیں پاک اور مقدس ہیں۔ اسی طرح سے صحابہ کرام کے بارے میں بھی فرمایا گیا کہ عمل بھی پاک اور قلبی مقامات بھی پاک، کوئی ان میں کھوٹ نہیں ہے نیتیں بھی مقدس ہیں ارادے بھی مقدس ہیں فکری طور پر یا اجتہادی خطا واقع ہو یہ بڑے سے بڑے کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ کوئی معصیت نہیں، کوئی برائی نہیں۔

اس میں زیادہ سے زیادہ مخلوقیت ہے۔۔۔ تو مخلوق ہونا کوئی برائی کی بات نہیں ہے۔ انبیاء بھی مخلوق ہیں۔ ملائکہ بھی مخلوق ہیں۔ اولیاء بھی مخلوق ہیں تو مخلوق ہونا عیب نہیں ہے۔۔۔ اتنا تو ہے کہ وہ بے شک مخلوق ہیں۔ لیکن مخلوق ہونے کے بعد ان کا ظہر و باطن ان کا قلب و قالب مقدس ہے۔

تقدیسِ قلب

ممکن تھا کوئی یوں کہتا کہ دلوں کے اندر خرابی ہو گی یہ تو ظاہری اعمال ہیں۔ تو قرآن کریم نے اس کا بھی رد کر دیا۔ فرمایا:

اولٰئك الذين امتحن الله قلوبهم للتقوى اللہ نے پہلے ہی ان کے قلوب کا امتحان کر لیا تھا۔ تقویٰ کے معیار پر ان کے قلوب کو جانچ لیا تھا۔ یہ پختہ نکلے:

اولٰئك هم الراشدون. یہ سب کے سب بزرگ اور مقدس ہیں۔ رشد و ہدایت لئے ہوئے ہیں۔

فَضلاً مِنَ اللهِ وَنِعمَةً

"یہ اللہ کی طرف سے اس کا فضل ہے اور اس کی بڑی نعمت ہے"۔

تو قلب کو الگ سراہا گیا۔ قالب کو الگ سراہا گیا۔ قلبی مقامات، قالب کے افعال کو الگ سراہا

گیا اور طبقے کو الگ۔

شرفِ صحابیت

اس وجہ سے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ الصحابة كلهم عدول سارے صحابہ متقی پاکباز اور مقدس ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب، شیخ، ولی اور کامل گزرے مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہؓ کا جو رفعت مقام ہے۔ وہ بڑے سے بڑے قطب اور غوث کو نصیب نہیں۔۔۔ اس واسطے کہ صحابی وہ ہے جس نے اپنی آنکھ سے نبی کریم کا دیدار کیا ہے۔ اپنے کانوں سے بلا واسطہ کلام مقدس کو سنا ہے یہ شرف غیر صحابہ کو۔۔۔ نصیب نہیں ہو سکتا۔ تو بلاواسطہ آفتاب نبوت کا نور جس طبقے نے لیا ہے۔ جو تیزی اس میں ہو گی بالواسطہ نور میں وہ تیزی نہیں ہو سکتی۔ وسائط کے سبب سے کچھ نہ کچھ پھیکا پن ضرور آئے گا سب سے پہلے ایمان کا اثر اور نقش جو پڑا ہے۔ وہ صحابہؓ کے قلب پر پڑا ہے بلاواسطہ کسب فیض کیا، اور فیض صحبت حاصل کیا۔ تو نگاہیں بھی مقدس تھیں ان کے کان اور سماعتیں اور زبانیں بھی مقدس ہو گئیں۔ اور ان کی ترقی قلوب ہو گئی۔

انکی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے اپنی ہر قوت کا مصرف یہ سمجھا کہ انکے ذریعہ اللہ کے رسول کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرتے جائیں یہی ان کا دین یہی ان کا ایمان ہے۔

عشقِ صحابہؓ

حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جب وفات ہوئی تو ایک صحابی ہیں، وہ عوام صحابہؓ میں سے ہیں۔ یعنی خواص میں سے نہیں ہیں کہ فقہاء و علماء صحابہ میں سے ہوں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ تو اس دور میں عوام میں تھے مگر صحابی ہیں تو کھیت میں ہل چلا رہے تھے۔ تو کسی خبر دینے والے نے خبر دی کہ نبی کریم ﷺ کی وفات ہو گئی۔ ایک دم رک کر ششدر اور حیران رہ گئے!

کہا وفات ہو گئی۔۔۔؟

کہا کہ ہاں! وفات ہو گئی۔۔۔

بس ہل چھوڑ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ!

"اے اللہ! یہ آنکھیں اس لئے تھیں کہ تیرے نبی کریم ﷺ کا دیدار کریں۔ یہ کان اس لئے تھے کہ تیرے مقدس رسول کی آواز سنیں اور جب رسول دنیا میں نہیں تو میری بھی بینائی ختم کر دے اور میری سماعت بھی ختم کر دے۔ اب میں نہ کسی کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ نہ کسی کی آواز سننا چاہتا ہوں"۔

مستجاب الدعوات تھے۔ اس وقت دعا قبول ہو گئی اور اسی وقت نابینا ہو گئے اور اسی وقت بہرے ہو گئے کہ کوئی لفظ سن نہیں سکتے تھے۔

یہ گویا انتہائی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کا مصرف دیدار نبوی سمجھا ہوا تھا۔ کانوں کا مصرف یہ تھا کہ حضور ﷺ کی آواز سنیں اور کوئی مصرف نہ تھا۔

یہ انتہائی کمال ولایت اور قرب مع اللہ اور نسبت مع النبی ﷺ ہے کہ تمام اعضاء وقویٰ بدن کی

آخری۔۔۔غایت اللہ اور اس کا رسول رہ جائے' کان ہوں تو ان کا مصرف یہ ہے کہ اللہ ورسول کی باتیں سنیں' آنکھ ہو تو اس کا مصرف یہ ہو کہ اللہ کے رسول کا دیدار کرے' ہاتھ اس لئے ہوں کہ اس سے اللہ اور رسول کے آثار کو چھوئیں' قرآن پر ہاتھ رکھیں حدیث پر ہاتھ رکھیں دینی کتابیں اور دینی مکانات پر ہاتھ رکھیں۔ بیت اللہ کے پردوں پر ہاتھ رکھیں گویا ہاتھ کا مصرف یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو چھوئیں جو اللہ و رسول کے نام لگی ہوئی ہیں۔

وہ کسی عارف نے کہا ہے کہ

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکوئے تو رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را
او دامنت گرفتہ بسوئے ام کشیدہ است

عارف کہتا ہے کہ مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے۔ مگر اس لئے ناز نہیں کہ میری آنکھ ہے' اس لئے ناز ہے کہ وہ ترا جمال دیکھنے والی ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ میری آنکھ ہے اس لئے کہ وہ تیری دیدار کنندہ ہے۔۔۔اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے قدموں پر سر رکھدوں۔ اپنے قدموں کی تعظیم کروں نہ اس لئے کہ میرے قدم ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ قدم مجھے تیرے کوچے کی طرف کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تیری مسجد اور بیت اللہ کی طرف دینی احکامات کی طرف' دینی چیزوں کی طرف' یہ قدم مجھے کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے قدموں میں اپنا سر ڈالدوں۔ مجھے قدموں سے محبت ہوگئی ہے' یہ تجھ تک پہنچنے کا واسطہ بن گئے ہیں۔

اور میرا جی چاہتا ہے کہ ہر دم اپنے ہاتھوں کو چومے جاؤں۔ نہ اس لئے کہ میرے ہاتھ ہیں بلکہ اس لئے کہ تیرا دامن پکڑ کر تجھے میری طرف لے آتے ہیں۔ اور قرب کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔۔۔تو کمال ولایت ہے کہ آدمی اپنے ہر وصف کو ہر عضو کو ہر سلیقے کو حق تعالیٰ تک پہنچنے کا اور اللہ کے رسول تک پہنچنے کا واسطہ بنائے۔ صحابہ میں عوام صحابہ کو یہ مرتبہ نصیب تھا۔ صحابہ کے بعد پچاسوں برس کی محنت اور ریاضت کے بعد کہیں یہ مسئلہ آدمی کے سامنے حل ہوتا ہے کہ میرے جسم اور میری روح کی غرض وغایت اللہ اور اس کا رسول ہے۔ بیسیوں برس کی محنت ترک لذات اور مجاہدوں کے بعد کہیں اس مقام تک پہنچتا ہے۔ مگر صحابہ کی یہ بات ہے کہ عوام صحابہ پہلے ہی قدم پر اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ دنیا تو دنیا اگر ہماری ذات کا بھی مصرف ہے تو اللہ و رسول ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز نہیں' غرض اس طبقے کی تقدیس فرمائی گئی۔ اور اس طبقہ کو مقدس ترین طبقہ کہا گیا۔

معیار ایمان و عمل

اس واسطے اہلسنت والجماعت کا یہ مذہب ہو گیا کہ:

الصحابہ کلھم عدول۔

سارے صحابہؓ متقی، عادل اور پاکباز ہیں اور ہماری تنقید سے بالاتر ہیں۔ ہماری ہر حالت سے اونچے ہیں۔ ہمارا فرض ہوگا کہ ان کو سامنے رکھ کر اپنے ایمانوں کو پرکھیں۔ اگر ان کے ایمان کے مطابق ہو جائے تو ہمارا ایمان درست ہے۔ ورنہ غلط ہے ہم ان کے اعمال کو کسوٹی کے طور پر سامنے رکھیں اگر ہمارا عمل ان کے عمل پر منطبق ہو گیا تو سیدھا۔ ورنہ ہمارے عمل میں کھوٹ ہے وہ ہمارے عمل کے حق و باطل کو پرکھنے اور پہچاننے کے معیار اور کسوٹی ہیں۔ اس طرح ہمارے ایمانوں کو پہچاننے کا معیار ہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے جناب نبی کریم علیہ السلام سے دین کے راوی ہیں اگر ان میں معاذ اللہ کوئی خرابی ہے تو پھر ہمارے دین کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر بنیاد میں خرابی پڑے تو ہم پھر صحیح ایمان نہیں لاسکتے۔ ہمارا ایمان تو انہی کے قدموں کے صدقے ہے اگر وہ صحیح ایمان لائے ہیں تو ہمارے پاس صحیح ہے اگر انہوں نے کوئی معاذ اللہ غلطی کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بعد والوں کے ایمان درست ہوں۔ تو درحقیقت وہ ہمارے ایمان کے پہچاننے کے لئے ایک کسوٹی ہیں۔ ہمارے علم اور عمل کے صحیح اور درست ہونے کے لئے۔ اس لئے کہ علم کی روایت بھی انہوں نے اللہ کے رسول سے کی ہے۔ اور عمل کی روایت بھی انہوں نے ہی کی ہے۔

اسوہ علم و عمل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے یہ فرمایا گیا کہ آپ اللہ کی طرف سے عمل لے کر آئے ہیں۔ سچا اور قطعی علم لا کے امت کے سامنے پیش کیا۔ اسی طرح عمل کے نمونے بھی اللہ کی طرف سے آپ ہی لے کر آئے ہیں۔ ان نمونوں کو دیکھ کر امت نے عمل کا نمونہ سیکھا، اگر علم محض دیدیا جاتا اور عمل کا نمونہ سامنے نہ آتا تو جس شخص کا جیسا جی چاہتا عمل کا نمونہ اختیار کر لیتا۔ نماز کا حکم دیدیا جاتا مگر نماز کا ڈھنگ عمل کر کے نہ بتلایا جاتا تو میں اپنی ڈھنگ کی نماز پڑھتا۔ آپ اپنی روش کی نماز پڑھتے۔ ایک نماز کی لاکھوں نمازیں بن جاتیں۔۔۔ لیکن اللہ کے رسول نے جہاں علم دیا جہاں نماز کا آرڈر دیا وہاں نماز کا نمونہ بھی دیا۔

اسی واسطے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ:

صلوا اے لوگو! نماز پڑھا کرو۔

یہ فرمایا کہ:

صلوا کما رأیتمو نی اصلی.

"نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو"۔

یعنی نماز کے صحیح ہونے کا نمونہ میں ہوں اسی ڈھنگ کی پڑھو۔

اسی طرح آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ توضئوا ۔۔۔ اے لوگو وضو کر لیا کرو۔ جس طرح تمہارا جی چاہے۔ وضو کا آرڈر بھی دیا اور وضو کر کے بھی دکھلایا کہ یوں کرو۔ ایک دفعہ آپ نے وضو فرمایا تو تمام اعضاء کو ایک ایک دفعہ دھویا۔ فرمایا:

هذا وضوء لا یقبل الله الصلوة الابه.

"یہ وہ وضو ہے جس کے بغیر نماز ہی نہیں قبول ہوگی"۔

یعنی اگر ایک دفعہ بھی اعضاء وضو نہ دھوئے جائیں تو وضو نہیں ہوتا تو پھر نماز کیسے ہوتی۔ یہ تو وہ وضو ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد دوبارہ وضو کیا اور ہر عضو کو دو مرتبہ دھویا۔ ہاتھ بھی دو مرتبہ دھوئے، کلی بھی دو مرتبہ کی، ناک میں پانی دو مرتبہ اور منہ بھی دو مرتبہ دھویا فرمایا کہ یہ وہ وضو ہے جو نور علی نور ہے۔ ایک نور ایک دفعہ دھونے میں دوسرا نور دوسری دفعہ کے دھونے میں۔

پھر تیسری دفعہ وضو کیا اور اس میں تمام اعضاء وضو کو تین مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ:

هذا وضوءی و وضوء الانبیاء من قبلی.

"یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے سارے پیغمبروں کا یہی وضو ہے"

تو آپ نے آرڈر نہیں دیا کہ وضو کرو۔ یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں ہو کہ جب چاہو تم اپنی طرف سے گھڑ لو۔ عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں کہ جیسا چاہو نمونہ بنالو اس میں بھی اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

اسوہ نبی کی احتیاج

حدیث میں واقعہ آتا ہے، حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کا جو صحابی ہیں، رمضان شریف کے بارے میں آیت نازل ہوئی:

کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی اللیل.

فرمایا گیا کہ ۔۔۔ کھاؤ اور پیو جب تک کھل کر نمایاں نہ ہو جائے سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے یعنی متمیز نہ ہو جائے اور الگ پہچان نہ ہو جائے، اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات جب جانے لگے سپیدی کا تاگہ جب نمودار ہو جائے اور صبح صادق ہو گئی اب کھانا پینا بند کر دو روزے کی نیت کر لی۔ رات میں کھانے کی اجازت ہے اور جہاں پو پھٹی اب کھانا پینا ممنوع ہو گیا۔

تو خیط ابیض یعنی سفید ڈورا صبح صادق کی لکیر کو کہا گیا ہے۔ اور سیاہ ڈورا رات کی لکیر کو کہا گیا حضرت عدی ابن حاتمؓ نے ایک دوڑا سفید رکھا اور اور ایک ڈورا سیاہ رنگوایا اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور کھانا پینا جاری ہے، تکیہ اٹھا کر دونوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ جب یہ ڈورے الگ پہچانے جائیں گے تب کھانا پینا بند کروں گا تو صبح صادق کب کی ہو گئی، چاندنا بھی ہو گیا مگر اتنا چاندنا نہیں ہوا تھا کہ ڈورے الگ نمایاں ہو جائیں تو صبح صادق گزرے ہوئے بیس منٹ گزر گئے اور یہ اپنا کھا پی رہے ہیں سو جب تک ڈورے الگ الگ نمایاں نہیں ہوں گے کھانے پینے کی اجازت سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع ہوئی نبی کریم ﷺ کو۔

تو آپ نے عدی ابن حاتمؓ سے فرمایا! تم کیا کرتے ہو؟ روزے کی نیت کب کرتے ہو؟

یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ کھاؤ پیو جب تک سفید ڈور کی سیاہ ڈورے سے الگ پہچان نہ ہو جائے ۔۔۔ یا رسول اللہ میں نے دو ڈورے تکئے کے نیچے رکھ رہے ہیں ایک کالا ڈورا ایک

سفید ڈورا۔ آپ نے فرمایا: ان وسادتك لعریض تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ کالا ڈورا اور سفید ڈورا دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے۔۔۔ یعنی رات اور دن دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے' تیرے تکئے کی بڑائی کا کیا ٹھکانہ ہے؟

بندہ خدا! کالے ڈورے سے مراد رات کی سیاہی ہے اور سفید سے مراد صبح صادق کی لکیر ہے؛ تو تیرا تکیہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے نیچے صبح صادق بھی آگئی اور رات بھی آگئی۔۔۔ تب واضح ہوا کہ کالے ڈورے سے مراد خداوندی رات ہے اور سفید ڈورے سے مراد خداوندی صبح صادق ہے۔ تو لغت کے لحاظ سے وہ یہ مطلب سمجھے اور لغت کے لحاظ سے وہ مطلب صحیح تھا۔ مگر مراد' اللہ کی یہ نہیں تھی۔

اب اگر اللہ کا رسول اس مراد کو بیان نہ فرماتے۔ تو عمر بھر وہ اسی غلطی میں مبتلا رہتے' ایک روزہ بھی ان کا صحیح نہ ہوتا۔۔۔ اس لیئے واضح ہوا کہ قرآن وحدیث میں ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک ارادی معنی جن کا اللہ ورسول نے ارادہ کیا ہے۔ ایک اس کا ترجمہ ہے اور ایک اس کا مطلب ہے یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں کہ جو چاہو اپنی طرف سے گھڑ لو۔ عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں ہو جیسا چاہو نمونہ بنالو۔ اس میں اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

علم وعمل کی مطابقت

اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں یہ فرمایا گیا کہ یہ قرآن تبیانا لکل شی ہے۔ ہر چیز کے لئے یہ تبیان ہے۔ تبیان دعوی مع الدلیل کو کہتے ہیں' یعنی اس میں احکام بھی ہیں اور احکام کے دلائل بھی ہیں یعنی مدلل دعوؤں اور مدلل مسائل کا مجموعہ ہے۔

اس طرح سے فرمایا کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ　تو قرآن نے جتنے علم کے نمونے پیش کئے۔ اللہ کے رسول نے اتنے ہی عمل کے نمونے پیش کئے۔ قرآن میں جو چیز قال کی صورت میں ہے اللہ کے رسول میں وہی چیز حال کی صورت میں ہے۔ وہاں قول ہے یہاں عمل ہے تو قول اور عمل دونوں مطابق ہے آپ جو کچھ کرتے ہیں' قرآن وہی کچھ کہتا ہے' جو کچھ قرآن کہتا ہے وہی آپ عمل کرتے ہیں۔ تو علم وعمل کی مطابقت ہے۔

اتباع محض

یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں اختلافات بہت کم ہیں' اس لئے کہ جہاں کسی آیت کے مضمون میں انہیں اشکال ہوا وہ اللہ کے رسول کے عمل کو دیکھ لیتے تھے اشکال حل ہو جاتا تھا۔ معلوم ہو جاتا تھا کہ اس عمل کا مصداق یہ ہے کہ اس عمل کی ہیئت عمل یہ ہے جو اللہ کے رسول نے کر کے دکھلائی۔ تو جتنی چیزیں قرآن میں علم کی صورت میں ہیں وہ سب چیزیں رسول اللہ ﷺ میں عمل کی صورت میں ہیں۔ تو آپ نے جہاں یہ فرمایا کہ "یہ کرو اور یہ نہ کرو" وہیں آپ نے کر کے دکھلا دیا کہ جو کرنے کی چیز ہے اس کی ہیئت یہ ہے اور جو بچنے کی صورت ہے تو

بچنے کی یہ ہیئت ہے، تو وضو کر کے دکھلایا۔ نماز کو کر کے دکھلایا جہاد کو کر کے دکھلایا۔ روزے کو کر کے دکھلایا۔ شادیاں کر کے دکھلائیں کہ یہ نمونہ ہے۔ اور غمی کو کر کے دکھلایا کہ یہ نمونہ ہے، دوستوں سے یہ معاملہ ہے، دشمنی سے یہ ہے، صلح کا یہ طریقہ ہے، جنگ کا یہ طریقہ ہے۔ اصول بتلا دیئے اور ان اصولوں کے مطابق اپنے عمل کا نمونہ پیش کر دیا۔۔۔ تو خلوت ہو یا جلوت، انفراد ہو یا اجتماع، جماعتی زندگی ہو یا فردی، سب کے عمل کے نمونے آپ نے کر کے دکھلا دیئے۔ اس واسطے امت کے لئے اتباع ہی اتباع ہو گیا تجویز باقی نہیں رہی تجویز تو تب کریں، جب کوئی نمونہ نہ دکھلایا گیا ہو۔ سارے نمونے موجود ہیں آگے اتباع رہ جاتا ہے۔ گھڑنا یا بنانا یا ساخت نہ عمل کے درجے میں باقی۔ علم پورے کا پورا لاکر پیش کر دیا۔ شریعت جامع ہے۔ اس شریعت پر پورا پورا عمل کر کے رکھلایا تو اتباع باقی رہ جاتا ہے، تجویز امت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔

تو حضرات صحابہؓ نے سب سے پہلے اتباع کیا، سب سے زیادہ متبع سنت وہی ہیں۔ سب سے زیادہ متبع شریعت وہی ہیں۔ انہوں نے ہر نمونے کو اللہ کے رسول سے روایت کیا۔۔۔ تو قرآن کریم کی عملی روایت بھی صحابہؓ سے چلی اور اس کی روایت بھی صحابہؓ سے چلی۔ عمل بھی کر کے دکھلاتے رہے۔ صحابہؓ پھر تابعین اس کے بعد تابعین اس کے بعد تبع تابعین۔

فرائض رسالت

قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ نبی کریم ﷺ کے چار وظیفے ہیں:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویز کیهم ویعلمهم الکتب والحکمة

اللہ نے رسول بھیجا۔ اس کی کیا شان ہے؟

اللہ کے رسول نے چار کام کئے۔۔۔ پہلے تلاوت آیات کی یعنی بلا کم وکاست، وحی کے الفاظ جو اللہ نے آپ کے قلب مبارک پر نازل کئے پڑھ کر سنا دیئے۔۔۔ اس کے بعد تعلیم دی۔۔۔ تعلیم تلاوت سے الگ ہے، تلاوت کا تعلق لفظوں سے ہوتا ہے۔ تعلیم کا تعلق معانی سے ہوتا ہے یعنی پہلے لفظ سنائے پھر معانی سمجھائے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے۔۔۔ اس کے بعد تعلیم حکمت کی اور حکمت سے مراد یہاں اسوہ حسنہ ہے یعنی کر کے دکھلایا۔ اس لئے کہ حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمت نظری اور ایک حکمت عملی۔ حکمت نظری تو تعلیم میں آگئی کہ نظر و فکر کی چیز تھی علمی صورت میں آپ نے بتلا دی، اب عملی صورت رہ جاتی تھی۔ اس کو حکمت سے تعبیر کیا کہ عمل کا نمونہ پیش کر دیا تو عمل بھی سکھلایا اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا۔

تزکیہ قلوب

اس کے بعد چوتھی چیز بتلائی ویز کیهم دلوں کے مانجھنا اور ان کو صاف کرنا یہ بھی آپ کا ایک وظیفہ ہے، امت کا تزکیہ فرمانا اور ان نفوس میں استقامت پیدا کرنا۔ زیغ کجی اور ٹیڑھ نکال دیں، فہم کی ایسی سلامتی پیدا کریں کہ جب

اللہ کی آیات پڑھی جائیں تو آدمی ٹھیک وہ مطلب سمجھے جو اللہ کی مراد ہے۔ دل صحیح راستہ پر پڑ جائے۔

اس واسطے کہ اگر دل میں ٹیڑھ رہ جاتی ہے تو صحیح سے صحیح کلام کا مطلب بھی ٹیڑھا سمجھتا ہے۔ سمجھ کا دارومدار دل پر ہے اور دل کا راستہ غلط ہو تو ہر مکتوب غلط ہو جائے گا۔۔۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کے دل میں خدا نخواستہ یہودیت بھری ہوئی ہے وہ قرآن کو پڑھے گا تو ساری آیتوں میں سے یہودیت نکالنا شروع کر دے گا اسے یوں معلوم ہو گا کہ سارا قرآن یہودیت سکھلانے کے لئے آیا ہے۔ نصرانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے نصرانیت نکلتی ہوئی معلوم ہو گی۔ اگر قادیانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے قادیانیت نکلتی ہوئی معلوم ہو گی۔۔۔ کوئی اور نظریہ مکتب فکر لے لیجئے۔ جو مکتب فکر بنا ہوا ہو گا ویسا ہی آدمی ہر آیت ہر روایت سے مطلب سمجھے گا تو سمجھنے کا دارومدار دل پر ہے۔ اگر دل میں صحیح سلامتی پیدا کی جائے تو آدمی ٹھیک مطلب سمجھے گا اور اگر دل ٹیڑھا ہے تو ہر چیز ٹیڑھی ہے۔۔۔ تو نبی کریم ﷺ نے فقط تعلیم ہی نہیں دی۔ فقط مطالب ہی نہیں بتلائے بلکہ دلوں کا رستہ بھی سیدھا کیا تاکہ سیدھا مطلب سیدھے دل میں اتر جائے گھر کر جائے۔ اگر دلوں میں ٹیڑھ رہ گئی تو یقینا مطلب بھی ٹیڑھا بن جائیگا۔

عمل کی نگرانی

تو آپ نے تزکیہ بھی کیا اور عمل کی نگرانی بھی کی۔ ایک طرف مسائل سکھلائے اور ایک طرف عمل دیکھتے کہ آیا صحابہ کا عمل اس کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ آپؐ راتوں کو نگرانی فرماتے تھے۔

حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رات کو آپ نگرانی کرتے ہوئے گھومے تو آپ صدیق اکبرؓ کے مکان سے گزرے تو صدیق اکبرؓ تلاوت میں مشغول تھے اور اتنی آہستہ تلاوت کر رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے تو سننے میں آتی تھی ورنہ سننے میں نہیں آتی تھی۔ آپ آگے پہنچے، فاروق اعظمؓ کے مکان سے گزرے وہ اتنے زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے کہ سارا محلہ گونج رہا تھا۔

صبح کو جب یہ حضرات دربار نبوی میں جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھتے تھے کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے کان لگائے تو مشکل سے سننے میں آئے عرض کیا 'یا رسول اللہ اسے سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے یعنی اللہ رب العزت' تو مجھے زور زور سے پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو میرے دل کی کھٹک سے بھی واقف ہے:

واللہ علیم بذات الصدور

"مجھے ضرورت نہیں تھی کہ میں زور زور سے بولوں"۔

لا تدعون اصم ولا غائبا.

تم جو پکار رہے ہو نہ بہرے کو پکار رہے ہو نہ غائب کو پکار رہے ہو وہ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ اور شنوا و بینا اور سمیع و بصیر ہے۔ اس واسطے میں آہستہ پڑھتا تھا۔

فاروق اعظمؓ سے پوچھا کہ تم اتنا زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟

عرض کیا:

اوقظ الوسنان واطرد الشیطان

زور زور سے پڑھ کر سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا کہ اس کوچے میں نہ آنے پائے قرآن کی آواز سن کر دور سے بھاگ جائے۔۔۔ تو دونوں کے پاس حجت تھی اور دونوں کے قلب کا ایک مقام تھا۔ اپنے مقام کے مطابق ہر ایک کا عمل سچا اور حق تھا حضور علیہ ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکر! تم ذرا آواز کو پستی سے بلند کر دو۔۔۔ اور۔۔۔ اے عمر! تم ذرا رفعت سے پستی کی طرف آؤ۔۔۔ تاکہ اعتدال قائم ہو جائے۔ دونوں نقطہ اعتدال پر آ جاؤ۔۔۔ ظاہر بات ہے کہ یہ نگرانی تھی۔ یہ قلب کی راہیں درست کرنا تھا۔

غرض مجاہدہ

یہ کوئی جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا۔ آہستہ پڑھنا بھی جائز ہے اور پکار کر پڑھنا بھی جائز ہے یہاں جائز و ناجائز کی بحث نہیں تھی۔ یہاں قلب کو راہ اعتدال پر لانے کی بحث تھی۔ یہ چیز قلبی مقامات سے متعلق ہے، مسائل سے نہیں بلکہ مقامات باطن سے متعلق تھی تو جہاں رسول علیہ ﷺ نے علم سکھلایا۔ مسائل بتلائے وہاں دلوں کو مانجھا بھی اور صاف بھی کیا۔ مجاہدے اور ریاضتیں کرا کر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت بھری۔ تاکہ دنیا کی محبتیں قلب سے نکل جائیں تو کہیں جہاد، کہیں مجاہدہ اور کہیں راتوں کے تہجد صحابہ کرامؓ اس قدر راتوں کو تہجد میں راسخ القدم بن کے اتنا کھڑے رہتے تھے کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا یہ محنتیں اور مجاہدے کس لئے تھے؟ تاکہ نفس کی مرغوبات ختم ہو کر روح کی مرغوبات سامنے آجائیں، قلب کے اندر محبت الٰہی جاگزیں ہو جائے اور راسخ ہو جائے اب دنیا کا کام بھی کریں تو اللہ کے لئے کریں، نفس کے لئے نہ کریں، تو نفس کی راہوں کو بند کر کے قلب اور روح کی راہیں ان کے سامنے کھول دیں، کوئی عمل بند نہیں کیا۔

فرق عمل

اعمال جو ایک عامی آدمی کرتا ہے، وہی ایک ولی بھی کرتا ہے، فرق ہوتا ہے قلب کے راستے میں اس کا کرنا لوجہ اللہ ہوتا ہے، اور اس کا لوجہ النفس ہوتا ہے، عمل دونوں کا برابر ہے۔ کھاتا یہ بھی ہے اور ایک ولی بھی کھاتا ہے، بازار میں یہ بھی جاتا ہے اور ایک ولی کامل بھی بازار جاتا ہے، صورت عمل میں تو فرق نہیں مگر نیت عمل اور غرض و غایت عمل میں فرق ہے تو باطن کا فرق ہوتا ہے آپ نے قلوب کو صاف کر کے باطن کو مانجھ دیا کہ جو کچھ کریں لوجہ النفس نہ رہے، لوجہ اللہ ہو جائے۔ دوستی ہو یا دشمنی، محبت ہو یا عداوت خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔

اخلاص عمل

حضرت علیؓ کا واقعہ سیر کی کتب میں مشہور ہے کہ آپ نے غزوہ بدر میں ابو جہل کو پچھاڑ دیا اور ارادہ کیا کہ خنجر لے کر اسے ذبح کر دیں۔

اس نے غصہ میں آکر حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ بس خنجر چھوڑ کر کھڑے ہوگئے قتل سے باز آگئے کہ اب نہیں قتل کروں گا۔

ابو جہل نے کہا اے علی! میں تو تم کو دانشمند سمجھتا تھا۔ میں تمہارا ابھی دشمن تمہارے رسول کا بھی دشمن اور تمہارے دین کا بھی دشمن۔ ایک منٹ کے لئے میں نہ چاہتا کہ تمہارا دین اس دنیا میں باقی رہے۔ تم یا تمہارے رسول باقی رہیں اتنے بڑے دشمن پر قابو پا کر اسے چھوڑ دینا یہ کونسی دانشمندی ہے؟ تم نے کیوں نہیں مجھے قتل کیا۔

فرمایا کہ میں تجھے اللہ کے لئے قتل کرنے بیٹھا تھا۔ میری کوئی ذاتی لڑائی تجھ سے نہیں کوئی ذاتی بغض نہیں۔ اللہ کی وجہ سے عداوت تھی اور یہ ساری لڑائی بھڑائی اللہ کی وجہ سے تھی۔ جب تو نے میرے منہ پر تھوکا تو میرے نفس میں غصہ پیدا ہو گیا' اب اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبات سے قتل کرتا تو میری عبادت شرک میں بدل جاتی۔ میری توحید' توحید باقی نہ رہتی۔ اس واسطے میں قتل سے باز آگیا۔ اس لئے کہ یہ قتل وغارت نفسانی جذبے سے نہیں رحمانی جذبے سے ہے۔ جب نفس میں غضب پیدا ہو گیا۔ تو اب قتل کرنا نفس کی راہنمائی سے ہوتا خدا کی راہنمائی سے نہ ہوتا۔ لوجہ اللہ نہ ہوتا۔ لوجہ النفس ہوتا۔ تو معلوم ہوتا ہے صحابہ کا جو کچھ عمل تھا وہ اللہ کے لئے تھا۔ نفس کے لئے نہ تھا۔

حقیقتِ ولایت

یہ دولت حضرات صحابہ کرام کو نبی اکرم ﷺ کے تزکیہ سے نصیب ہوئی۔ آپ نے ریاضتیں اور مجاہدے کرا کر دلوں کو مانجھا اور دلوں کی راہ درست کی نیتیں بھی صاف۔ منزلیں بھی صاف' غرض وغایت بھی درست' ہر عمل کھانا پینا سونا جاگنا اللہ کے لئے ہو گیا۔۔۔ ان کی جوتیوں کی برکت ہے کہ اولیاء کرام میں بھی یہ چیزیں آئیں۔۔۔ ولایت کہتے ہی اس کو ہیں کہ قلب کا راستہ درست ہو جائے۔ ولایت کے یہ معنی نہیں کہ آدمی کھانا چھوڑ دے' لباس چھوڑ دے' گھر بار ڈھادے' گھر میں رہنا سہنا ترک کر دے' ولی کے معنی یہ ہیں کہ گھر میں رہے مگر حظ نفس کے لئے نہیں۔ خدا کی رضا کے لئے کھانا کھائے مگر نفس کی لذت کے لئے نہیں' رضائے خداوندی کے لئے۔ ایک ولی اور عامی میں یہی فرق ہوتا ہے تو عمل ولی اور عامی کا ایک ہوتا ہے۔ مگر قلب کا فرق ہے۔ نیتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ قلب کے مقامات کا فرق ہوتا ہے۔ تو اولیاء میں یہی چیز ہوتی ہے کہ وہ ہر بات لوجہ اللہ کرتے ہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ کا واقعہ

سہل بن عبداللہ تستریؒ یہ اولیائے کاملین میں سے ہیں اور بڑے اونچے رتبے کے اولیاء میں ہیں۔۔۔ حتی کہ اس درجہ کے لوگوں میں ہیں کہ خود سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں۔ وہ جو حق تعالیٰ نے عالم ازل میں عہد لیا تھا الست بربکم۔۔۔؟ آدم علیہ السلام کی کمر سے ان کی ساری اولاد نیک، و بد نکالی گئی اور سب کو سامنے کر کے حق تعالیٰ نے عہد لیا۔

الست بربکم ؟

"کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟"

سب نے وہاں عہد کیا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ ہمارے پروردگار ہیں۔۔۔ یہ سہل بن عبداللہؒ اس درجے کے لوگوں میں ہیں فرماتے ہیں کہ :

"مجھے آج تک وہ عہد یاد ہے۔ اور وہ مقام بھی یاد ہے جہاں یہ عہد لیا گیا تھا"۔

اس درجہ ان کی روح صاف ہے اور جلا لئے ہوئے ہے کہ عالم ازل کا نقشہ پیدائش کے بعد بھی ان کے ذہن میں تھا۔۔۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ مجاہدین کی ایک جماعت جا رہی تھی۔ تو ان کا ارادہ ہوا کہ میں بھی جہاد میں شریک ہوں کہ مفت میں ایک اتنی بڑی عبادت ملتی ہے تو ان کے نفس میں تقاضا پیدا ہوا کہ میں جہاد میں شریک ہو جاؤں۔۔۔ لیکن جب نفس میں تقاضا پیدا ہوا تو بیٹھ گئے۔ اور کہ یہ نفس کیوں چاہتا ہے کہ جہاد میں شریک ہوں۔ نفس کو تو جہاد سے بچنا چاہئے تھا نفس چاہے کہ میں عبادت کروں تو نفس تو اس درجے کی چیز نہیں وہ تو عبادت سے روکنے والی چیز ہے۔

اِنَّ النَّفسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوۡءِ .

نفس تو برائی کا امر کرتا ہے نہ یہ کہ امر کرے کہ تم نماز پڑھو اور جہاد کرو اور اللہ کی راہ میں جان دیدو۔ نفس کو تو بچنا چاہئے۔ تو نفس میں کیوں یہ تقاضا ہے؟ کوئی مکر پوشیدہ ہے اور نفس کے اندر کوئی کھوٹ ہے غرض بیٹھ گئے اور بیٹھ کر سوچنا شروع کیا۔ کہ آخر نفس کے لئے جہاد کے اندر کیا لذت کا سامان ہے۔ کہ یہ نفس کہہ رہا ہے۔ کہ جہاد میں چلو۔

تو ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے چالیس برس روزے رکھتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ اور ایک دن بھی چالیس برس میں افطار نہیں کیا اور جہاد میں روزہ رکھ کر شریک ہونا مکروہ ہے۔ اگر رمضان بھی ہے تو بھی مستحب یہ ہے کہ افطار کرے تاکہ قوت سے جہاد کر سکے۔ بھوکا آدمی جہاد نہیں کر سکے گا۔ تو نفس کی مکاری یہ چھپی ہوئی تھی کہ چالیس برس سے مجھے بھوکا مار رکھا ہے۔ جہاد میں جاؤ گے تو دن میں کھانے کو روٹی مل جائے گی۔ یہ مکر پوشیدہ تھا۔۔۔ اب کھڑے ہوئے اور کہا اے نفس! میں جہاد میں جاؤں گا اور روزہ رکھ کر جاؤں گا۔ آج (افطار کرنے کے) مستحب کو انجام نہیں دوں گا چاہے مکروہ ہو مگر تجھے ستانا ہے اور تیرا مقابلہ کرنا ہے جہاد بھی کروں گا تو روزہ رکھ کر کروں گا۔ تجھے کھانے کو وہاں نہیں ملے گا۔

اس پر بھی نفس نے کہا تم جاؤ جہاد میں، میں تیار ہوں۔

پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ! یہ نفس جہاد کا کیوں تقاضا ہے؟ یہ تقاضا قلب اور روح میں ہونا چاہئے یہ نفس کیوں تقاضا کر رہا ہے اسے تو جہاد سے بچنا چاہئے پھر بیٹھ گئے غور اور مراقبہ کیا کہ آخر کونسا مکر نفس کے اندر پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ جہاد کرو۔

تو سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ چالیس برس سے خلوت میں ہوں، آدمی کے نفس کا تقاضا لوگوں سے ملنا جلنا انس و موانست حاصل کرنا ہوتا ہے۔ انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ یہ جانوروں کی طرح بھٹوں میں وحشت زدہ ہو کر الگ الگ نہیں رہتا۔ بستیاں بنا کر رہتا ہے۔ میل

جول سے رہتا ہے تاکہ انس و موانست پیدا ہو۔ یہ تو انس کا بندہ ہے۔۔۔ اور اسی واسطے انسان کو کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ اُنس ہے جس میں انس نہ ہو وہ انسان ہی نہیں۔ تو انسان کا جبلی تقاضا انسیت و موانست ہے کسی عرب کے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

وَمَا سُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلاَّ لِاُنْسِهٖ
وَمَا الْقَلْبُ اِلاَّ انه يَتَقَلَّبُ

انسان کو انسان کہا ہی اسی لئے گیا ہے کہ اس میں انسیت اور موالنست کا مادہ موجود ہے۔ جیسے قلب کو قلب اس لئے کہتے ہیں کہ قلب کے معنی لوٹنے پوٹنے کے ہیں۔ قلب میں چونکہ ہر وقت کا لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے کبھی یہ جذبہ، کبھی یہ خیال، کبھی یہ ارادہ اس لئے قلب کو قلب کہتے ہیں۔ تو انسان انسان بنا ہی اس لئے کہ اس میں انس ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ چار آدمیوں کے ساتھ مل کر رہے۔ تنہائی میں اسے وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تو چالیس برس سے سہل بن عبداللہؒ خلوت میں رہتے تھے۔ نفس چاہتا تھا کہ لوگوں سے مل جل کر رہیں مگر بچتے تھے۔ نفس میں تقاضا جہاد کا ہوا کہ جب جہاد کریں گے تو چار آدمیوں سے ملاقات تو ہوگی۔ یہ جو تنہائی میں مجھے گھوٹ رکھا ہے۔ جہاد میں جا کے یہ تنہائی کی وحشت کچھ تو کم ہوگی۔ ایک خیمہ میں جب جمع ہونگے نو دس آدمی ہوں گے تو کچھ بات چیت کرنے کا موقع ملے گا کسی میدان میں جمع ہوں گے ایک دوسرے کے ساتھ موانست حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ تو یہ جو تنہائی کی وحشت کے ساتھ چالیس برس سے مجھے مار رکھا ہے۔ یہ مار تو ختم ہو جائے گی۔ اس لئے جہاد کا تقاضا پیدا ہوا۔

یہ گویا مکر تھا جو چھپا ہوا تھا۔۔۔ تو سہیل بن عبداللہ پھر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ :

"اے نفس! اگر میں جہاد کو بھی جاؤں گا تو کسی شخص کی طرف نہ دیکھوں گا نہ انس حاصل کروں گا۔ نہ کسی سے گفتگو کروں گا۔ تجھے خلوت ہی میں رکھوں گا اور تجھے اسی طرح مارنا ہے"۔

نفس نے کہا کہ یہ بھی منظور ہے اگر تم جہاد کے لئے چلو۔۔۔ اب پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ کونسی ایسی مکاری چھپی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ نفس جہاد کا تقاضا کر رہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ :

اے اللہ! اس نفس میں ایسا باریک مکر ہے جو مجھ پر منکشف نہیں ہوتا تو مجھ پر کھولے گا تو واضح ہوگا کہ کیا خباثت ہے اور کیا مکاری ہے جو چھپی ہوئی ہے کہ نفس چاہتا ہے کہ میں شریعت کے عمال سرانجام دوں۔

ادھر سے الہام ہوا اور آپ اصلیت کھلی وہ یہ کہ چالیس برس ریاضت اور مجاہدے میں گزر گئے تھے گویا نفس کو مار رکھا تھا موتوا قبل ان تموتوا... مرنے سے پہلے اسے مار دیا تھا۔ اس کی خواہشات کو کچل دیا تھا۔ اس کی مرضیات کو فنا کر دیا تھا تاکہ مرضی حق حاصل ہو۔۔۔ نفس پر یہ چیزیں شاق تھیں۔ تو نفس میں جہاد کا تقاضا اس لئے تھا کہ میدان میں جائے ایک دفعہ گولی لگے گی تو روز روز کی جھک جھک کا تو خاتمہ ہو جائے گا۔ بس ایک دفعہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ جو روز کی موت ہے۔ یہ تو ختم ہوگی۔ جو ہونا ہوگا ایک دفعہ ہو جائے گا۔ ایک دفعہ تلوار پڑے گی ختم ہو جائیں گے۔۔۔ یہ مکر

پوشیدہ تھا۔

سہل ابن اللہؒ نے اس سے توبہ کی۔ اور کہا کہ یااللہ میری نیت درست کر دے۔ جب نیت درست ہوئی تو جا کر مجاہدین میں شریک ہوئے اور جہاد کے لئے گئے۔

عمل بلا تزکیہ

یہ کیا چیز تھی؟ یہ وہی تھا کہ نفس مانجھ کر اس درجہ صیقل بنالیا تھا اور حقیقی معنوں میں رضاء خداوندی کا ادراک اور احسان: جب تک نفس میں صفائی نہ ہو نہیں ہو سکتا۔۔۔ بعض دفعہ ایک عادت بصورت عبادت ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں عبادت کر رہا ہوں اور وہ نفس کی پرستش ہوتی ہے ایک صاحب باطن بتاتا ہے کہ اس کے اندر کھوٹ ملا ہوا ہے۔ یہ عبادت صحیح نہیں بنی۔ اس سے رضائے حق تعالیٰ نہیں ہو گی۔۔۔ تو اس کا ادراک ہو جانا اور اس کی سمجھ پیدا ہو جانا کہ نفس کی کیا خواہش ہے اور حق تعالیٰ کی کیا مرضی ہے کس جانب کو مجھے جانا چاہئے اور کس جانب کو ترک کرنا چاہئے۔ تو نفس کی باریک باریک خواہشیں اور مکاریاں ہوتی ہیں یہ اس وقت تک منکشف نہیں ہو سکتیں۔ جب تک نفس کے اندر صفائی نہ پیدا ہو۔ جب تک جلاء نہ پیدا ہو اور نورانیت نہ پیدا ہو۔۔۔ اور یہ نورانیت بغیر مجاہدے اور بغیر ریاضت کے نہیں آسکتی۔۔۔ اس واسطے مجاہدے اور ریاضتیں کرائی گئیں۔ اس کے ذریعہ سے ان کے نفوس سے جو شرک کے نرغے میں تھے۔ وہ نکل گئے۔ وہ جو کج راہی تھی وہ نکل گئی۔ وہ جو غیر اللہ کی محبت میں سرشار تھے۔ وہ محبت ختم ہوئی۔

کمالِ استقامت

اب انکی محبت تھی تو اللہ کے لئے' عداوت تھی تو اللہ کے لئے۔ دینا تھا تو اللہ کے لئے 'لینا تھا تو اللہ کے لئے۔ ایمان استقامت سے پیدا ہوتا ہے جس کی حدیث میں ایک موقع پر فرمایا گیا:

من احب لله وابغض لله و منع لله فقد استکمل الایمان

"جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی۔ عداوت باندھی تو اللہ کے لئے کسی کو دیا تو اللہ کیلئے کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا"۔

تو دنیا میں آدمی جو کچھ بھی عمل کرتا ہے۔ یا بچتا ہے تو اس کا منشاء یا محبت ہوتی ہے یا عداوت ۔۔۔ جس کام کو آپ کرتے ہیں اگر رغبت ہو گی جبھی تو آپ کریں گے اگر نفرت ہو گی تو کیسے کریں گے۔ تو کسی چیز کی رغبت ہونا اس کے کرنے کی دلیل ہے' کرنا اس سے محبت اور مرغوب ہونے کی دلیل ہے جس چیز سے عداوت ہو گئی اس سے آپ بھاگتے ہیں۔ تو کسی چیز کو نہ کرنا اس سے نفرت کی دلیل ہے۔۔۔ تو فرمایا گیا کہ جس نے رغبت کی تو لوجہ اللہ کی۔ نفرت کی تو بوجہ اللہ کی۔ رغبت اور نفرت کا تعلق نفسانی جذبات سے باقی نہ رہے۔۔۔ دیا کسی کو تو اللہ کے لئے نہ دیا تو اللہ کے لئے' جب ہر حرکت اور سکون لوجہ اللہ بن جائے۔ تب کہا جائے گا کہ نفس کامل ہو گیا۔ اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

تفویضِ مطلق

اس کے معنی اسلام کے ہیں یہی حقیقی اسلام ہے کہ جو کچھ ہو اللہ کے لئے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا تھا:

اِذْقَالَ لَه رَبُّه اَسْلِمْ

"اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ"۔

مسلم بننے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ غیر مسلم تھے۔ اب اسلام قبول کریں۔۔۔ آپ تو پیغمبر ہیں۔ مسلم ہونے کے کیا معنی؟ یعنی گردن جھکا دو۔ جو کچھ کرو ہمارے لئے کرو۔ اپنے نفس کے لئے کچھ مت کرو۔۔۔ مسلم بننے کے یہ معنی تھے یعنی تفویض کرنا اپنے نفس کو سونپ دینا اللہ کے حوالے کر دینا کہ جس طرح اس کی شریعت الٹ پلٹ کرے، اس طرح الٹ پلٹ ہو جاو تمہاری اپنی کوئی مرضی یا تدبیر باقی نہ رہے، تم ایسے بن جاؤ کالمیت فی یدالغسّال جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہو۔ جدھر کو کروٹ دیدے، دیدے، مردہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ادھر کو کیوں پلٹ دیا جدھر کو بٹھادے، لٹادے، کروٹ دیدے، میت نہلانے والے کیا ختیار میں ہوتا ہے۔۔۔ اس طرح سے آدمی اپنے ارادہ واختیار سے شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ غیر ارادی طور پر تو اب بھی انسان اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کی مرضی سے اس کی حرکت اور سکون ہے۔۔۔ لیکن ارادے سے اپنے آپ کو سونپ دے کہ جدھر کو آپ چاہیں گے ادھر ہی کو میرا ارادہ متوجہ ہو جائے گا۔

یہ اسلام ہے۔۔۔ اس کو کہا گیا کہ:

اِذْ قَالَ لَه رَبُّه اَسْلِمْ.

"اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ"۔

یعنی اپنے کو ہمارے حوالے کر دو جس طرح ہم الٹیں پلٹیں تم تیار رہو۔

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

"اے اللہ! میں مسلم بن گیا"۔

یعنی میں نے اپنے کو حوالے کر دیا۔ جس طرح سے آپ کا جی چاہے مجھ میں تصرف کریں۔ میری محبت ہوگی تو آپ کے لئے ہوگی۔ عداوت ہوگی تو آپ کی خاطر ہوگی نفس کی خاطر کچھ نہیں ہوگا۔

فرمایا کہ جب تم مسلم بن گئے اور مان لیا تو دوسری جگہ فرمایا گیا کہ اب اس اسلام کا اعلان کرو۔ وہ اسلام کیا ہے؟

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَه وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

"اے ابراہیم! اعلان کر دو کہ میری نماز اور میرا حج میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ کے لئے ہے میرے اپنے لئے کچھ نہیں"۔

جس کا کوئی شریک نہیں ہے تو میرے ان اعمال میں شریک نہیں ایک ہی کی رضا کے لئے

کر رہا ہوں چند کی رضا کے لئے نہیں اور اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور میں آج کے دور میں اول مسلم ہوں۔۔۔ تو اسلام کے معنی یہ نکل آئے کہ نماز بھی ہے تو اللہ کے لئے ہے۔ حج ہے تو اللہ کے لئے۔ مرنا ہے تو اللہ کے لئے جینا ہے تو اللہ کے لئے۔ یعنی تفویض محض اپنے آپ کو حوالے کر دینا ہے۔ اسلام کے یہی معنی ہیں کہ آدمی اپنے کو حوالے کر دے۔ کہ نہ اس کی اپنی مرضی باقی رہے نہ اس کی اپنی رضا باقی رہے، رضا ہو تو اللہ کی ہو ارادہ ہو تو اللہ کا ہو۔

فناءِ کلی

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تو کیا کھائے گا؟

اس نے کہا کہ جو آقا کھلا دے۔

کہا تو کیا پہنے گا؟

اس نے کہا جو آقا پہنا دے۔

کہا۔ تو کام کیا کرے گا؟

کہا۔ آقا جو کام لے لے۔

اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟

اس نے کہا اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں بنتا!

پھر میں آقا ہی نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ میری مرضی بھی غلام میری رائے بھی غلام میری خواہش بھی غلام اگر خواہش ہے تو آقا ہی کے لئے ارادہ ہے تو آقا کا ہے۔۔۔ تو ایک انسان جب غلام بن کر اپنے کو دوسرے کے اس درجے حوالے کر دیتا ہے۔ حالانکہ دوسرا انسان اس کا خالق نہیں اس کا مالک نہیں پھر بھی ذرا سے احسان کی بدولت حوالے ہو گیا۔ تو محسن حقیقی جو اللہ رب العزت ہیں جس کا دعویٰ کیا ہے کہ میں اس کا غلام اور بندہ ہوں۔۔۔ اس کا بندہ بھی بنے اور تجویز بھی اپنی پیش کرے۔ اس کا بندہ بھی بنے اور اس کے سامنے پھر رائے بھی رکھے۔ یہ بندگی نہیں دعویٰ بندگی ہے اور وہ غلط ہے۔ بندگی یہ ہے کہ کالمیت فی ید الغسال مرضی حق کے تابع ہونا ہے۔

مرضی حق

آج دنیا میں لوگ اللہ کو اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ خود اس کے تابع ہونا نہیں چاہتے۔ مرضی سوچ لیتے ہیں کہ ایسا ہو استفتاء بھی کریں گے تو اس نیت سے کہ ہماری مرضی کے مطابق فتویٰ ہو اگر رائے بھی پوچھیں گے تو اس نیت سے کہ جو ہم چاہیں گے وہ تو اپنی جگہ قائم رہے اور دعاء بھی ہو تو اسی کے تابع ہو فتویٰ بھی ہو تو اسی کے تابع ہو۔ یہ تو اللہ کو تابع بنانا ہے۔ تو دعویٰ تو اپنے تابع ہونے کا ہے اور آدمی متبوع بن گیا اور چاہتا ہے کہ خدا اس کے تابع ہو تو یہ چلنے والی بات نہیں۔ تفویض کے بھی خلاف ہے اور اسلام کے بھی خلاف ہے مسلم ہونے کے تو یہ معنی ہیں کہ میں تابع ہوں مرضی حق کے میری مرضی کوئی چیز نہیں۔ فنائے مرضی ہی کا نام اسلام ہے فنائے خواہش کا نام اسلام ہے اگر ہم میں ہماری مرضی زندہ ہے تو مسلم کب ہیں؟ اور اگر خواہش زندہ ہے تو حقیقی معنی میں مسلم کب ہیں؟ اس لئے فرمایا گیا کہ اسلام یہ ہے کہ اپنے کو سونپ

دو۔ اور حوالے کردو۔ یہ زندگی اگر صحیح معنی میں دیکھی گئی تو حضرات صحابہ کرامؓ میں دیکھی گئی۔ اگر ان کی آنکھ اس چیز کو دیکھ رہی ہے اور اللہ و رسول اس کو کوئی اور چیز کہلوانا چاہیں تو آنکھ کو بے تکلف جھٹلانے پر تیار تھے مگر مرضی حق کو جھٹلانے کو تیار نہ تھے۔

حدیث میں ہے کہ حجتہ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ :

ای یوم ھذا.

"یہ کون سا دن ہے؟"۔

پؑ نے پوچھا؟

سب جانتے تھے کہ ۹ ذیالحجہ ہے۔ عرفہ کا دن ہے۔ حج میں جمع ہیں۔ تو سیدھا جواب یہ تھا کہ یوم عرفہ ہے۔۔ جواب کیا دیتے ہیں اللہ و رسول اعلم اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں آپ نے پوچھا

ای بلد ھذا.

"مکہ مکرمہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ کون سا شہر ہے؟"۔

سب جانتے تھے کہ مکہ ہے، جواب یہ ہوتا کہ "مکہ" ہے مگر جواب کیا دیتے ہیں :

اللہ ورسولہ اعلم

"اللہ ورسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ کون سا شہر ہے"۔

آپ نے فرمایا :

ای شھر ھذا

" یہ کون سا مہینہ ہے؟"۔

سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے جواب دے دیتے کہ ذی الحجہ ہے مگر جواب میں یہ عرض کیا :

اللہ و رسولہ اعلم

" اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا مہینہ ہے"۔

تابعین میں سے ایک شاگرد نے ایک صحابیؓ سے پوچھا کہ یہ جواب آپ نے کیوں دیا۔ آپ کو قطعی علم تھا کہ یہ مکہ ہے۔ ذی الحج کا مہینہ ہے۔ نویں تاریخ ہے، تو نام لے کر بتاتے کہ فلاں شہر ہے، فلاں مہینہ ہے۔ فلاں تاریخ ہے۔ یہ کہنا کہ اللہ و رسولہ اعلم۔ یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ آپ نے یہ کیوں کہا۔۔۔؟

حقیقتِ اسلام

اس صحابیؓ نے جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفویض اسے کہتے ہیں۔۔۔ وہ صحابیؓ فرماتے ہیں ہم نے اس لئے کہا کہ :

اگر اس دن نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ مکہ نہیں مدینہ ہے۔ تو ہم کہتے کہ ہماری آنکھوں نے غلط دیکھا بلاشبہ یہ مدینہ ہے اللہ کا رسول غلط گو نہیں ہو سکتا۔۔۔ اور اگر آپؐ یہ

فرمادیتے کہ یہ ذی الحج نہیں محرم کا مہینہ ہے، ہم سب کہہ دیتے کہ ہم سب ایمان لائے بلا شبہ محرم کا مہینہ ہے، ہمارا علم غلط تھا کہ ہم اسے ذی الحجہ سمجھ رہے تھے۔

اور اگر حضور علیہ فرمادیتے کہ یہ نویں تاریخ نہیں بلکہ ذی الحج کی بارہویں تاریخ ہے، ہم کہتے کہ بلا شبہ یہ بارھویں تاریخ ہے، ہم سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے کہ یہ نویں تاریخ ہے۔

تو تفویض مطلق اسے کہتے ہیں کہ پیغمبر کی خبر کے مقابلے میں آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے کانوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے کہ میرا کان غلطی کر سکتا ہے، میری آنکھ غلطی کر سکتی ہے، مگر خدا کا رسول تبلیغ حق میں غلطی نہیں کر سکتا۔ اس کو تفویض مطلق کہتے ہیں۔ اور فی الحقیقت یہ اسلام ہے۔

آج ہم اللہ ورسول کو اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں کہ اپنی مرضی پہلے متعین کر لی۔ اور مسئلے کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہا۔ گویا خدا اور رسول کو اپنے تابع بنا رہے ہیں حالانکہ تابع بننے کا صحابہؓ نے یہ درجہ حاصل کیا ہے کہ آنکھوں تک کو جھٹلانے کے لئے تیار ہیں۔۔ ہم تو خدا ورسول کو اپنے خیال کا تابع بناتے ہیں، وہ مشاہدے کا بھی تابع نہیں بناتے۔ مشاہدے کو بھی اللہ ورسول کے تابع کرتے تھے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے اگر اللہ کے رسول اس کے خلاف فرمادیں گے 'حق وہ ہوگا' آنکھ حق پر نہیں ہوگی۔ آنکھوں کی تکذیب کے لئے تیار ہیں۔

اللہ کے نام کے مقابلہ میں مشاہدہ کی تکذیب

اور یہ تو یہ ہے۔۔۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ اللہ کے نام کی وجہ سے اپنے مشاہدے کی تکذیب کر دیتے ہیں۔۔۔ سیر کی روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک چور کو دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے۔۔ اور دن میں دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے، اور چیز اٹھا رہا ہے۔ آنکھ سے دیکھ لیا، اس کو بلا کر پکڑ کر فرمایا۔

"ظالم! یہ دن دھاڑے چوری کرتا ہے تجھے شرم نہیں آتی"۔

اس نے کہا: واللہ الذی لاالہ الاھو ماسرقت

"قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے میں نے چوری نہیں کی"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

صدقت ربی. و کذبت عینی.

اپنے پروردگار کے نام کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں بے شک تو نے چوری نہیں کی۔ جب تو نے اللہ کے نام پر حلف دیا تو اللہ کا نام سچا ہے۔ میں اس کی تکذیب نہیں کر سکتا۔۔۔ یہ اتباع کامل کا درجہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کا نام بھی آجائے۔ حالانکہ چور اس نام پاک کو غلط استعمال کر رہا ہے۔ مگر جرات نہیں کرتے کہ تکذیب کریں کہ خدا کا نام آگیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ خادم کو گوشت خریدنے کے لئے بھیجتے جب وہ لیکر آتا تو گوشت کی بوٹیاں گن لیتے تھے۔ مثلاً ایک پیسے میں چھ بوٹیاں آنی چاہئے تھیں۔ تو یہ پوچھ لایا ہے یا پانچ لایا ہے۔

خادم کہتا کہ مجھ پر کیا اعتماد نہیں۔۔۔؟
فرمایا اعتماد ہے اپنے قلب کی تسکین اور تیرے ساتھ حسن ظن باقی رکھنے کے لئے میں یہ کام کرتا ہوں کہ گن لیتا ہوں۔ کسی نے کہا کہ یہ خادم دھوکہ کرتا ہے اور یہ کم لے آتا ہے اور پیسے آپ سے زیادہ لے جاتا ہے، فرمایا کہ وہ خادم اللہ کا نام لے کر کہتا ہے کہ میں پورا پورا لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا وہ غلط نام لیتا ہے اور غلط حلف اٹھاتا ہے۔ اور کم لے آتا ہے۔ اور آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔
فرمایا:

من خدعنا فی اللہ ان خدعنالہ.

"جو اللہ کا نام لے کر دھوکہ دے گا ہم ضرور اس کے دھوکہ میں آئیں گے اللہ کے نام کو ہم نہیں جھٹلا سکتے"۔

علم، محبت اور اخلاق کا وظیفہ

اس کا تعلق عظمت سے ہے۔ جب اللہ کے نام کی اس درجہ عظمت پیدا ہو جائے کہ اسکے سامنے آنکھ بھی بے کار، کان بھی بے کار، باتیں بھی بے کار، اللہ ہی اللہ سامنے ہے، وہ حقیقی معنی میں قلب کی تفویض کا اور اسلام کا مقام ہے، یہ مقام حضرات صحابہؓ کو جناب رسول ﷺ کی تعلیم اور تزکیہ سے دیا گیا تھا علم کے ذریعے آپ نے مسائل بتلائے اور تزکیہ کے ذریعے سے قلوب کا راستہ سیدھا کیا۔
تو آپؐ نے فرمایا کہ میری بعثت کی غرض وغایت کیا ہے؟

انما بعثت معلما.

"میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، تاکہ علم کے ذریعے سے امت کو صحیح راستہ دکھلا دوں"۔
اور۔۔۔

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق.

"میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق کو مکمل کر کے پیش کروں"
ان کو اخلاق کریمانہ کا مکمل نمونہ بنا دوں۔۔۔ اخلاق عمل کی قوت ہیں۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ علم سے تو میں راستہ دکھلاتا ہوں۔ اور اخلاق درست کر کے اس راستہ پر چلنے کی قوت پیدا کرتا ہوں۔ علم آدمی کو اس وقت تک نہیں چلا سکتا۔ جب تک اخلاق درست نہ ہوں۔ اخلاقی قوت سے ہی آدمی چلے گا۔ علم کا کام فقط راستہ دکھلانا ہے۔
اگر ایک عالم بہت اعلیٰ علم حاصل کرے مگر عمل کی طرف متوجہ نہیں۔ تو راستہ اس نے دیکھ لیا مگر محض علم اسے راستے پر نہیں چلا سکتا۔ جب تک اس کے اندر چلنے کی اخلاقی قوت نہ ہو۔
اخلاق میں صبر ہے، شکر ہے، شجاعت ہے، رضا ہے تسلیم ہے یہ عملی چیزیں ہیں۔۔۔ علم راستہ بتلا دے گا کہ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ اور بچنے کا یہ طریقہ ہے۔۔۔ لیکن اس طریقہ پر آدمی چل پڑے، چلا دینا علم کا کام نہیں ہے۔ یہ کام اندرونی قوت کا ہے جو اخلاقی قوت ہے۔ اگر قلب میں محبت ہے آدمی شجاعت اختیار کرے گا۔ محبوب ہی کی خاطر لڑے گا۔ اور محبوب کے دشمنوں کو فنا کر دینا

چاہے گا۔ معلوم ہوا کہ محبت اخلاق کو چلاتی ہے، علم نہیں چلاتا۔۔۔ اگر انسان کے اندر صبر ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو مرغوب خدا کی خاطر اختیار کرے گا اس پر جم جائے گا، گویا طاعت پر جمے گا اور صبر کرے گا۔ اس کے خلاف سے ہٹ جائے گا، یہ صبر محبت ہی کرائے گی اگر حق تعالیٰ شانہ سے محبت نہ ہو تو عبادت پر آدمی صبر کیسے کرے؟۔۔۔ آپ نماز پر صبر کئے بیٹھے ہیں۔ سردی ہے، لحاف چھوڑ کر سردی کے زمانے میں نماز کے لئے آتے ہیں تو عبادت پر اتنا جمنا یہ محبت ہی سے تو ہے محض علم سے نہیں۔ علم نے تو راستہ دکھایا تھا کہ بھئی! اگر تم نے نماز پڑھ لی تو ثواب ملے گا۔۔۔ لیکن پڑھنا اور پڑھنے کے لئے اٹھنا۔ اور اپنے عیش و آرام کو چھوڑنا یہ محبت کراتی ہے، علم نہیں کراتا۔ ہے تو محبت اخلاق کو حرکت میں لاتی ہے، اخلاق عمل کو حرکت میں لاتے ہیں۔ تب جا کے آدمی عمل کرتا ہے۔

غرض ہر چیز کا ایک وظیفہ ہے۔ علم کا کام راہ دکھلانا ہے۔ محبت کا کام حرکت میں لانا ہے۔ اخلاق کا کام عمل کرا دینا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے دائرے میں عمل کرے گی۔ سارے کام آپ علم کے اوپر ڈال دیں کہ وہی راستہ دکھلائے وہ چلائے۔ وہی گردن پکڑ کر آپ کو مسجد میں لے جائے تو ایک چیز سارے کام انجام نہیں دے سکتی۔ الگ الگ قوتیں ہیں۔۔۔ غرض تعلیم کے ذریعے سے علم پہنچتا ہے۔ تزکئے کے ذریعے سے اخلاق درست ہوتے ہیں اور محبت پیدا کرائی جاتی ہے۔۔۔ تو نبی کریم ﷺ کے دو وظیفے نکلے۔ ایک تعلیم اور ایک تربیت۔ تعلیم سے آپ مسائل پہنچاتے تھے۔ یہ جائز یہ ناجائز، یہ حلال یہ حرام۔ جائز کے اوپر چل پڑے اور ناجائز سے بچنے لگے۔ یہ چیز تزکیہ اور احوال قلب سے متعلق تھی۔

قلب کی حالت اگر درست نہ ہو، فتنے میں پڑا ہوا ہو اور شکوک و شبہات میں پڑا ہوا ہو تو شکی آدمی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ تذبذب اور تردد ہو گا تو کبھی عمل ظہور پذیر نہیں ہو گا۔ قوت یقین پہلے آئے پھر آدمی چلے گا اور اخلاق ابھاریں گے تو آدمی عمل کریگا۔ اس واسطے دو وظیفے فرمائے گئے۔ گویا بعثت کی دو غرض و غایت نکلیں۔

ایک فرمایا:

انما بعثت معلما

"میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔

اور ایک فرمایا:

بعثت لا تمم مکارم الاخلاق

"میں بھیجا گیا ہوں تا کہ اخلاق کا مکمل نمونہ تمہارے سامنے رکھ دوں"۔

تا کہ تمہارے اخلاق صحیح ہو جائیں اخلاق کے بغیر عمل نہیں ہو گا اور تعلیم کے بغیر عمل نہیں آئے گا جس سے جائز و ناجائز کا پتہ چلے گا۔

تعلیم بلا تربیت کا نقصان

تو مجلس مبارک میں ایک طرف مسائل کی تعلیم ہوتی تھی جائز و ناجائز اور حلال و حرام بتلایا جاتا تھا۔ اور رات کو نگرانی

فرماتے تھے کہ عمل کیسا ہے، مجاہدے کراتے تھے تاکہ نفوس کا تزکیہ ہو جائے اس کا تعلق جائز و ناجائز سے نہیں قلب کے احوال باطن سے ہوتا ہے۔۔۔ احوال باطن وہی درست کر سکتا ہے، جو باطن کے ان مقامات سے گذرا ہوا ہو۔ جو اس راہ میں چلا ہوا نہیں ہے، وہ کس طرح سے اعمال باطن کو درست کریگا اسے خود اپنے اندر کا پتہ نہیں دوسرے کے اندرون کا کیا پتہ چلے گا

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اس واسطے جیسے ظاہری مسائل پوچھنے کی ضرورت ہے، باطنی احوال کے درست کرنے کے لئے بھی لوگ اہل باطن کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ وسوسوں کو دور کر کے قلب کی راہ کو درست کرلیں۔۔۔ تو نبی کریم ﷺ نے جیسے مسائل کی تعلیم دی حلال و حرام جائز و ناجائز کے دائرے کو بتلایا فرائض بتلائے واجبات اور ان کی مقداریں بتلائیں ان کے ادا کرنے میں جو خطرات اور وسوسوں کی رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں، ان کے رفع کرنے کی ذمہ داری بھی آپؐ ہی نے لی۔ اور قلب کو درست کرنے کا طریقہ بھی آپ نے اختیار فرمایا۔ اس کا نام تعلیم ہے اور اس کا نام تربیت ہے، تربیت سے آدمی صحیح بنتا ہے، اگر تعلیم ہی تعلیم ہو اور علم ہی علم، تو کورے علم سے راستہ تو نظر آئے گا مگر چلنے کی طاقت پیدا نہیں ہوگی۔۔۔ جیسے غالب نے کہا تھا کہ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

آج کے دور میں بد عملی جہالت کی وجہ سے نہیں ہے۔ علم کے باوجود بد عملی ہے، علم کے راستے اتنے پھیل چکے ہیں کہ قدم قدم پر آدمی کو علم ہوتا ہے۔ کاغذ ہے، پیپر ہے، رسائل اور اخبارات ہیں، رات دن علم سامنے آرہا ہے، مگر رات دن بد عملی بڑھتی جاتی ہے، یہ بد عملی جہالت کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ عدم تزکیہ کے سبب سے ہے کہ جب نفوس مانجھے ہی نہیں گئے اور قلب کے مقامات ہی درست نہیں ہوئے، دل کی کلیں ہی درست نہیں ہیں، تو جتنا بڑا علم ہوگا اتنی ہی بڑی بد عملی بھی ہوگی، اس لئے جہاں ظاہری علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وہاں باطنی تربیت کی بھی ضرورت ہے اس کے بغیر آدمی چلتا نہیں ہے۔

اہمیتِ تزکیہ

اگر یہ چیز ضروری نہ ہوتی تو حضور ﷺ کے فرائض میں تزکیہ نہ رکھا جاتا۔ اور تربیت نہ رکھی جاتی۔ تو سب سے زیادہ ضرورت تربیت کی پڑتی ہے۔ اور تربیت کیساتھ تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔ اور ان دونوں چیزوں کا تعلق کسی منجھی ہوئی شخصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

تزکیہ میں شخصیت کی احتیاج

آدمی یہ چاہے کہ میری تربیت کاغذ سے ہو جائے تو کاغذ اور کتاب تربیت نہیں کرسکتے، کاغذ میں تو کالے کالے نقوش ہوتے ہیں، ان نقوش کی مرادات کیا ہے۔۔۔؟ یہ تو معلم سمجھا سکتا ہے اور مزکی بتلا سکتا ہے کاغذ

نہیں بتلائے گا۔۔۔ چنانچہ قرآن میں جو کیفیات ہیں تو کاغذ میں حرفوں کا نقش آتا ہے، کیفیت تو نہیں آتی بہت سی کیفیتیں ہیں جو طرز ادا سے تعلق رکھتی ہیں، کلام کے بہت سے ایسے معانی ہوتے ہیں جو طرز ادا ہیئت کذائی اور لب ولہجے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اگر وہ ہیئت اور انداز نہ ہو کلام کا مطلب متعین نہیں ہوگا۔۔۔ اور میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اردو کا ایک جملہ اسکے کئی معنی آتے ہیں اور سب کا تعلق لب ولہجے سے ہے۔ وہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی دوست کے پاس آپ بھجوادیں تو کاغذ تو کالے کالے نقوش لکھے ہوتے ہیں، لب ولہجہ لکھا ہوا نہیں ہے، وہ اس سے جو سمجھے گا وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی بلکہ جو کیفیت اس پر غالب ہوگی وہ وہی معنی سمجھے گا وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی اور اسکی اپنی مراد ہوگی۔۔۔ وہ دنیا کہ یہ کہہ کر دھوکہ دے گا کہ لکھنے والے کی یہ مراد تھی حالانکہ یہ غلط ہے، کلام اس کا تھی، مراد اس کی اپنی تھی ٹھیک اسی طرح سے قرآن وحدیث میں بہت سے مضامین کا تعلق لب ولہجے سے ہے، اور بہت سے مضامین کا تعلق شان نزول سے ہے، ان سب سے کٹ کر اگر محض قرآن وحدیث کے لکھے ہوئے الفاظ سامنے آجائیں اور اس کا آپ مطلب لیں تو وہ مطلب آپ کا ہوگا اگرچہ لفظ خدا کے ہوں گے اب آپ دنیا کو یہ کہیں کہ خدا نے یہ فرمایا۔ یہ دھوکہ دہی ہوگی وہ تو آپ فرمارہے ہیں۔ اور دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں۔۔۔ اس لئے کہ خدا کا مطلب تو جب کھلتا جب خدا کی طرف سے کوئی بیان کرنے والا آکر اپنے لب ولہجے، اپنے طرز ادا، اپنے ماحول اور اپنی کیفیت سے بیان کرتا۔ آپ کے سامنے ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ شان نزول بھی آپ کے سامنے نہیں، کالے نقش، کھلے ہوئے آپ کے سامنے ہیں، تو ماحول، کیفیت اور ہیئت کذائی آپ کی اپنی ہے، اور قرآن اور حدیث پر آپ نے تھوپ دی ہے۔۔۔ تو حقیقت میں وہ قرآن اور حدیث کا مطلب نہیں، وہ آپ کا مطلب ہے، لفظ آپ نے اللہ کے لئے اور مطلب اپنی طرف سے گھڑ لیا۔

اسی کو مٹانے کے لئے تعلیم و تزکیہ کو رکھا گیا ہے، کہ ایک شخصیت آکر تعلیم دے اور سمجھائے کہ یہ مراد ربانی ہے، اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا۔ تاکہ وہ کلام بھی سنائیں اور کلام سنا کر اس کا مطلب بھی بیان کریں کہ یہ اس کا مطلب اور مصداق ہے۔

مقاصدِ بعثت

بہر حال آپ ﷺ دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ علم سے دنیا کو آراستہ کریں اور اس عمل سے راہ حق نظر آئے، اور تزکیہ سے آراستہ کریں جس سے لوگوں میں اس راستے پر چلنے کی قوت پیدا ہو، اور عمل کا نمونہ سکھلائیں تاکہ عمل من گھڑت نہ ہو۔ اس میں بھی لوگ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے متبع ہوں۔۔۔ یہی چیزیں نبی کریم ﷺ کی بعثت کی غرض وغایت ہیں اسی کے مجموعے کا نام تعلیم وتربیت ہے۔۔۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ حدیث میں ایک غرض ظاہر کی گئی فرمایا:

انما بعثت معلما.

"میں دنیا معلم بن کر بھیجا گیا ہوں"۔

وہ علم سکھاؤں جس کے ذریعے سے لوگوں کو حق کا راستہ ملے، لوگ خدا تک پہنچیں۔ ان کے

اخلاق اور کردار و کریکٹر درست ہوں۔ دوسری غرض یہ فرمائی:

بعثت لاتمم مکارم اخلاق

میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاقِ کریمانہ کا اعلیٰ ترین نمونہ تمہارے سامنے رکھوں اور عمل کر کے دکھلا دوں اور اخلاقِ کریمانہ کی ہیئت کذائی تم کو دکھلا دوں اس کا نام تربیت ہے اس کا نام تعلیم ہے خلاصہ یہ نکلا کہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں آنے کی غرض و غایت تعلیم و تربیت ہے تاکہ دنیا کی قومیں علم سے محروم نہ رہ جائیں اور اخلاق سے محروم نہ رہ جائیں۔

اندازِ تعلیم و تربیت

اور یہ تعلیم و تربیت کس شانِ بعثت سے کی؟ تو بعثت کی شان یہ ہے کہ اس میں رحمت کا غلبہ ہے شریعت کے ایک ایک حکم سے رحمت ٹپکتی ہے ایک ایک حکم میں شانِ رحمت رچی ہوئی نظر آتی ہے غضب اور قہر رچا ہوا نہیں ہے، محبت کی آمیزش ہے عداوت کی آمیزش نہیں ہے، شفقت رچی ہوئی ہے بیگانگی اور بے تعلقی رچی ہوئی نہیں ہے انس موانست رچی ہوئی ہے وحشت رچی ہوئی نہیں۔۔۔ تو نبی کریم ﷺ نے تعلیم دی، تربیت کی، اور ساتھ ساتھ وحشت سے بچایا نفرتوں سے بچایا انس و موانست کو پھیلایا محبت و یگانگت پھیلائی۔

اندازِ حکومت

حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ ابن جبلؓ کو جب آپ ﷺ نے یمن بھیجا۔۔۔ ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اور معاذ بن جبل ﷺ کو قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس بنا کر بھیجا۔ آپ نے دونوں صحابیوں کو اونٹ پر سوار کیا اور خود پیدل ساتھ ہوئے۔۔۔ ان کو رکاوٹ تھی کہ حضور ﷺ پیدل چلیں۔ اور ہم سواری پر بیٹھیں مگر امر ارشاد تھا کہ نہیں۔ تم بیٹھوں۔۔۔ تو یہ اونٹ پر سوار ہوئے اور حضور ﷺ پیدل ساتھ ہیں میل بھر تک ساتھ تشریف لائے گئے اور مختلف نصیحتیں فرمائیں۔

فرمایا! جب تم یمن میں پہنچو گے تو تمہیں عیسائیوں کی رعایا ملے گی۔ وہاں کے سب باشندے عیسائی ہیں تم وہاں جا کے کیا کام کرو گے۔۔۔ تو نصیحت فرمائی کہ:

بشرا ولا تنفرا. ویسرا ولا تعسرا و تطاوعا ولا تختلفا.

عیسائیوں کی ریاست میں لوگوں کو بشارتیں سنانا نفرتیں نہ دلانا آسانیاں بہم پہنچانا لوگوں کو تنگیوں میں مبتلا نہ کرنا۔ مطاوعت، وحدت اور اتحاد پیدا کرنا اختلاف کی راہیں مت ڈالنا کہ لوگ بکھر جائیں تم ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرنا متفرق بنانے کی کوششیں مت کرنا۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

تم کو دنیا کے جوڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے دنیا کو توڑنے کے لئے تم کو نہیں بھیجا گیا متفرقوں کو جمع کرنا کے تمہارا کام ہے، جمع شدہ کو متفرق کر دینا یہ تمہارا کام نہیں ہے اور جمع کرنے کا معیار تمہاری ذات نہیں ہوگی اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول ﷺ کا بیان ہوگا۔۔۔ اسی پر لوگ جمع

ہو سکیں گے تمہاری عقل پر جمع نہیں ہوں گے تمہارے مزاج پر جمع نہیں ہوں گے ہر شخص عقل رکھتا ہے ضروری نہیں ہے کہ دوسرے کی عقل کا تبع ہو تم کہو گے میرا مزاج یہ ہے دوسرا کہے گا میرا مزاج یہ ہے۔۔۔ لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے سب گردن جھکا دیں گے وہ معیار ہے غرض تم لوگوں بشارتیں سنانا نفرتیں مت دلانا۔ انہیں بانٹنا متفرق کرنا اور گروہ سازی مت کرنا۔ سب کو ایک گروہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کوئی از خود گروہ بنے یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ تمہاری طرف سے اذن اور اعلان وحدۃ و اتحاد کا ہونا چاہئے۔۔۔ تو شان رحمت ہے کہ لوگوں کو ملاؤ اور بانٹو مت، متفرق مت کرو ان کے سامنے ایسی چیزیں کہو کہ اگر ان کے قلوب بکھرے ہوئے بھی ہوں تو جڑ جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ایسے کلمات ان کے سامنے مت کہو کہ ان میں گروہ بندی پیدا ہو جائے وہ بٹ جائیں اور متفرق ہو کر ان میں نفرتیں پیدا ہونے لگیں کسی ایک مرکز پر انہیں لانے کی کوشش کرو۔ تو یہ ہی شان رحمت ہے۔۔۔ غرض تعلیم دینا بھی شان رحمت ہے تربیت کرنا بھی شان رحمت ہے۔

رحمتِ مجسم

لیکن اگر اس ضابطے کو فرض قرار دیا جائے تو اس تعلیم و تربیت کو جس شان سے ادا کیا گیا وہ شان تو رحمت ہی کی ہے۔ اور وہ شان انس و موانست اس کو حضور ﷺ فرماتے ہیں،

انما بعثت رحمة ولم ابعث لعانا.

"میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں لوگوں کو دور کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا"۔

یہ آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا ہے جب غزوہ احد کے اندر ستر صحابہؓ کی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ حضور ﷺ کے سر مبارک پر پتھر لگا۔ اور خون کی چادر منہ پر آگری۔ دندان مبارک شہید ہو گئے۔۔۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے لئے بددعا کیجئے کہ ان نابجاروں نے اللہ کے رسول کو زخم پہنچایا۔ سر مبارک پر زخم لگا۔ محبوب صحابہؓ جن میں حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ بھی شامل ہیں، شہید ہو گئے بددعا فرمائیے۔۔۔!

اس پر فرماتے ہیں:

انما بعثت رحمة ولم ابعث لعانا.

"میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھٹکار دینے والا بنا کر بھیجا گیا"۔

اور فرماتے ہیں

اللهم اهد قومي فانهم لا يعلمون.

"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت کر! یہ جاہل ہیں۔ جانتے نہیں ہیں"۔

اس موقع پر بھی رحمت ہی کا ظہور ہوا یہ اخلاق عظیم تھا کہ دوسرے گالیاں دیں اور آپ ﷺ ان کے حق میں دعائیں کر رہے ہیں، دوسرے تلوار اٹھا کر زخم لگائیں اور آپ اپنی زبان فیض ترجمان سے ان کے اوپر پھول برسائیں یہی ہے وہ شان رحمت کہ دوستوں کے ساتھ رحم کرنا تو ہے

ہی۔۔۔ لیکن دشمنوں کے ساتھ جو رحم وکرم کرے اور دشمنوں کو جو نوازنے کی کوشش کرے، کہا جائے گا کہ وہی ''رحمتِ مجسم'' ہے۔ غرض ہر موقع پر آپ نے دشمنوں کے ساتھ وہ کیا جو آج دوستوں کے ساتھ بھی کیا جانا مشکل ہے۔

بہر حال بعثت کی شان رحمت کی ہے، اور بعثت کی غرض وغایت تعلیم اور تربیت کی ہے۔۔۔ یہی تین حدیثیں ابتداء میں پڑھی تھیں کہ ایک میں شانِ بعثت بتلائی گئی۔ دو احادیث میں بعثت کی غرض وغایت بتلائی گئی۔

انما بعثت رحمة میں شانِ بعثت ہے، کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور بعثت معلما اور بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں غرض وغایت یعنی تعلیم وتربیت ہے۔۔۔ یہ تین روایتیں میں نے پڑھی تھیں بقدر ضرورت ان کی تشریح کی ہے، ان سب کا مقصد اور گویا لب لباب اور حاصل یہ نکلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد اصلی تعلیم وتربیت ہے۔

نیابتِ نبوی اور نبی کے بعد قوم نبی کے قائم مقام بنتی ہے، تو نبی کریم ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد یہ پوری امت نبی کے قائم مقام اور نبی کی نائب ہے، اس کا بھی اصلی فریضہ یہ ہے کہ یہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ ویسے دنیا میں اخلاق کے جوہر پیدا کرے، بہت سی تعلیمات ہیں جو سامان بناتی ہیں جیسے آپ سائنس پڑھیں گے تو بہترین قسم کے سامان بنائیں گے فلسفہ پڑھیں گے تو دماغی ریاضت ہو جائیگی۔

'ہندسہ اور انجینئرنگ پڑھیں گے تو بہترین قسم کی مکانات بنائیں گے یہ سب چیزیں آپ کی ضروریات کی ہیں اور اچھے اچھے سامان آپ کے لئے مہیا کریں گی لیکن اچھے انسان بنانا ان علوم کا موضوع نہیں اچھے سامان بنانا موضوع ہے، اگر آپ اچھا انسان بننا چاہتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے نیچے آنا پڑے گا نبیوں کی دنیا میں آنے سے غرض اچھا سامان بنانا نہیں چھری کانٹے بنانا نہیں ہے، یہ تو ضرورت کی چیزیں ہیں۔ جس طرح آپ چاہیں یہ خود بنالیں۔ ان کے آنے کی غرض یہ ہے کہ آپ کو انسان بنادیا جائے۔۔۔ انسان کے ہاتھ میں اگر چھری ہوگی تو دوست کے گلے پر چھری نہیں چلے گی۔ دشمن کے گلے پر چلے گی انسان کے ہاتھ میں اگر برتن ہوگا تو صحیح استعمال کرے گا جانور کے آگے ہوگا تو اسے پھینک مارے گا اس لئے آدمی اگر آدمی بن گیا تو سامان بھی کار آمد ہو گئے اور اگر آدمیوں میں آدمیت نہ رہی تو یہ سامان وبال جان بن جائیں گے۔ دنیا میں کروڑوں روپے کا سامان بھرا ہوا ہے۔ اور آدمی جانوروں کی مانند ہوں۔ جن میں نہ خدا کی پہچان، اور نہ رسول کی پہچان نہ حق وباطل کی پہچان، نہ انس ومؤانست ایسے میں سامان اور زیادہ وبال جان ہیں۔

اور اگر ایک بھی سامان نہ ہو چٹنی روٹی پر گزر ہو۔ مگر آدمیوں میں انسانیت کا جوہر ہو انس ہو محبت ہو ہمدردی خلائق ہو وہ دنیا جنت ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام دنیا کو جنت بنانے آئے ہیں جہنم بنانے نہیں آئے۔ جہنم والوں کے اخلاق فرمائے گئے ہیں۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا.

جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی دوسری پارٹی اس پر لعنت کرے گی۔ کہ تم پر لعنت ہو

تمہاری وجہ سے ہم مبتلا ہوئے۔ وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہارے بہکانے کی وجہ سے ہم مبتلا ہوئے۔
تو جہنم کا عذاب ایک طرف، یہ لعن طعن خود ایک مستقل عذاب ہے۔
اور جنت والوں کے اخلاق بیان کئے گئے ہیں۔

اِخوَاناً عَلٰی سُرُرٍ مُتَقٰبِلِینَ

بڑی بڑی مسندوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اور دل ایسے ہوں گے جیسے حقیقی بھائی کے ہوتے ہیں، ہر ایک کے دل میں محبت کھچی ہوئی اور رچی ہوئی ہے، تو انبیاء علیہم السلام محبتیں پیدا کرنے آئے ہیں عداوتیں پیدا کرنے نہیں آئے۔ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اور یہ چیز بغیر رحمت اور شفقت کے نہیں ہوتی۔ تو امت کو بھی اسی طرح شفیق بننا چاہئے اپنوں میں بھی باہم اور اغیار کے حق میں بھی کہ انہیں ہدایت کریں اور انہیں سیدھا راستہ دکھلائیں ایسی راہیں پیدا کریں کہ لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ اس طرح محبت واتحاد سے چلیں اس میں قوم کی بھی قوت ہے، ملک کی بھی قوت ہے، جتنی پاکیزگی آپ کے نفوس میں بڑھے گی جتنے پاکیزہ اعمال بڑھیں گے، آپ اپنی قوم کے لئے بھی مفید ثابت ہوں گے۔ اگر بد عنوانیاں رہیں تو قوم کے لئے بھی اور حکومت کیلئے بھی وبال جان بن جائیں گے۔ تو آدمی وہ ہے جو صحیح طور پر معاشرہ کے لئے آدمی ثابت ہو اور بہترین انسان ثابت ہو۔

احساس ذمہ داری

بلا شبہ بہت سی چیزوں میں حکومت روک تھام کرتی ہے۔ چوروں کو پکڑتی ہے، ڈکیتوں کو پکڑتی ہے، قانون بناتی ہے۔۔۔ لیکن کچھ ذمہ داری حکومت پر نہیں کچھ آپ پر بھی عائد ہوتی ہے، آپ کو بھی تو اپنے اخلاق درست نہ کرے ہوں گے۔ جہاں کوئی سپاہ اور سی۔ آئی۔ ڈی نہ ہو، وہاں پھر آپ خیانت کریں گے ایسا آدمی ہو کہ جب تنہائی میں ہو جب بھی نیک نفس ہو، مجمع میں ہو جب بھی نیک نفس ہو۔ یہ جب ہو سکتا ہے کہ اس کا نفس درست ہو جائے ورنہ اگر انسان بد نفس ہے تو ڈر کے مارے مجمع میں خیانت نہیں کرے گا مگر جب تنہائی میں جائیگا خیانت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوگی وہ آدمی آدمی نہیں بلکہ آدمی کی صورت ہوگی۔
تو آدمی صورت انسان کا نام نہیں حقیقتِ انسان کا نام ہے ؎

گر بصورتِ آدمی انسان بُدے
احمد و بو جہل ہم یکساں بُدے

اگر صورت سے آدمی آدمی بنا کرتا تو صورت انسان میں محمد ﷺ اور ابو جہل دونوں کی صورت انسان کی تھی۔۔۔ مگر زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے، وہ فرق حقیقت کے لحاظ سے ہے حضور ﷺ کی حقیقت دیکھی جائے تو عرش کے اوپر پہنچی ہوئی ہے، اور ابو جہل کی حقیقت دیکھی جائے تو تحت الثری میں پہنچی ہوئی ہے، صورتیں دونوں کی انسانوں کی ہیں یکساں ہیں۔۔۔ غرض

صورت سے آدمی نہیں بنتا۔ حقیقت سے بنتا ہے اور یہ حقیقت انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے بنتی ہے۔اس کے بغیر جوہر پیدا نہیں ہوتا۔۔۔اس لئے جہاں آپ اور علوم کی طرف توجہ کریں بنیادی طور پر اس عمل کی طرف توجہ کرنا سب سے ضروری ہے،جس سے ہمارا جوہر درست ہو۔۔۔ اس واسطے یہ تین حدیثیں میں نے تلاوت کیں کہ تعلیم و تربیت تو اصل غرض ہے۔اور اس میں شفقت اور رحمت کی شان ملی ہوئی ہونی چاہئے۔تب جا کے وہ تعلیم وتربیت صحیح معنی میں مفید ثابت ہوگی حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم تعلیم کے ذریعے سے علم حاصل کریں۔تربیت کے ذریعے سے اخلاق درست کریں اور حق تعالیٰ شانہ،ہمیں نبی کریم ﷺ کی سنتوں کے اتباع کی توفیق عطاء فرمائیں۔اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائیں۔ آمین۔

اللھم ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا و ھب لنا من لدنك رحمةً انك انت الوھاب. اللھم اعذنا من الفتن ماظھر منھا و مابطن. اللھم متعنا باسماعنا و ابصارنا و قوتنا احییتنا واجعل ثارنا علی من ظلمنا. ولا تجعل مصیبتنا فی دیننا. ولا تجعل الدنیا اکبر ھمنا و لا مبلغ ولا غایة ر غبتنا.اللھم لاتسلط علینا من لا یرحمنا اللھم زدنا ولا تنقصنا و اکرمنا ولا تھنا واعظناولا تحرمنا. واثرنا ولا توثر علینا و ارضنا عنك وارض عنا. اللھم وتوفنا مسلمین والحقنا بالصلحین غیر خذایا ولا مفتونین. وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقه سیدنا و مولانا

محمد واله و صحبه اجمعین.

برحمتك یا ارحم الراحمین.

(حررہ ۸ جمادی الاولیٰ ۹۰ھ)

☆☆☆☆☆☆☆

عناصر سیرت

"حضور اقدس ﷺ کے دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب تھی اور بائیں ہاتھ قلب نبوت تھا جس میں اخلاق کی روشنی بھری ہوئی تھی۔ کتاب اللہ کے اندر الوہیت کا جلال بھرا ہوا تھا۔۔۔ اگر فقط کتاب اللہ سامنے آتی پیغمبر نہ آتے تو الوہیت کا جلال مخلوق کو بھسم کر دیتا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی اس کو سمجھ سکے۔ اس روشنی کو قلب نبوت میں اترا گیا تو نبوت کی عبدیت کے ساتھ جب الوہیت کا نور اس پر فائز ہوا تو ٹھنڈی روشنی پیدا ہوئی جس کو انسان سہہ سکیں"۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَ نَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ. وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُاَن لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَولٰنَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ اَرسَلَہٗ اللّٰہُ اِلٰی کَآ فَّۃِ لِّلنَّاسِ بَشِیرًا وَّنَذِیرًا وَّدَاعِیًا اِلَیہِ بِاِذنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیرًا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اَمَّابَعدُ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ. قَد جَآءَ کُم مِّنَ اللّٰہِ نُورٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِینٌ یَّھدِی بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخرِجُھُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّورِ بِاِذنِہٖ وَیَھدِیھِم اِلٰی صِرَاطٍ مُّستَقِیمٍ. صَدَقَ اللّٰہُ العَظِیمُ.

تمہید

بزرگان محترم!

یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ۔ آیت کریمہ میں جناب رسول ﷺ کی ذات گرامی آپ کی چند بنیادی صفات اور چند بنیادی مقاصد و افعال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی آیت کی مجھے مختصر طریق پر کچھ شرح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنی ۔۔۔ مگر آیت کی تشریح سے قبل بطور تمہید و مقدمہ کے چند باتیں سمجھ لیجئے تاکہ اس کے بعد ۔ کے مقاصد سمجھنے آسان ہو جائیں۔۔۔ اور وہ یہ کہ جب انسان کسی بھی متعین منزل کی طرف

جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان چار کے بغیر منزل مقصود تک آدمی نہیں پہنچ سکتا۔

سب سے پہلی چیز روشنی راہ ہے۔ راستہ میں روشنی اور چاندنا ہو جس میں آدمی راستہ قطع کرے اور روشنی بھی ایسی کہ نہ اتنی تیز ہو کہ نگاہوں کو خیرہ اور چکا چوند کر دے کہ راستہ چلنا ہی مشکل ہو جائے۔ نہ اتنی دھیمی ہو کہ راستے کا نشیب و فراز ہی نظر نہ آئے بلکہ معتدل روشنی ہو جس میں آدمی بے تکلف چل سکے، غرض سب سے پہلی چیز راستہ کی روشنی ہے۔

اس کے بعد خود راستہ ہے کہ جو سیدھا ہو اس میں ٹیڑھ اور کجی نہ ہو۔ جس میں آدمی بے تکلف چل سکے۔ اگر راستہ میں اونچ نیچ ہے اور گڑھے ہوں تو روشنی بھی ہو گی تو گر جانے کا اندیشہ ہو گا۔ اس لئے روشنی ہونے کے باوجود ضرورت ہوتی ہے کہ راستہ سیدھا ہو اونچ نیچ اور نشیب و فراز سے بری ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک تیسری چیز کی اور ضرورت پڑتی ہے کہ راستہ بھی سیدھا ہو اور ساتھ میں راہنما بھی ہو اگر راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہو تو محض روشنی اور راستہ کام نہیں دے سکتا۔ تو راہنما کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر پہنچا دے۔

پھر چوتھی چیز" راہ رو" ہے کہ روشنی، راستہ اور راہنما بھی موجود ہے لیکن چلنے والا موجود نہیں تو منزل مقصود تک کون پہنچے؟

اس لئے ضرورت پیش آتی ہے کہ خود راہ رو بھی ہو۔ غرض یہ چار باتیں ہیں کہ ان کے بغیر منزل مقصود تک پہنچنا ناممکن ہے۔۔۔ اگر روشنی نہیں ہو گی اندھیرے میں چلنا دشوار ہو گا۔ روشنی ہو مگر راستہ نہ ہو تو آدمی چلے کس چیز پر؟ راستہ بھی ہو مگر راہنما اور راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہو تو پھر آدمی چلے کیسے؟ اور یہ تینوں چیزیں موجود ہوں مگر چلنے والا کوئی نہ ہو تو منزل تک کون پہنچے؟

حصولِ منزل کی شرائط

دنیا میں بھی آپ جب کبھی کسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو انہیں چند باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے، حق تعالیٰ نے آپ کے لئے روشنی کا بندوبست کیا۔ چنانچہ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجاً وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجاً وَقَمَراً مُنِيراً

برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بروج بنائے اور سراج منیر یعنی سورج اور قمر منیر رکھا دن میں آپ سورج کی روشنی میں راستہ طے کرتے ہیں اور رات کو چاند کی روشنی میں راہیں قطع کرتے ہیں۔ اللہ نے آسمان پر دو بڑے روشن سیارے رکھ دیئے۔ اور فرمایا وَبِالنَّجمِ هُم يَهتَدُونَ اور لاکھوں کروڑوں ستارے متعین کئے جس سے سمتیں متعین ہوتی ہیں اور آپ آسانی سے راہ قطع کر سکتے ہیں لیکن محض سورج کام نہ دیتا اگر زمین پر سڑکیں بنی ہوئی نہ ہوتیں۔ راہ ہی نہ ہو سورج تو نکلتا ہے لیکن پہاڑ ہیں نہ اس میں راستہ ہے۔ بڑے بڑے غار ہیں، کھڈ ہیں تو آدمی چلے گا تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔ منزل مقصود پر کیسے پہنچے گا؟

دوسری چیز یہ ہے کہ راہ ہو اور مستقیم ہو جیسا کہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے:

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ذلیل کر دیا پست بنا دیا کہ تم اس کے راستوں پر چلو۔ اس میں راہیں بنائیں کہ جس پر چل کر آدمی منزل مقصود پر پہنچے۔

راستہ ہو مگر راہنما نہ ہو راستہ قطع کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ جس کی حق تعالیٰ حکایت فرماتے ہیں:

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ

موسیٰ علیہ السلام نے جب مدین کا ارادہ فرمایا تو کہا کہ قریب ہے۔ اللہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔ راہنمائی خدا کی ہوگی مجھے راستہ نظر آئے گا تو راستہ کے لئے راہنما کی ضرورت ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے:

اطلبو الرفیق قبل الطریق راستہ چلنے سے پہلے رفیق سفر متعین کر لو جو تمہاری رہنمائی کرے۔

ظاہر بات ہے کہ راہ رو کی تو ضرورت ہی ہے۔ راستہ چلنے والا ہوگا تو ان تینوں چیزوں کا متلاشی ہوگا۔ اور اگر راہ رو ہی نہ ہو تو پھر کون چلے؟ غرض اصولاً کسی منزل تک پہنچنے کے لئے ان چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سفرِ روحانیت کی شرائط

جب مادی راستوں میں ان چار چیزوں کی ضرورت ہے تو اللہ تک پہنچانے والا راستہ جو نہایت عظیم اور طویل ہے اس کے لئے ان چیزوں کی کیا ضرورت نہیں ہوگی۔۔۔؟ آپ معمولی سفر کریں تو یہ چار چیزیں ضروری ہوں اتنا طویل و عظیم سفر کہ بندہ اپنے خدا تک پہنچے۔ اتنا لمبا راستہ کہ اللہ کی ذات وراء الوریٰ اور بندہ ظلمت در ظلمت

ع　چہ نسبت خاک را با عالم پاک

بندہ خدا تک جائے بلا راستہ، بلا روشنی اور بلا کسی راہنما کے پہنچ جائے اور بغیر اس جذبے کے پہنچ جائے جو اس کے دل میں راہ چلنے کے لئے ہونا چاہئے۔ لامحالہ ضرورت پڑے گی۔ بلکہ مادی راستوں سے زیادہ ضرورت پڑے گی۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے یہ دنیوی سڑکیں تو نہیں ہوں گی۔ حق تعالیٰ شانہ جو نور مطلق ہیں مادیات سے بھی بالا روحانیت سے بھی بالا اس کی لطافت کے سامنے روحانیت بھی کثیف ہیں تو اس کی ذات بابرکات اور لطیف و خبیر ذات تک پہنچنے کے لئے راستے بھی معنوی ہونے چاہئیں اور نور بھی معنوی ہونا چاہئے۔ (اس راہ کو قطع کرنے کے لئے) سورج کی روشنی کام نہیں دے سکتی سورج کی روشنی ہمیں ہندوستان سے پاکستان، ایران و عرب پہنچا دے گی مگر اس سے عرش عظیم تک نہیں پہنچ سکتے۔ جنتوں تک نہیں پہنچ سکتے عالم برزخ تک نہیں پہنچ سکتے تو جیسا عالم ویسی روشنی۔ اس لئے اللہ تک پہنچے کے لئے مادی راستہ کافی نہیں بلکہ روحانی و معنوی راستہ کی ضرورت ہے۔ اور ویسی ہی معنوی روشنی کی ضرورت ہے کہ وہ لطافت لئے ہوئے

ہو۔اس میں کثافت کا نشان بھی نہ ہو اور مادیت سے بالاتر ہو تو ظاہر بات ہے کہ اللہ تک آپہنچنے کے لئے ایسا راستہ درکار ہے اور ایسی ہی رہنما درکار ہے اور راہ رو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے اس کے لئے فقط یہ پَیر کافی نہیں کہ آدمی خدا تک چلا جائے وہ تو کوئی معنوی قوت ہونی چاہئے۔ تو مادی منزل کے لئے مادی راستے مادی طریقے مادی راہنما اور عالم غیب تک پہنچنے اور اللہ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے روحانی راستے روحانی راہنما اور روحانی رہ گزر کی ضرورت پیش آئے گی۔

نورِ معنوی کی ضرورت

تو حق تعالیٰ تک پہنچانے والی روشنی کون سی ہے؟ جس میں ہمیں صحیح طور پر نظر آجائے کہ راستہ کیسا ہے؟ نشیب و فراز کیسے ہیں؟ اس کے لئے حق تعالیٰ نے ایک روشنی کا مینار بلکہ روشنی کا آفتاب روشن کیا۔ لیکن وہ مادی آفتاب ہیں بلکہ آفتاب نبوت ہے۔ جس کی روشنی میں آپ اللہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ "وہ ذات ہے جناب محمد ﷺ کی"۔

جبکہ دنیا میں اتنی اندھیریاں چھا چکی تھیں کہ گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔

اس ظلمت میں حق و باطل میں امتیاز کرنا محال تھا۔ ساری علامتیں روشنیوں کی بجھ چکی تھیں۔ راستہ کے میل اور فرلانگ ختم ہو چکے تھے کہ جن سے راستہ کا پتہ چلے ظلمت ہی ظلمت پھیل چکی تھی کیفیت یہ تھی کہ بندے خدا اور مخلوق کا فرق مٹا چکے تھے۔ مخلوق کی ضعیف و ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کرلی تھیں اور خدا کی پاک صفات بندوں میں مان لی تھیں۔ بندوں کو خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا تھا اور خدا کو بندوں کے درجہ تک لے آئے تھے۔

یہود و نصاریٰ کے عقائد کی ظلمت

ایک جماعت کہتی تھی کہ اللہ میں وہ ساری صفات موجود ہیں جو بندوں کی بشری صفات ہیں۔ آپ توراۃ کو پڑھیں گے جو آج چھپی ہوئی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اللہ میاں سے کشتی ہو گئی اور بہت سے داؤ پیچ کے بعد اسرائیل بالاخر غالب آگئے خدا کو پچھاڑ دیا۔ (نعوذ باللہ)

لکھا ہے کہ طوفان نوح جب آیا ہے تو فرشتوں نے جا کر اطلاع کی کہ وہ آپ کا کنبہ ڈوب رہا ہے۔ مخلوق ختم ہو رہی ہے جب اور کچھ نہ بن پڑا تو خدا نے رونا شروع کر دیا۔ اور اتنا روئے کہ آنکھیں دکھنے آگئیں۔ فرشتے عیادت کے لئے پہنچے کہ اب مزاج کیسا ہے؟ اور آنکھوں کی سرخی کچھ کم ہو گئی یا نہیں؟ تو بندوں کی ساری ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کی ہوئی تھیں۔ جب کہ ایک قوم نے خدائی صفات بندوں میں مان لی تھیں۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے علم غیب تسلیم کرتے تھے۔ خدا کے لئے بیوی تجویز کی۔ خصوصیات الوہیت کو بندوں میں مان لی تھیں اور بندوں کی عیب دار صفات خدا کے اندر مان لی

نہیں ایک قوم نے مخلوق کو خدا کا ظرف بنادیا تھا کہ اس کے اندر حلول کرے اور طاریت کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ جسموں میں خدا سمائے ہو تو مخلوق ظرف بنی اور خالق اس کا مظروف بنا۔۔۔ اور ایک قوم نے خالق کو ظفر بنا کر مخلوق کو اس کے اندر سمایا ہوا کہا کہ مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسا کہ گولر کے پیٹ میں بھندے ہوتے ہیں تو خدا کے پیٹ میں مخلوق مظروف ہے تو ایک نے مخلوق کو ظرف مانا اور خدا کو سمایا ہوا مانا یہ وحدۃ الوجود کی گت بگڑی۔ بہر حال دونوں قسم کے عقیدے پائے جاتے تھے۔ اور خالق و مخلوق کا فرق مٹ چکا تھا۔

تردید عیسائیت

عیسائیوں نے کہا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْزُ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللهِ
یہود نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا کہ عزیز ہی صرف خدا کے بیٹے نہیں بلکہ ہم سب خدا کی اولاد ہیں۔

نَحنُ اَبنَاءُ اللهِ وَاَحِبَّائُو ہ ہم تو خدا کے بھائی بھتیجے ہیں، تو ایک نہیں لاکھوں بیٹے مانے۔

مجھے اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ اور صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ تھے جو ایک عالم با عمل ہی نہیں بلکہ عارف باللہ صاحب کشف و کرامت بزرگ بھی تھے۔ ان کے زمانے کا ایک طالب علم اتفاق سے ڈیرہ زون پہنچا۔ یہ متوسط درجہ کا تھی یعنی دستار بندی نہیں ہوئی تھی فاضل نہیں تھا۔ فارغ التحصیل نہ تھا۔ وہ کہیں ڈیرہ زون پہنچ گیا۔ وہاں ایک چوراہے پر کھڑا ہوا پادری تقریر کر رہا تھا اور یہ ثابت کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ طالب علم اس سے الجھ پڑا کہا کہ آپ غلط کہتے ہیں اور بحث شروع کر دی مگر پادری بڑا ہوشیار تھا اور یہ بیچارہ مبتدی طالب علم۔ اس کے مقابلہ میں بحث میں چل نہ سکا کئی جگہ اس نے طالب علم کو عاجز کر دیا۔ جس کا لوگوں پر برا اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کون جانے گا کہ یہ طالب علم ہے فاضل نہیں ہے، لوگ تو یوں کہیں گے ایک عالم آیا تھا اور پادری سے ہار کر چلا گیا۔ وہیں قریب ایک بھٹیارے کی دکان تھی۔ وہ فوراً دکان سے کود کر نیچے اترا اور اس نے طالب علم کو دھکا دے کر کہا کہ۔ "مولوی صاحب! آپ کا کام اس جاہل سے بحث کرنا نہیں، جاہل سے جاہل نمٹ سکتا ہے، عالم کا کام نہیں ہے کہ جاہل سے نمٹے اس پادری سے بحث کرنا ہمارا کام ہے، آپ پیچھے ہٹئے۔"

اسے بھی غنیمت معلوم ہوا کہ وہ عاجز آ گیا تھا۔۔۔ بھٹیارا آگے بڑھا اور کہا کہ پادری صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ "عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں" کہا اچھا آپ اس دعویٰ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہا کہ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اللہ میاں کی عمر کتنی ہو گی؟ کہا۔ بے وقوف! بے ادبی کی بات کہتا ہے وہ تو ازلی ہیں۔ ابدی ہیں۔ انہیں عمر سے کیا تعلق؟۔۔۔ تو اس نے کہا یہ مطلب ہے کہ بہت لمبی عمر ہے جس کی کہیں حد نہیں۔ کہا ہاں یو سمجھ لیجئے۔

بھٹیارے نے کہا کہ اتنی عمر میں ان کی کتنی اولاد ہوئی؟۔۔۔ پادری نے کہا کہ صرف ایک بیٹا۔

بھٹیارے نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ کہ میں بھٹیارہ باون برس کی عمر میں بارہ بچے جنوا چکا ہوں اور اللہ میاں کی اربوں کھربوں برس کی عمر اور کل ایک بیٹا۔ اس پر تالیاں جو پٹیں اور شور پڑ گیا کہ پادری ہار گئے ہار گئے۔ لوگوں نے دھکے دے کر اس کو وہاں سے نکال دیا اور مسلمانوں کی فتح کا اعلان ہو گیا۔

یہ واقعہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچا۔ فرمایا کہ بھٹیارے نے بڑا عالمانہ جواب دیا مگر وہ بے چارہ اصطلاحات سے واقف نہیں تھا اس لئے اس نے اپنی بات ایک عامیانہ زبان میں کہی مگر مقصد اس کا یہ تھا کہ اگر باپ بننا اللہ میاں کے لئے صفت کمال ہے اور اولاد ہونا اس کے لئے کوئی کمال کی بات ہے تو اس کی ہر صفت لامحدود ہونی چاہئے۔ اولاد بھی لامحدود ہونی چاہئے تھی جس کے عدد کی کوئی انتہا نہ ہوتی اور اگر اولاد ہونا خدا کے لئے عیب کی صفت ہے تو ایک بیٹا ہونا بھی عیب ہے۔ وہ ایک سے بھی بری ہونا چاہئے۔۔۔۔ بھٹیارہ کا یہ مطلب تھا مگر وہ بے چارہ اصطلاحی الفاظ سے واقف نہیں تھا اس لئے اپنے عامیانہ الفاظ میں کہا کہ عمر کتنی ہو گی۔ اور ان کروڑوں برسوں میں لے دے کے کل ایک بیٹا۔ حالانکہ میرے تو اب تک بارہ بچے ہو چکے ہیں۔۔۔۔ بہرحال عیسائیوں نے ایک ہی بیٹے کا دعوی کیا تھا۔

ردِ یہودیت

یہود نے آگے بڑھ کر کہا نحنُ ابنوءُ اللهِ وَاَحِبآءُ ہٗ ہم سب اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔۔۔ یہ گویا بھٹیارے کے مذہب پر چلے اس نے جو بحث میں کہا تھا کہ بہت سی اولاد ہونی چاہئے تھی تو یہود نے سمجھا کہ واقعی اللہ میاں کا کل ایک 'بیٹا۔ ہزار دو ہزار 'کروڑ دو کروڑ تو ہونے چاہئیں۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم سب خدا کے بیٹے ہیں۔ اور جو قومیں باقی رہ گئیں وہ بھی کچھ احباب میں ہیں کچھ بھتیجوں میں آجائیں گے غرض اللہ میاں سے رشتہ داری قائم کر لی تو قرب خداوندی کی یہ گت بنائی کہ قرب بمعنی قرابت۔ راشتہ داری لے لیا اور کہا کہ اللہ میاں کے قریب ہم بھی ہیں۔ یعنی اس کی اولاد ہیں۔ ہمارا نسب اس سے ملتا ہے۔

مشرکین کی تردید

مشرکین مکہ نے بھی یہ دعوی کیا تھا کہ اللہ میاں کی اولاد ہوتی ہے مگر انہوں نے کہا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں جس کا قرآن کریم نے جواب دیا کہ۔

اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی تِلْکَ اِذًا قِسمَۃٌ ضِیزیٰ تم تو بیٹوں پر راضی۔ بیٹی ہو جائے تو ناک منہ چڑھاؤ اور اللہ میاں کے لئے بیٹیاں؟ کیا تم نے بھونڈی تقسیم کی ہے؟ جس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ وہ ظالموں نے خدا کے سر تھوپ دیا۔ اگر اولاد ماننی ہی تھی تو کم از کم یہود کی طرح بیٹے تو مانتے۔ بہرحال مخلوق اللہ کی قدر نہیں جانتی تھی۔ خالق اور مخلوق کا فرق بھلا چکی تھی۔ اپنی عیب دار صفات خالق میں مان لی تھیں کہ ہم باپ ہیں تو وہ بھی باپ ہے۔ ہماری اولاد ہے تو اس کی بھی اولاد ہے۔ ہم کسی ظرف میں رہتے ہیں تو خدا بھی کسی ظرف میں رہتا ہے۔ ہم محدود ہیں تو معاذ اللہ وہ بھی رود ہے گویا اس درجہ کو جہالت کی ظلمت پہنچ چکی تھی کہ علم کا نشان باقی نہیں رہا تھا۔

مسخ عقل

اسی طرح اللہ کی صفات کے بارے میں اور اس کی توحید کے بارے میں مخلوق علم کو گم کر چکی تھی۔ توحید جیسی عقلی چیز جسے انسان عقلاً سمجھ سکتا ہے اسے سمجھنے کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ جناب رسول ﷺ نے توحید کامل کا دعویٰ کیا تو مشرکین مکہ نے حیرت سے کہا کہ :

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهاً وَّاحِدًا

کیا کروڑوں دیوتاؤں اور خداؤں کو ایک ہی خدا پیغمبر نے بنا دیا؟ کیا ایک خدا سارے آسمانوں اور زمینوں کا انتظام کرلے گا؟

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ یہ تو عجیب بات ہے جو پیغمبر کہہ رہے ہیں۔۔۔ یعنی عجیب تو یہ تھا کہ شرک مانا جائے۔ مگر شرک رگ و پے میں اتنا سرایت کر چکا تھا کہ توحید عجیب معلوم ہونے لگی۔

توحید اجمالی

توحید کا اجمال واقعی عقلی ہے۔ اگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بھی دنیا میں تشریف نہ لائیں۔ تو انسان کی فطرت اجمالاً مالک کے ایک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کلام لکھتے ہیں کہ اگر کسی قوم یا فرد کو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی دعوت نہ پہنچے پہاڑوں کی چوٹیوں میں گزر کر رہا ہو۔ کوئی ڈرانے والا پیغام حق لے کر اس تک نہ پہنچا اور اسی پر اس کی موت آگئی تو قیامت کے دن توحید کا سوال اس سے بھی ہوگا۔ اگر اجمالی وہ اتنا کہہ دے کہ "میں اتنا جانتا تھا کہ ہاں ہے کوئی پیدا کرنے والا اور وہ ایک ہے تفاصیل تو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بتاتے ہیں۔ تفاصیل مخبر صادق کی خبر اور وحی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتیں لیکن اتنا اجمال کہ کوئی پیدا کرنے والا ضروری ہے اور وہ چند نہیں ہو سکتے دس بیس نہیں ہو سکتے یہ ایک فطری امر ہے' اور توحید عقلی ہے لیکن معقولات بھی اس دور میں ختم ہو چکی تھیں اس درجہ جہالت کی ظلمت چھا چکی تھی کہ توحید پیش کی تو کہا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ؟ یہ پیغمبر نے کیا عجیب و غریب بات کہہ دی کہ ایک خدا سارے عالم کا انتظام کرلے گا۔

جہالت کی ظلمت

اسی طرح آپؐ نے معاد کو پیش کیا کہ دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی۔ یوم آخرت آنے والا ہے۔ قیامت آنے والی ہے' تم سب کو وہاں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ تو حیرت سے کہا کہ۔

مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ جب ہماری ہڈیاں گل سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں گی۔ پھر کون ہے جو ہمیں زندہ کرے اور اٹھائے؟ ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کوئی قادر مطلق موجود ہے تو جہالت کی ظلمت اس قدر تعصب پر چھا چکی تھی کہ توحید جیسی معقول چیز کو وہ عجیب بات سمجھے۔

بشریت انبیاء علیہم السلام

پیغمبر کی شان اور پیغمبر کی ذات کو بھی عجیب سمجھا۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں انہوں نے کہا تھا :

قَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَاكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْاَسْوَاقِ یہ کیسا رسول آیا ہے کہ کھانا بھی کھاتا ہے۔پانی بھی پیتا ہے بازاروں میں بھی جاتا ہے۔ گویا رسول کا تصور ان کے نزدیک یہ تھا کہ بشریت سے بالاتر ہو۔ تو رسول کی ذات کے لئے بشریت کا انکار لازم سمجھتے تھے کہ رسول بشری نہیں ہو سکتا۔ بشری عوارض اس پر طاری نہیں ہو سکتے۔

حالانکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر تمام بشری عوارض طاری کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان پر خدائی کا شبہ نہ کر سکیں اس لئے کہ ایک طرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ کی ذات بابرکات ہے کہ اشارہ فرمائیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ اشارہ فرمائیں تو بت آکر وضو کے لئے پانی پیش کریں۔ درختوں کو اشارہ فرمائیں تو دوڑ کر آئیں اور سر مبارک کے اوپر سایہ کر لیں۔ پانی میں ہاتھ ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے بہہ پڑیں۔ جس سے پندرہ سو آدمی سیراب ہو جائیں۔ تو ایک طرف تو یہ افعال اور عجائبات قدرت حضور ﷺ کے ہاتھ پر نمایاں ہوں۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ بخار چڑھتا ہے تو شدید اور فرمایا کہ جتنا تمہیں عام طور سے بخار آتا ہے۔ مجھے اس سے دوگنا آتا ہے۔ غزوہ احد میں سر مبارک پر پتھر لگ پڑا تو خون بہہ پڑا۔ ستر صحابہؓ شہید ہو گئے۔ لاشیں تڑپ رہی ہیں اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ طائف پہنچے تو طائف کے شہدوں نے آپ کے پیچھے کتے لگا دیئے۔ پتھر مارے۔ پائے مبارک زخمی ہو گئے۔ سجدہ میں تھے کہ مشرکین مکہ نے عین حرم کے اندر اونٹ کا اوجھ آپؐ کے سر پر ڈال دیا۔ جس سے اٹھنا دشوار ہو گیا۔ کانٹے آپؐ کے راستوں میں بچھائے گئے۔ سحر آپ پر کرایا گیا اور سحر کا اثر آپ پر ہو گیا۔ تو ایک طرف قدرت کے یہ کارنامے کہ اشارہ کریں تو چاند دو ٹکڑے ہو جائے۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ اوجھ گر جائے تو آپ اٹھ نہیں سکتے۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ انگلیوں سے چشمے جاری ہو جائیں اور ایک طرف یہ کیفیت کہ بیت نبوت میں دو دو مہینے دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا کہ کھانے پینے کو کچھ مل جائے۔ یہ متضاد چیزیں کیوں رکھی گئیں اگر فقط معجزات دیئے جاتے تو آپ کی ذات پر خدائی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے تمام بشری عوارض طاری کیے تاکہ انبیاء علیہم السلام کی بشریت کی کوئی نفی نہ کرے۔

عظمتِ انبیاء علیہم السلام

اور پھر فرمایا دیا گیا کہ اپنی زبان سے اعلان کر دو۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلَيَّ کہہ دو اے پیغمبر کہ میں بشر ہوں اور بشر بھی فقط نہیں کہا بلکہ مثلکم فرمایا کہ تم جیسا بشر ہوں۔ یعنی جو تمہارا طریق پیدائش ہے۔ وہی میرا طریق پیدائش ہے۔ جو تمہارا طریق وفات ہے وہی میرا طریق وفات ہو گا جیسے تم پر عوارض بشریت آتے ہیں میرے اوپر بھی آتے ہیں۔ تو میں بشر ہوں اور تم جیسا بشر ہوں۔ ہاں اللہ نے یہ بزرگی دے دی کہ مجھ پر وحی فرمائی۔ مجھ پر اپنا کلام نازل فرمایا یہ میری خصوصیت ہے جو تم میں سے کسی کو نہیں دی گئی۔ تو یہ بزرگی خدا کی دی ہوئی ہے۔ لیکن دی کس کو؟ بشر ہی کو دی ہے۔ لیکن اس بزرگی کے آنے کے بعد بشریت کا چولہ نہیں اتر گیا۔ میں بھی اپنی وحی کا اسی طرح متبع ہوں

جیسا کہ تمہیں اتباع کی دعوت دے رہا ہوں۔ چنانچہ فرمایا:

قُل مَا كُنتُ بدعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِیْ مَا يفعَلُ بِی وَلَا بِکُم میں کوئی انوکھا رسول نہیں آیا۔ میں وحی کی اتباع کرتا ہوں۔ جس طرح وحی خداوندی کے تم پابند ہو میں بھی پابند ہوں۔ جس طرح تم قانون حق کے پابند ہو۔ میں بھی پابند ہوں۔۔۔ یہ تمام چیزیں آپ سے اس لئے پیش کرائی گئیں تاکہ واضح ہو جائے کہ آپ بشر ہیں۔

نفیِ بشریت کا نقصان

اور حقیقت یہ ہے کہ بشریت کی نفی کرنا یہ بد قسمتی کی بات ہے۔ ہماری نوع میں اللہ نے وہ ذات بابرکات پیدا کی کہ تمام مخلوقات میں بڑھ چڑھ کر ہے یہ تو ہماری نوع کا خدا کا شرف ہے۔ کہ ایسا شرف بخشا اور ہم اپنی نوع کی توہین کریں گے کہ اگر حضور ﷺ کو اس سے نکال دیں کہ آپ بالاتر ہیں۔ یہ ہماری بد قسمتی اور محرومی کی بات ہو گی۔ ہم تو دلائل کی رو سے کہیں گے کہ حضور ﷺ بشر ہیں تاکہ آپ کی ذات بابرکات سے بشریت کی عظمت واضح ہو۔ بہر حال جہاں معجزات دیئے گئے وہاں عوارض بشریت بھی دیئے گئے تاکہ کسی کو آپ پر خدائی کا شبہ نہ ہو سکے۔

اظہارِ عبدیت کا امر

اسی لئے ایک موقع پر آپ نے فرمایا اور فرمایا مامور ہو کر قُل اِنِی لَن یُجِیرَنِی مِنَ اللهِ اَحَدٌ وَلَن اَجِدَ مِن دُونِهٖ مُلتَحِدًا "آپ اعلان کر دیجئے کہ اگر اللہ میری پکڑ کرے تو کوئی مجھے چھڑانے والا نہیں اسی کا فضل و کرم مجھے چھڑا سکتا ہے"۔

اور اس کے ساتھ آپ نے دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی کہ۔

لن ینجی احد کم عمله تم میں سے کسی کا عمل کسی کو نجات نہیں دلا سکتا بجز اللہ کے فضل کے تو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا ولا انت یا رسول الله کیا آپ کو بھی آپ کے عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ فرمایا لا الا ان یتغمدنی الله برحمته کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک اللہ ہی کا فضل میری دستگیری نہ فرمائے۔۔۔ تو انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ عبدیت کے کلمات اس لئے ادا کرائے جاتے ہیں تاکہ کسی کو ان کی الوہیت کا شبہ نہ ہو جائے۔ ان کی خدائی کا شبہ کسی کو نہ گزر جائے اس لئے یہ تمام چیزیں پیش آتی ہیں۔

دورِ بعثت کا اجمالی حال

غرض مشرکین میں نبوت کا تصور یہ تھا کہ وہ بشریت سے بالاتر کوئی چیز ہے کہ نبی نہ کھائے نہ پیئے تو کہتے تھے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَاكُلُ الطَّعَامَ وَيَمشِی فِی الاَسوَاقِ بہر حال خدا کے بارے میں بھی رسول کے بارے میں بھی اس قدر ظلمت عالم پھیل چکی تھی۔ مکہ کے اندر بھی مکہ کے ارد گرد بھی اور چہار طرف قلوب میں ظلمت اور اندھیر چھا گیا تھی۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

انا اللہ نظر الی قلوب بنی ادم فمقت عربهم و عجمهم اللہ نے انسانوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی تو غضبناک نگاہ سے دیکھا۔ کوئی شمہ خیر کا باقی نہیں رہ گیا تھا الا غبر اھل الکتب اہل سوائے کتاب میں سے چند گے چنے افراد جو حق کے اوپر قائم تھے۔ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر اپنے دین کو بچارہے تھے۔ مخلوق سے الگ تھے۔ حق کے لئے عام مجامع کے اندر، عام اجتماعات اور عام بستیوں میں گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی تو حق پر جمنے کے لئے لوگ پہاڑوں کی کھوہ میں جاتے تھے تاکہ دین کو سلامت رکھ سکیں۔۔۔ تو عقائد، اعمال، اخلاق اور رسول کی ظلمت پھیل چکی تھی۔ ہر طرف اندھیریاں چھاگئی تھیں۔ ان اندھیریوں میں ایک تیز روشنی کی ضرورت تھی۔ کہ ان تمام ظلمات کے پردے چاک ہوں۔ اور روشنی سامنے آئے جس سے عقائد ، اعمال اور احوال درست ہوں۔ تو اس شدید ترین اندھیری کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے جناب رسول ﷺ کو بھیجا۔

شانِ تشریف آوری

آپ اس شان سے دنیا میں تشریف لائے کہ آپ کے دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور آپ کے بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔ اکٹھی دو روشنیاں لے کر آپ تشریف لائے۔ غالباً آپ کو یہ شبہ ہوگا کہ ہم نے یہ کسی تاریخ میں نہیں پڑھا۔ کسی حدیث میں نہیں کہ آپ کے ہاتھ میں چاند اور سورج ہوں۔ یہ ایک نئی سی بات ہے۔۔۔ تو میں عرض کرتا ہوں کہ آپ صبر و سکون سے کام لیں۔ بلاشبہ حضور اکرم ﷺ کے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔ سورج سے کیا مطلب ہے؟ یعنی دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب تھی۔ اور بائیں ہاتھ میں قلب نبوت تھا۔ جس میں اخلاقی کی روشنی بھری ہوئی تھی۔ کتاب اللہ کے اندر الوہیت کا جلال بھرا ہوا تھا۔ اگر فقط کتاب اللہ سامنے آئی اور پیغمبر نہ آتے تو الوہیت کا جلال مخلوق کو بھسم کر دیتا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی اس کو سمجھ سکے اس کی روشنی کو قلب نبوت میں اتارا گیا تو نبوت کی عبدیت کے ساتھ جب الوہیت کا نور اس پر فائز ہوا تو ٹھنڈک پیدا ہوئی جس کو انسان سہہ سکیں۔ تو سورج اللہ کی کتاب تھی اور چاند جناب رسول ﷺ کا قلب مبارک تھا جو کمالات اخلاق کا مرکز تھا۔ اس طرح سے آپ دنیا میں تشریف لائے یعنی جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ خدا کی کتاب کے اندر جلال تھا اور قلب مبارک کے اندر شان جمالی تھی۔

جامعیتِ شریعت

اس لئے شریعت مقدسہ میں دونوں شانیں موجود ہیں۔ رحمۃ للعالمین کی شریعت ہے جس میں عفو و درگذر اور معافیاں بھی ہیں اور ساتھ ساتھ حدود ، قصاص اور جہاد بھی ہے چور چوری کرے تو ہاتھ کاٹ دو زانی زنا کرے تو سنگسار کر دو جہاں شریعت کے اندر رحمۃ للعالمین ہے۔ وہاں جلالی شانیں اور تعزیرات و عقوبات بھی موجود ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

بعثت مرحمة و ملحمة میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں اور جنگ مجسم بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں۔ مطیعوں کے لئے رحمت ہوں اور مجرموں کے لئے غضب مجسم ہوں۔ اسی طرح فرماتے

ہیں۔

انا الضحوك القتال میں بہت زیادہ ہنس مکھ بھی ہوں۔ اور بہت زیادہ قتال کرنے والا بھی ہوں۔ یعنی رحمت کی شان بھی ہے۔ اللہ کی رحمت میرے اندر سرایت کئے ہوئے ہیں اور غضب کی شان بھی ہے کہ خدا کے غضب سے اس کے منکروں کے مقابلہ میں غضب مجسم بنتا ہوں۔ غرض دونوں شانیں آپؐ نے ظاہر فرمائیں۔ بہر حال نبی کریم ﷺ دونوں روشنیاں لے کر آئے آپؐ کی ذات بابرکات فی الحقیقت ایک نور ہے۔ کیسا نور تھی؟

حق وباطل میں امتیاز کا نور

جیسی ظلمت آپ کے سامنے ابھی آئی ویسا ہی نور تھا۔ جہالت اخلاق وعقائد کی ظلمت بنی آدم میں تھی جبلت کی شہوتیں، جبلت کی ظلمتیں۔ یہ ایسی ظلمات ہیں۔ جن سے حق و باطل میں امتیاز نہیں ہوتا تو ان ظلمتوں کے لئے ویسے ہی نور کی ضرورت تھی کہ یہ ظلمتیں رفع ہوں۔ چاندنے میں حق وباطل نظر آئے۔ حق وباطل اس سورج کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔ وہ پیغمبر کی روشنی میں نظر آتا ہے۔ جو علم اور کمالات اخلاق کی روشنی ہے۔ حقیقت میں نبوت نورانی ہے۔

غرض جس طرح کی ظلمتیں میں نے عرض کیں یہ ظلمتیں وہ نہیں ہیں جو سورج کے ڈوبنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ حسی اور مادی ظلمت ہے اور جہالت وبداخلاقی کی ظلمت یہ معنوی ظلمت ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ۔

الظلم ظلمة ظلم یہ ظلمت وتاریکی ہے۔ عدل روشنی ہے تو عدل کی روشنی سورج کی طرح سے نہیں ہے۔ علم کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح نہیں ہے، مگر سورج کی روشنی اس روشنی کے سامنے ماند ہے، سورج فقط مکان کو روشن کرتا ہے اور علم کی روشنی قلوب اور ارواح کو روشن کرتی ہے سورج سے فقط زمین اور مکان روشن ہوتا ہے، اور علم سے زمان، مکان اور اعیان سب روشن ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نور خداوندی ہیں۔ مگر مادی نور نہیں ہیں معنوی نور ہیں۔ یعنی عمل الٰہی کا پرتو جو آپ کے اوپر پڑا ہے وہ عالم میں کسی کے اوپر نہیں ڈالا گیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ:

اول ماحلق الله نوری اس روایت کو بعض نے ضعیف اور بعض نے موضوع کہا ہے لیکن اس کا مضمون صحیح ہے، کیونکہ قرآن کریم نے دعویٰ کیا کہ: قَدْ جَاءَكُم مِنَ اللهِ نُورٌ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور پہنچا۔ اور نور سے مراد ذات محمدی ﷺ تو اول ماخلق الله نوری کو دیکھا جائے تو اگرچہ حدیث موضوع بھی ہو مگر مضمون کے لحاظ سے صحیح ہے، کیونکہ قرآن کے ساتھ موئد ہے۔۔۔۔ بہر حال نبی کریم ﷺ نور ہیں۔ مگر معنویت کا نور ہیں۔ روحانیت کا نور ہیں۔ اخلاق کا نور ہیں۔ کمالات خداوندی آپ کے اندر ظہور کرتے تھے۔ جلوہ کرتے تھے اس کی روشنی آپ کے اندر تھی۔ یعنی آپ مظہر اتم تھے۔ اللہ کے کمالات کے جس طرح سے یہ بجلی کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔ فیوز جو ہے اس کے اندر ایک بہت معمولی سا تار ہے۔ لیکن جب اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے ہو جاتا ہے تو وہ اتنا روشن ہو جاتا ہے کہ میدانوں کو چمکا دیتا ہے۔ تو اصل میں روشنی پاور

ہاؤس سے آتی ہے۔ خود اس کے تار کے اندر روشنی نہیں ہے لیکن منور ہو کر تار کی ہستی نظر نہیں آتی۔ روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ ایسے میں اگر تار کہہ دے انا النور میں تو خود نور ہو۔۔ تو وہ کہہ سکتا ہے لیکن حقیقت میں نور اور ہے اس کی ذات اور ہے اس کی ذات پر نور نے جلوہ کیا ہے۔ وہ نور کا مظہر بن گیا۔ اسی واسطے نور بھی کہہ جا سکتا ہے۔ اور جب ذات کی طرف نگاہ جائے گی تو کہا جائے گا کہ میں تو تار ہوں۔ روشنی دوسرے کی ہے جو میرے اندر آرہی ہے۔۔۔ انبیاء علیہم السلام وہ صلاحیتیں لے کر آتے ہیں کہ علوم خداوندی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اخلاق ربانی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔۔۔ تو یہ نور معنوی نور ہے جیسا کہ وہ ظلمت معنوی ظلمت تھی۔ معنوی ظلمت کے رفع کرنے کے لئے معنوی نور کی ضرورت تھی۔ آفتاب کا نور اسے زائل نہیں کر سکتا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات نور بن کر آئی آپ کی ذات کو دیکھ کر مخلوق نے یہ سمجھ لیا کہ حق یہ ہے باطل یہ ہے نیکی اسے کہتے ہیں بدی اس کہتے ہیں۔ آپ کے اعمال، اخلاق اور پاکیزہ کردار کو دیکھ کر دنیا کے سامنے معیار آگیا اور سمجھا کہ نیکی کس چیز کا نام ہے۔ خلق حسن کس چیز کا نام ہے۔ کمال کس چیز کا نام ہے۔ عیب کس چیز کا نام ہے۔

گویا نبی کریم ﷺ حق تعالیٰ تک پہنچنے کے راستہ کے لئے روشنی تھے۔ اس کے بغیر راستہ نظر نہیں آسکتا تھا۔ تو آپ مشعل نور بن کر تشریف لائے اور راہ خداوندی لوگوں کے سامنے کھل گئی۔

راہنمائے حق

راہنما کیا چیز ہے؟۔۔۔۔ حقیقت میں نبی کریم ﷺ کی ذات تو مشعل نور ہے جس سے راہ کھلی۔ لیکن راہ کے لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے تو راہنما آپ کی سنتیں۔ آپ کے افعال اور کردار ہیں۔ اسوہ حسنہ جس کو سیرت کہا جاتا ہے۔ وہ اسوہ حسنہ جو حضور ﷺ کے اقوال و افعال اور احوال کا مجموعہ ہے۔ فی الحقیقت وہ راہنما ہے تو یہ ایک نور راہ آیا جس سے راستہ روشن ہوا اور ایک راہنما آیا۔ وہ حضور ﷺ کی زندگی ہے جو راہنمائی کرتی ہے اس طرح سے چلو۔

اسوہ عمل

آپ نے آکر جو اعمال کا نمونہ پیش کیا فقط آپ نے قانون نہیں پیش کر دیا۔ قانون کے ساتھ اپنا اسوہ بھی پیش کیا۔ آپ نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ صلوا نماز پڑھو بلکہ یہ فرمایا کہ:

صلوا کما رایتمونی اصلی نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اسی نمونے کی نماز پڑھو۔ تو آپ نمونہ عمل بن کر دنیا کے اندر آئے۔ آپ کی شریعت عمل کے لئے راہنما تھی جس کے سامنے آپ کی نماز ہو گی وہ نماز صحیح پڑھے گا۔ آپ کی نماز سامنے نہیں ہو گی۔ نماز صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ تو یہ نہیں فرمایا کہ صلوا بلکہ فرمایا

صلوا کما رایتمونی اصلی اسی طرح آپ نے وضو فرمایا۔ فقط آرڈر نہیں دیا بلکہ وضو کر کے دکھلایا ایک دفعہ آپ نے وضو کیا۔ تو تمام اعضا کو ایک ایک دفعہ دھویا۔ اور فرمایا:

هذا وضوء لا یقبل اللہ صلوٰۃ الا بہ یہ وضو ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتے۔ اگر ایک دفعہ بھی اعضا کو نہ دھویا جائے تو وضو ہی نہ ہوگا۔۔۔ اس کے بعد آپؐ نے دوبارہ وضو فرمایا اور اعضاء کو دو دو مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ یہ وضو ہے جو نور علیٰ نور ہے۔ اور اس کے بعد تیسری مرتبہ وضو کیا۔ تو تین تین دفعہ اعضاء وضو کو دھویا اور فرمایا کہ۔

هذا وضوئی ووضوء الانبیاء من قبلی یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے جتنے انبیاء تھے وہ یہی وضو کرتے تھے۔

ضرورتِ مربیّ

تو آپؐ نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ تو ضئوا ٗ کو وضو کرو بلکہ کر کے دکھلایا کہ اس طرح سے کرو کیونکہ عمل کی بہت سی خصوصیات ہوتی ہے جو بلا عامل کی ہیت کے سمجھ میں نہیں آسکتیں ' الفاظ سے آدمی عمل کی ہیت نہیں بنا سکتا۔ جب تک کہ عمل کی ہیئت سامنے نہ ہو۔ دین ہی میں نہیں بلکہ ہر صنعت میں ہر حرفت میں یہی طریقہ ہے کہ محض اصول اور کتاب کافی نہیں ہوتے جب تک کر کے دکھلانے والا کوئی مربی اور استاد سامنے نہ ہو۔۔۔ خیاطی کا فن ہے۔ آپ پانچ سو صفحے کی کتاب پڑھ جائیں۔ جس میں یہ اصول ہوں کہ کپڑے سینے کے یہ یہ طریقے ہیں لیکن ایسی باریکیاں ہوتی ہیں کو کہ کاغذ پر نہیں آسکتیں کر کے دکھلانے والا جب تک اس ہیئت سے کر کے نہ دکھلائے۔ اسی واسطے حضرات محدثین نے جہاں جہاں احادیث کی روایت کی ہے وہاں خود بھی عمل کر کے دکھلایا ہے اور اپنے عمل کو روایت کے مطابق کیا ہے۔ میں نے مشکوۃ شریف اپنے والد بزرگوار رحمتہ اللہ علیہ سے پڑھی مشکوۃ شریف میں جب یہ باب آیا کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہئے تو رکوع کی بحث آئی تو اسے پڑھا کر سجدہ کر کے دکھلایا کہ یوں کرنا چاہئے تو ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ ہم تو رات دن رکوع وسجدہ کرتے ہیں۔ اس میں درس کے دوران جماعت میں کر کے دکھلانے کی کیا ضرورت تھی؟

فرمایا کہ یہ میں نے اس لئے دکھلایا کہ جب میں نے مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تھی تو انہوں نے بھی مجھے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور فرمایا کہ جب میں نے شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی اس موقع پر یونہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنی نے فرمایا کہ جب میں نے شاہ اسحق صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی مجھے یوں ہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاق صاحب نے فرمایا کہ جب میں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے حدیث سمجھا کر یوں ہی رکوع اور سجدہ کر کے دکھلایا تھا اور کہا کہ مجھے شاہ ولی اللہ نے یونہی کر کے دکھایا تھا اور شاہ ولی اللہ نے کہا کہ مجھے شیخ ابو طاہر مدنی نے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور آخر تک نبی کریم ﷺ تک سند پہنچادی۔

تسلسل ہیئت عمل

تو محدثین جہاں الفاظ کی روایت کرتے ہیں وہاں ہیئت عمل کو بھی کر کے دکھاتے ہیں یعنی الفاظ فقط اصول کا نام نہیں بلکہ تاریخ بھی اس

کے ساتھ وابستہ ہے۔ کوئی قانون قانون نہیں ہو تا جب تک اس کے ساتھ اس کی تاریخ نہ ہوں۔ تو روایات کے ساتھ امت کا تعامل بھی موجود ہے۔ اس میں اس عمل کے بارے میں راہنمائی ہوتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمل کیا صحابہؓ نے اس عمل کی نقل کی تابعین نے اس عمل کی نقل کی روایت بھی پیش کی۔

اسی واسطے بعض روایات جو مسلسل بالاولیات کے نام سے ہیں کہ حضور ﷺ نے کسی روایت کو ظاہر فرمایا اور اسی مجلس میں اس کو کر کے دکھلایا تو محدثین روایت کے ساتھ ساتھ سند اور اس کو کر کے دکھاتے چلے آتے ہیں۔

مثلاً حدیث مسلسل بالماء والتمر یہ عبد اللہ ابن عمرؓ سے ایک روایت ہے کہ حضور ﷺ نے کھجور کی فضیلت بیان کی اور بیان کر کے خود کھائی اور اپنا اولش (کھجور کا بقیہ) عبد اللہ بن عمرؓ کو دیا اور کٹورے میں پانی پیا اور بچا ہوا پانی عبد اللہ ابن عمرؓ کو پلایا۔ عبد اللہ ابن عمرؓ نے اپنے شاگرد کو کھجور کی فضیلت کی یہ حدیث سنائی تو فضیلت بیان کر کے اسی طرح کھجور کھائی اور بقیہ نصف اپنے شاگرد کو کھلائی اس طرح پانی پیا اور بچا ہوا اپنے شاگرد کو پلایا۔ اسی طرح تابعین نے تبع تابعین نے اتباع تبع تابعین کو کیا یہاں تک کہ سند ہم تک پہنچ گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ محدث سہارنپوری اکابر علماء میں سے گزرے ہیں۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور جو مشہور ہے۔ اس کے حضرت صدر مدرس تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ کے خلفاء میں سے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ حضرت مولانا کے ساتھ سفر میں ساتھ ہوا۔ حضرت میرٹھ جا رہے تھے راستے میں مجھ سے فرمایا کہ اس وقت میری حدیث کی سند پوری جماعت میں سب سے زیادہ عالی اور بلند ہے میں ایک واسطے سے حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ کا شاگرد ہوں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے سند کی اجازت دوں اس کے لئے تو خود سہارنپور آ کر اجازت لے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں ضرور حاضر ہوں گا۔۔ لڑکپن کی بات تھی اور ابالی پن کی وجہ سے بھول بھال گیا۔ ایک برس گزر گیا پھر اتفاق سے سفر میں ساتھ ہوا۔ پھر یہی ارشاد فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ اب میں حاضر ہوں گا پھر برس چھ مہینے کے قریب گزر گئے چھ مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لئے جا رہے ہیں۔ اب میں نے سوچا کہ اگر یہ سند نہ لی تو میں محروم ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں نے سہارنپور کا سفر کیا حضرت بہت خوش ہوئے۔ مولانا محمد زکریا صاحبؒ جو آج مظاہر العلوم کے شیخ الحدیث ہیں سے فرمایا کہ حدیث کی جتنی کتابیں مظاہر العلوم کے کتب خانے میں ہیں وہ سب لے آؤ۔ تو ساری صحاح ستہ معاجم مسانید اور سنن سب کتابیں آ گئیں اور اجازت دی تو حضرت نے بہت سے کتابوں کا اول مجھ سے پڑھوایا اور بعض کتابوں کو خود پڑھا اس کے بعد فرمایا کہ مسلسل بالاولیات بھی لے کر آؤں تو الیانع الجنی لائی گئی جس میں وہ روایتیں جمع ہیں۔ جو اولیات کے ساتھ مسلسل ہیں جن میں عمل کے ساتھ ہیئت عمل کی ضرورت ہے تو کھجور بھی منگوایا اور عبد اللہ ابن عمرؓ کی روایت بیان کی کہ اس طرح حضور ﷺ نے کھجور کی فضیلت بیان کر کے خود کھائی اور انہیں کھلائی پانی پیا اور بچا ہوا پانی پلایا۔ تو

خود کھجور کھا کر مجھے پلایا۔ اس عمل کی سند نبی کریم ﷺ تک ملادی غرض محدثین جہاں حدیث کی روایت کرتے ہیں وہاں اس کے تعامل کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کی صفات اور کیفیات کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ حدیث کے درس میں جب رنۃ النیاحہ کی حدیث آئی یہ زمانہ اہلیت میں رسم تھی کہ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا تھا تو وہ وصیت کر کے مرتا تھا کہ مجھ پر چھ مہینے تک رونا۔ تا کہ یہ سمجھا جائے کو بڑا آدمی مرا ہے۔ کوئی ایک برس کی کوئی دو برس تک رونے کی وصیت کرتا تھا۔

اب ظاہر بات ہے کہ برس دن رونے کے لئے کس کی آنکھ میں اتنے آنسو رکھے ہوتے ہیں۔ کہ ایک برس تک رویا جائے۔ اس لئے رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں جو چھ مہینے برس دن تک روتی تھیں اور طریقہ ان کا یہ ہوتا تھا کہ جہاں کوئی تعزیت کرنے والا آیا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ کوئی آرہا ہے تو دوڑ کر آئیں اور حلقہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ اور جب وہ قریب پہنچا تو انہوں نے راں راں کرنا شروع کر دیا۔ واکذا وا جبلا ہائے تو ایسا تھا۔ تو ویسا تھا۔ جب تعزیت کرنے والا چلا گیا تو انہوں نے بھی رونا موقوف کر دیا پھر کوئی آیا پھر شروع کر دیا تو شہرت ہوتی تھی کہ بڑا آدمی مرا ہے کہ رونا ہی نہیں تھمتا تو کرایہ پر رونے والیاں رکھی جاتی تھیں اور وہ بیان کر کے روتی تھیں۔ ماتم کرتی تھیں۔

تو جب یہ حدیث آئی تو میرے والد صاحب نے اس راں راں کی نقل اتاری ہم لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی تو والد محترم نے فرمایا کہ مولانا گنگوہی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی اور انہوں نے فرمایا تھا کہ شاہ عبدالغنی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی۔ آگے نبی کریم ﷺ تک سند پہنچادی بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات تو مشعل نور تھی کہ آپؐ کو سامنے رکھ کر عرش تک پہنچنے کا راستہ نظر آجاتا تھا کہ یہ حق ہے اور فدں راستہ باطل ہے نور اور ظلمت میں امتیاز ہو جاتا تھا اور راہنما آپ ہی کی سنتیں تھیں۔ آپ کا طریق عمل تھا جس سے آدمی حق کا راستہ پاتا تھا حج اس طرح کرتے ہیں' روزہ اس طرح' نماز اس طرح جہاد اس طرح کرتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ' معاشرت' معیشت' صلح و امن کا یہ طریقہ ہے سب چیزیں آپ نے عملی طور پر کر کے دکھلائیں۔

عملی قرآن

تو کتاب اللہ میں جو چیزیں علمی شکل میں موجود تھیں۔ حضور ﷺ کی ذات میں وہ چیزیں عملی شکل میں موجود تھیں اس لئے اللہ کا علمی قرآن وہ ہے جو اوراق اور کاغذوں میں موجود ہیں اور عملی قرآن نبی کریم ﷺ کی ذات تھی۔ جو قرآن میں لکھا ہوا تھا وہ آپؐ میں کیا ہوا موجود تھا۔ اسی واسطے صدیقہ عائشہؓ سے جب پوچھا گیا کہ حضور ﷺ کے اخلاق اور سیرت کیا تھی تو فرمایا۔ کان خلقه القران اگر حضور ﷺ کی سیرت دیکھنی ہے تو اول سے آخر تک قرآن پڑھتے جاؤ۔ یہ حضور ﷺ کی شریعت تھی یعنی جو اس میں لکھا ہوا ہے وہی آپ کے اندر عملی شان سے موجود ہے جو چیزیں اس میں اقوال کی شکل میں موجود ہیں۔ وہ آپ ہی کی

ذات میں احوال کی شکل میں موجود ہیں تو آپ کی سنتیں راہنما ہیں مگر حضور ﷺ کی ذات نہ آتی تو راہنمائی ناممکن تھی۔

طریقہ تعلیم خداوندی

اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کے لئے اور دین کی راہ قطع کرنے کے لئے محض کتاب اللہ کافی نہیں جب تک کہ شخصیت ساتھ نہ ہو۔ محض لٹریچر کافی نہیں ہے جب تک کہ کوئی شخصیت راہنمائی نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ کے زمانہ خیر و برکت تک تعلیم کا یہی طریقہ اللہ نے رکھا کہ کتاب بھی بھیجی اور کتاب کے ساتھ معلم کتاب بھی بھیجے۔ آدم علیہ السلام کو صحیفے دیے گئے تو خود ان کو بھی ساتھ بھیجا گیا ادریس علیہ السلام کو پچاس صحیفہ دیئے گئے تو حضرت ادریس بھی ساتھ بھیجے گئے۔ اگر صحف ابراہیم بھیجے گئے تو ابراہیم علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے۔ تورات آئی تو موسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے اگر انجیل آئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے۔ زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے اور قرآن آیا تو نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات آئی۔

اس لئے اگر پیغمبر نہ آئیں تو محض کتاب کے الفاظ سے آدمی مراد ربانی کو نہیں سمجھ سکتا۔ اگر سمجھ جاتا تو پیغمبروں کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب کے الفاظ کو بیت اللہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا اور اعلان کر دیتے کہ اے لوگو! تم مریضان نفوس ہو اور یہ شفاء لما فی الصدور ہے۔ جاؤ اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج خود کر لو اگر اٹھا کر لوگ لے جاتے تو مرادات ربانی ان کی سمجھ میں نہ آتیں جب تک پیغمبر تعلیم نہ دیتے۔

انبیاء علیہم السلام کی احتیاج

اس واسطے کہ کلام کی مراد سمجھنے کے لئے کبھی لب ولہجے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، کاغذ پر جو کلام لکھا جاتا ہے۔ تو اس میں کلام کی کیفیات کاغذ پر نہیں آتیں وہ لب ولہجے اور ہیئت سے سمجھ میں آتی ہیں۔ ماحول سے سمجھ میں آتی ہیں محض کاغذ اور کاغذ کے کالے حروف سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان کا ایک جملہ ہے "کیا بات ہے" عام طور سے بولا جاتا ہے۔ اس کے کئی معنی آتے ہیں۔ اور سارے معنوں کا تعلق لب ولہجہ سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی! کیا بات ہے؟ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے ایک چیز کی تحقیر کی ہے کہ نہایت ذلیل ہے کیا بات ہے اور اگر میں یوں کہوں کہ کیا بات ہے۔ اب آپ سمجھیں گے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو ایک ہی جملہ ہے اس کے معنی وسوال، تعجب تفخیم شان اور تحقیر شان کے آتے ہیں۔ لیکن ہر معنی کا تعلق لب ولہجے سے ہے۔ کاغذ اور کالے نقوش سے نہیں اب اگر آپ کسی کے سامنے کاغذ پر لکھ کر بھیج دیں کہ "کیا بات ہے" وہ مطلب سمجھے گا جو اس کے ذہن میں کیفیت ہے۔ وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی اس کی اپنی طبع گھڑی ہوئی مراد ہوگی اور متکلم کے سر تھوپ دے گا حالانکہ مراد اپنی ہوگی۔ تو ٹھیک اسی طرح

قرآن حکیم کا ایک لب ولہجہ ہے اگر قرآن کے ساتھ بیان کرنے والے مربی نہ آتے 'لب و لہجہ' ماحول اور ہیئت کذائی سے نہ سمجھاتے تو قرآن کریم سے اللہ کی مرادیں سمجھنا آپ کے لئے ممکن نہ ہوتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لب ولہجہ طریق عمل اور ہیئت کذائی سے سمجھایا۔ حدیث میں حضرت عدی بن حاتمؓ کا واقعہ فرمایا گیا۔ جب قرآن کریم کی یہ آیت اتری کہ کُلُو واشربُوا حَتی یتبیَنَ لکمُ الخیطُ الاَبیض مِنَ الخَیطِ الاَسودِ مِنَ الفجرِ

رمضان کی راتوں میں کھاؤ اور پیو۔ جب تک فجر کا سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے تو سفید ڈورے سے مراد صبح صادق ہے جو پو پھٹتی ہے اور ایک لمبی لکیر آسمان پر کھنچ جاتی ہے اور سیاہ ڈورے سے رات کی تاریکی مراد ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتمؓ نے ایک ڈورا کالا لیا اور ایک سفید اور دونوں تکیئے کے نیچے رکھ لئے کھاتے پیتے رہے تکیہ اٹھایا دیکھا کہ اتنا اندھیرا ہے کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہیں ہوتا۔ پھر کھاتے پیتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح صادق بھی ہوگئی پندرہ بیس منٹ اوپر گزر گئے کیونکہ صبح صادق کے بعد کچھ دیر اندھیرا رہتا ہے، مگر چونکہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ اور نمایاں نظر نہیں آیا اس لئے کھاتے پیتے رہے۔ جب اتنا چاندنا ہو جاتا کہ دونوں ڈورے الگ الگ نظر آنے لگتے تب روزے کی نیت کرتے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں اس کی اطلاع دی گئی۔ تو آپؐ نے عدی ابن حاتمؓ کو بلایا۔ فرمایا تم کیا عمل کرتے ہو؟ انہوں نے کہا حضرت! قرآن شریف میں یہ آیت نازل ہوگئی ہے کُلوُا واشربُوا حتّٰی یَتبَیَّنَ لکمُ الخیطُ الَا بیَضُ منَ الخیطِ الاَ سوَدِمِنَ الفَجرِ

تو میں نے کالا اور سفید ڈورا اپنے تکیئے کے نیچے رکھ لیا ہے تاکہ دیکھتا رہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ان وسادتك لعويض تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ کالا سفید دونوں ڈورے اس کے نیچے آگئے۔ بندہ خدا کالے ڈورے سے مراد رات کی تاریکی اور سفید ڈورے سے مراد صبح صادق کی سفیدی ہے تو نے روئی کے دھاگے سمجھ لئے۔ تو لغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے۔ مگر اللہ کی مراد نہیں تھی مراد سمجھانے والے پیغمبر تھے۔ اگر مراد پیغمبر نہ سمجھائیں تو کالا ڈورا اور سفید ڈورا الگ الگ نظر آتے پر وہ روزہ رکھنا شروع کرتے روزہ رکھتے رہتے کوئی ملامت اس پر نہ ہوتی۔ مگر وہ مراد خداوندی نہ ہو سکتی، غرض لغت ہوتا ہے مراد خداوندی دوسری ہوتی ہے۔ عرفی معنی مراد ہوتے ہیں۔

تعینِ مراد میں عرف کا دخل

ہمارے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ "سونے پر سہاگہ" تو لغتہ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سونا رکھ کر سہاگہ اس کے اوپر چھڑک دو لیکن مراد یہ نہیں مراد عرف عام میں یہ ہے کہ جب کسی چیز میں خیر کا مبالغہ بیان کیا کرتے ہیں۔ اس وقت کہتے ہیں کہ سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ یعنی سونا تو اپنی ذات سے عمدہ ہی تھا اور سہاگہ لگنے کے بعد کندن بن گیا۔ یعنی اس کی خوبی بڑھ گئی۔۔۔ عرف عام اور اہل زبان میں رہ کر یہ محاورے سمجھ میں آتے ہیں پھر ان کی لطافت محسوس ہوتی ہے۔ کوئی محض ڈکشنریاں

دیکھے اور اہل عرف سے قطع نظر کر دے تو وہ یہ سمجھے گا کہ سونا رکھ کر سہاگہ پیس کر اس پر چھڑک دے تو اہل عرف اس کی بات پر ہنسیں گے یہ عرف کو جانتا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں ہمارے اساتذہ میں ضلع ہزارہ کے حضرت مولانا غلام رسول خان صاحبؒ تھے اردو پوری طرح نہیں بول سکتے تھے۔ جیسے سرحد کے لوگ بول سکتے ہیں۔ ویسی ہی بولتے تھے اور دعوی مولانا کو یہ تھا کہ میں سب سے زیادہ اردو جانتا ہوں۔ تو ایک موقع پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ جمع تھے حضرت شیخ الہندؒ ان کے بھائی مولانا محمد حسن صاحب وغیرہ تو مولانا محمد حسن صاحب نے کہا کہ میاں مولوی غلام رسول! چالیس برس سے تم دارالعلوم دیوبند میں مدرسی کر رہے ہو اور تمہیں اردو بولنی نہیں آئی۔۔۔ مولانا کو غصہ آ گیا کہنے لگے۔ " میں اردو نہیں جانتا؟"۔۔۔ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو لغو سمجھتا ہوں اس لئے بولتا نہیں ہوں۔

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ ہندوستانیوں سے زیادہ سمجھتے ہیں؟

کہا کہ ہاں ۔۔۔۔۔

انہوں نے کہا کہ بتاؤ اس کے کیا معنی ہیں۔ "کریلا اور نیم چڑھا؟"

اب مولانا چپ بیٹھے کہ اس کا کیا مطلب کہ کریلا اور نیم چڑھا۔

کہنے لگے کہ اس عطف (لفظ اور) نے کام خراب کر رکھا ہے ورنہ معنی ظاہر تھے حکیم صاحب نے کہا کہ چلو تم عطف نکال دو۔ "کریلا نیم چڑھا" اس کا مطلب بتلا دو کہنے لگے اب معنی ظاہر ہے کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا۔ سارا مجمع ہنس پڑا۔

اب ظاہر بات ہے کہ مولانا نے لغت کی مدد سے یہ معنی بیان کئے اہل عرف میں کبھی رہے نہیں تھے کہ اس محاروے کی حقیقت کو سمجھتے۔ کریلا لیا اردو کا نیم فارسی کا لیا چڑھا لیا ہندی کا اور تینوں چیزوں کو ملا کر ایک معنی بنا دیئے تو اس معنی پر اہل عرف کو ہنسنا ہی تھا یہ معنی مراد تھوڑا ہی ہیں۔

ایسے ہی ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک کلکٹر تھا یہ آج سے چالیس برس کی بات ہے، انہیں بھی یہی دعوی تھا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں ان کے ہاں پیش کار ہمارے دیوبند کے منشی حبیب حسن تھے بڑے عمدہ شاعر تھے، بڑی شستہ ان کی زبان تھی تو بعض اوقات وہ کلکٹر دعوی کیا کرتا کہ ویل! پیش کار۔ ہم تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہے۔

یہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں کہ یہ کمبخت اردو کیا جانے اس کی مادری زبان نہیں۔ اہل عرف میں یہ نہیں رہا۔ اسے خواہ مخواہ یہ دعوی ہو گیا۔ اب یہ ملازمت کے ڈر کے مارے بول نہیں سکتے تھے کہ کہیں برخاست نہ کر دے کہیں روٹی نہ جائے۔

ایک دن کوئی بات آ پڑی تو اس کلکٹر نے میز پر جوش کے ساتھ مکہ مار کر کہا کہ ویل پیش کار! تم جاہل ہو اردو سے۔ ہم اردو جانتے ہیں۔ پیش کار کو بھی غصہ آ گیا انہوں نے کہا کہ میری نوکری رہے یا نہ رہے مگر مجھے اس کے دماغ سے یہ خناس نکالنا ہے۔ اس نے میز پر ایک مکہ مارا تھا انہوں نے دو مکے مارے اور کہا۔

ویل صاحب بہادر! تم جاہل مطلق ہو تم نہیں جانتا اردو کسے کہتے ہیں ہم جانتے ہیں۔ صاحب کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا آسمان پر۔ کہنے لگا تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔ کہنے لگے تمہیں کیا خبر اردو کی؟

انہوں نے کہا ویل صاحب بہادر۔۔۔! اچھا میں تمہارا امتحان لیتا ہوں۔ بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں؟ کہ "صاحب بہادر سے جب میں نے یہ پوچھا تو بغلیں جھانکتے رہ گئے" صاحب نے کہا ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا۔ یہ بغلیں جھانکنا ہو گیا۔

وہ ہنس پڑے کہ یہ معنی ہیں؟ تو کہنے لگا اور کیا معنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ تو ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ آپ بتائیں میں کیوں بتاؤں؟ اب وہ صاحب بہادر بیٹھ کر سوچ رہے ہیں کہ ظاہر معنی تو یہی ہیں کہ بغل ادھر جھانک لی بغل ادھر کو جھانک لی۔ بغلیں جھانکنے کا لفظ صادق آ گیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو کہنے لگا کہ ویل پیش کار! آپ ہمیں تین دن کا مہلت دیں ہم آپ کو ڈکشنری دیکھ کر بتائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حضور تین دن کے بجائے آپ کو ایک ہفتہ کی مہلت ہے۔ اور ساری ڈکشنری دیکھ کر بتائے گا۔ تو صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنا شروع کیں۔ لغت کی ہر چھوٹی بڑی کتاب دیکھ ماری۔ ان میں کہیں بھی یہ کیفیت اور ہیئت موجود نہ تھی۔ یہ محاورہ تھا۔ جب صاحب بہادر عاجز ہو گیا تین چار دن کے بعد کہا کہ ویل پیش کار صاحب ہمیں کسی ڈکشنری میں یہ چیز نہیں ملی بغلیں جھانکنا تو لکھا ہے مگر اور کچھ نہیں نکلتا۔

انہوں نے کہا حضور قیامت تک اور کچھ نکلے گا بھی نہیں۔ پھر اس نے کہا اچھا آپ بتلائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نہیں بتلاتا آپ ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ کہا آپ بتلا دیں انہوں نے کہا توبہ کریں آئندہ میں یہ نہیں کہوں گا میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔ یہ صاحب بہادر پر بڑا شاق گذار۔ مگر جہالت کا اقرار کر چکے تھے تو مجبوراً انہیں کہنا پڑا کہ اچھا اب ہم نہیں کہیں گے۔ تب انہوں نے بتلایا کہ بغلیں جھانکنا لغۃً اس کے معنی یہ ہیں ہے کہ بغل میں ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا مگر عرف میں اسکے معنی یہ ہیں کہ بغلیں جھانکنا یہ تحیر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جب آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ اس سے کوئی بات بن نہیں پڑی۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا تو یہ حیرت سے کنایہ ہے۔

ہر زبان میں یہ چیز ہوتی ہے کہ ایک لغوی معنی ہوتے ہیں ایک اصطلاحی اور ایک عرفی معنی ہوتے ہیں۔ فارسی کا محاورہ ہے کہ "فلاں شخص آب در ۔۔۔ کرو۔ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔

تو ٹوکری میں پانی ڈالنے کا لغوی مطلب تو یہ ہے کہ آدمی ٹوکری نیچے رکھ کر اوپر سے گھڑا انڈیل دے۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص بے نتیجہ اور فعل عبث کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے نتیجہ کچھ نہیں۔ ہزاروں گھڑے ڈال دے گا پانی بہہ جائے گا۔ غرض جب کوئی آدمی عبث کام کر رہا ہو جو بے نتیجہ ہو تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔

توجو لوگ فارسی دانوں کے عرف میں نہ رہے ہوں۔ اہل عرف کی صحبت نہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ وہ لغت کی مدد سے ایسے ہی معنی بیان کریں گے کہ اہل عرف ان کے معنی اور حماقت و جہالت پر ہنس پڑیں گے یہی شان قرآن وحدیث کی بھی ہے کہ ان کا بھی ایک عرف ہے قرآن فقط لغت پر نہیں اترا اس کی کچھ اصطلاحیں ہیں۔ کچھ محاورات ہیں۔ ادا کا کچھ لب ولہجہ ہے وہ اس لب و لہجے اس ماحول اور طرز ادا ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ تبھی اس کی مرادیں متعین ہوسکتی ہیں۔
اس لئے اگر کوئی شخص قرآن دانوں کے عرف کو ہی نہیں جانتا ہو قرآن والوں کے عرف میں نہ رہا ہو وہ کبھی بھی مراد ربانی کو نہیں سمجھ سکتا وہ لغت کی مدد سے مراد خداوندی کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو قرآن کریم کا لغت کی مدد سے حل کرنا کافی نہیں ہے۔ یہ کافی نہیں کہ آپ نے (عربی ادب کی کتاب) مقامات حریری یا اردو ادب کی کتابیں پڑھ لیں۔

مرادِ قرآنی کی تعلین میں سنت کا مقام

نیز یہ تو قابلیت کی بات ہے اور یہ تو تعجب بالائے تعجب ہے کہ اردو کے ترجمے دیکھ کر آپ مفسر بن گئے اس سے قرآن حل نہیں ہوتا جب تک مراد مرات ربانی پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں اور وہ جب سمجھ میں آئیں گی جب پیغمبر کے اقوال و افعال اس کے ساتھ ملائے جائیں جن سے قرآن کریم کی تفسیر اور تطبیق ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے جب ابن عباسؓ کو خوارج کے مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا کہ ان سے بحث ومناظرہ کرو اور ان کو حق سمجھاؤ۔۔۔ ابن عباسؓ تیار ہوئے۔۔۔ تو ابن عباسؓ سے فرمایا دیکھو خوارج کے سامنے مجمع میں قرآن سے کوئی دلیل نہ پیش کرنا بلکہ سنت سے دلیل پیش کرنا۔
انہوں نے عرض کیا حضرت! قرآن حکیم کا علم تو میرا موضوع ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے مجھے قرآن فہمی کی دعا دی ہے میں عالم قرآن ہوں۔ یہ میرا مضمون اور موضوع ہے۔ اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں اس سے استدلال نہ کروں اس کی کیا مصلحت ہے۔
فرمایا کہ قرآن کریم کی آیتیں ذی وجوہ ہیں۔ اصولی جملے ہیں۔ کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر عوام کے سامنے ایک آیت پڑھ کر اس کا مطلب بیان کرو گے۔ مخالف اس آیت کے عموم سے فائدہ اٹھا کر اسی کے دوسرے معنی بیان کر دے گا' عوام یوں کہیں گے کہ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ حق و باطل واضح نہیں ہوگا۔۔۔ لیکن جب سنت رسول کی دلیل پکڑو گے۔ تو حضور ﷺ کا قول اور عمل مشخص ہے اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں ہوگی تو قرآن کریم کے معنی متعین ہو جائیں گے۔ دورنگی نہیں رہے گی دو معنی لینے کی گنجائش نہیں رہے گی اور حق واضح ہو جائے گا عوام سمجھیں گے کہ یہ حق ہے۔
اس لئے جب تک قرآن کے ساتھ سنت کو نہ ملایا جائے قرآن کی مراد مشخص نہیں ہو سکتی معنی متعین نہیں ہو سکتے۔۔۔ اس کے بغیر اگر مراد متعین کریں گے تو وہ آپ کی اپنی مراد ہوگی جو آپ قرآن کے سر تھوپ دیں گے تو یہ تلبیس ہوگی یا نفاق ہوگا کہ لفظ قرآن کے لئے معنی اپنا ڈال

دیئے۔۔۔ حالانکہ دنیا میں کسی کے کلام کا بھی مطلب بیان کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ جب تک وہ صاحب کلام خود نہ کہے کہ یہ میرا مطلب ہے۔۔۔ تو ظاہر بات ہے کہ مراد ربانی کی تعیین اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک حق تعالیٰ شانہ اپنی طرف سے کسی کو نہ بھیجیں کہ جا کر میری مراد بتلادو۔

اسی واسطے قرآن کریم کی دو شانیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ پر قرآنی آیات کی وحی ہوتی تھی تو ابتداء میں حضور علیہ السلام کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اس کو رٹنا شروع کر دیتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائے اور۔ میرے ذہن میں آیت جم جائے۔۔۔ حق تعالیٰ شانہ نے حکم فرمایا:

تحرّكْ به لِسَانَكَ لِتَعجل بِه" اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دیں۔ جلدی مت کریں"۔ اس خیال سے کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ یہ لفظ میرے سینے میں جمع ہو جائیں۔ اس لئے فرمایا۔ اِنَّ عَلَينَا جَمعَه وقُرْانَه

"ہمارے ذمہ ہے اس کا تمہارے سینہ میں جمع کر دینا اور تمہاری زبان سے اس کا پڑھوا دینا تو حق تعالیٰ نے ذمہ لیا"۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِع قُرانَه

"جب ہم (بواسطہ فرشتہ) کلام کرنے لگیں۔ تو اس کا اتباع کرو سنتے رہو"۔ یہ پہلا حکم تھا جو قرآن کے بارے میں آپ کے لئے فرمایا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جمع کر دینے اور پڑھوا دینے کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے۔ معنی نہ جمع کئے جاتے ہیں نہ پڑھوائے جاتے ہیں۔ اب آگے معنی کی بات رہ جاتی ہے تو معنی کی صورت یہ نہیں تھی۔۔۔ یہ آپ نے کسی روایت میں کسی جگہ نہیں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم کی جب آیت اترتی ہو تو نبی کریم علیہ السلام بیٹھ کر سوچتے ہوں کہ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ ایک یہ۔ یہ معنی ذرا زمانے کے زیادہ مناسب ہیں۔ لاؤ یہ اختیار کر لو۔ اس لئے کہ اگر خدانخواستہ یہ ہوتا تو یہ اپنی اختراع ہوتی متکلم کی مراد نہ ہوتی تو حق تعالیٰ شانہ نے جیسے لفظوں میں پابند کیا آگے معانی میں بھی پابند کیا۔ فرماتے ہیں:

ثُمَّ اِنَّ عَلَينَا بَيَانَه

پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کر دینا کہ مطلب کیا ہے مراد کیا ہے"۔

تو بیان کا تعلق لفظوں سے نہیں ہوتا۔ معانی سے ہوتا ہے' اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضور علیہ السلام قرآن کے الفاظ کے بارے میں بھی امین تھے۔ اپنی طرف سے الفاظ اختراع نہیں فرماتے تھے۔ اور معانی کے بارے میں بھی امین تھے۔ جو آپ کے قلب مبارک میں اللہ نے ڈالا وہی معنی آپ نے سمجھا اپنی عقل سے یا سوچ بچار سے معنی متعین نہیں کئے تو نبی کو وحی میں آزادی نہیں ہے۔ کہ الفاظ و معانی یا شوشہ گھٹا بڑھا سکے تو میں اور آپ کیسے آزاد ہو جائیں گے؟ کہ جو ہمارا جی چاہے ہم سمجھے لیں ہم انہی معنی کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول نے سمجھے اور آپ کو سمجھائے گئے۔۔۔ قرآن

خود دعویٰ کرتا ہے کہ تم انہیں معنی کے اندر مقید ہو۔ اب وہ معنی اور بیان رسول کہاں ہے؟ اسی بیان رسولؐ کو حدیث کہتے ہیں اور اسی کو سنت کہتے ہیں۔ کسی چیز کا بیان قول سے کیا کسی چیز کا عمل سے کیا اور کسی چیز کا تقریر سے کیا کہ عمل دوسرے کا تھا۔ آپؐ نے سکوت فرمایا یہ بیان تقریر کہلاتا ہے، ایک بیان قولی ہے اور ایک بیان فعلی ہے، ان تینوں بیانوں کے مجموعے کا نام سنت ہے۔

تفکر فی القرآن اسی واسطے ایک جگہ فرمایا گیا:

وَاَنزَلنَآ اِلَيكَ الذِكرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيهِم وَلَعَلَّهُم يَتَفَكَّرُونَ

"اے پیغمبر! ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا تاکہ تم کھول کھول کر اس کو بیان کردو۔ اور شاید کہ لوگ میں تفکر کریں"۔

تو تفکر کا درجہ بیان کے بعد رکھا کہ بیان دے دو تاکہ مراد واضح ہو۔ اس مراد کے اندر رہ کر لوگ غور و فکر کریں تاکہ حقائق و معارف اور علوم لوگوں پر کھل جائیں۔ اس واسطے کہ علوم و معارف اللہ کی مراد میں چھپے ہوئے ہیں ہماری اختراع میں علوم اور معارف نہیں ہیں تو پہلے بیان اور مراد سامنے آئے تو اس میں غور کریں گے تو حقائق علمی کھلیں گے۔۔۔ اور اگر اللہ کی مراد ہی سامنے نہ ہو تو پھر ہم کس چیز میں غور کریں گے؟ پھر جو غور ہوگا وہ محض ہمارا ذاتی تخیل ہوگا اس تخیل کو ہم قرآن کریم کے سر تھوپ دیں گے۔ حالانکہ قرآن اس سے بری ہوگا۔ تو نبی کریم ﷺ مبین بن کر تشریف لائے کیونکہ قرآن کریم کی مرادات بغیر مبین کے سمجھ میں نہیں آتیں۔

جمع حدیث کی تکوینی تدبیر

اسی واسطے حضرات محدثین نے حدیث کی جمع و تنقیح اور تشریح کی طرف پوری پوری توجہات منعطف کیں اور حق تعالیٰ شانہ نے انہیں محیر العقول حافظے دیئے۔ ان کے حافظوں میں کئی کئی لاکھ حدیثیں جمع ہوتی تھیں۔ عظیم الشان مجالس میں بیٹھ کر حدیث کا املا کیا جاتا تھا اور ایک ایک محدث اٹھتا تھا۔ اس کے سینے میں دو دو تین تین لاکھ احادیث مع متن اور سند کے جمع ہوتیں حق تعالیٰ کو یہ چیزیں حافظوں میں محفوظ کرانی تھیں تو محیر العقول حافظے دیدیئے۔

امام ترمذی کے شیخ حجاز کا سفر کر رہے تھے۔ جہاز میں بیٹھے تھے اس زمانے میں بادبانی جہاز ہوتے تھے۔ ہوا موافق ہوئی چل پڑے۔ مخالف ہوئی لنگر ڈال دیا تو چھ چھ مہینے میں جا کر جدہ کے ساحل پر اترتے تھے برس اور دو برس حج کرنے میں لگتے تھے تو امام ترمذی کے شیخ جہاز پر سوار ہوئے۔ ترمذی اور بہت سے تلامذہ بھی ساتھ سوار ہو گئے۔ جہاز میں مدت کافی لگتی تھی۔ اس لئے یہ ارادہ کیا کہ شیخ سے عرض کریں کہ آپ احادیث کا املا کرائیں ہمارا یہ وقت احادیث کے سننے اور لکھنے میں کٹے۔ امام ترمذی کے استاد نے مان لیا اور کہا کہ کل سے ایک وقت مقرر کرلو تاکہ میں حدیثیں املا کراؤں۔

امام ترمذی کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات۔ اب انہوں نے سوچا کہ اگر میں مجلس میں بے کاغذ اور قلم دوات کے گیا تو مجھے اٹھا دیا جائے گا یہ باب حدیث اور باب املا کے خلاف ہے۔ اس لئے سب

سے پیچھے بیٹھ گئے اور اپنا ایک گھٹنا کھڑا کر کے اپنا ہاتھ سامنے رکھتے اور دوسرے ہاتھ کو حرکت دیتے رہتے تاکہ شیخ یوں سمجھیں کہ لکھ رہے ہیں۔ اور مجلس سے نہ اٹھائے جائیں۔ تیس چالیس روز اسی طرح گزر گئے اور ہر دن میں دس دس، بیس بیس حدیثیں روایت ہوتی تھیں۔ ایک روز شیخ نے گردن اٹھائی دیکھا کہ نہ کاغذ نہ قلم۔۔۔ فرمایا یہ کیا حرکت ہے؟ عرض کیا نہیں ہے۔ فرمایا قلم ہے؟ عرض کیا کاغذ نہیں۔ پھر یہ کیا حرکت ہے؟ عرض کیا میں اس لئے ایسا کرتا تھا کہ آپ یہ سمجھیں گے کہ اس کے پاس کاغذ قلم نہیں ہے۔ اس لئے مجلس سے اٹھا دیں گے تو میں اپنے کو بصورت کاتب نمایاں کرتا تھا کہ میں بھی لکھ رہا ہوں۔

شیخ کو غصہ آیا فرمایا تم نے میری محنت اکارت کر دی۔ تم درس میں مت بیٹھو۔ انہوں نے عرض کیا حضرت! محنت اکارت نہیں ہوئی۔ مجھے الحمد للہ وہ ساری روایتیں حفظ یاد ہیں۔ اب ان کو ترتیب وار پڑھنا شروع کیا کہ پہلی تاریخ میں آپ نے یہ حدیثیں مع اس سند کے بیان کیں۔ دوسری تاریخ میں یہ بیان کیں۔ اور یہ ان کی سند ہے۔ تیسرے دن آپ نے یہ حدیثیں بیان کیں اور ان کی سند یہ ہے اتنے روز میں جتنی روایتیں املا کرائی تھیں وہ ساری امام ترمذی نے سنا دیں۔ تو شیخ نے ان کے حافظے پر اعتماد فرمایا ارو اجازت دے دی کے تم میرے درس میں بیٹھ سکتے ہو۔۔۔ تو یہ محیر العقول حافظہ نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

امام ابوداؤد کے بیٹے نے جو خود بھی محدث تھے بغداد کا سفر کیا تو بغداد کی جامع مسجد میں جب معلوم ہوا کہ امام ابوداؤد کے بیٹے آئے ہیں اور وہ خود بھی محدث ہیں سارے عوام جھک پڑے۔ لاکھوں آدمی جمع ہو گئے کہ کچھ حدیثیں تبرکا سنی جائیں۔

بعض علماء نے عرض کیا کہ آپ الحمد للہ یہاں تشریف لائے ہیں۔ اللہ نے آپ کو محدث بنایا ہے۔ کچھ حدیثیں آپ سنا دیں اور املا کرا دیں۔ فرمایا کہ:

"میں بیاض ساتھ نہیں لایا جس میں حدیثیں لکھی ہوئی ہیں"۔

اس کو بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ ایک محدث یوں کہے کہ میں اپنی یاد داشت ساتھ نہیں لایا۔ وہ محدث کیا ہوا جس کا حافظہ اتنا کمزور ہو۔

تو بعض نے کچھ لعن کا لفظ کہا جو ابن ابی داؤد کے کان میں پڑ گیا اس میں غیرت جو آئی تو فورا منبر پر بیٹھ گئے اور ابوداؤد کی حدیثیں سنانا شروع کیں تو ایک دو تین دن میں پوری ابوداؤد مع سند اور متن کے اپنی یاد داشت سے سنا دی ایک دو مقام کے سوا کہیں فروگزاشت نہیں ہوئی۔۔۔ پھر لوگوں نے مان لیا کہ واقعی یہ محدث ہیں۔

بہر حال حق تعالیٰ کو اپنے پیغمبرؐ کا کلام جمع کرنا تھا تو محیر العقول حافظے پیدا کر دیئے۔

دور جدید میں روایت حدیث کا طریق

جب ساری حدیثیں سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہو گئیں۔ اسی نسبت سے حافظے کم ہونا شروع ہو گئے اس لئے کہ حاجت باقی نہیں رہی آج ہم اس درجے پر پہنچ گئے ہیں

کہ اگر نوٹ بک جیب میں نہ رکھیں تو صبح کی بات شام کو نہیں یاد رہ سکتی۔ کاغذ دیکھ دیکھ کر اپنے افعال کو انجام دیتے ہیں۔

میرا جو یہاں آکر حشر ہوا۔ وہ یہ کہ جلسوں کی کچھ تاریخیں متعین ہوئیں۔ یہاں دعوت چائے کی۔ یہاں کھانے کی۔ یہاں تقریر یہاں مذاکرہ۔ وہ پندرہ دن کا پروگرام لکھا گیا۔ اب وہ نامہ اعمال میری جیب میں پڑا ہوا ہے اور بحمد اللہ ہے دائیں جانب۔ بائیں جانب نہیں ہے۔ روز صبح کی نماز پڑھ کر میں دیکھتا ہوں کہ آج کہاں تقریر ہے۔ آج کہا جانا ہے۔ تو حافظوں کی یہ حالت ہے کہ پندرہ دن تو پندرہ دن صبح کی بات شام کو یاد نہیں رہتی۔ آج اگر کوئی یوں کہ کہنے لگے میں امام بخاری ہوں، امام مسلم ہوں یا امام ابوداؤد ہوں۔ تو یہ مضحکہ خیز بات ہوگی۔ جن لوگوں کے حافظوں میں اللہ کو حدیث کو جمع کرانا تھا انہیں ایسے حافظے دے دیئے۔ جب کتابوں میں روایت آگئی اب محدثین فقط یہ ہیں کہ روایت کا حوالہ دے دے کہ یہ روایت بخاری میں ہے، یہ مسلم میں ہے' یہ ترمذی میں ہیں۔ اول سے لے کر اخیر تک پوری سند پڑھنا اور رجال کی تنقیح کی حاجت باقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ کام سب محدثین کر چکے ہیں۔ پکی پکائی ہمارے سامنے آگئی ہے۔ یہ نہایت ناندری ہوگی کہ ہم دعوی کریں کہ ہم بھی بخاری ہوگئے۔ صبح کی بات تو شام کو یاد نہیں رہتی اور بخاری بننے کا دعوی ہے۔

یہ قدرتی چیز ہے کہ جب کسی قوت سے کام لینے کی ضرورت باقی نہ رہے اسی نسبت سے وہ قوت گھٹنی شروع ہو جاتی ہے تو حافظہ گھٹتے گھٹتے اس نوبت پہ آگیا

اجتہادی قوت کا فقدان

اور میں کہتا ہوں کہ یہی صورت درایت اور تفقہ کے اندر بھی ہے، اجتہاد جس کو کہتے ہیں۔۔۔ جب قرآن اور حدیث کتابوں کے اندر جمع ہو گیا اور حافظوں سے نکل کر سفینوں میں آگیا۔ تو مسائل نکالنے کی طاقت جس کو اجتہادی قوت کہتے ہیں اللہ نے آئمہ کے اندر اعجازی طور پر پیدا کی ایک رات میں ایک، آیت سے ایک ایک سو مسئلے نکالے ہیں اور فقہ کو مرتب کردیا۔ وہ استنباطی و اجتہادی مسائل جب سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہوگئے اور کتابوں میں آگئے۔ تو اسی نسبت سے اجتہاد گھٹنا شروع ہوا۔ گھٹتے گھٹتے اس حد تک پہنچ گیا کہ ایک شخص عالم بنتا ہے مگر بعض دفعہ الٹی سمجھ جاتا ہے، کہتے کچھ ہیں سمجھتا کچھ ہے تو فہم بھی ہمارے خراب اور ختم ہوگئے الٹی بات سمجھتے ہیں۔۔۔ ایک روایت یہاں سے نقل ہوئی ہے چلتے چلتے چند زبانوں کے بعد وہاں پہنچ کر کچھ کا کچھ بن جاتا ہے اور پروپیگنڈہ بن جاتا ہے۔ اصلیت کا پتہ نہیں ہوتا۔ تو اسی نسبت سے اجتہادی قوت بھی ختم ہوگئی۔ اس لئے آج اگر کوئی ابو حنیفہؒ یا شافعیؒ ہونے کا دعوی کرے تو یہ مضحکہ خیز دعوی ہوگا۔ اس لئے کہ اس قوت کے باقی رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ کام اپنا پورا کر گئی۔ تو حافظے بھی ختم ہوگئے۔ اجتہادی قوتیں بھی اس نسبت سے ختم ہوگئیں۔ اس لئے جس طرح روایت میں ہمارا بڑا درجہ یہ ہے کہ ہم کتاب کا حوالہ دے دیں۔ استنباطی مسائل میں بڑا فقیہ وہ ہے جو کتاب کا حوالہ دے دے کہ یہ فلاں کتاب میں ہے۔

بہر حال جناب رسول ﷺ کو حق تعالیٰ نے مبین بنا کر بھیجا۔ تاکہ آپ اللہ کی آیتوں کو بیان کریں کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اس کی مراد یہ ہے جیسا کہ عدی ابن حاتمؓ کو آپ نے سمجھا دیا۔ ورنہ عدی ابن حاتمؓ تو روئی کے ڈورے لے بیٹھ گئے تھے۔ آپؐ نے آیت کی مراد کا بیان کیا کہ روئی کا دھاگہ مراد نہیں ہے، بلکہ صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔ تو اس طرح آپؐ نے بیان کر کے آیت کی مراد کو کھول دیا۔ اگر پیغمبر کی ذات نہ آتی۔ فقط قرآن کریم سامنے آتا تو یہ مرادات نہ کھل سکتیں۔ ہم اپنے ذہن سے سمجھتے بھی ہمارے ذہن میں آتا۔

تزکیہ قلب

پھر اگر ذہین تربیت یافتہ نہ ہو۔ مزکی نہ ہو۔ صاف نہ ہو۔ اخلاقی قوتیں اس میں نہ ہوں۔ ایسے میں اگر وہ غور کرے تو اوندھا را ہی سمجھے گا اور اپنے مذاق کے مطابق سمجھے گا۔ اس لئے جہاں اس کی ضرورت تھی کہ شخصیت آکر مرادیں سمجھائے وہاں اسکی بھی ضرورت تھی کہ مخلوق کا ذہن بھی بنائے۔ ذہنیت بھی درست کرے۔۔۔ نبی کریم ﷺ نے جہاں مراد کو بیان کیا۔ وہاں لوگوں کے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ان کا ذہن بھی بنایا۔

اگر کوئی شخص مشرکانہ ذہنیت لے کر قرآن کو دیکھے تو یوں معلوم ہوگا کہ ہر آیت سے شرک ہی نکل رہا ہے، اگر نصرانی ذہنیت سے سوچے تو یوں معلوم ہوگا کہ ہر آیت میں عیسائیت بھری پڑی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم تو ایک مرد سخی کی مانند ہے۔ دوست اس سے کمالے دشمن کمالے۔ وہ تو جزئی وجوہ اصولی اور کلی جملے ہیں۔ ہیر پھیر کر آدمی اپنا مطلب نکال سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی یہودیانہ ذہنیت سے دیکھے تو یوں معلوم ہوگا کہ قرآن میں یہودیت بھری پڑی ہے، لیکن اگر کوئی موحدانہ ذہنیت لے کر جائے کا تو آیت آیت سے توحید نکلے گی اس لئے جہاں مراد سمجھانے کی ضرورت تھی وہاں ذہن کو بنانے کی بھی ضرورت تھی تو آپؐ نے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ریاضت اور مجاہدات بھی اپنے صحابہؓ کو کرائے توجہ الی اللہ کی مشق بھی کرائی انابت الی اللہ رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ کے مجاہدے بھی کرائے تاکہ اللہ سے ربط صحیح ہو۔ ذہن میں استقامت پیدا ہو جائے۔ ذہن میں استقامت پیدا کرنا یہ ایک مستقل موضوع اور مقصد نبی کے آنے کا ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کے چار فریضے بیان کئے گئے ہیں۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الامیین رَسُولاً مِنهُم يَتلُوا عَلَيهِم اٰيٰتِه وَيُزَكِّيهِم وَ يُعَلِّمهُمُ الكِتٰبَ وَالحِكمَةَ

اللہ کی ذات وہ ہے جس نے امیوں میں رسول بھیجا۔ کیسا رسول؟ خود بھی امی ہے لکھنے پڑھنے کی خبر نہیں مگر علوم وہ بیان کئے جن سے لوگوں کو عاجز کر دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

بہر حال رسول بھیجا اس کا کیا کام ہے۔ اس کے کیا فرائض ہیں؟

لوگوں کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے یعنی اللہ نے جو الفاظ اتارے ہیں۔ ان امانت اور دیانت کے ساتھ پورے الفاظ پہنچا دیتے ہیں۔ نیز تعلیم بھی دیتا ہے، تعلیم بیان مطالب کو کہتے ہیں یعنی ان کے معانی بھی سمجھاتے ہیں یہ نہیں کہ فقط الفاظ لوگوں کے سامنے رکھ دے اور یوں کہہ دیں کہ جو تمہارا جی چاہے اس کے معنی سمجھ لیں۔ اس لئے کہ تعلیم کہتے ہی اسے ہیں کہ الفاظ کے اندرونی حقائق اور معانی کو سامنے رکھا جائے۔ تو کتاب کی تعلیم معانی و مطلب کے ساتھ دیتے ہیں۔ اور آگے فرمایا حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، حکمت کی دو قسمیں ہیں، حکمت نظری اور حکمت عملی، حکمت نظری تو علمی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ تعلیم میں آگئی۔ اس لئے متعین ہو گیا کہ حکمت سے مراد حکمت عملی ہے۔ یعنی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ معانی بھی سمجھاتے ہیں۔ پھر کر کے دکھلاتے بھی ہیں تاکہ نمونہ عمل بھی سامنے آجائے۔ جس کے معنی اسوہ حسنہ کے ہیں تو عمل کی ہیئت بھی سامنے پیش کر دیتے ہیں تاکہ حضور علیہ ﷺ کے عمل سے آیت کے معنی متعین ہو جائیں۔

آدمی میں یہ سب چیزیں ہوں مگر اس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کی ضرورت تھی وہ یزکیہم ہے ان کے دلوں کو مانجھتے تھے ان میں زیغ اور کجی بھی نکالتے تھے کسی کی یہودیانہ ذہنیت تھی تو یہود سے مسلم بنا کسی کی نصرانی ذہنیت تھی تو نصرانیت سے مسلم بنا کسی کی مشرکانہ ذہنیت تھی تو شرک سے اسلام کی طرف آیا۔ غرض وہ پچھلے اثرات زائل کر کے قلب کو پاک کر دیا۔ اس کے لئے ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے، تو آپ جہاں حلال و حرام کا بیان کرتے تھے وہاں پاک صاف قلوب کی دیکھ بھال بھی فرماتے تھے۔

عمل کی نگرانی

راتوں کو اٹھ کر اپنے صحابہؓ کی نگرانی فرماتے تھے کہ عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر رہے ہیں تو کیسا عمل کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ آپؐ تشریف لے گئے صدیق اکبرؓ کے مکان سے گزرے تو دیکھا کہ صدیق اکبرؓ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں۔ مگر اتنی آہستہ کہ کان لگا کر سنو تو آواز آتی ہے، ورنہ آواز نہیں آتی۔ آگے حضرت عمرؓ کے مکان کی طرف بڑھے تو اس زور سے پر قرآن پڑھ رہے تھے کہ محلہ گونج رہا تھا۔۔۔ صبح کو حضور علیہ ﷺ کے دربار میں دونوں حضرات جمع ہوئے۔۔۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے ابو بکرؓ! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے۔ تو عرض کیا یا رسول اللہ! میں اس کو سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے: یعنی اللہ کو سنا رہا تھا۔ تو مجھے زیادہ چلانے کی ضرورت کیا تھی۔۔۔ پھر فاروق اعظمؓ سے پوچھا کہ تم اتنے زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ تو عرض کیا کہ اوقظ الوسنان واطرد الشیطٰن سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، اس لئے زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ ان کی شان ہی اشدھم فی امر اللہ عمر ہے۔ آپؐ نے فرمایا اے ابو بکر! تم ذرا آواز کو اونچا کر دو۔ اور اے فاروق! تم ذرا آواز کو نیچا کر دو تاکہ اعتدال پیدا ہو جائے۔

یہ کوئی حلال و حرام یا جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا یہ عمل کی نگرانی تھی، طرز عمل سنبھالنا تھا۔ تاکہ استقامت اور اعتدال پیدا ہو جائے۔

قلوب کا علاج

حدیث میں ہے کہ بعض لوگوں نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں وسوسے بہت آتے ہیں؟ فرمایا وسوسے آتے ہیں؟ عرض کیا سوالات کا ایک سلسلہ ہمارے دلوں میں پیدا ہے۔ دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کس نے بنائی؟ دل سے جواب نکلتا ہے اللہ نے بنائی۔ آسمان کس نے بنایا دل سے جواب نکلتا ہے کہ اللہ نے۔ چاند سورج کو کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے کہ اللہ نے ان سوالوں کے بعد ذہن میں ایک کلیہ جمع ہوتا ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت ہے۔ ہر موجود کے لئے کسی موجد کی ضرورت ہے تو سوال ہمارے دل میں آتا ہے کہ اللہ میاں بھی تو موجود ہیں تو ان کے بنانے والا اور پیدا کرنے والے کون ہے؟

جب یہ سوال آ گیا تو ہمارا ایمان کہاں باقی رہا؟ جب اللہ کی نسبت یہ خیال آئے کہ اس کا بنانے والا کون ہے؟ تو ایمان کہاں باقی رہا؟ اور جب ایمان نہ رہا تو عمل میں تو ایمان سے طاقت آتی ہے تو ترقی عمل رک گئی، عمل معطل ہو گیا۔ وسوسہ کا اثر یہی پڑتا ہے کہ آدمی عمل سے معطل ہو جاتا ہے گویا عملی زندگی اور عملی ترقی رک گئی۔

سبحان اللہ! آپؐ نے اس وسوسہ کو دفع فرمایا۔ اور کس حکیمانہ طریق سے اس وسوسہ اور شبہ کو زائل فرمایا۔

فرمایا۔ یہ جو تمہیں شبہات ہوتے ہیں سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں تم انہیں برا سمجھتے ہو یا اچھا؟

عرض کیا یا رسول اللہ اتنا برا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے لیکن یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے۔ فرمایا:

ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ فرمایا یہی تو ایمان کی علامت ہے۔۔۔ یہ ایمان ہی تو ہے جو اس وسوے کو برا ابتلا رہا ہے۔ اگر اندر ایمان نہ ہو تو آدمی وسوسے کو برا نہ سمجھے ڈرے کیوں؟ یہ ایمان ہی ڈر پیدا کر رہا ہے۔

جیسے آنکھ کھل جاتی ہے' بیدار ہو گئے سمجھ یوں رہے تھے کہ ایمان باقی نہیں رہا واضح ہوا کہ ایمان تو موجود ہے وہ جو عمل کی ترقی رک گئی تھی۔ وہ پھر جاری ہو گئی۔

اب یہ کوئی جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا نہ حلال و حرام کا مسئلہ تھا یہ قلب کی تربیت کا مسئلہ تھا دل کی کلیں درست کرنی تھیں۔ دل کا رخ صحیح کرنا تھا کہ ادھر کو چلو ادھر کو نہ چلو۔

حضرت حنظلہؓ جا رہے تھے صدیق اکبرؓ سے ملاقات ہوئی۔ صدیق اکبرؓ نے پوچھا اے حنظلہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ نافق حنظلہ حنظلہ تو منافق ہو چکا ہے۔ اس میں ایمان باقی نہیں ہے' فرمایا وما ذاک؟ یہ کیا بات کہی؟ فرمایا بات یہ ہے کہ جب تک حضور ﷺ کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں تو جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اور جب گھر آتے ہیں اور بال بچوں میں لگتے ہیں تو وہ چیز باقی نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ ہم میں منہ دیکھے کا ایمان ہے' حقیقی ایمان نہیں ہے' حضور ﷺ کی مجلس میں جاتے ہیں ایمان آ جاتا ہے گھر آتے ہیں ایمان نکل جاتا ہے' یہی معنی نفاق کے ہیں۔۔۔

صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ یہ بات تو میرے اندر بھی ہے کہ جب حضور ﷺ کی مجلس میں ہوتا ہوں تو عرش و کرسی کا گویا مشاہدہ کرتا ہوں اور گھر میں یہ کیفیت نہیں ہوتی یہ تو میرا بھی حال ہے اور جب یہ حال تیرا بھی اور میرا بھی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی دل کا روگ ہے۔ چلو حضور ﷺ کی خدمت مبارک میں اس کا علاج کرائیں تو دونوں کے دونوں حاضر ہوئے اور صدیق اکبرؓ نے سارا واقعہ سنایا کہ حنظلہ ملے۔ میں نے ان سے حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے میں تو نفاق آ گیا۔ پھر میں نے کہا یہ حال تو میرا بھی ہے۔۔۔ یارسول اللہ ہم میں تو نفاق ہے ایمان کہاں ہے ہمارے اندر؟ پھر میں نے کہا کہ یہ حال تو میرا بھی ہے۔۔۔ یارسول اللہ ہم میں تو نفاق ہے ایمان کہاں ہے ہمارے اندر؟ یہ تو منہ دیکھے کا ایمان ہے۔۔۔ فرمایا:

یاحنظلة ساعة وساعة فرمایا اے حنظلہ! گھبرانے کی بات نہیں ساعة و ساعة یہی ہوتا ہے کہ کبھی حضور کی کیفیت کبھی غیب کی کیفیت کبھی غیوبت کبھی حضور۔

اور اس کو آپؐ نے مثال سے سمجھایا۔ فرمایا دیکھو سمندر ہے سمندر میں بعض دفعہ تو مد و جزر ہوتا ہے۔ طوفانوں کا زمانہ ہوتا ہے موجیں اٹھتی ہیں جیسے مئی جون اور جولائی کے مہینے ہیں پھر اکتوبر نومبر، دسمبر میں آ کر سمندر ساکن بن جاتا ہے۔ جب موجیں اٹھتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سمندر دوگنا سہ گنا ہو گیا بلکہ چوگنا ہو گیا گویا اس کا پانی بہت بڑھ گیا۔ اور جب ساکن ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پانی گھٹ گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا نہ موجوں میں پانی بڑھتا ہے نہ سکون میں گھٹتا ہے جب پانی میں جوش ہوتا ہے تو تموج کی وجہ سے نظر یوں آتا ہے کہ پانی چوگنا بن گیا۔ سکون کے وقت وہ بات نہیں رہتی۔۔۔ فرمایا۔

"اسی طرح سے جب تم میری مجلس میں آتے ہو تو ایمان کے سمندر میں جوش پیدا ہوتا ہے وہ چوگنا نظر آتا ہے، جب گھروں میں جاتے ہو تو سکون پیدا ہوتا ہے ایمان کے اندر کمی نہیں آتی۔ رہتا اتنے کا اتنا ہی ہے، جیسے سمندر میں سکون کے وقت کمی نہیں، جوش کے وقت زیادتی نہیں"۔

جو وسوسہ گزر رہا تھا وہ قلب سے نکل گیا اور جو عمل کی ترقی رک گئی تھی وہ پھر جاری ہو گئی۔۔۔ یہ قلوب کا علاج کرنا ہے۔ یہ حلال و حرام کا بیان نہیں۔ یہ تربیت و تزکیہ نفوس ہے۔ دلوں کا رخ درست کرنا ہے، تو تعلیم مدارس کا کام ہے، تربیت شیخ کا کام ہے۔

نبی کریم ﷺ امت کے سب سے بڑے استاد بھی ہیں اور سب سے بڑے شیخ بھی ہیں ایک طرف آپؐ اعمال کی تصحیح فرماتے ہیں اور ایک طرف دلوں کو مانجھتے ہیں اور دلوں میں نورانیت پیدا فرماتے ہیں

قلبی نورانیت کے آثار

اس نورانیت اور قلب کے رخ صحیح ہونے کا اثر یہ ہے کہ جب دل کی راہ صحیح پڑ گئی، جو آیت سامنے آئے گی اللہ کی صحیح مراد سمجھنے کا کجی باقی نہیں رہے گی صحیح مطلب سمجھے گا اور جس کے قلب کی تربیت صحیح نہ ہو اسے آیتوں میں شبہ ہو گا روایتوں میں شبہ ہو گا اس لئے کہ دل میں کجی ہے وہ کجی حدیث یا قرآن کی نہیں وہ اس

کے قلب کی ہے اسے وہ حدیث و قرآن میں نظر آتی ہے، حالانکہ حدیث و قرآن اس سے بری ہے اس نے اپنے قلب کو کسی سے صحیح کرایا نہیں۔

بلا تربیتِ قلب قرآن فہمی

ایک نا تربیت یافتہ نفس جس میں حرص و ہوا کبر و حسد اور انانیت ہے ان اخلاق کے ساتھ جب قرآن میں غور کرے گا تو اوندھے سیدھے مطلب لے گا اس لئے کہ قلب اور استہ صحیح نہیں وہ نفس کی طرف متوجہ ہے خدا کی طرف متوجہ ہی نہیں۔

اسی واسطے اس حدیث میں فرمایا گیا ہے جس میں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی گئی ہے۔

یوشك رجل شبعان على اريكته يقول عنقریب ایک وقت آئے گا کہ ایک پیٹ بھرا ہوا آدمی تکیہ لگائے ہوئے مسند پر بیٹھا ہوا ہوگا اور کہے گا۔ حسبنا كتب الله کتاب اللہ کافی ہے۔ ہم حدیث کو نہیں مانتے۔ جو اس میں حلال ہے اس کو حلال سمجھیں گے جو اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھیں گے۔۔۔ تو جہاں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی ہے وہاں یہ خبر بھی دی کہ اس فتنہ کا منشاء کیا ہوگا؟ تو فرمایا۔

رجل شبعان على اريكته ۔۔۔ پیٹ بھرا ہو آدمی۔۔ پیٹ بھر کر کھانے والا وہی ہوتا ہے جس کے نفس کے اندر حرص اور زور زیادہ ہوتی ہے۔ صاحب تقویٰ اور متقی کی کام یہ ہے کہ بقدر ضرورت کھائے۔ لیکن اناپ شناپ کھائے اور ناک تک پیٹ بھر جائے یہ حریص ہونے اور ہوسنا کی کی علامت ہوتی ہے، اور حریص وہ ہوتا ہے جو بندہ نفس ہوتا ہے جب بندہ خدا بنتا ہے تو کجی باقی نہیں رہتی اور بندہ نفس ہے تو نفس کی طرف رخ رہے گا۔ تو منہ نفس کی طرف کئے ہوئے ہیں۔ اور خدا کی آیتوں میں غور کر رہا ہے تو برعکس مطلب سمجھے گا۔ صحیح مطلب اس کو نہیں سمجھ میں آئے گا۔ اس لئے دو لفظ فرمائے شبعان اور على اريكته شبعان سے حریص ہونے کی طرف اشارہ ہے اور على اريكته اس سے کبر اور نخوت کی طرف اشارہ ہے۔ تو وہ لوگ جن کو اپنے عمل پر گھمنڈ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور باقی سب جاہل ہیں تو پہلا نزاع تو یہ ہے کہ ان میں کبر و نخوت ہے اور حریصا شان ہے۔ اس کو لے کر قرآن کو سمجھیں گے تو اپنی شان کے مطابق ہی وہ مطلب بھی سمجھیں گے اور خیال یہ کر لیں گے کہ یہ اللہ کا مطلب اور مراد ہے۔ اس لئے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا کہ لفظوں کی بھی تلاوت کرے، معنی بھی سمجھائیں عمل بھی کر کے دکھلائیں نفوس کو مانجھیں اور تزکیہ بھی کریں۔

اللہ کے رسول کے دنیا سے اٹھنے کے بعد یہ چاروں چیزوں موجود رہنی چاہئیں تب تو دین کامل موجود ہے اور اگر ان میں سے ایک بھی گھٹ جائے تو کہا جائے گا کہ حضور ﷺ ناقص دین چھوڑ گئے ہیں کامل اسلام باقی نہیں ہے۔

خدمتِ کلامُ اللہ

الحمدللہ آج تلاوت آیات بھی موجود ہے لاکھوں حفاظ امت کے اندر موجود ہیں جن کو قرآن کے الفاظ از بریاد ہیں۔ دنیا میں کسی قوم

نے اپنی مذہبی کتاب کی وہ خدمت نہیں کی جو مسلمانوں نے کی ہے اینچھ برس کا بچہ کھڑا ہوتا ہے اور الحمد سے لے کر والناس تک فرفر پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔۔۔ رمضان شریف میں آپ دیکھیں مساجد میں رونق ہوتی ہے جگہ جگہ تراویح ہوتی ہیں۔ امام پڑھ رہا ہے اگر اس نے کہیں غلطی کی تھی مقتدی پیچھے لگ جاتے ہیں جب تک اس کو لقمہ دے کر صحیح نہ کرادیں اس کو آگے نہیں چلنے دیتے تو سننے والے بھی حفاظ ہوتے ہیں پڑھنے والے بھی تواتر طبقہ کے ساتھ قرآن کی روایت موجود ہیں' توالفاظ کے محافظ در حقیقت حفاظ ہیں۔

قرآن کے معانی کی حفاظت کرنے والے علماء ربانی ہیں۔ عمل کر کے دکھلانے والے حضرات صوفیائے محققین ہیں جو کمال تقویٰ ودیانت سے عمل کی ہیئتیں بتلاتے ہیں اور عمل کر کے دکھلاتے ہیں اور دلوں کو مانجھنے والے وہ حضرات ہیں جو خانقاہوں میں بیٹھ کر قلوب کی تربیت کرتے ہیں تو تلاوت' تعلیم تزکیہ اور اسوہ کے تمام افعال جاری ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز باقی نہ رہے تو کہا جاتا کہ حضور ﷺ کے بعد اسلام کے چار ستونوں میں سے ایک گر گیا۔ تو تو اسلام کی عمارت کیسے باقی رہتی ؟

آج بحمد اللہ چاروں طبقے موجود ہیں اور یہ چاروں حق تعالیٰ شانہ کے خلفاء ہیں۔ اللہ کے ایک عملی خلیفہ ہیں جو اس کے الفاظ کو محفوظ کئے ہیں ایک علمی خلیفہ وہ ہیں جو اس کی معانی کو محفوظ کئے ہوئے ہیں ایک عملی خلفاء ہیں کہ آیتوں میں جو کیفیات چھپی ہوئی ہیں اور قلب پر پڑتی ہیں۔ ان کیفیات کو ریاضیات اور مجاہدات سے محفوظ کئے ہوئے ہیں یہ مٹنے والی چیز نہیں۔ انکار کرنے والے انکار کریں پہلے بھی منکر پیدا ہوئے ہیں۔

خدمتِ حدیث

فرق اتنا ہے کہ پہلے منکر قرار کی صورت سے انکار کرتے تھے یعنی وضاعین حدیث کا زمانہ۔ یعنی حدیثیں گھڑ گھڑ کر صحیح احادیث سے ملاتے تھے تاکہ صحیح احادیث کا اعتماد اٹھ جائے۔ وگ احادیث کو نا قابل اعتبار سمجھیں تو انہیں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حدیث کا انکار کریں' اقرار کر کے پھر سازش کر کے حدیثیں گھڑ کر رلا ملا دیتے تھے' لیکن اللہ جزائے خیر دے حضرات محدثین کو کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا' مستقل کتابیں لکھ دیں کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں یہ حدیثیں موضوع ہیں' احادیث کی اقسام بیان کیں' حجیت کے مراتب بیان کئے۔

ہر حدیث ایک ہی درجے کی نہیں ہوتی۔ اگر حدیث متواتر ہے اس کی سند کا ثبوت ایسا ہے۔ جیسے قرآن کا اس حدیث سے جو چیز ثابت ہو گی وہ قطعی ہوگی اور موجب یقین ہو گی۔۔۔ اگر حدیث اس سے کم درجہ کی ہو تو اسے خبر واحد کہتے ہیں۔ وہ موجب ظن ہو گی۔ موجب یقین نہیں ہو گی۔ اگر حدیث ظنی ہے اور اس میں کچھ اور کمزوری پیدا ہو گئی وہ کمزوری اور پیدا ہو معضل ہو گی۔ تائید کے درجے میں استعمال کی جاسکے گی' کسی حکم کی بنا نہیں بنائی جاسکے گی۔ غرض حدیث کی اقسام بیان کیں کہ متن کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں' اگر اول سے یعنی صحابہ کی طرف سے کوئی راوی حذف ہو جائے تو

اسے مرسل کہیں گے۔ شروع میں اگر راوی نہ رہے تو اسے معضل کہیں گے بیچ میں راوی نہ رہے تو اسے مشکل کہیں نئے معضل ومرسل اور مشکل کے احکام بیان کئے جو حدیث حضور ﷺ تک متصل ہو۔ سارے راوی اس کے ثقہ ہوں وہ مرفوع متصل کہلائے گی۔ اور جس میں انقطاع پیدا ہو جائے اس کا یہ حکم ہے تو اس کو مستقل فن بنایا دنیا میں روایت کا فن موجود نہیں تھا مسلمانوں میں نے یہ فن بنایا اور حدیث کے فن کے لحاظ سے اس کو بنایا حدیث کی تاریخ اور رجال حدیث کی تاریخ مرتب کر دی۔

روایت کرنے والے آدمی چار لاکھ کے قریب ہیں۔ تو چار لاکھ آدمیوں کی سوانح عمریاں جمع کر دیں، تا کہ واضح ہو جائے کہ کس کیریکٹر کے آدمی۔ تھے کس کردار کے آدمی تھے۔

روایتِ حدیث میں احتیاط

پھر روایت میں یہ احتیاط کہ اگر عمر بھر میں ایک دفعہ جھوٹ ثابت ہو جائے تو اس کی عمر بھر کی روایتیں کالعدم کر دیتے تھے کہ یہ روایتیں قابل اعتبار نہیں ہیں اور جھوٹ بولنا تو بجائے خود رہا۔ اگر صورت کذب اور واہمہ کذب بھی پیدا ہو جائے تب بھی اس کی روایت چھوڑ دیتے تھے۔

ایک محدث ہیں ان کا واقعہ تراجم میں موجود ہے کہ انہیں معلوم ہوا کہ اس حدیث کی سند عالی شام میں موجود ایک محدث کے پاس ہے تو ایک حدیث کی سند لینے کے لئے مدینہ منورہ (زادہا اللہ شرفاً وکرامۃ) سے تین سو میل کا سفر شام کے لئے کیا۔ اس زمانے کے سفر پیدل چلنا اونٹوں پر چڑھنا وغیرہ مہینوں میں جا کی پہنچتے تھے۔ صرف ایک حدیث سننے کے لئے تین سو میل سفر کی صعوبت اختیار کر جا کر ان کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ محدث فلاں محلے میں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر گئے آواز دی وہ باہر آئے۔ سلام ومصافحہ کیا۔ انہوں نے نہایت اخلاق سے ٹھہرایا۔ ان کی مجلس ہوئی تو ان کا ایک بچہ اس مجلس میں آ گیا۔ بچے میں ضدی ہوتی ہے وہ کسی چیز پر ضد کرنے لگا۔ اس کو ہزار بہلایا پھسلایا مگر وہ ضد بچہ مانتا نہیں تھا۔ تو ان محدث نے ہاتھ بند کر کے کہا کہ آؤ تمہیں چیز دیں۔ وہ بچہ آیا تو ہاتھ میں تو کچھ تھا نہیں اسے بہلانا مقصود تھا اسے لے کر باہر کر دیا یہ جو حدیث سننے گئے تھے یہ لاحول پڑھ کر اٹھ کر چلے آئے اور کہا کہ جو معصوم بچے کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہے کہ ہاتھ میں کچھ نہیں تھا اور کہا کہ آؤ تمہیں چیز دیں۔ اسے اللہ پر جھوٹ بولتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے وہ رسول پر جھوٹ بول دے تو کیا اس کی زبان تھام لی جائے گی تو یہ بالکل مباح تھا۔ لیکن سارا اپنا سفر اکارت کر کے واپس آ گئے کہ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے حدیث سنی جائے بچے کو بہلانے کے لئے جھوٹ بول دے۔ ہاتھ میں چیز نہ ہو اور کہہ دے کہ آؤ چیز دیں حالانکہ واقعہ کے حط سے یہ جھوٹ نہیں تھا بہلانے کے لئے توریہ کی سی صورت ہوتی ہے ایسے آدمی کو ذب نہیں کہا جا سکتا مگر حدیث کی سند میں صورتِ کذب اور وہمِ کذب کو بھی کذب سمجھا ہے اس احتیاط سے روایتیں لی ہیں تب آج دین مِنَّہ صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر خدا نخواستہ شیئون منکر پیدا ہو جاتے تو قرآن سمجھانے والا آج کوئی باقی نہ رہتا۔ بس پھر یہی ہوتا کہ اور دو کے ترجمے دیکھ دیکھ کر لوگ الگ الگ بانٹتے اور کہتے کہ یہ خدا کی مراد ہے اور وہ علم نہ ہوتا اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے۔

تو نبی کریم ﷺ کو جو چار فریضے دے کر بھیجا گیا تھا۔ وہ چاروں فریضے آج بھی موجود ہیں۔ اور چاروں میں حضور ﷺ کے خلفاء موجود ہیں۔ الفاظ کی روایت کرنے والے۔ معانی اور احکام کی روایت کرنے والے، تزکیہ قلوب کے سلسلے میں نیابت کا فرض انجام دینے والے بھی اور عمل کا نمونہ دکھلانے والے بھی ہیں۔

آدابِ تعلیم

مگر ہاں ان کی تلاش کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے کہ ایسے لوگ لوگوں کے گھروں پر نہیں جایا کرتے کہ ہم سے سیکھ لو۔ لوگوں کو ان کے گھروں پر جانا پڑتا ہے۔

العلم یوتی ولا یوتی علم خود نہیں آتا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس جایا جاتا ہے۔

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے ہارون الرشید نے کہا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ آپ انہیں "موطا" پڑھا دیں۔ (یہ حدیث کی کتاب ہے) آپ نے وعدہ فرمایا کہ پڑھا دوں گا۔۔۔ ہارون الرشید نے کہا کہ کس وقت تشریف لایا کریں گے؟ فرمایا تشریف لانے کا کیا مطلب؟

العلم یوتی و لا یوتی علم خود لوگوں کے دروازوں کے اوپر آیا کرتا ہے؟ ان کو خود آنا پڑے گا تو ہارون الرشید پر ذرا بھاری گزرا مگر اس نے کہا کہ بہتر حاضر ہوں گا مگر ایک شرط ہے کہ عام طالب علموں میں نہ بٹھائیں۔ ان کو ذرا امتیازی جگہ بٹھلائیں۔

فرمایا طالب علمی کی لائن میں سب برابر ہیں، اگر آپ کو جاہل رکھنا ہے تو میں امتیازی برتاؤ کروں؟ عالم بنانا ہے تو یہ برتاؤ نہیں ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے تم بنی عباس ہو۔ تم نبی کریم ﷺ کے اقارب ہو۔ اگر تم ہی اس کو ذلیل کرو گے تو اسے عزت دینے کے لئے کون آئے گا؟

پھر شاہزادے اسی طرح جاتے تھے اسی طرح مودب بیٹھتے تھے اور استاد کی جھڑکیاں بھی سنتے تھے، اس طرح حدیث حاصل کی۔۔۔ پھر ہارون الرشید کا بھی یہ عالم ہوا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ مامون سے کہا کہ پانی ڈالو میں پیر دھوتا ہوں۔ تو مامون الرشید شاہزادہ پانی ڈال رہا تھا امام مالک اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے صاف کر رہے تھے اچانک ہارون الرشید پہنچ گئے تو دیکھ کر امام مالک سے شکایت کی۔ یہ شکایت نہیں کہ کیوں پیر دھلوائے؟ کیوں پانی ڈلوایا۔ فرمایا مجھے اس کی شکایت ہے کہ آپ اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے مل رہے ہیں، مامون کے ایک ہاتھ میں لوٹا ہوتا ایک ہاتھ سے آپ کے پیر مل کر دھوتا۔ مامون کا یہ فرض تھا۔ نہ یہ کہ وہ فقط پانی ڈالے پھر اس درجے پر ہارون الرشید آگیا

کمالِ طلب

تو حقیقت یہ ہے کہ:

العلم عز لاذل فیه یحصل بذل لاعز فیه

یہ امام ابو یوسف کا مقولہ ہے کہ علم ایک ایسی عزت ہے جس میں ذلت کا نشان نہیں۔ مگر ایسی ذلت سے حاصل ہوتا ہے جس میں عزت کا نشان نہیں، غلامی محض کرنی پڑتی ہے، اساتذہ کے آگے

جھکنا پڑتا ہے اڑی کڑی جھیلنی پڑتی ہے۔ تب جا کر چار حرف آتے ہیں۔ ابن عباسؓ سے کسی نے پوچھا کہ یہ اتنا بڑا علم آپ کو کیسے حاصل ہوا تو فرمایا۔

بلسان سئول و قلب عقول.

سوال کرنے والی زبان اور عقل مند قلب کے ذریعہ حاصل ہوا میں نے سوال کرنے میں کبھی عار نہیں کیا۔ اگر مسئلہ معلوم نہیں ہوا اپنے چھوٹے سے سوال کر لیا چنانچہ ایک دفعہ ایک مسئلہ ذہن میں اٹکا تو حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی ہیں حضرت ابن عباسؓ کے استاد ہیں۔ ضرورت پڑی کہ ان سے تحقیق کی جائے تو بارہ بجے دوپہر کو یہ سوال ذہن میں آیا تو زید بن ثابتؓ کی دہلیز پر بیٹھ گئے جہاں جلتا ہوا پتھر ہے' دھوپ پڑ رہی ہے یہ خیال کیا کہ جب ظہر کی نماز کے لئے نکلیں گے تو سوال کروں گا اگر مسجد میں پہنچ گئے تو درس شروع ہو جائے گا سوال کا موقع نہیں رہے گا تو ساری دوپہر دھوپ میں دہلیز پر بیٹھ کر گزارا۔۔۔۔ جب اچانک زید بن ثابتؓ نکلے : مایا۔

اے ابن عم رسول! (ﷺ) یہ آپ کہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟ عرض کیا۔۔۔ حضرت ایک مسئلہ اٹک رہا تھا اس کی تحقیق کرنی ہے۔۔۔ فرمایا۔۔۔ پھر آجاتے۔

عرض کیا۔ سوال تو دل میں اب ہی کھٹکا تھا پھر آنے کا کون سا وقت ہے؟ جب سوال ذہن میں آیا تو جبھی حاضر ہو گیا۔

اس سے شدت طلب معلوم ہوئی۔ اور شدت طلب کے ساتھ ساتھ کسر نفس بھی واضح ہوا کہ علم کے حاصل کرنے میں نہ کسی وقار کا سوال نہ کسی خودداری کا سوال غلاموں اور خادموں کی طرح جا کر دہلیز کے اوپر بیٹھ گئے پس طرح سے علم حاصل ہوتا ہے۔

عظمتِ استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند' (جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا) کو خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی فقہی مسئلہ میں کسی موقع پر خنزیر کا ذکر آیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ تو بھنگیوں سے معلوم ہو سکتا ہے' وہی خنزیر پالتے ہیں' انہیں کو زیادہ معلوم ہوگا۔

تو حضرتؒ کے گھر میں جو بھنگی آتا تھا' ایک دن اس سے پوچھا کہ بھئی! خنزیر کے بارے میں اس بات میں تمہاری کیا تحقیق ہے؟ کیا علم ہے؟ اس نے اصلیت بتلائی کہ یہ صورت ہوتی ہے۔ اس دن کے بعد سے جب وہ بھنگی آتا تو اس کی تعظیم۔ میں کھڑے ہو جاتے اور فرماتے۔

"اس کے ذریعہ مجھے ایک علم حاصل ہوا ہے"۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

انا عبد من علمنی حرفا ان شاء باع وان شاء عتق

میں اس کا زر خرید غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھا دیا۔ چاہے مجھے بیچ دے' چاہے آزاد کر دے۔ تو علم اس کے ساتھ آتا ہے کہ اتنا نفس پست کر لیا جائے اتنی ذلت و تواضع اختیار کی جائے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے سارا علم سمٹ کر خود بخود ہمارے سینے میں آجائے یہ عادت اللہ

کے خلاف ہے۔

اہل علم کا استغناء

ایسے لوگ جو علم میں گہری نظر رکھتے ہیں، علمی تحقیقات پر ان کی عمریں بسر ہوئی ہیں، وہ لوگوں کے گھروں کے دروازوں کو جھانکتے نہیں پھرتے، لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان کے پاس آئیں۔ جو آتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں جو نہیں آتے بے علم رہ جاتے ہیں، مگر امت خالی ہو جائے تو اس سے نبی کریم ﷺ کی تکذیب لازم آتی ہے، آپؐ نے فرمایا:

یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاهلین

فرمایا کہ ہر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، اس علم کو اٹھاتے رہیں گے اور اس علم کے ذریعے سے غلو کرنے والوں کی تحریفوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے، مبطلوں کی دروغ بافیوں کے پردے چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور علم نکھر کر سامنے آتا رہے گا آپ ہمارے ہاتھ میں علم و عمل ذوق اور استقامت ذہن کی پوری قوت دے کر گئے ہیں، سارے راستے ہمارے لئے کھول کر گئے ہیں۔

گمراہی سے حفاظت کی ضمانت

آپ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ:

تَرَکْتُ فِیْکُمْ الثقلین لن تضلو بعدی ابداً ان تمسکتم بهما

دووزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے ان کو مضبوط پکڑ لیا اور ان کو لپٹ گئے تو کبھی قیامت تک گمراہ نہیں ہو گے۔

کتاب الله وسنتی

اللہ کی کتاب اور میری سنت ـــ میرا طریقہ اور میرا عمل ـــ ان کو وزنی کہا ہے؟ اس لئے کہ جب طوفان اٹھتے ہیں۔ تنکے کا سہارا پکڑ لینے سے جان نہیں بچتی۔ کوئی لکڑی تیر رہی ہے۔ بڑی سے بڑی وہ خود بہہ رہی ہے۔ آپ نے اس پکڑ لیا بہنے ہی کی طرف جائیں گے۔ جان بچنی ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی چٹان پڑی ہو۔ جو ہلائے نہ ہلے اگر اسے پکڑ لیں گے تو طوفان آپ کا کچھ نہیں کر سکتا۔ تو کتاب و سنت ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں۔ دنیا میں کتنے ہی جہالتوں اور دروغ بافیوں کے طوفان آئیں لیکن اس چٹان سے جو تمسک کر رہا ہے وہ کبھی نہیں بہک سکتا، کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کتاب اللہ اپنی جگہ اٹل ہے اس کے معانی بھی اصل ہیں، حدیث رسولؐ اور اس کے معانی اپنی جگہ اصل ہیں جو اس سے تمسک کرے گا وہ کبھی نہیں بہک سکتا کبھی گمراہ نہیں ہو وہ ہر دروغ بافی کا پردہ چاک کر سکتا ہے ہر مبطل کے انکار اور ہر جاہل کی رکیک تاویلوں کو رد کر سکتا ہے تو حضور ﷺ خبر دے گئے ہیں کہ قیامت تک امت میں خلف صالح پیدا ہوتے

رہیں گے۔

تجدید دین

جہاں یہ خبر دی کہ فرقے پیدا ہوں گے۔ گمراہ پیدا ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ حقانی لوگ بھی برابر جاری رہیں گے۔ اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا

لاتزال طائفة من امتی منصور بن علی الحق لا یضر ھم من خاذلھم و لامن خالفھم حتی یاتی امر اللّٰہ

فرمایا! میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی جو منصور من اللہ ہوگی۔ اللہ کی طرف سے اس کی تائید ہوگی خلاف کرنے والے اسے ضرر نہیں پہنچا سکتے رسول کرنے والے اسے رسوا نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ اسی طرح آپؐ نے فرمایا:

ان اللہ یبعث لھذہ الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا.

اس امت میں ہر سو برس کے بعد مجددین آتے رہیں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے۔ دودھ اور پانی الگ کر کے نکھار کر علم اور مسائل نکالتے رہیں گے۔

صدی کے اخیر میں جو لوگ قلت علم اور کثرت جہل سے کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے من گھڑت رسوم اور عمل پیدا کر دیں گے تو اللہ نے وعدہ کر دیا کہ ہر صدی کے آخر میں مجددین آکر دین کو نکھار دیں گے پھر صدی کے اخیر میں علمی اور عملی فتنے پیدا ہوں گے پھر مجدد آجائیں گے خواہ جماعتوں کی صورت میں آئیں یا افراد کی صورت میں آئیں غرض امت گمراہ ہونے والی نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

لا تجتمع امتی علی الضلالة

میری امت پوری کی پوری کبھی گمراہی پر قیامت تک جمع نہیں ہوگی۔ اہل حق ہمیشہ باقی رہیں گے۔ حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

کیف تھلك امة انا اولھا والمسیح اخرھا والمھدی وسطھا

وہ امت کیسے گمراہ ہو سکتی ہے جس کے ابتدائی سرے پر میں ہوں۔ انتہائی سرے پر مسیح ابن مریم ہوں اور بیچ میں حضرت مہدی ہوں تو امت کا اول و آخر کے لحاظ سے بھی بتلایا کہ وہ حق پر قائم رہے گی امت کے درمیانی قرون کا بھی بتلایا کہ ہر قرن میں مجدد آئیں گے امت کے ہر قرن کے ہر ہر سال کے بارے میں بتلایا کہ:

یحمل اذا العلم من کل خلف عدولہ تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری ہوگا اور خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے' یہ امت کوئی لاوارثی امت نہیں ہے جس کا جی چاہے اس کا حلیہ بگاڑ دے اگر بگاڑنے والے پیدا ہوں تو اس بگاڑ کو دکھلانے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ تاویل کرنے والے ہوں گے تو اس رکیک تاویل کو باطل کرنے والے بھی پیدا ہوں گے۔ بہر حال یہ دین ہر دہر اور قرن میں نکھرا ہوا رہے گا۔

فرقہ ناجیہ فرق اتنا ہے کہ کبھی اہل حق کی قلت ہوگی کبھی کثرت ہوگی۔ لفظ **طائفة من امتی** کا بولا ہے یعنی ایک چھوٹی جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی چاہے عددی قلت ہو مگر

بہر حال موجود رہے گی۔ اسی طرح جہاں یہ خبر دی کہ امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے اور بہتر ناری ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ ایک فرقہ ناجی ہوگا۔

اس پر صحابہؓ نے عرض کیا:

وَمَنْ هم یا رسول اللہ (ﷺ) وہ کون ہیں تو آپؐ نے فرمایا
جس پر میں اور میرے صحابہؓ آج کے دن ہیں اس پر چلنے والا فرقہ حق ہے۔

صحابہؓ معیار حق ہیں

اس حدیث میں آپؐ نے بتلایا کہ ماانا علیه الیوم واصحابی جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ جو میرا دین ہے وہی بعینہ میرے صحابہؓ کا دین ہے۔ جو میرا عقیدہ ہے وہی بعینہ میرے صحابہؓ کا عقیدہ ہے جو میرا عمل ہے وہی بعینہ میرے صحابہؓ کا عمل ہے۔۔۔ فرق اتنا ہے کہ حضور ﷺ کی ذات میں ان اعمال کے ساتھ وہ اعمال بھی ہیں کہ امت ان کی نقل نہیں اتار سکتی جو خصوصیات نبوت میں داخل ہیں۔ صحابہ کے اندر عملوں کے مختلف نمونے ہیں تاجر ہے تو تجارتی عمل دیانت کے ساتھ اس کے اندر موجود ہے بعض صحابہؓ زارع اور کاشت کار ہیں تو زراعت کے مسائل دیانت کے ساتھ ان کے اندر موجود ہیں۔ فوجی ہیں تو فوج کے مسائل دیانت کے ساتھ موجود ہے۔ سول میں ملازم ہیں تو اس کے مسائل دیانت کے ساتھ ان میں موجود ہیں۔ تو صحابہؓ مختلف رنگوں کے ہیں۔ مگر ہر رنگ میں دیانت بھری ہوئی ہے سرخ اور سبز رنگ ہے۔ مگر اندر ان کے دین کی روح کام کر رہی ہے۔

امت میں چونکہ طبقات مختلف ہیں طبائع مختلف ہیں۔ مزاج مختلف ہیں تو صحابہؓ میں اللہ نے اتنے ہی مزاج کے لوگ پیدا کر دیئے تاکہ جس مزاج کا آدمی ہو جیسا مزاج چاہئے ویسے ہی مزاج کا آدمی ہو جیسا مزاج چاہئے ویسے ہی مزاج کا آدمی صحابہؓ میں مل جائے اس لئے فرمایا کہ "میں اور میرے صحابہؓ" تو سارے صحابہؓ کا ایک دین ہے اس لئے جو صحابہؓ کا متبع بن گیا وہ میرا متبع ہے۔ تو آپؐ نے اپنی ذات کو اپنے صحابہؓ کو معیار بتلایا کہ ان کے عمل اور ایمان پر اپنے عمل اور ایمان کو پرکھ لو۔۔۔ یعنی تم صحابہؓ کے افعال پر نقد و تبصرہ نہیں کر سکتے۔ صحابہؓ تمہارے افعال پر نقد و تبصرہ کریں گے کیونکہ وہ تمہارے کھرے اور کھوٹے پہچاننے کے لئے کسوٹی ہیں۔ تو کسوٹی ناقد ہے منقود نہیں ہے۔

صحابہؓ ناقد ہیں ہم منقود ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ منقود ہمیشہ مغلوب ہوتا ہے۔ ناقد غالب ہوتا ہے۔ اگر ہم صحابہؓ پر نقد و تبصرہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان پر غالب اور افضل ہیں۔ ان کے اعمال کا کھرا اور کھوٹا بتا سکتے ہیں۔ حالانکہ صحابہؓ ہمارے حق میں کسوٹی ہیں۔ وہ بتلائیں گے کہ تمہارا اتنا عمل کھوٹا ہے کیونکہ وہ ہمارے مطابق نہیں ہے اور اتنا کھرا ہے کہ جو ہمارے مطابق ہے۔ گویا صحابہؓ کو معیار بتلایا گیا۔

اہل حق کی پہچان

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر صحابہؓ کی عظمت و محبت اور اطاعت دل میں موجود ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ فرقہ حق پر ہے اور اگر عظمت و محبت اور اطاعت موجود نہیں ہے تو باطل پر ہے یہ ایک کھلا معیار ہے۔ اس لئے جو فرقے صحابہؓ کی شان میں گالم گلوچ کرتے ہیں وہ کبھی حقانی نہیں کہے جا سکتے۔ انہوں نے پہلی بنیاد ہی ختم کر دی جو ان سے حق میں اس کے قائل ہیں کہ ان کی فلاں بات کھری ہے اور فلاں کھوٹی ہے وہ کبھی بھی دین کو پوری طرح نہیں پا سکتے۔ دین کو وہی پائیں گے جو صحابہؓ کی پوری عظمت کے قائل ہیں۔۔۔ چنانچہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ:

الصحابة كلهم عدول.

سارے صحابہؓ عدول، متقی اور پارسا ہیں۔

جیسے انبیاء علیہم السلام اپنے اقوال میں معصوم ہیں۔ صحابہؓ اپنی نیات اور باطن میں محفوظ ہیں عملی لغزش اگر ان سے ہو جائے تو ہو جائے مگر ان کے قلوب کا رخ اتنا پاک اور صحیح ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کو پہلے ہی جانچ لیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

أُولٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ

صحابہؓ کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کا پہلے ہی امتحان کر لیا ہے۔ انہیں اپنے رسول کی صحبت کے لئے منتخب کیا ہے، تو امتحان کر لیا اور یہ امتحان میں پاس ہو گئے اس لئے ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی ہے تو جس پر حق تعالیٰ اطمینان نہ فرمائیں اسے کیسے اجر دیں؟ اسی طرح اور مقام پر ارشاد ہے:

رضی الله عنهم و رضوا عنه

اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی۔۔۔ جن کے دلوں میں کھوٹ ہو۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔

رضا بھی ایسی کہ اس کا اعلان کر دیا گیا اور اعلان قرآن حکیم میں کیا گیا تاکہ قیامت تک یہ اعلان جاری رہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں آسکتا کہ ان کا کھوٹ ثابت ہو۔ قیامت تک ان کی رضا کا پتہ دے دیا۔۔ غرض قلوب اور باطن کا پتہ یہ کہہ کر دیا کہ ہم نے ان کے قلوب کو جانچ لیا ہے۔

اور اعمال کا پتہ دوسری جگہ دیا۔ فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَه اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَماءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبتغونَ فَضلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضوَاناً.

تم انہیں دیکھو گے کہ رکوع اور سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رضا کی تلاش کر رہے ہیں۔ ہر حال میں اللہ کی طرف انابت اور رجوع ہے ان کے سجدوں کا اثر ان کی پیشانیوں پر آ گیا ہے تو ایک طرف عمل کو سراہا اور ایک طرف دل کو سراہا۔ ایک طرف ان کا مقام بتلا یا تو من حیث الطبقہ جس طبقے کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے۔ وہ صرف صحابہؓ کا طبقہ ہے بعد میں افراد آئے

رہیں گے۔ لیکن من حیث الطبقہ پورے طبقے کو سراہا گیا۔ اس کی تقدیس کردی گئی ہو۔ سوائے صحابہؓ کے دوسرا طبقہ نہیں ہے۔ اس لئے فرمادیا گیا

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم

میرے سارے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں جس کی روشنی میں چل پڑو گے۔ ہدایت پاجاؤ گے راستہ تمہیں مل ہی جائے گا کسی کا استثناء نہیں کیا۔۔۔ تو صحابہؓ امین ہوئے۔

وارثت نبوی کا استحقاق

اور گویا کہ صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کی پہلی روحانی اولاد ہیں پھر ان کی روحانی اولاد تابعین ہیں جنہیں وہ وراثت ملی پھر ان کی روحانی اولاد تبع تابعین ہیں۔ جنہیں وہ وراثت ملی ثم و ثم چلتے چلتے وہ فرقہ حقہ وہ اہل حق آج بھی ان کے اور حضور ﷺ کے کمالات کے وارث بنے تو ہماری عملی وراثت جب ہی قائم رہ سکتی ہے کہ ہمارے آباؤاجدلو کا سلسلہ نبی کریم ﷺ تک پہنچ جائے۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی کٹ گئی وراثت سے محروم ہو جائیں گے اس لئے کہ وراثت اسے ملتی ہے جس کا نسب محفوظ ہو اور نسب ہی محفوظ نہ ہو تو وراثت کا حق دار کہاں ہے؟ جس نے طبقہ صحابہؓ یا تابعین یا تبع تابعین سے تعلق نہ رکھا تو سوال یہ ہے کہ وہ دین اس تک پہنچا کیسے؟ وہ جو سلسلہ زنجیر کا آرہا ہے تھا اس کی کڑی ٹوٹ گئی تو دین کیسے پہنچا؟۔۔۔ وحی آنے سے رہی کیونکہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ عقلی اختراعات کا نام دین نہیں ہے نقل کا نام دین ہے اور منقول ہونے کے لئے سلسلہ کی ضرورت ہے اور سلسلہ میں سے ایک کڑی نکل گئی پھر دین کیسے پہنچا؟ تو لامحالہ الفاظ معانی ذوق اور استقامت قلب نیز تزکیہ نفس میں سلسلہ ماننا پڑے گا ساری چیزیں ہم تک منتقل ہو کر پہنچیں گی تب تک دین کا کمال ہم میں پیدا ہو گا سلسلہ کٹ گیا یا سلسلہ کے ذریعہ جو ہر چیزیں ہم تک پہنچ رہی تھیں ان میں سے ایک کڑی کٹ گئی۔ دین ناقص رہ جائے گا۔ تو وعدہ یہ کیا گیا ہے کہ دین کامل ہو کر باقی رہے گا اور سلسلہ ختم ہونے کے بعد سرے سے دین نہیں رہتا اور دین کے اجزاء میں سے کوئی چیز کٹ جائے تو کامل دین نہیں رہتا تو نبی کریم ﷺ کی تکذیب لازم آئے گی۔ اور آپؐ کا کلام اس سے بری ہے کہ کوئی اس کی تکذیب کرے۔

آفتابِ راہ اور راہ نما

بہر حال نبی کریم ﷺ آفتاب نبوت بن کر تشریف لائے دنیا میں عقائد و اعمال اور رسول کی جو ظلمات پھیل گئی تھیں آفتاب نبوت نے آکر ان سب کے پردے چاک کردیئے، دیگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام ستاروں کی مانند ہیں۔ ستارے سارے کے سارے نمودار ہو جائیں مگر رات زائل نہیں ہوتی اگرچہ روشنی پھیل جائے۔ آفتاب کی آمد کا جب قصہ شروع ہوا پو پھٹی تو ابھی آفتاب نکلا نہیں مگر رات غائب ہونا شروع ہو جاتی ہے تو تمام انبیاء علیہم السلام آئے انہوں نے دلوں میں دماغوں میں روشنی پھیلائی۔ لیکن رات ہی رات رہی مگر آفتاب نبوت طلوع ہوتے رات ختم ہو گئی اور دن نکل آیا اور ہر چیز جتنی دن میں واضح نظر آتی ہے رات میں نظر نہیں آتی تو توحید کے دقائق رسالت کے دقائق بلاشبہ

سارے انبیاء علیہم السلام نے سمجھائے۔ لیکن رات کے وقت روشنی میں آدمی اجمالی طور پر سمجھتا ہے۔ دن کی روشنی میں ایک ایک مخفی چیز نمایاں ہو جاتی ہے تو توحید و رسالت کے جتنے دقائق اس دین میں کھلے۔ پچھلے ادیان میں وہ حقائق نہیں نکلتے جتنے علوم و معارف توحید ورسالت کے اس دین نے واضح کئے دنیا کے کسی دین میں نہیں کھلے پچھلے انبیاء علیہم السلام نے نکتے کھولے مگر جتنی روشنی تھی اتنا اجمال سامنے آگیا جب روشنی پڑی تو چھپی چیزیں بھی کھل گئیں اور نمایاں ہو گئیں۔

غرض آپ کی ذات بابرکات آفتاب نبوت اور مشعل نور ہے کہ آپ کو سامنے رکھنا اس کی یہ دلیل ہے کہ حق واضح ہو گیا جو آپ سے اوجھل ہے۔ وہ ناحق ہے اور جو آپ میں روشن ہے وہ حق ہے تو راستہ قطع کرنیکی لئے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے روشنی بھیج دی۔ راہنما کی ضرورت تھی تو آپ کی سنتیں ہماری راہنما ہیں کہ نماز وجہاد ایسے کرو۔ گھریلو زندگی ایسے بسر کرو تو ایک ایک سنت ہمارے عمل ے لئے راہنمائی کرتی ہے تو جہاں راستہ کے لئے نور کی ضرورت تھی وہاں رہنما کی بھی ضرورت تھی۔

صراط مستقیم

اور صراط مستقیم اللہ کی روشن کتاب ہے۔ جس نے ایک لائن بچھادی ہے۔ جس پر آدمی دوڑتا ہوا اللہ تک پہنچ جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

القران حبل الله الممدود من السماء الى الارض

یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اس نے آسمان سے زمین تک لٹکادی ہے۔ تمہارا کام کیا ہے؟

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا

اللہ کی رسی کو تم مضبوط پکڑلو۔

جب یہ رسی کھینچی جائے گی تو اس کے ساتھ لپٹنے والے کھنچ کر اوپر پہنچ جائیں گے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن پہلے آسمان سے لے کر ساتویں زمین تک یہ سارا علاقہ جہنم کا ہوگا۔ جس میں آگ بھی تپے گی اور سارے سانپ بچھو وغیرہ ہوں گے۔

اور آسمان اول کے اوپر جنتیں ہوں گی۔ ویسے جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے لیکن قیامت کے دن اسے آسمان اول پر لاکر رکھیں گے اور آسمان بیچ میں ہوگا پانچ سو برس کی مسافت اس کا پل ہوگا جو کہ اعراف ہوگا۔ جس میں کچھ آثار جنت کے ہوں گے اور کچھ آثار جہنم کے ہوں گے تو یہ سارا جہنم کا علاقہ ہے جس میں ہم اور آپ پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ نے رسی لٹکائی جسے جہنم سے نکل بھاگنا ہو۔ اس رسی کو پکڑنے میں اسے کھینچنے والا ہوں جو اسے پکڑ لے وہ بھی آجائے گا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ کفار نے جو اللہ کی رسی کو نہیں پکڑا تو انہیں جہنم میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں وہ ہیں ہی جہنم میں۔۔۔ تو اللہ کی رسی ٹوٹ نہیں سکتی البتہ چھوٹ سکتی ہے تو غور کرتے رہنا چاہئے بیدار رہنا چاہئے کہ کہیں یہ رسی چھوٹ نہ جائے۔

اللہ کے باطن سے نکل کر اس کا کلام (رسی) آیا۔ جو اسے تھامے گا۔ باطن حق سے اس

کا تعلق قائم ہو گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

تبرك بالقرآن فانه كلام الله و خرج منه

قرآن پاک سے برکت حاصل کرو۔ کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔

حق تعالیٰ کا تبرک براہ راست دنیا میں جو موجود ہے وہ صرف اس امت کے ہاتھ میں موجود ہے کہ اس نے کلام کیا اور وہ کلام بعینہ ہمارے ہاتھ میں موجود ہے۔

ویسے تو زمین، آسمان، سورج وغیرہ سب کچھ اس کا تبرک ہے جن سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ مخلوق ہیں اور قرآن کو پیدا نہیں کیا یہ تو کلام ہے اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ جو اس کی صفت ہے، تو صفت کو موصوف پیدا نہیں کیا کرتا۔ صفت موصوف سے صادر ہوتی ہے۔ میں یوں نہیں کہوں گا۔ کہ میں اپنے کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ یوں کہوں گا کہ بول رہا ہوں یعنی کلام مجھ سے صادر ہو رہا ہے۔ سرزد ہو رہا ہے کہ جو چیز میرے اندر بھری ہوئی ہے وہ باہر نکل رہی ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ تو جو چیز اللہ سے صادر ہو رہی ہو۔ وہ اللہ سے منقطع نہیں ہو سکتی۔ اس کا سرا اوپر اللہ میاں سے لگا ہوا ہے نیچے کا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تھامو گے تو اللہ کی ذات تک رسائی ہو گی۔ اسی واسطے کثرت تلاوت سے جو ترقی ہوتی ہے اس سے ذات باری تعالیٰ سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری عبادات سے آدمی صفات خداوندی تک پہنچتا ہے، بہر حال یہ مسئلہ بہت طویل ہے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم اللہ کی ایک رسی ہے جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہے، وہ اس رسی کو مضبوطی سے تھام لے۔ غرض کتاب اللہ صراطِ مستقیم ہے۔ جس پر چل کر آدمی اللہ تک پہنچتا ہے۔

تو حضور ﷺ کی ذات مشعل نور، اور آپ کی سنتیں راہنما اور سیدھا راستہ کتابِ مبین اور چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔ اگر چلنے کا جذبہ ہے، تو راستہ روشنی مینارے، میل اور فرلانگ کے نشانات موجود ہیں، اور منزل بھی سامنے ہے اور اگر چلنے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے حق میں روشنی اور راستہ سب کچھ بیکار ہے۔ سنتیں اور واجبات بھی بے کار۔

؎ تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآن و حدیث کی طرف سے کوئی کمی اور کوتاہی نہیں ہے کمی اور کوتاہی چلنے والوں کی طرف سے ہے۔ یہ چلنا نہیں چاہتے ورنہ ادھر سے فیضان خداوندی موجود ہے۔

حصولِ مقصد کی شرائط

بہر حال میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے چار باتوں کی ضرورت ہے، ایک روشنی، راہ، ایک راستہ، ایک راہنما ہو جو مبصر اور دانا ہو۔ راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہو تو روشنی حضور ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ اور صراطِ مستقیم کتاب اللہ ہے جس میں کہیں ٹیڑھ کا نشان نہیں ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ

یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا' زیغ اور ٹیڑھ پن نہیں ہے' سیدھا سیدھا راستہ ہے۔
یہ فرمایا لَارَیْبَ فِیْهِ یہ نہیں فرمایا لا ریب فیھم کہ لوگوں کے اندر ریب (اور شک) نہیں جتنی کھٹک ہے وہ ہمارے ہی سینوں میں ہے' کتاب میں کوئی کھٹک نہیں مگر یہ کھٹک بھی کتاب ہی کی طرف رجوع کرنے سے زائل ہوگی۔ خود بخود زائل نہیں ہوگی۔۔۔ آپ اس انتظار میں رہیں کہ پہلے کھٹک زائل ہو جائے پھر کتاب اللہ کو پکڑوں ؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے بدن پر ناپاکی لگی ہوئی ہو اور دریا ہو سامنے اور یہ کہے کہ پہلے پاک ہو جاؤں۔ دریا کہے گا۔ بے وقوف! میرے اندر آ کے دیکھ' پاک بھی میں ہی کروں گا اس لئے اگر کسی کے دل میں زیغ اور کجی موجود ہے اور وہ اس کا علاج چاہتا ہے تو اس میل کو دھونے کے لئے کتاب و سنت ہی ذریعہ ہے۔

لٹریچر کی کثرت کا نقصان

زیغ تربیت اور تزکیہ نفس سے ہٹے گا اس کے لئے شخصیت کی ضرورت پڑے گی شخصیتوں کی طرف رجوع کئے بغیر محض کاغذ لٹریچر اور کالے نقوش سے کام نہیں چلے گا۔ آج ہم لٹریچر کتنا ہی اکٹھا کر لیں ہزاروں کتابیں شائع کر دیں لیکن جب تک نفس کی تربیت نہ ہو تو جو کتاب جس کے آگے جائے گی جب ذہن بنا ہوا نہیں تو الٹے ذہن سے الٹی بات سمجھے گا۔ یہ سیدھے ذہن سے دیکھے گا۔ سیدھی بات سمجھ میں آئے گی اور ذہن عموماً نا تربیت یافتہ ہیں۔ اس لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ لٹریچر کی کثرت عموماً مسلمانوں کو مضر پڑ رہی ہے۔ وہ فقط کاغذ کے بندے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اہل حق کی طرف رجوع نہیں کرتے بس کتابچہ دیکھ لیں گے۔ تو کتابچوں سے دین تھوڑا ہی آتا ہے' دین تو صحبت اہل اللہ اور صحبتِ صلحاء سے آتا ہے۔

مرکزِ علم شخصیت ہے اور کتاب علامت

اسی واسطے جب کسی عالم کو علم کو جانچتے ہیں۔ اس سے یہ پوچھا کرتے ہیں ؟ کہ تمہارا استاد کون ہے ؟ اور اس کا استاد کون ہے ؟ سلسلہ کیا ہے ؟ یعنی سند پوچھی جاتی ہے۔۔۔ اگر دیکھتے ہیں کہ سند بڑے بڑے علماء کی ہے تو سمجھتے ہیں کہ مستند عالم ہے۔ یوں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ نے کون سی کتاب پر پڑھا تھا۔ اگر تو مطبع مجتبائی کی چھپی ہوئی تھی۔ تب تو آپ بڑے عالم ہیں' اگر کسی اور مطبع کی تھی تو آپ گھٹیا درجہ کے عالم ہیں' کیونکہ وہ کتابیں غلط چھاپتا تھا اس کا کاغذ اچھا نہیں ہوتا تھا تو عالم کا علم کاغذ اور کتاب سے نہیں پہچانا جاتا۔ روشنائی کی عمدگی سے نہیں پہچانا جاتا۔ اس سے پہچانا جائے گا کہ اس کا معلم کیسا تھا۔ اس میں دین تھا یا نہیں' ابن سیرین فرماتے ہیں کہ :

ان ھذا العلم دین فانظر و اعمن تاخذوا دینکم

یہ علم تمہارا دین ہے۔ تو جس سے دین سیکھو پہلے اسے بھی دیکھ لو اس میں بھی دین ہے یا نہیں' اس لئے کہ دین سینوں سے آتا ہے' سفینوں سے نہیں آتا۔
کتاب تو درحقیقت نقوش اور علامات ہیں۔ ان نقوش اور علامات کے حقائق سینوں کے اندر موجود

ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا:

بَل هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ اُوتُوا العِلمَ

یہ آیات بینات اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

انہوں نے اس ریاضت و مجاہدہ اور امانت و دیانت سے سینوں میں لیا ہے۔ کتابوں کی سند نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے کون سی کتاب چھپی تھی اور اس سے پہلے کون سی۔ یہ دیکھیں گے کہ اسے کس نے پڑھایا اور اسے کس نے پڑھایا۔ تو محدثین سندوں میں شخصیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ کتابوں کو پیش نہیں کرتے اس لئے مرکز علم شخصیت ہوتی ہے کتاب نہیں کتاب علامت ہوتی ہے جس سے وہ علم موجود رہے اور غلطی کے وقت کتاب کی طرف رجوع کریں۔

آدابِ طریق

اس لئے محض کتابوں اور پمفلٹوں سے اگر ہم دین حاصل کریں۔ کبھی دین حاصل نہیں ہوگا۔ دس رائیں پیدا ہوں گی۔ یہی وجہ ہے جو کتاب دیکھتا ہے اس کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے۔ یہ جو ہو رہا ہے کہ ہر آدمی کہتا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اب اسے کون سمجھائے کہ آیت کا مطلب سمجھنے کے لئے کچھ اصول موضوعہ بھی ہیں اور کچھ مقدمات بھی ہیں۔ وہ تو نے حاصل نہیں کئے۔ چاہتا یہ ہے کہ سارے مطالب میں سمجھ لوں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے اقلیدس کی شکل حل کرنے کے لئے ایک دیہات کا گنوار یہ کہے کہ مجھے اقلیدس کی اڑتالیسویں شکل سمجھادو۔ آپ اسے پوچھیں گے کہ اصولِ موضوعہ تجھے یاد ہیں؟ وہ کہے گا کہ وہ تو میں نے نہیں پڑھے۔ علوم متعلقہ تجھے یاد ہیں؟ کہ یہ بھی نہیں پڑھے۔ تو استاد کہے گا میں سمجھاؤں کس طرح؟ جب مبادی تیرے ذہن میں نہیں تو مقاصد کس طرح ذہن میں ڈالوں غرض علم کے لئے بہت سے مبادی اور مقدمات کی ضرورت ہے اور وہ کتاب و سنت میں ہیں۔ وہ مقدمات ذہن میں ندارد و نتیجہ سمجھنے کے لئے آجائے اور بحث کرنے کے لئے تیار اب کس طرح سے ان کو سمجھایا جائے تو لٹریچر کی زیادتی سے یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ دس ہزار آدمی ہیں تو مسئلہ کے اندر دس ہزار رائیں ہیں پھر ہر ایک اپنی رائے پر جمود کئے ہوئے ہے کہ اسے ہی مانو یہی امر حق ہے یا پھر مجھے سمجھادیں۔ اور جو چیز سمجھ میں نہ آئے۔ چاہے اسی کے نقصان فہم کی وجہ سے سمجھ میں نہ آئے وہ سمجھتا ہے کہ مسئلہ ہی غلط ہے جو میں سمجھتا ہوں وہ صحیح ہے۔

اس لئے علامات قیامت میں فرمایا گیا ہے کہ:

اعجاب كل ذى راى برايه

ہر شخص کو اپنی رائے پر اتنا اصرار اور جمود ہوگا کہ وہ اسے وحی خداوندی سمجھے گا کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اپنی رائے کے اوپر ایک گھمنڈ اور اتراہت اور مرادات واضح ہوں گی۔ پھر خود بخود اپنا کھوٹ اپنے اوپر کھل جائے گا۔ تو حضور علیہ السلام کی روشنی میں انسان سب سے پہلے اپنا کھوٹ دیکھتا

ہے۔اس کھوٹ کو زائل کر کے محبت اور اتباعِ کتاب سے اپنے اندر نورانیت پیدا کرتا ہے اطاعت کے لئے نبی کی سنتیں درکار ہیں تو سنن نبوی ہمارے عمل کے لئے راہنمائی کرتی ہیں اور حضور ﷺ کی ذات روشنی پہنچاتی ہے اور سیدھا راستہ کتابِ مبین ہے اب ضرورت ہے چلنے کی تو چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔اگر ہم ہی نہ چلیں تو کتاب وسنت کا کوئی قصور نہیں۔گھر بیٹھے ہی ایک رائے قائم کرلیں تو کتاب وسنت پر وہ رائے عائد نہیں ہوسکتی اسی واسطے دین کے اندر مطیع و متادب بنکر چلنے کی ضرورت ہے۔

وسائلِ علم کا اَدب

دین کی بنیاد اَدب کے اوپر ہے۔
؎ بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

جب ادب نہیں تو دین کبھی حاصل نہیں ہوگا۔دین کی بنیاد تادب پر ہے اللہ کا ادب۔اللہ کے رسول کا ادب، کتاب اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، اہل علم کا ادب، اور وسائل علم کا ادب جب تک نہ ہو دین نہیں آسکتا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ جو واقعی آیت من آیات اللہ تھے اور اس زمانے میں قدیم محدثین کا ایک نمونہ اللہ نے علم و درایت وتفقہ اور عمل کے لحاظ سے پیدا کردیا تھا نے خود ایک دفعہ فرمایا۔بات تو بڑی چھوٹی سی ہے مگر جب آدمی کرے تو اس پر استقامت بڑی مشکل ہے۔فرمایا۔

"پانچ برس کی عمر سے جب سے میں نے ہوش سنبھالا اور آج میری عمر ساٹھ برس کی ہے کسی دینی کتاب کو میں نے بے وضو ہاتھ نہیں لگایا"۔

یعنی قرآن کے بارے میں نہیں۔حدیث کی کتاب ہو فقہ کی ہو اصول فقہ کی ہو جس پر دینی فن کا اطلاق آجائے فرمایا اسے میں بے وضو ہاتھ نہیں لگاتا اتنا ادب تھا تو حضرت شاہ صاحب بن گئے بے ادب کا مقام تھوڑا ہی ہے کہ وہ شاہ صاحب بن جاتے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا :

يٰاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَرفَعُوٓا أَصوَاتَكُم فَوقَ صَوتِ النَّبِى وَلَا تَجهَرُوا لَه بِالقَولِ كَجَهرِ بَعضِكُم لِبَعضٍ اَن تَحبَطَ اَعمَالُكُم وَاَنتُم لَاتَشعُرُونَ

"اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند مت کرو۔کیونکہ یہ بے ادبی ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی آواز سے اپنی آواز کو غالب بنانا چاہتے ہیں تو یہ گستاخی ہے ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں۔

معلوم ہوا کہ اعمال کی بقا ادب کے ساتھ ہے اگر بے ادبی ہوگی تو عمل حبط وضبط ہو جائیں گے کوئی اجر نہیں ملے گا۔

حضرت فاروق اعظمؓ خلقی طور پر جہری الصوت (بہت بلند آواز) تھے جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسجد نبوی میں آہستہ بولنے لگے تھے کہ لوگ ان کی باتوں کا کان لگا کر سنتے تھے، کہتے تھے کہ

میری آواز بلند نہ ہو کہ میرے عمل اللہ کے ہاں حبط کر لئے جائیں۔۔۔ غرض یہ کہ ادب سکھلایا گیا۔۔۔ اسی طرح فرمایا گیا:

لَا تَجعَلُوا دعَاءَ الرَّسول بَیْنَکُمْ کَدُعَاءِ بَعضِکُم بَعضاً

رسول کو اس طرح مت پکارو۔ جس طرح آپس میں بے تکلف ایک دوسرے کو پکار دیتے ہو۔ بلکہ ادب وعظمت اور احترام کے ساتھ پکارو۔

بعض صحابہؓ نے یا محمد کہہ کر پکارا۔۔۔ تو تنبیہ فرمائی گئی یا رسول اللہ یا نبی اللہ کہہ کر پکارو۔ نام لے کر مت پکارو۔

رعایتِ مقام

خود حق تعالیٰ شانہ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو نام لے لے کر پکارا ہے اور حضور اکرم ﷺ کو آپ کے القاب سے پکارا۔

یٰاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُم بِاَسْمَآئِهِم
یٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ
یٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ
یٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ
یٰعِيسٰى اِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ
یٰمُوسٰى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي

غرض ہر نبی کا نام لے پکارا۔۔۔ اور حضور ﷺ کو جو خطاب فرمایا تو کہیں یا محمد نہیں

یَاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ یَا اَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِن رَّبِّکَ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ

منصب کے لقب لئے جاتے ہیں۔ تاکہ حرمت واحترام واضح کر دیا جائے۔ اور نمونہ بتلا دیا جائے کا نام لے کر کوئی نہ پکارو۔ خطاب خداوندی سے پکارو۔ رسول و نبی آپ کا خطاب ہے۔ حبیب اللہ آپ کا خطاب ہے۔۔۔ تو جب حق تعالیٰ شانہ جن کے حضور ﷺ پیدا کئے ہوئے ہیں وہ احترام فرمائیں گویا اپنی بنائی ہوئی چیز ان کے نزدیک اتنی اعلیٰ ہے کہ خود بھی احترام فرما رہے ہیں تو ہماری اور آپ کی کیا مجال ہے کہ ہم بے حرمتی سے پیش آئیں۔ اگر بے حرمتی سے پیش آئیں گے تو عقائد و عمل اور دین بھی حبط۔۔۔ غرض اللہ کے رسول کا ادب بتلایا گیا۔

کتاب اللہ کا ادب بتلایا گیا

لَا یَمَسُّه اِلاَّ الْمُطَهَّرُون

کتاب اللہ کو چھوئیں۔ صرف وہ لوگ جو طہارت حاصل کر چکے ہوں؛ وضو اور غسل جنابت کئے ہوئے ہوں۔ جو پاک ہوں وہ ہاتھ لگائیں تو کتاب اللہ، رسول اللہ، بیت اللہ اور مساجد کا ادب بتلایا۔

لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ مساجد میں جمع ہو گئے ادھر ادھر کی بات چیت شروع کر دی تو

اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمَ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِي خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْ خُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ

اس سے زیادہ بد قسمت و بد بخت کون ہے جو مساجد میں ذکر اللہ کرنے والوں رو کے اور مساجد کو ڈھائے۔

ایک مسجد کی صورت ہے جو اینٹ پتھر ہے۔ان کے ڈھانے کا یہ مطلب ہے کہ عمارت گرادے اور ایک مسجد کی حقیقت ہے جو ذکر اللہ ہے اگر کوئی ذکر اللہ پر پابندی عائد کردے اور مخل بن جائے تو اس نے مسجد کی حقیقت کو ڈھادیا۔ دنیا کی باتوں سے ایسے مخل بن جائے کہ دوسرا نفلیں نہ پڑھ سکے زور زور سے دنیا بھر کی خرافات کر رہے ہیں۔ دوسرے کی تلاوت میں خلل پڑ رہا ہے۔ یہ حقیقت مسجد کو ڈھادینا اور گرادینا ہے ان لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں تھا بلکہ ان لوگوں پر واجب تھا کہ مسجد میں خوف وودہشت زدہ اور ڈرتے ہوئے داخل ہوئے کہ یہ دربار خداوندی ہے نہ یہ کہ بے ادبی گستاخی لاپرواہی اور لاابالی پن سے داخل ہوتے۔

اسی طرح اولیاء اللہ کا ادب بتلایا گیا کہ اللہ کے جتنے اولیاء ہیں۔ انکی عظمت و حرمت کو ملحوظ رکھا جائے۔

حدیث میں فرمایا گیا'

من صلی خلف عالم تقی فکانما صلی خلف نبی

جس نے کسی متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبیؐ کے پیچھے نماز پڑھی تو ربانیوں کی توقیر اور ادب بتلایا گیا۔ بہر حال علم کا ادب وسائل واشخاص علم کا ادب بتلایا گیا۔ ادب کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا۔۔۔ جس قوم کے اندر جسارت اور بے ادبی ہوگی۔ وہ دین سے محروم رہے گی۔

صاحب ہدایہ نے ایک قطعہ لکھا ہے۔

فساد	کبیر	عالم	متهتك
واكبر	منه	جاهل	متنسك
هما	فتنه	في العالمين	كبيرة
لمن	بهمافي	دينه	يتمسك

وہ عالم فساد کبیر ہے جو بے ادب اور گستاخ ہو وہ دنیا کو بے ادبی کے راستہ پر ڈال دے گا تو عالم میں مفسدہ پھیلا رہا ہے اور اس سے بڑا مفسد جہالت کے ساتھ من گھڑت طریقوں پر عبادت کرے۔ کہ جس راستہ پر چاہا بے سند چل پڑا۔ بے سند رسوم اختیار کیں۔ بدعات میں مبتلا ہو گیا۔ یہ جاہل بھی بے ادب عالم سے زیادہ فساد کبیر ہے جو جہالت سے عبادت کرے۔ مسئلہ اور فتویٰ نہ پوچھے۔ ایسا عالم اور جاہل یہ دونوں عالم کے اندر فتنے ہیں اور اس شخص کے لئے بھی فتنہ ہیں جو ان سے اپنے دین کا تمسک کرے اور انہیں اپنا راہنما بنائے۔ وہ بھی فتنہ میں گرفتار ہو جائے گا۔

عالم کا جوہر

عالم کا جوہر یہ ہے کہ اس میں ادب ہو۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنَ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

خوف خدا اور خشیۃ اللہ عالم ہی کے اندر ہوتا ہے جتنا جس میں علم ہے۔ اتنا ہی اس میں خشیت ہے۔ جتنا علم سے کورا ہے۔ اتنا ہی اس میں بے خوفی ہے اور نڈر ہے تو بنیادی چیز ادب ہے۔ دین اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک ادب نہ کیا جائے۔ اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہم بارگاہ رسالت کے اندر ادب اختیار کریں کہ حضور ﷺ کا نام لیں تو درود شریف پڑھیں۔ نام مبارک آئے تو کہیں ﷺ۔

ایک تو رسمی درود ہے کہ ہم نے ایک طریقہ باندھ لیا کہ بیٹھ کر پڑھو' درود شریف ہے۔ یہ تو ایک رواجی چیز ہے اور ایک یہ ہے کہ جب اللہ کے رسولؐ کا نام آئے تو درود پڑھے بغیر نہ رہے ﷺ ضرور کہیں حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ :

اس سے زیادہ بخیل کوئی نہیں جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے۔

اس لئے سب سے بڑی چیز ادب ہے اور حضور ﷺ کی اطاعت و اتباع ہے۔ اطاعت نام کو نہ کرے اور ادب کا مدعی بنے تو وہ "عشق سعدی تا بزانو" ہے عشقِ حقیقی نہیں۔ اس لئے کہ جب ادب اور عظمت ہوئی ہے تو اطاعت اس کے لئے لازم ہوتی ہے۔

بہر حال ان وسائل کا ادب اور تادّب لازمی ہے ورنہ اس کے بغیر عمل نہیں ہو سکے گا۔ یعنی راستہ پر آپ نہیں چل سکیں گے۔ یعنی راہ روکی جو قید تھی تو اس کے لئے یہ تین چیزیں ہیں کہ روشنی رلا راہ اور ساتھ میں راہنما۔ تو راہ رو بھی ہونا چاہئے۔ تو اس میں شرط یہ ہے کہ متادب بن کر چلے اللہ کے راستہ میں سینہ ابھار کر نہ چلے۔ گردن جھکا کر چلے گا تو سر بلند کیا جائے گا اور سینہ ابھار چلے گا تو پٹخ دیا جائے گا۔

من تواضع لله رفعه الله

جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا۔ اللہ سے بلند رکھیں گے۔

عبادت کا مفہوم اور اگر چلے گا تو اس کے لئے دوسری چیز فرمائی گئی ہے :

الكبرياء ردائى والعظمة ازارى فمن نازعنى فيهما قصمتة.

کبریائی اور تکبر میری چادر ہے۔ عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا اس کی گردن توڑ دوں گا۔ میں اس کو نیچا دکھا دوں گا۔ تواضع کرے گا تو اونچا ہوگا۔ اینٹھے گا تو نیچا ہوگا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

پستی سے سر بلند ہو اور سرکشی سے پست
اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

ابھر کے چلتا ہے تو گرا دیتے ہیں۔ گر کر چلتا ہے تو اٹھا دیتے ہیں تو اس راہ کے اندر گردن جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ وہ اور راہ ہوگی جس میں آپ اکڑ کر چلیں۔

ہاں اگر وہ خود ہی ہمیں کہیں کہ اکڑ کر چلو پھر ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ انہوں نے حکم دیا :

لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا

خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ اور فرماتے ہیں:

اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الارض لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلاً

اے اکڑ کر چلنے والے! تو جو اینٹھ کر چل رہا ہے تو سینہ ابھار کر گردن اکڑا اکڑ کر چل رہا ہے تو تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالے گا۔ آسمان کو نہیں پہنچ سکے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا جتنی میں ہے پھر کیوں اس مصیبت میں مبتلا ہے۔ اکڑ کر کہیں اوپر پہنچ جاتا تو ٹھیک تھا۔ اکبر (لسان العصر) نے خوب کہا ہے۔ ؎

تعجب ' نخوتِ اہلِ زمیں پر مجھ کو آتا ہے
یہ کیوں اس پر اکڑتے ہیں کہ جس میں مر کر گڑنا ہے

جس چیز کے پیٹ میں سرنگوں ہو کر اور سر کے بل جانا ہے اس پر سر کو ابھارنا دانائی اور دانشمندی کے خلاف ہے اس لئے حکم دیا کہ اکڑ کر نہ چلو۔

لیکن اگر ہمیں حکم دیں کے اکڑ کر چلو جیسا کہ جس طواف کے بعد سعی ہوتی ہے تو اس کے ابتدائی تین پھیروں میں حکم ہوتا ہے کہ اکڑ کر چلو، ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ ؎

گر طمع خواہد زمن سلطان دین
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اگر بادشاہ یوں کہے کہ لالچی بنو تو ہم لالچی بن کر دکھائیں گے پھر ہمیں قناعت کی ضرورت نہیں اگر اللہ میاں یوں کہیں کہ تم لالچی بنو تو سو دفعہ لالچی بنیں گے پھر قناعت کے سر پر خاک ڈالیں گے۔

وَفِی ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ

جنت کے بارے میں حریص بننا چاہئے کہ ایک دوسرے پر حریص بن کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خوب لالچ کا مظاہرہ کریں۔ قناعت اگر کرنی ہے تو دنیا کے مال میں کرو۔ ہوسنا کی چھوڑ دو لیکن آخرت کی نعمتوں کے بارے میں ہوسناک بنو۔ کسی حد پر نہ ٹھہرو۔

جنت کی نعمتوں میں علم اور معرفت بھی ہے اس لئے فرمایا کہ:

منہو مان لایشبعان طالب العلم و طالب الدنیا

"دو بھوکوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ طالب علم اور طالب دنیا کا"۔

اما طالب العلم فیزداد رضی الرحمن واما طالب الدنیا فیتمادی فی الطغیان

طالب علم جتنا بڑھے گا رضا خداوندی بڑھتی رہے گی اور دنیا کی طلب میں جتنا بڑھے گا۔ سرکشی اور تمرد بڑھتا رہے گا تو جہاں قناعت کرنی ہے وہاں قناعت کرے۔ جہاں لالچی بننا ہے وہاں لالچی بنے۔ اور دونوں حکم خداوندی کے تابع ہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ بندہ وہ ہے جو فرمان خداوندی کے تابع ہو۔ بندگی اور عبدیت کے یہی معنی ہیں کہ جس وقت جو حکم دیں اسے انجام دے۔ اگر وہ یوں حکم دیں کہ نماز پڑھو تو نماز پڑھنا

عبادت بن جائے گا اور اگر یوں کہیں کہ ہرگز مت پڑھو۔ تو نماز کا چھوڑ دینا عبادت بن جائے گا پانچوں وقتوں میں حکم دیا کہ نماز پڑھو۔ تو نماز پڑھنا عبادت اور تین وقتوں میں حکم دیا کہ ہرگز مت پڑھو۔ طلوع، غروب اور استواء آفتاب کے وقت۔ اس وقت نماز پڑھے گا تو گناگار ہوگا۔ کوئی ثواب نہیں ملے گا۔۔۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ نماز چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے جو کہہ دیں وہ کرو۔

حکم دیا کہ روزے رکھو۔ بہت اچھا۔ بس یہ عبادت ہے۔ عید کے دن حکم دیا کہ خبردار اگر روزہ رکھا تو گناہ گار ہوگے۔ افطار واجب ہے اس سے معلوم ہوا کہ نہ روزہ رکھنا عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت ہے۔ کہے کا ماننا عبادت ہے۔

خود کشی حرام کر دی۔ خون مت بہاؤ اسی طرح دوسرے کا بھی خون نہ بہاؤ۔ فرمایا:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ.

جس نے مسلمان کو عمداً قتل کیا۔ اس کی جزاء جہنم ہے۔

گویا قتل کرنا عظیم الشان معصیت ہے اور جہاں وہ فرمائیں کہ خوب قتل کرو۔ وہاں وہ عبادت ہے۔ چنانچہ جہاد میں جائے تو سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خون بہادے تو معلوم ہوا کہ نہ خون کا بہانا معصیت نہ چھوڑنا معصیت کہنا نہ ماننا معصیت ہے اور ماننا اطاعت ہے۔ ہر چیز میں یہی اصول کارفرما ہے۔

فطرت اور شریعت

اسلام معتدل مذہب ہے جسے اسپرنگ پالیسی کہتے ہیں وہ ہے اسلام میں دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے کہیں ادھر کا حکم دیتے کہیں ادھر کا حکم دیتے ہیں۔ علی الاطلاق کسی چیز کو معصیت نہیں قرار دیا۔

ایسے ہی "جھوٹ بولنا" بلاشبہ معصیت ہے۔ گناہ کبیرہ ہے بلا توبہ کے معاف نہیں ہوتا لیکن انسان میں مبالغہ آمیزی کا ایک طبعی جذبہ ہے کہ جھوٹ بات بھی کہہ جاتا ہے۔ زور کلام میں بعض دفعہ غلط چیزیں بھی کہہ جاتا ہے۔۔۔ اس جذبے کو بھی شریعت نے پامال نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ محفوظ رکھو اگر کہیں نوبت آئے اور ہم اجازت دیں تو ضرور جھوٹ بول لینا۔

چنانچہ فرمایا اگر دو بھائیوں میں لڑائی ہو رہی ہو۔ تلواریں کھنچ چکی ہوں۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو۔ تم جھوٹ بول کر صلح کرا سکتے ہو تو کرا دو۔ تمہیں جھوٹ بولنے میں وہ اجر ملے گا جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے۔۔۔ آپ نے ایک بھائی سے جا کر یہ کہا۔

"کہ بھائی تم کس سے لڑ رہے ہو وہ تو رات تمہاری بڑی تعریفیں کر رہے تھے اور رو رہے تھے کہ میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا"۔

اس نے نے کہا اچھا! میرے بھائی کے دل میں اتنی گنجائش ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ بڑا دشمن ہے۔۔۔ کہا آپ نے بالکل غلط سمجھا۔

دوسرے سے بھی جا کر یہ کہہ دیا کہ تم کس سے دشمنی کر رہے ہو وہ تو رات بھر تمہارا

ذکر کرتے رہے اور جدائی کا افسوس کرتے رہے۔

اس کی دشمنی بھی ڈھیلی ہو گئی۔ اس کی بھی ہو گئی دونوں نے صبح مصافحہ کیا۔ حالانکہ آپ نے جھوٹ بولا تھا۔ اس جھوٹ پر آپ کو وہ اجر ملے گا جو آپ کو اطاعت وعبادت پر ملتا۔۔۔ اگر سچ بول دیں اور اس سے فتنہ پھیلے تو وہ سچ حرام ہے۔ اسی لئے غیبت حرام ہے۔ غیبت سچ بولنے ہی کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ غیبت کی تعریف یہی ہے کہ کسی کی واقعی برائی کو اس کی پشت پیچھے بیان کرے۔ اگر جھوٹی بات کہی تو وہ افتراء ہے تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ کیونکہ فتنے کا ذریعہ ہے اور وہ جھوٹ بولنا ضروری ہو جاتا ہے اس لئے کہ رفع فتنہ کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح دھوکہ دینا مکر و فریب بہت بڑی چیز ہے۔

لیس منا من غشنا

وہ ہم میں سے ہے ہی نہیں جو دھوکہ بازی کرے۔

لیکن فرماتے ہیں الحرب خدعۃ جہاد میں دھوکہ دینا بھی جائز ہے۔ وہاں جا کے یہ عبادت بن گئی تو دھوکہ دہی کے جذبے کو شریعت نے پامال نہیں کیا۔ مگر اپنے کنٹرول میں رکھا ہے۔ جہاں ہم کہیں استعمال کرو۔ جہاں روکیں رک جاؤ۔ اس لئے کہ تم ہمارے بندے ہو۔ اپنے نفس کے بندے نہیں ہو کہ وہ تمہارا نفس چاہے وہ کرو۔ نہیں جو ہم چاہیں وہ کرو نفس کو پیچھے پھینکو۔

تو جھوٹ، مکر و فریب یہ یقیناً معصیت ہیں اور انسان کے ضمیر کے اندر یہ معصیتیں رکھی گئی ہیں۔ جھوٹ بولنے کا انسان کے قلب میں ایک کونہ ہے اور مکر و فریب کا بھی ایک کونہ ہے۔ غیض و غضب اور حسد کا بھی ایک کونہ انسان کے دل میں ہے تو شریعت اس لئے نہیں آئی کہ پیدائشی مادوں کو زائل کر دے یا ختم کر دے بلکہ اس لئے آئی ہے کہ مصرف بتا دے اور ٹھکانے لگا دے۔

غصہ کا جذبہ ہے۔ اس کو شریعت نے پامال نہیں کیا اگر غصہ نہ ہو تو آپ جہاد کیسے کریں گے؟ اگر جوش اور جذبہ نہ ہو تو باطل کے مقابلہ میں آپ کیسے آئیں گے؟ اگر سارے ہی ٹھنڈے ہو جائیں تو ملک کی حفاظت کون کرے گا۔ فوجی طاقت بھی تو ہونی چاہئے اور کبھی کبھی اس کا مظاہرہ بھی تو چاہئے تاکہ فتنوں کا استحصال ہوں۔ اس لئے غصہ بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔ اس کو پامال نہیں کیا۔ یہ کہا کہ جہاں ہم کہیں وہاں استعمال کرو۔ جہاں ہم نہ کہیں وہاں ٹھنڈے بن جائیے۔ جہاں بے مصرف استعمال کرو گے۔ گناہ گار بنو گے۔ جہاں مصرف صحیح میں استعمال کرو گے نیکو کار بن جاؤ گے۔ غرض کوئی جذبہ جسے ہم برے سے برا سمجھیں اسے شریعت نے ختم نہیں کیا۔ ہاں ٹھکانے لگایا ہے۔ یہی معنی ہیں دین فطرت کے کہ کسی قوت کو زائل نہیں کیا بلکہ ہر قوت کے مصارف بتلا دیئے۔ تو اپنی قوت کا استعمال کرنا یہ فطرت ہے، مصارف کا بیان کرنا شریعت کا کام ہے۔ اس لئے فطرت کو پامال نہیں کیا۔

دینِ فطرت کی عجیب تعبیر

اگر انسان ان قوتوں کو کھو دے تو انسان ہی باقی نہیں رہے گا۔ پھر شریعت پر عمل کون کرے گا۔ ان چیزوں کے

مجموعے ہی کا نام انسان ہے۔

ہاتھ اور پیر کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ اگر ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دیں تو شرعی اعمال کون انجام دے گا؟ اگر پیر کو کاٹ کر پھینک دیں تو بیت اللہ اور مسجد میں کون جائے گا۔ ان اعضاء کو صحیح رکھ کر ہی دین پر صحیح عمل ہو سکتا ہے۔

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ قوتوں اور اعضاء کو زائل کر دو یہ دین ہے کسی جوگی نے ہاتھ اٹھایا اور برس دن اٹھائے رکھا۔ حتی کہ وہ خشک ہو گیا۔ تو اس قوت کو زائل کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دین دار بن گئے۔ تو تذیب جسمانی کا نام دین نہیں ہے۔ تہذیب روحانی کا نام دین ہے یہ جب ہو گی جب جسم کو استعمال میں لگاؤ۔

عمل کرو۔

تو ہاتھ کاٹ دینا یا مٹا دینا یہ دین نہیں ہے۔ ہاتھ کو شریعت کے مطابق صحیح مصرف میں استعمال کرنا یہ دین ہے۔ فرمایا گیا:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده

مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

تو یہ دین ہے کہ ہاتھ کو مار پٹائی کے لئے استعمال کرو۔ مگر مومن کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔ سچے کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔ جھوٹے کے مقابلے میں مجرم کے مقابلے میں استعمال کرو۔ تو اگر ہاتھ کی قوت زائل کر دی تو مجرم کے اوپر ہاتھ اٹھانے والا کون ہو گا؟ دین دار بن کر سارے لنجے بن جائیں گے۔ غرض شریعت اسلام دین فطرت ہے اور دین فطرت کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی قوت کو پامال نہ کیا جائے۔ ہر قوت کا صحیح مصرف بتلایا جائے۔ تو غصہ، جھوٹ، دھوکہ اور جذبہ اطاعت اور تواضع کا بھی مصرف بتلایا۔ سب چیزوں کے مصارف کو متعین کرنا یہ شریعت کا کام ہے اور ان ساری قوتوں کے حقوق ادا کرنے کا نام اسلام ہے کسی ایک قوت کو آپ کھو دیں اس کا حق ادا نہ کریں۔ اسی حد تک آپ کا اسلام ناقص ہو گیا۔ دین ناقص ہو گیا۔

ان ساری چیزوں کے مجموعے کو جناب نبی کریم ﷺ نے عملاً کر کے دکھلا دیا۔ ہاتھ یوں اٹھاتے ہیں چلتے یوں ہیں۔ غصہ یوں کرتے ہیں۔ مہربانی یوں کرتے ہیں۔ محبت کا یہ طریقہ، عداوت کا یہ طریقہ ہے۔ ان ساری سنتوں کو راہنما بنا کے اپنی اندرونی قوتوں کو استعمال کی کیجئے۔ نمونہ نبی کا سامنے ہو۔ جذبہ آپ کے اندر ہو تو آپ کا دین کامل و مکمل ہو جائے گا بہر حال راہ رو کے اندر رہروی کی طاقت ہونی چاہئے۔ اگر اسمیں طاقت موجود ہے تو راستہ بھی موجود ہے۔ راستے کی علامتیں بھی موجود ہیں۔ روشنی بھی موجود ہے۔ راہنما بھی موجود ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خلل جتنا ہے وہ راہ رو کے اندر ہے۔

راہ دکھلائیں کیسے راہ رو منزل ہی نہیں

جود و عطا

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ روزانہ آسمان دنیا پر حق تعالیٰ کی تجلیات اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ جیسا ہاتھ ان کی شان کے مناسب ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ

انا الملك من ذالذی یدعونی
انا الغافر من ذالذی یستغفرنی
انا الرازق من ذالذی یسترز قنی

میں بادشاہ ہوں کوئی ہے مانگنے والا؟
میں مغفرت کرنے والا ہوں کوئی ہے بخشش طلب کرنے والا؟
میں رزق دینے والا ہوں کوئی ہے رزق طلب کرنے والا؟

یعنی بندے کو تکلیف نہیں دی تو اتر کر آسمان پر آ۔ اپنی تجلیات سے عرش سے آسمان دنیا پر نزول فرمایا۔ جو آپ کا آسمان ہے تو بجائے آپ کو تکلیف دیتے کہ اوپر چڑھو۔ خود بادشاہوں کا بادشاہ نیچے آتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے۔

اور ہاتھ پھیلانا سائل کا کام ہے۔ مگر یہاں دینے والا ہاتھ پھیلا رہا ہے کہ مانگو کون مانگتا ہے؛ صبح صادق تک یوں ہی آوازیں لگتی رہتی ہیں جن کو اللہ نے توفیق دی ہے اٹھتے ہیں تہجد پڑھتے ہیں گڑ گڑاتے ہیں۔ مانگتے ہیں۔ ان کو منہ مانگی مرادیں ملتی ہیں جو محروم القسمت ہیں وہ پڑے رہتے ہیں۔ رعایت و سہولت پھر آسانی کتنی کر دی۔ تہجد کو ہی دیکھو کہ حضور ﷺ سے بارہ رکعات بھی ثابت ہیں آٹھ بھی اور چار رکعات بھی ثابت ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو بھی پڑھ لیں تو بھی آپ تہجد گزار ہیں بلکہ ایک حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر اخیر شب میں اٹھنا ذرا بھاری ہو تو عشاء کی سنتوں کے وتروں سے پہلے دو یا چار رکعات تہجد کی نیت سے پڑھ لیں وہ بھی تہجد ہی شمار ہوگا۔ یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اخیر شب میں تہجد پڑھی۔

بلکہ حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن ایک شخص حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو کہ عمر بھر تہجد پڑھا۔

ملائکہ عرض کریں گے۔ یا اللہ اس نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ کیسے لکھ دیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب یہ سونے کے لئے لیٹتا تھا تو نیت کرتا تھا کہ آج ضرور اٹھوں گا۔ مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ تو آنکھ نہ کھلنا یہ اس کے قبضے کی چیز نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے تھا یہ تو نیت کر لیتا تھا اور

نیة المرء خیر من عمله

آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے؛ جب عمر بھر روزانہ نیت کرتا تھا تو لکھ دو کہ روزانہ تہجد پڑھتا تھا۔ پوری عمر کا اجر و ثواب (باوجود سوئے رہنے کے اس کو) مل جائے گا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی نہ پڑھے تو کم از کم سوتے ہوئے نیت ہی کر لیا کرے کہ اللہ میاں آج ضرور اٹھوں گا۔ یہ دوسری چیز ہے کہ اگر آنکھ کھل جائے تو تہجد پڑھ لو۔ اگر آنکھ نہ کھلے گی تو نیت کے لحاظ سے تہجد گزار بن جاؤ گے تو اس سے زیادہ آسانی اور کیا چاہتے ہو۔ نیت کرنے میں ہلدی لگی نہ پھٹکری۔ نہ پیسہ نہ دھیلہ مفت کا ایک ثواب۔ اتنی بھی کوئی کوشش نہ کرے۔ تو اس محروم القسمتی کا کسی کے

پاس کیا علاج ہے۔ بلکہ آدمی ہر خیر کی نیت کرے۔

انوار السنن

اچھا خیر کی نیت بھی نہ کرو یہ جو روزانہ فرائض کے علاوہ اعمال انجام دیتے ہو۔ مثلاً بازار جا رہے ہو۔ سودا خرید رہو۔ کپڑا لا رہے ہو۔ دنیا بھر کے کام کرتے ہو اگر ان کاموں میں یہ نیت کر لو کہ حق تعالیٰ کے انعامات ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ انعام کا استعمال کرو تو میں تعمیل حکم الٰہی کے واسطہ یہ چیزیں خرید رہا ہوں۔ تو وہی اجر ملتا ہے شروع ہو جائے گا جو عبادت کے اوپر ملتا تو ذرا سی نیت کے پھیر سی آدمی چاہے تو عادت کو عبادت بنا لے اور ذرا سے غفلت اور بے فکری سے عبادت کو چاہے عادت بنا لے کہ بے اجر ہو کر رہ جائے۔ تو جب اللہ نے عادتوں پر بھی اجر رکھا ہے اور اس میں نیت کافی ہو جاتی ہے تو وہ آدمی بڑا محروم ہے کہ نیت ہی نہ کر پائے۔ جس پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی محنت نہیں بس ذرا سی فکر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب آدمی ایسا بھی کیا ہو کہ شتر بے مہار بن جائے کہ اسے نیت کرتے بھی تعجب ہو کہ میں خود بھی آزاد اور میری فکر آزاد۔ تو پھر آزادی کے ساتھ جنگل میں چلے جانا چاہئے۔ شہر میں کیوں رہے۔ کسی بھی چیز کا پابند کیوں رہے۔

تو سنن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اتنی آسان ہیں کہ ان میں اگر آدمی ذرا فکر کرے تو محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اور اجر و ثواب کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ لیکن

ے　اگر تو ہی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

خود اگر ارادہ نہ کرو تو اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ لقمان حکیم کے پاس بھی اس کی دوا نہیں یہ ایسا لاعلاج مرض ہے۔

تو میرے بزرگو!

سب سے پہلے ادب اور عظمت پیدا کرو۔ دین کی اہل دین کی اور وسائل دین کی۔ اس کے بعد اپنی نیت صحیح کرو۔ نیت کی صحت کے ساتھ جذبہ رکھو کہ اپنے پیغمبر کی سنتوں کا اتباع کریں گے جو نور حضور ﷺ کی سنتوں میں ہے وہ نور اور برکت تمہارے بنائے ہوئے نمونوں میں نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ ہاں میں کہتا ہوں کہ مشائخ طریقت ہی بنائیں وہ ان کے حال کی بات ہو گی۔ لیکن نقالی جب کریں تو رسم پیغمبر کی کریں گے۔ اس لئے کہ رسم پیغمبر سے بہتر کوئی رسم نہیں ہو سکتی۔ جو طرز کلام حضور ﷺ کا ہے اس میں جو نور ہے وہ کسی کے طرز کلام میں نہیں ہو سکتا۔ تو انوار و برکات اہل اللہ کے کلام میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کے عمل میں بھی لیکن

ع　از تودہ کلاں بردار

جب اٹھانا ہی ہے تو بڑے ڈھیر میں سے اٹھاؤ۔ جس سے اونچے پہنچو تو اصل چیز نبی کریم ﷺ کی سنت کا اتباع ہے۔

آثارِ محبت

تو محبت کا جذبہ رکھو اور محبت کے ساتھ اطاعت کا جذبہ رکھو۔

حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں:

من احبنی فقد اطاعنی و من اطاعنی کان معی فی الجنة

"جس نے میرے ساتھ محبت کی وہ میری اطاعت ضرور کرے گا اور جو میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا"۔

معلوم ہوا کہ محبت کا ثمرہ لازمی اطاعت ہے اگر اطاعت اور تابع سنت نہیں ہے تو دعوی محبت باطل ہے، نیز عاشق دعوی نہیں کیا کرتا۔ عاشق تو عمل کرتا ہے جو کہتا پھرے کہ میں فلاں کا عاشق ہوں لوگ کہیں گے جھوٹا ہے مکار ہے عاشق کہیں دعوی کرتے پھرتے ہیں۔ عشق کی اولین منزل ترک دعوی ہے کہ دعوی نہ رہے فنائیت محضہ ہو جائے اور جو مدعی بنا ہوا ہے تو مدعی اپنی بقا کا قائل ہے اس میں فنائیت کہاں؟

غرض عاشق کے لئے دعوی کہاں؟ سب سے پہلی چیز عاشق کے لئے ترک دعوی ہے، اس لئے اگر کوئی عاشق رسول ہے تو اس کی علامت یہ ہے۔

کہ دعوی نہ ہو کہ میں عاشق رسول ہوں۔ بلکہ نادم ہو کہ جتنا عشق کرنا چاہئے تھا نہیں کر سکا۔ اور اس عشق کو اطاعت سے پہچانا جائے گا۔ اس لئے کہ آپؐ نے خود فرمایا کہ:

من احبنی فقد اطاعنی

"جو میرے ساتھ محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا"۔

تو محبت کی علامت اور اس کے ظہور کا طریقہ فی الحقیقت اطاعت ہے جیسا کہ ایمان کی علامت عمل صالح ہے تو ایمان نام محبت ہی کا تو ہے۔

لایومن احد کم حتی اکون احب الیه من ولده ووالدیه والناس اجمعین

"کوئی شخص تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کو میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت نہ اپنے نفس سے ہو اپنے اہل وعیال اور ماں باپ سے ہو"۔

اور اس کا پتہ چلتا ہے جب مقابلہ پڑتا ہے کہ ایک طرف اللہ ہے اور ایک طرف اولاد ہے کس کو اختیار کروں؟

جو محب اور مومن ہو گا وہ یقیناً اللہ کو ترجیح دے گا۔ اولاد کو ترک کر دے گا۔

حدیث میں واقعہ آتا ہے کہ جب غزوہ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبرؓ کے ایک صاحبزادے ایمان نہیں لائے تھے وہ کفار کی صف میں تھے اور صدیق اکبرؓ ادھر تھے۔۔۔ جب غزوہ بدر ختم ہو گیا اور وہ صاحبزادے ایمان لے آئے تو ایک دن انہوں نے صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ اے باپ! اس جنگ (بدر) میں کئی مرتبہ اس کی نوبت آئی کہ آپ ٹھیک میری زد کے اوپر آ گئے اور میں چاہتا تیر پھینکتا یا تلوار لگاتا تو یقیناً آپ کو ختم کر دیتا۔ مگر دل میں خیال آیا کہ میرا باپ ہے میں بیٹا ہو کر باپ پر حملہ کروں۔۔۔؟ یہ اس نے کہا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

اس غزوہ میں تو میری زد میں نہیں آیا۔ اگر آ جاتا تو خدا کی قسم سب سے پہلے تیرے گلے

پر تلوار چلاتا۔ اس لئے کہ تو میرا بیٹا نہیں تھا۔ جب تو دشمن رسول بن گیا تو میں دشمنان رسولؐ سے مقابلہ کررہا تھا۔ آل اور اولاد کا وہاں کیا کام؟

تو محبت خداوندی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب اللہ اور رسولؐ کا مقابلہ دوسری چیزوں سے پڑ جائے تو صدیق اکبرؓ ایمان اور محبت رسولؐ کے مقابلہ میں بیٹے کو ختم کردینا چاہتے تھے تو محبت دو باتوں سے پہچانی جاتی ہے ایک یہ کہ دعویٰ ترک کردے۔ دوسرے محبوب کا اتباع کرے۔ اتباع بھی نہ ہو اور مدعی بھی ہو۔ وہ جھوٹا دعویٰ ہے۔ حقیقی دعویٰ نہیں ہے۔ اس لئے دعویٰ بھی ترک کیجئے نیت بھی اپنی صحیح کیجئے۔ عشق رسولؐ ہے تو سنت رسولؐ کی پیروی کیجئے۔

اسوۂ حسنہ

اگر جناب رسول ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور نمونہ جامع ہے جیسا کہ آپ خود دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ نے جامع رسول ہمارے پاس بھیجا۔ زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس کا نمونہ عمل نہ دکھلایا ہو تو آپ کو ہر گوشہ زندگی میں دیکھنا چاہئے کہ میرے رسولؐ نے یہ فعل کس طرح انجام دیا۔ اگر غمی ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ میرے رسولؐ نے یہ غمی کس طرح انجام دی۔ آج تیجے دسویں اور چالیسیوں کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح اگر شادی ہو تو میرے رسولؐ نے کس طرح شادی کی۔ آیا اسی طرح سے برداریوں کے اندر نوید پھیری تھی۔ اسی طرح بڑھ چڑھ کر مفاخرت کی دعوتیں کی گئیں تھیں تو خوشی ہو یا غمی ہر چیز کے اندر مومن اور مسلم کی پہلی نگاہ اس پر جانی چاہئے کہ میرے رسول پاکؐ نے کس طرح کرکے دکھلایا تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز میں تو آپ رسول کی اطاعت کریں شادی بیاہ میں نہ کریں۔ موت اور غمی میں نہ کریں۔ یہ چیزیں آپ کے اختیار میں تھوڑا ہی دی گئیں۔ یہ چیزیں تو اہم چیزیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ معمولی معمولی چیزیں بھی آپ کے اختیار میں نہیں دی گئیں۔ لباس پہننا بھی آپ کے اختیار میں نہیں دیا گیا۔ آپ پابند ہیں کہ اسی نمونے کے مطابق پہنیں جو اللہ کے رسول کا نمونہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ کرتہ پہنو تو دایاں ہاتھ پہلے دائیں آستین میں ڈالو پھر۔ بایاں ہاتھ بائیں آستین ڈالو۔ تو سنت طریقہ یہ تھا کہ دایاں ہاتھ پہلے ڈالو اور بایاں بعد میں ڈالو۔ آج موجود تہذیب کے مطابق بایاں پہل ڈالتے ہیں اور محب رسول اور عاشق تو ہوتا ہے جو لباس پہنے تو سمجھے کہ میں سنت کی مطابق کررہا ہوں۔ یا سنت کے خلاف کررہا ہوں۔ محبوب کے طرز عمل پر چل رہا ہوں۔ یا اپنے نفس کو محبوب بنا رکھا ہے۔ اس کے نمونے پر چل رہا ہوں۔ تو اس میں بھی آپ آزاد نہیں ہیں۔

فرمایا گیا جب رات کو سوتے وقت لباس اتارو تو اسے زمین پر یا فرش پر ویسے نہ ڈالو دو تین تہہ کرکے رکھو یا لوپر ٹانگو۔ فرماتے ہیں:

اطووا ثیابکم ترد الیھا ارواحا

کپڑوں کو لپیٹ کر رکھوں۔ کپڑوں میں ارواح ہوتی ہیں۔ کپڑے کی ایک روح ہے۔ اگر وہ

نکل گئی تو کپڑے کی برکت جاتی رہے گی۔ پہننے کا حظ اور لذت ختم ہو جائے گی تو معلوم ہوا کہ لباس اتار کر رکھنے میں بھی آزاد نہیں۔ ایک طریقہ ہمیں بتلا دیا گیا ہے۔

نیند کا مسنون طریقہ اسی طرح ہم سونے میں بھی آزاد نہیں سونے کے چار ہی طریقے ہیں یا آدمی الٹا لیٹ کر سوئے یا چت لیٹ کر سوئے یا دائیں کروٹ پر یا بائیں سوئے۔ الٹا لٹک کر یا کھڑے کھڑے نہیں سو سکتا۔ اس لئے یہی چار طریقے متعین ہیں۔

تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اوندھا لیٹ کر سونا مکروہ ہے۔ شریعت نے اسے پسند نہیں کیا۔

حضرت ابوہریرہؓ مسجد نبوی میں الٹے لیٹے ہوئے تھے آپؐ نے پیر سے ٹھوکر ماردی اور فرمایا:

یا جندب یا جندب ان هذا ضجعة اهل النار

"یہ اوندھا لیٹنا جہنمیوں سے مشابہت ہے"۔

اہل جہنم اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ جہنمیوں سے مشابہت پیدا کرے۔ اس لئے اوندھا لیٹنا ناپسند کیا اور مکروہ قرار دیا۔

کوئی شخص چت لیٹے تو جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ ضعیفوں کی سی ہیئت ہے۔ بیمار آدمی ہو تو چت پڑا رہتا ہے۔ ایسے ہی جو بے قابو گرتا ہے تو چت گرتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ فلاں پہلوان نے پچھاڑ دیا اور وہ چاروں شانوں چت گرا یوں نہیں کہتے کہ چاروں شانوں پٹ گرا۔ تو چت گرنا بے قابو ہونے کی علامت ہے ضعیفوں کی سی ہیئت بنانے کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ فرمایا گیا:

المومن القوی خیر من المومن الضعیف

"قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے بہادر مسلمان بزدل مسلمان سے بہتر ہے"۔

بزدلی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی بہادری جمع ہوتی ہے تو ضعیفوں اور بے قابو لوگوں کی سی ہیئت بنانا پسندیدہ نہیں۔

اب رہا بائیں کروٹ پر لیٹنا یہ بھی جائز ہے مگر شریعت نے کچھ نامناسب سمجھا ہے کہ اس واسطے کہ بائیں جانب قلب ہے جب آپ بائیں رخ پر لیٹیں گے تو قلب کو سکون ملے گا اور جتنا زیادہ سکون ملے گا نیند گہری آئے گی اور جتنی گہری نیند آئے گی۔ آپ گھوڑے بیچ کر سوئیں گے۔ پھر نہ نماز کی فکر رہے گی' نہ تہجد کی۔ نہ قیام لیل کی تو اس سے عبادت کے نظام میں خلل پڑے گا۔ عبودیت کے اندر فرق پڑے گا تو نومِ غریق (گہری نیند) کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چوکنا سونا شریعت نے پسند کیا ہے۔ اس واسطے یہ بھی ناپسند ہے۔

اب ایک یہی طریقہ رہ جاتا ہے یعنی دائیں کروٹ پر لیٹنا۔ یہی سنت ہے نبی کریم ﷺ کی اور دائیں کروٹ پر جب آدمی لیٹے گا تو قلب بائیں جانب ہے وہ معلق رہے گا۔ جب معلق رہے گا تو گہری نیند کبھی نہیں آئے گی۔ چوکنا نیند آئے گی۔ اس وقت جو ارادہ کر کے سوئے گا جبھی آنکھ کھلے گی تو میں کہتا ہوں کہ ہم سونے میں بھی آزاد نہیں آپ سمجھتے تھے کہ یہ ایک عادت کی چیز ہے۔

طبعی چیز ہے طبعیات پر بھی شریعت نے آداب عائد کر دیئے ہیں ہم تو سونے میں بھی پابند ہیں چہ جائیکہ شادی اور غمی میں آزاد ہو جائیں۔ چہ جائیکہ رسوم میں آزاد ہو جائیں تو لباس اور سونے کے اندر بھی قانون شریعت لاگو ہے

رسوم و خیالات اور قانون شریعت

حتی کہ ہمارے خیالات کے اوپر بھی یہ قانون لاگو ہے کہ خیالات میں بد بھی دل کے اندر نہ لاؤ۔ فکر بھی صحیح ہو عقیدہ بھی صحیح ہو قلب پاک چیز ہے پاک ظرف ہے اس کے اندر پاک چیزیں بھرو۔ ناپاک چیزیں مت بھرو۔ تو ہمارے قلب پر بھی قانون شریعت عائد ہے۔

سلاطین دنیا کا قانون بدنوں پر عائد ہوتا ہے اس لئے کہ بدن تک ہی ان کی رسائی ہے ہمارے قلب اور قلبی خیالات کو وہ نہیں جان سکتے لیکن جو عَلِیمٌ بِذَاتِ الصدور ہو دلوں کی کھٹک سے واقف ہو اس کا قانون تو دل پر بھی عائد ہو گا۔ وہ دل کی حرکت کو بھی دیکھ رہا ہے تو ضروری ہوا کہ تنہائی میں بیٹھ کر بد فکری بھی نہ کریں۔ خیالات فاسدہ بھی نہ لائیں۔ وساوس بھی سوچ سوچ کر نہ لائیں۔ غیر اختیاری طور سے آ جائیں تو بلا سے آ جائیں۔۔۔ تو جب قلوب کے خیالات، لباس، سونا اور جاگنا سب میں پابند ہیں۔ تو ہم دنیا اور معاشرہ کے اہم امور سے کیسے آزاد ہو جائیں گے۔ ان میں بھی ہم پابند رہیں گے۔ شادی ہو گی اس میں دیکھنا پڑے گا کہ نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہؓ کی شادیاں کس طرح سے ہوئیں۔ غمی ہو گی تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ حضور ﷺ اور حضرات صحابہؓ نے غمی کے وقت میں کیا کیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم بیان کر کے روؤ۔ بلکہ فرمایا:

ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ

''تم بیان کر کر کے روتے ہو اس سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے''۔

اور وہ عذاب یہ نہیں ہوا کہ جہنم میں ڈال دیا جائے۔ بیان کرتے ہوئے جب یوں کہاں جاتا ہے کہ واجبلاہ واکذاہ ہائے تو تو پہاڑ جیسا تھا۔ ہائے تو تو سونے جیسا تھا۔ تو ملائکہ چوکے لگتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ تھے۔ آپ واقعی ایسے عظیم تھے۔ یہ جو طعن کا طرز ہوتا ہے۔ یہ برچھے سے زیادہ آدمی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو یہاں ہم بیان کر کے مناقب بیان کرتے ہیں۔ وہاں عذاب دیا جارہا ہے۔ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اگر بڑے سے بڑا غم پیش آجائے تو صبر کرو۔ تحمل سے کام لو۔ عمل کے نظام میں خلل نہ پڑے۔ رونا اور رونے کو لے کر بیٹھنا اور ماتم کرنا یہ بزدل عورتوں کا کام ہوتا ہے۔ مردوں کا کام نہیں ہے کہ رو رو کر گزاریں۔ بڑے سے بڑا صدمہ آئے تو مضبوط قلب ہو کر رہے۔ ماتم کے کیا معنی؟ تو رونے کا جب وقت آئے تو آپ اس وقت بھی شریعت کو دیکھیں گے کہ میرے نبی نے کیا کیا۔ آنکھوں سے رونا جائز ہے۔ بیان کر کر کے اور نوحہ کر کے رونا یہ ناجائز ہے۔

ترکِ سنت وبال

غرض شادی ہو، غمی ہو، چلنا ہو پھرنا ہو، اٹھنا ہو بیٹھنا ہو، سونا ہو جاگنا ہو راہنما اس میں سنت بنے گی اگر سنت کو ترک کر دیا جائے اور حدیث کو

قطع کر دیا جائے تو زندگی بنتی نہیں۔ قرآن تو دستور اساسی ہے۔ دستور اساسی سے معاشرہ تھوڑا ہی بنا کرتا ہے جب تک اس کا بیان کر کے اس کی جزئیات سامنے نہ آئیں اور بیان شدہ چیزوں میں سے استنباط کر کے سارے پہلو نہ کھول دیئے جائیں۔ تو عمل کی ہیئت نہیں بن سکتی اصول اور کلیات سے عمل تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔ عمل جزئیات سے ہوتا ہے جزئیات جب نکلتی ہے جب کلیات میں سے نکالی جائیں اور کلی کا بیان کیا جائے تو بیان رسول کو اگر قطع کر دیا۔ تو کلیات ہی کلیات رہ جائیں گی عمل ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقط قرآن پر اکتفا کرنے والے فی الحقیقت کام چوروں کی جماعت ہے۔ اس لئے کہ نہ انہیں عمل مقصود اور نہ عمل کی محنت اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں لوگ پکا مومن سمجھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ حدیث کا رشتہ (قرآن حکیم سے) قطع کر دو۔ نہ ہوگا نہ عمل کی ضرورت پیش آئے گی۔ قرآن سے جتنا ہمارا جی چاہا کر لیا۔ جتنا جی نہ چاہا نہ کیا اس لئے میں نے عرض کیا کہ سنت راہنما ہے جناب رسول ﷺ کی ذات اقدس ایک روشن مینار ہے جس سے اللہ تک پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے اور آپ کی سنتیں اس پر راستہ پر چلنے کی راہنمائی کرتی ہیں اور وہ راستہ کتاب اللہ ہے جو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اور چلنے والے آپ ہیں۔ اگر آپ میں طاقت ہے تو آپ چلیں گے اور طاقت نہیں ہے، یا آپ پیدا بھی نہیں کرنا چاہتے تو چلنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اس کا الزام کتاب وسنت پر نہیں آئے گا۔ چلنے والوں کی کوتاہی پر آئے گا۔

نور اور کتاب یہی چند چیزیں ہیں جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا

قَدْ جَاءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

حق تعالٰی نے بشارت سنائی کہ تمہارے پاس نور آگیا۔ اللہ کی جانب سے آیا ہے۔ معاذ اللہ کوئی بنا ہوا نہیں کسی نے افترا کر کے کہہ دیا ہو کہ میں نور ہوں۔ بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نور تمہارے پاس پہنچ گیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ نور سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات عالی ہے جو روشنی راہ ہے اور آگے فرماتے ہیں کہ فقط روشنی نہیں آئی کتب مبین بھی آئی جو سیدھا راستہ ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

"یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو۔۔۔ یہ ایک ہی راستہ ہے۔۔۔ سبل متفرقہ پر مت چلو"۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتدع اور متبع سنت کی کچھ علامتیں ہیں بدعت پسند کی علامت ہمیشہ مجادلہ اور بدکلامی ہے۔ اور متبع سنت کی علامت ہمیشہ سلامتی اور سادگی کے ساتھ مسئلہ بیان کرنا ہے۔ حدیث میں آپ فرماتے ہیں۔ جس قوم میں بدعت کا زغہ پیدا ہو گیا۔ جدال، مجادلہ بدگوئی و بدکلامی اور جھگڑا اس کے اندر ضرور آجائے گا۔ اشتعال انگیزی اور فساد پھیلانا اس کا وطیرہ ہوگا اور جو سنت پر قائم ہوگا۔ وہ نبی کا طریقہ پیش کر دے گا۔ نہ اس میں جذبات کی ضرورت ہے نہ برا کہنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال روشنی اور سیدھا راستہ نور اور کتاب مبین سے مراد ہیں۔ آگے فرماتے ہیں:

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَه سُبُلَ السَّلٰمِ

اللہ اسے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ سلامتی کے راستے اس کے سامنے کھلتے ہیں۔ جو اس کی رضا کی پیروی کرے اور چاہتا ہو کہ اللہ راضی ہو جائے۔

اسلام قانون نہیں دین ہے ایک تو یہ ہے کہ محض رسمی طور پر اسلام کو ایک لاء اور قانون کی طرح سمجھ کر اس پر چلیں تو یاد رکھئے اسلام لاء اور قانون نہیں ہے۔ دین ہے۔ قانون اور دین میں فرق یہ ہے قانون روکھی دفعات کا نام ہے اور دین وہ ہے جس میں محبت او عشق بھی شامل ہو تو اسلام قانون نہیں ہے بلکہ دین ہے تو دین کے اندر طریق ثواب بھی ہو گا طریقِ عشق بھی ہو گی محبت بھی ہو گا اور قلب کے جذبات بھی ہوں گے اس لئے فرمایا کہ رضا کا طالب ہو۔ قانون پر اس لئے بھی چلتے ہیں کہ نہیں چلیں گے تو پٹائی ہو گی نہیں چلیں گے تو جیل پہنچ جائیں گے۔ کچھ جان کا خوف اور کچھ اپنے منافع پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ لیکن دین پر محض اس لئے چلتا ہے کہ میرا اللہ راضی ہو۔ محبوب کی رضا کے لئے اطاعت اور پیروی کرتا ہے اور جو رضا نہیں چاہتے تو فرمائیں گے کہ ہم اس سے راضی ہونا نہیں چاہتے۔ ہم تو غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ہیں محتاج تو تم ہو جب تم راضی نہیں ہونا چاہتے تو ہم کیوں راضی ہوں؟

نورِ علم و اخلاق

مقصد اور نصب العین کیا ہے؟

يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

تاکہ اللہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور میں لے آئے

اس سے معلوم ہوا کہ نور سے مراد حسّی نور ہیں ہے۔ یہ پہلے سے بھی موجود تھا۔ سورج بھی روشن تھا۔ چاند بھی روشن تھا۔ اس میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟۔۔۔ وہ معنوی نور ہے اور معنوی ہی ظلمت مراد ہو گی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ حضور ﷺ نور ہیں۔ معنوی نور ہیں حسی نور نہیں ہیں۔ وہ معنوی نور جس سے اچھائی اور برائی میں تمیز ہو۔ وہ علم کامل اور عدل واخلاق ہیں جس پر نبوّت کی بنیاد ہے۔

نبی علم وحی سے لئے کر آتے ہیں اور اخلاق کاملہ اپنی فطرت اور اللہ کے دین سے پیش کرتے ہیں تو اخلاق کا نور علم کا نور یہ دونوں چیزیں پیش کرتے ہیں علم کے نور میں حدّت اور شدّت ہوتی ہے اور اخلاق کے نور میں رفعت اور رافت ہوتی ہے۔۔۔ اس لئے کہ علم اللہ کا ہے علم میں ترفع کا خاصہ ہے۔ عالم کبھی گردن جھکا کر نہیں رکھتے علم ہمیشہ اسے اونچا لے جائے گا۔ رفعت کی طرف لے جائے گا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بعض دفعہ تکبر پیدا ہو جاتا ہے بعض دفعہ نخوت پیدا ہو جاتی ہے بعض دفعہ غرور اور گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے تو علم کے گھمنڈ کے لئے بدرقہ عبدیت ہے اور عبدیت نہیں آتی جب تک کسی شخصیت کے آگے آدمی پامال نہ ہو۔

پیش مرد کاملے پامال شو

تو علم رفعت دکھلاتا تھا اور شخصیتوں کے آگے جھکنا تواضع سکھلاتا تھا ان دونوں کو جب

ملایا تو وقار بھی جمع ہو گیا۔ تواضع بھی پیدا ہو گئی علم سے وقار آتا ہے۔اور شخصیتوں کے آگے جھکنے سے قلب میں تواضع پیدا ہوتی ہے اگر علم نہ ہو اور شخصیتوں کے آگے جھکے تو ذلت نفس پیدا ہو گی جس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے اور اگر محض علم ہو اور شخصیتیں سامنے نہ ہوں تو کبر اور نخوت کا دروازہ کھل جائے گا۔اس لئے جو اہل شخصیتوں سے وابستہ نہیں وہ عموماً متکبر ہوتے ہیں اور جو علم سے وابستہ نہیں۔ مگر شخصیتوں سے وابستہ ہیں۔اس میں ذلت نفس پیدا ہو گی۔

علم بلا شخصیت

اور دونوں کی مثالیں دو قوموں میں موجود ہیں یہود کی امت ایک علمی امت ہے تورات ان کو دی گئی۔جس کے بارے میں ارشاد ہے:

تَفْصِيْلاً لِكُلِّ شَيْءٍ

"ہر چیز کی تفاصیل بیان کی گئیں"۔

لیکن اہل تورات نے شخصیتوں سے اجتناب کیا انبیاء علیہم السلام سے وابستگی کو کم کیا۔ان کی توہین کی۔ان کو قتل کیا۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَاتَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ.

انبیاء علیہم السلام کی بے حرمتی کی اور کہا کہ وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی کتاب اللہ (تورات) ہمارے لئے کافی ہے۔جب تورات موجود ہے، ہم اس کو سمجھیں گے اور چلیں گے۔نبی کی ضرورت کیا ہے۔ تو شخصیتوں کا دامن چھوڑ دیا تو محض کتاب کا علم ان کے لئے نخوت و ترفع اور استکبار کا ذریعہ بن گیا۔یہ متکبر قوم ہے جو نخوت شعار ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا

ہم اپنی آیتیں پھیر دیں گے۔اس قوم سے جو زمین کے اندر متکبر بنی ہوئی ہے۔جس کا کام نخوت شعاری کبر اور ترفع ہے کہ اس ترفع اور تکبر نے ان کے قلب کا ستیاناس کر دیا۔قلب کے رخ کو غلط کر دیا ہے اور اس درجہ کجی اور زیغ پیدا کر دیا ہے کہ جب ہماری کوئی آیت سامنے آتی ہے تو ایمان نہیں لاتے جب سیدھی راہ سامنے آتی ہے تو کبھی اس راستہ پر نہیں چلتے اور جب کبھی کوئی غی طغیانی یا کجی کا راستہ آتا ہے تو فوراً چل پڑتے ہیں سنت پیش کرو نہیں چلتے۔بدعت پیش کرو فوراً چل پڑتے ہیں۔بہر حال یہود کو متکبر کہا گیا اس لئے کہ فقط کتاب کو اختیار کیا اور شخصیتوں کو ترک کر دیا۔

شخصیت بلا علم

نصاریٰ کی امت یہ عملی امت ہے اس کو علم زیادہ نہیں دیا گیا۔انجیل میں احکام زیادہ نہیں ہیں۔ یہ فی الحقیقت تصوف کی کتاب ہے۔اس میں تزکیہ نفوس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے انہوں نے شخصیتوں کو اتنا پکڑا کر کتاب کو چھوڑ کر

شخصیتوں کو خدا کا قائم مقام بنادیا۔
مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہا بعضوں نے اللہ کہا:

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ

انہوں نے اپنے علماء اور صوفیاء کو رب بنادیا خدا بنادیا تو اس درجہ شخصیتوں کا دامن پکڑا پھر جھکتے جھکتے ذلت نفس پیدا ہوگئی۔ اور شرک میں گرفتار ہوگئے تو ان سے علم چھوٹ گیا اور شرک آگیا۔ یہود میں شرک نہیں تھا تو تکبر پیدا ہوگیا تو فقط کتاب ہوگی تو تکبر پیدا ہوگا۔ فقط شخصیت کی پیروی ہوگی تو ذلت نفس پیدا ہوگی اور کتاب و شخصیت کو ملادو تو وقار کے ساتھ تواضع للہ پیدا ہو جائے نہ کبر رہے گا نہ ذلت نفس باقی رہے گی۔ تو امت مسلمہ نے یہ دونوں چیزیں سنبھال لیں ایک طرف اہل اللہ کا دامن پکڑتی ہے اور ایک طرف کتاب وسنت کا دامن پکڑتی ہے۔ دونوں چیزوں کو ملا کر چلتی ہے تو وقار بھی ہے خودداری بھی ہے اور تواضع للہ بھی ہے۔

حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

لقد تتبعون سنن من قبلکم شبرا بشبر باعا بباع ذراعا بذراع حتی لو دخل احدا. الخ

اے مسلمانو! تم لوگ پچھلی امتوں کی خوب پیروی کروگے۔ بالشت بالشت بھر، ہاتھ ہاتھ بھر، دو دو ہاتھ بھر یعنی حقیر سے حقیر چیزوں میں اور بڑی سے بڑی چیزوں میں۔ حتی کہ اگر پچھلی امتوں میں سے کوئی سوارخ میں گھسا ہوگا جو فعل لغو اور عبث ہے تم میں بھی ایسے پیدا ہوں گے جو یہ فعل لغو اور عبث کریں گے۔

عرض کیا یارسول اللہ! وہ پچھلی امت کون سی ہے؟

فرمایا وہی یہود ونصاریٰ

غرض فرمایا گیا کہ تم یہود ونصاری کی پیروی کروگے۔ عبادات میں، اعتقادات میں، معاشرت میں، معشیت میں، گھریلو زندگی میں، اجتماعی زندگی میں ہو بہو پیروی کروے گے۔ حتی کہ صورتوں شکلوں اور معنویت میں بھی ان کے پیرو بنے ہوئے ہوگے۔۔۔ تو یہود ونصاری کے دو نزغے بیان کئے۔ ایک متکبر لت ہے، جس نے کتاب کو لے کر شخصیتوں کو چھوڑ دیا۔ ایک عیسائیوں کی ضال اور گمراہ لت ہے۔ جنہوں نے شخصیتوں کو لے کر کتاب کو چھوڑ دیا تو لت میں بھی دونوں نمونے موجود ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ کو ہاتھ میں لے کر چلتا ہے۔ سلف و آئمہ اور علماء سب کو ترک کرتے ہیں۔ نحن رجال وهم رجال ہم بھی آدمی وہ بھی آدمی۔ ضرورت کیا ہے کسی کے سامنے جھکنے کی کتاب موجود ہے تو بلا شبہ ان کا دعوی تو صحیح کیا مگر فقط کتاب کا اثر یہ ہے کہ استکبار اور جود نیز رفعت وترفع کی شان ان میں پیدا ہوگی۔

ایک طبقہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کتاب اللہ کیا ہے ہم نہیں جانتے کہ بخاری اور مسلم کیا ہے۔ یہ جو اہل اللہ اور اہل کمال شخصیتیں ہیں یہی ہمارے لئے کتاب ہیں۔ یہی ہمارے لئے طریقہ ہیں۔ جو یہ کہیں گے ہم وہ کریں گے۔

شریعت وطریقت کا مابہ الامتیاز

ظاہر بات ہے کہ نبی کے بعد اہل اللہ میں سے معصوم کوئی نہیں۔۔۔اور معصوم نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ گناہ کرتے ہیں۔ یعنی دینی اعمال میں بہت سی چیزیں غلبہ حال میں ایسی سرزد ہوتی ہیں کہ حقیقتاً صحیح ہوتی ہیں۔ مگر ظواہر شریعت کے خلاف ہوتی ہیں۔ مغلوب الحال جو ہوئے۔۔۔اگر فقط شخصیتوں کی پیروی رہ جائے اور کتاب وسنت کے اصول سامنے نہ ہوں توان کے احوال سے جو ان کی حرکتیں سرزد ہوئی ہیں ان میں بھی پیروی کریں گے، تو گمراہ ہوں گے۔ منصور نے اگر وجد میں آ کر "انا الحق" کہہ دیا اور منصور کی ہر چیز شریعت بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا انا الحق کہے کہ میں بھی خدا ہوں۔ حالانکہ وہ غلبہ حال میں ایک کلمہ سرزد ہوا تھا۔ نہ یہ اصول ہے تو شریعت قانون کلی کا نام ہے اور طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ قانون کلی تو ہر کس و ناکس کے لئے پیغام ہوتا ہے اور شخصی احوال دوسرے کے حجتہ نہیں ہوتے ہر ایک کی شخصی حالت الگ الگ ہے۔ اگر منصور نے انا الحق کہا تو میرے لئے فرض نہیں ہے کہ میں بھی انا الحق کہوں۔ ہاں اگر وہ حال میرے اندر پیدا ہو جائے پھر غیر اختیاری طور پر میں کہہ دوں تو پھر کسی کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر حال نہ ہوا اور ان کی وجدی حرکات کی نقالی کروں تو یہ محض رسوم کی پیروی ہے۔۔۔ بہر حال ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے کہ اس نے کہا کہ اصل کتاب ناطق تو یہ اہل اللہ ہیں ہم نہیں جانتے کہ کتاب میں کیا لکھا ہے اصل یہ ہیں۔ ان کے سامنے جھکے تو شرک اور بدعت میں مبتلا ہو گئے۔

اور دوسرا طبقہ کتاب پر اس درجہ جھکا کہ شخصیتوں کو چھوڑ کر کبر اور نخوت میں مبتلا ہوا۔

سفیان ثوری نے لکھا ہے:

من فسد من علماء نا ففيه شبه من اليهود و من فسد من عبادنا ففيه شبه من النصارى

ہمارے علماء میں سے جو بگڑتا ہے وہ یہود کے نقش قدم پر ہوتا ہے اور عباد اور زہاد میں سے جو بگڑتا ہے وہ نصاریٰ کے نقش قدم پر ہوتا ہے۔ محقق کون ہے؟ جو نہ تکبر میں مبتلا ہو نہ ذلت نفس میں وقار کے ساتھ تواضع للہ انجام دیتا ہے۔۔۔اور یہ جب ہوگا کہ کتاب اور شخصیت دونوں کو ملا کر ان کا دامن پکڑ کر آدمی چلے تو حقانی علم وعمل اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے اور تادب مع اللہ نصیب نہیں ہو سکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے۔

مدرسہ وخانقاہ

واقعہ یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو علم مدارس میں سکھلایا جاتا ہے اور تربیت اخلاق خانقاہ میں ہوتی ہے۔ مدرسی ہونے کے ساتھ جب تک آدمی خانقاہی نہ بنے تکمیل نہیں ہوتی محض خانقاہ میں جائے گا تو آدمی وجدی بن جائیگا۔ اسے خانقاہ میں خوب وجد آئے گا اور کورا مدرس بنے گا تو نجدی بن جائے گا۔ تو اس راہ میں نہ وجدی ہونا کافی نہ نجدی ہونا کافی۔ نجد اور وجد دونوں کو آدمی جمع کرے۔ تبھی کامل بنے گا۔ ایک طرف آدمی علم لے جس کے لئے مدرسہ جانا پڑے گا اور ایک طرف تربیت بھی لے اس کے لئے خانقاہ جانا پڑے گا۔۔۔ بہر حال دونوں چیزوں کو جمع کرنا یہ محقق ہونے کی علامت ہے۔

یہ جو مولویوں اور صوفیوں کی لڑائی ہے میں کہا کرتا ہوں کہ ایک طرف کورے مولوی جن میں عشق کی کمی ہے اور ایک طرف کورے عاشق جن میں علم کی کمی ہے محقق اور کامل کبھی نہیں لڑا کرتا۔ اس کے ظرف کے اندر وسعت ہوگی تو کامل بننے کی کوشش کیجئے۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ایک ہاتھ میں جام شریعت ہونا چاہئے اور ایک ہاتھ میں جام عشق ہونا چاہئے۔ آگ بھی ہو اور پانی بھی ہو، جلال بھی ہو اور جمال بھی۔ جب جا کے آدمی میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ کمال کی کوئی صورت نہیں۔ اور اعتدال بھی تبھی ہوگا جب جلال و جمال جمع ہو جائیں گے۔

روح کا اعلان

تو فرمایا گیا:

یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ

اللہ تعالیٰ اس آدمی کی رہنمائی فرما دیتے ہیں۔ جو ہماری رضا کی پیروی کرے۔ اور رضا کا مقام ہے۔ رضا اسی کو حاصل ہوگی جو قلب کو متوجہ کرے گا۔ باطن سے گویا ابتداء ہوئی۔ اہل باطن سے آدمی اپنا علاج کرائے گا۔ جبھی تو رضا پیدا ہوگی۔

جیسے بدن پر بیماری آتی رہتی ہے۔ دل اور نفس پر بھی آتی ہے۔ بدن کی بیماریوں کے لئے طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ جو کہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ روح کی بیماری ہوگی تو روحانی طبیب کے پاس جانا پڑے گا۔ جو وہ کہے گا کرنا پڑے گا۔ وہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ کہے گا معصیت سے پرہیز کرو۔ روزانہ کے اعمال شریعت غذا ہیں۔ ان میں کوتاہی نہ کرنا اور دوا ذکر اللہ ہے۔ اس کی اتنی تسبیح پڑھنا۔ اتنا اللہ کا نام لینا۔ تو دوا غذا اور پرہیز سب ہی کچھ ہے۔

بہر حال جیسے بدن پر بیماریاں آتی ہیں۔ ایسے ہی نفس پر بھی بیماریاں آتی ہیں۔ جیسے بدن کے معالج ہیں ایسے ہی نفس قلب کے بھی معالج اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ تو جو ان سے معالجہ کرائے گا۔ اس کے قلب میں مقام رضا پیدا ہوگا۔ اسی طرح عشق و محبت اور تفوض کا مقام پیدا کئے ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو کچھ پیدا نہیں ہوگا۔۔۔ اس لئے باطن کی بھی ضرورت ہے۔ ظاہر کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ مشعل راہ حضور ﷺ ہیں جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور آپؐ کی سنتیں راہنما ہیں اور کتاب اللہ صراط مستقیم ہے۔ مگر چلے گا وہ جس کا دل درست ہوگا۔ اور رضاء خداوندی کا اثر ہو۔

سیرتِ نبوی کے عناصر اربعہ

اور مقصد کیا ہے؟ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ مقصد نور میں لانا ہے۔ جیسی ظلمت تھی اس کا مدمقابل ویسا

ہی نور ہو گا۔ جہالت مظلم اور معصیت کی ظلمت تھی۔ اس کے مقابل جو نور آئے گا وہ علم اطاعت کمال اور اخلاق ربانی کا ہو گا۔ جس کا مرکز بنا کر نبی کریم ﷺ بھیجے گئے۔ تو آپؐ کی سیرت کے یہ عناصر اربعہ ہیں، تعلیم کتاب، تلاوت الفاظ تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس اور اس کے ساتھ یہ بھی صحیح کہ آپ مشعل نور آپؐ کی سنتیں راہنما۔ آپ کا بتایا ہوا راستہ قرآن اور اس پر چلنے والے مسلمان۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اس راستہ پر چلیں۔ عناصر سے اپنے عنصر کو بنائیں۔ اپنے بدن اور روح کا علاج کریں۔ اپنے نفس کی تکمیل کریں۔ حق تعالیٰ شانہ ہمیں توفیق دے کہ ہم مرضیات حق پر چلیں۔ نبی کریم ﷺ کی سنتوں پر عمل کریں اور من گھڑت راستوں کو ترک کریں۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم علم صحیح استعمال کریں کتاب و سنت کا مقام ہمارے قلوب کے اندر آجائے۔۔۔ آمین

اللھم ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا و ھب لنا من لدنك رحمةً انك انت الوھاب
اللھم انا نعوذبك من الفتن ماظھر منھا وما بطن ربنا لاتجعلنا فتنة للقوم الظلمین
اللھم توفنا مسلمین غیر خزایا والا مفتونین وصلی اللہ تعالی علیه خیر خلقه
محمد واله واصحابه اجمعین برحمتك یاارحم الراحمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام عالمی مذہب ہے

قرآن کریم تمام کتابوں کا محافظ ہے ان کے اندر جو تعلیم حق ہے۔وہ قرآن نے جاری کر دی اور اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا۔ قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔۔۔اس لیے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا میسائی بنے گا۔یہ عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا اسی طرح جو مسلم بناوہ صحیح معنی میں موسائی بنا کہ اس نے سند متصل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔وہی ابراہیمی بناوہی آدمی بنا۔یعنی جناب آدم علیہ السلام کو مانا۔۔۔تو سند متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے۔اس نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا۔اس کا ماننا سب کا ماننا ہے۔اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے''۔

از حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَ شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّابَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ. صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

حکیمانہ تشکر

بزرگان محترم!

میرے تعارف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا۔یہ اپنی عالی ظرفی اور بلند خیں کا اظہار

کیا گیا ہے۔ میرے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ان حضرات نے اپنی طرف کی بلندی ظاہر فرمائی۔ میری بلندی اس میں نہیں ہوتی۔ اس لئے میرے ذمہ شکریہ ادا کرنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ تعریف اپنی کریں کہ ہم اتنے عالی حوصلہ یا وسیع الظرف ہیں اور شکریہ میں ادا کروں؟ اپنی تعریف کریں تو مجھ پر شکریہ کب فرض ہے؟ میری تعریف کرتے تو میں شکریہ ادا کرتا۔۔۔ اور تعریف کی بھی تو ایسی کہ اس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی نے کہا یہ چاند اور سورج ہیں تو میں کب چاند اور سورج ہوں میں انسانی مخلوق ہوں یہ کونسی میری تعریف ہوئی جو واقعہ کے خلاف ہے۔

کسی نے کہا کہ بہت بڑا آدمی ہوں؟ تو میں کب بڑا ہوں؟ غرض میری تعریف کرتے میں شکریہ ادا کرتا۔ نے میری تعریف نہیں کی۔ اس لئے میرے ذمہ نہیں ہے کہ میں حضرات کا شکریہ ادا کروں؟

دار العلوم کا ایک طالب علم

جہاں تک تعارف کا تعلق ہے تو میں اپنا تعارف خود کرائے دیتا ہوں! میرا تعارف نہ چاند سورج سے ہوگا۔ نہ علم اور فضل سے ہوگا۔ اس لئے کہ علم اور فضل میں یہ حضرات مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔

کے سامنے مولانا محمد حسن صاحب کھڑے ہوئے تھے وہ ہمارے دار العلوم (دیوبند) کے استاذ ہیں۔ میں بھی ان کی تعظیم کرتا ہوں میں ان کے سامنے ایک طالب علم ہوں۔

مولانا انظر شاہ صاحب ہیں۔ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ مگر علم میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں میں دل سے ان کی عظمت کرتا ہوں۔۔۔ تو میرا تعارف یہ ہے کہ میں دار العلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔ وہاں کے اساتذہ اور بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنا میرا کام ہے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ غرض اس سے زیادہ سمجھا بھی نہ جائے۔

اور یہ کوئی تواضع نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو دن رات تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا علم تازہ ہے مجھے پڑھے ہوئے ساٹھ برس ہوگئے۔ ان کا علم تازہ ہے اور میرا باسی۔ اور باسی ہو کر بھی چوراسی ہوگیا۔ گویا قریب الختم ہے۔۔۔ اس واسطے میرا تعارف اس سے زیادہ نہیں کہ دار العلوم کا ایک طالب علم ہوں۔ اور ان حضرات کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا اپنی عالی ظرفی سے کہا۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ادائیگی فرض

باقی شکریہ ادا کر دینا میرا فرض تھا۔ کہ جب انہوں صدر بنا دیا۔ تو اصل میں تو صدر بنانے والے ہیں۔ جو گھٹیا آدمی کو بنا سکتے ہیں تو وہ خود صدر ہیں (بلکہ صدر ساز ہیں) جن کو بنانے پر قدرت ہے وہ خود صدر ہوں گے۔ بہر حال جب انہوں

صدر بنادیا اور اس کرسی پر بٹھادیا۔ تو لامحالہ اس کرسی کا وقار اور اس کی لاج رکھنا میرا فرض ہے۔۔۔ اس سلسلہ میں چند باتیں مجھے گزارش کرنی ہیں۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے جس کے بارے میں چند باتیں گزارش
کرنی ہیں۔ اس سے پہلے ایک مختصر سی تمہید عرض کر دوں جس کے ذریعے آیت کا مفہوم سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا اور آیت کا جو منشاء اور مقصد ہے وہ بھی انشاء اللہ واضح ہو جائے گا۔ ابتداء میں تھوڑی سی تمہیدی باتیں ہیں۔

تمہید

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا بین الاقوامی ہو گئی ہے۔ یعنی ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے پہلے اگر دوسری ولایتوں کا مہینوں میں سفر ہوتا تھا اب وہ دنوں میں ہونے لگا ہے جو سفر دنوں میں ہوتے تھے اب وہ گھنٹوں میں طے ہونے لگے ہیں جو گھنٹوں میں ہوتے تھے وہ منٹوں میں طے ہونے لگے تو ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے۔ پہلے بچپن میں ہم لوگ اگر دس بارہ میل کا سفر کرتے تھے تو بڑی تیاریاں ہوتی تھیں۔ کہ سفر در پیش ہے۔ آج وہ سفر سفر نہیں رہا شہروں میں دس بارہ میل کا سفر تو روزانہ ہوتا ہے۔ تو وسائل ایسے مہیا ہو گئے کہ جن کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں بدل گیا ہے۔ ہوائی جہاز پہ آپ یورپ جائیں گے تو بارہ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے پہلے دیوبند سے دہلی تک اڑتالیس گھنٹے لگتے تھے۔ اور اب لندن بارہ گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو ہزاروں میل کا سفر ایسا ہو گیا ہے جیسے چند فرلانگ کا سفر ہوتا ہے سواریاں ایسی ایجاد ہو گئیں کہ انہوں نے ساری دنیا کو لپیٹ کر رکھ دیا۔

نظریاتی یکسانیت

اسی طرح سے علم و فضل کے وسائل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آج جو یہاں علم رکھتے ہیں وہی علم لندن والے بھی رکھتے ہیں۔ وہی معلومات امریکہ و جرمنی میں ہیں۔ کوئی خصوصیت کہیں کی باقی نہیں رہی۔ حتی کہ تمدن کی خصوصیات مٹی چلی جا رہی ہیں یورپ و امریکہ اور ہندوستان کا تمدن یکساں سا ہو گیا ہے۔ جو چیزیں آپ لندن میں دیکھیں گے وہی بمبئی میں اور کلکتہ میں دیکھیں گے جو امریکہ میں ہیں وہی امریکن اسٹائل یہاں بھی نظر پڑیں گی۔ تو تمدن بھی یکساں نظریات بھی یکساں گویا پوری دنیا بین الاقوامی بن گئی۔ مسائل ایک ملک کے ہیں اور دنیا کے سارے ملک مل کر طے کر رہے ہیں تو کسی ملک کی سیاست اپنی اندرونی نہیں رہی بلکہ بیرونی سیاست کے تابع ہو گئے ہیں ہر ملک کا یہی معاملہ ہے کشمیر کا معاملہ آپ کے ملک کا ہے اور اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ در پیش ہے آپ کے ملک کا مسئلہ ہے اور یورپ و امریکہ والے بیٹھ کر طے کر رہے ہیں۔ تو چھوٹے چھوٹے مسائل اقوام متحدہ میں پیش ہوتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ تو کسی ملک

کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی اس لئے نظریات بھی یکساں ہوتے چلے جارہے ہیں۔ جو نظریہ تمدن کے بارے میں یورپ کا ہے وہی آج امریکہ اور روس کا بھی ہے۔ تو مدنیت اور معاشرے کا ایک ہی ذریعہ ہو گیا ہے۔ کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وہاں سے نظریات بر آمد ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک میں آتے ہیں۔ قبول کرتے ہیں۔ تو ساری دنیا سمٹ کر ایک کنبہ بن گئی ہے جس سے ہر ملک کی خصوصیات ختم ہو گئیں۔ نظریات ایک ہو گئے۔ ذہنوں کا رخ ایک بن گیا۔ پلیٹ فارم ایک بن گیا۔ اور دنیا چاہتی ہے کہ سب کے اندر یکسانیت پیدا ہو جائے۔ یہ ایک نظریہ ہے جو اب چل رہا ہے۔

مذہبی یکسانیت

تو میں عرض کرتا ہوں کہ نظریات جب یکسانیت کے ساتھ قائم ہو گئے حتی کہ تمدن و معاشرہ بھی ایک ہو تو قدرتی طور پر یہ مسئلہ سامنے آئے گا کہ پھر مذہب بھی ایک ہی ہو۔ دین بھی سب کا ایک ہی ہو۔ تمدن ایک ہو جائے اور دین ایک نہ ہو یہ فطرت اور طبیعت کے خلاف ہے۔۔۔ نظریات میں یکسانیت پیدا ہو گئی۔ مذہب کی یکسانیت کا مسئلہ باقی رہ گیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ آتا جارہا ہے۔ اور مذہبیت جاندار ہو رہی ہے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لایبقی علی ظهر الارض بیت مدر ولا وبر الاادخله الله کلمة الاسلام بعز عزیز وبذل ذلیل.

روئے زمین پر کوئی کچا اور پکا مکان باقی نہیں رہے گا۔۔ کپڑے کا گھرانہ ہو جیسے خیمہ یا پتھروں کا گھرانہ ہو جیسے پہاڑوں پر مکانات ہوتے ہیں۔ یا اینٹ پتھر کا گھرانہ جسے آپ تعمیر کرتے ہیں۔۔۔ کوئی گھرانہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا بعز عزیز و بذل ذلیل کوئی رغبت سے قبول کرے یا مجبور ہو کر۔۔۔ مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان کسی کے گلے پر چھری رکھیں گے یا قبول کرو نہیں تو ذبح کر دیں گے۔ اس کی تو اسلام نے مخالف کی ہے۔ صاف فرمایا گیا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدتَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ.

دین کے اندر کوئی جبر نہیں ہے نیکی اور بدی خیر اور شر خود کھل کر سامنے آگئی ہے جس کا جی چاہے اسلام قبول کرے جس کا جی چاہے نہ کرے کوئی جبری چیز نہیں ہے۔ حتی کہ یہاں تک فرمایا:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ.

"اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ لوگ مسلمان بنیں"۔

یہ آپ کا حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حق ہے جس کے جی میں چاہے ایمان ڈال دیں آپ کا کام صرف تبلیغ اور دین کا پہنچا دینا ہے ماننا نہ ماننا ہر شخص کے اختیار میں ہے جس کو دوسری جگہ قرآن

کریم نے فرمایا۔

فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَّمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا.

"جس کا جی چاہے ایمان قبول کرے جس کا جی چاہے نہ قبول کرے ہم نے عذاب آخرت تیار کرر کھاہے جس کا جی چاہے بچ جائے جس کا جی چاہے اپنے کو اس کے اندر جھونک دے"۔

تو دین میں کوئی جبر نہیں۔

اس لئے فرمایا۔ بعز عزیز و بذل ذلیل اسلام کا کلمہ ہر شخص تک پہنچ جائے گا خواہ وہ رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر۔۔۔ تو مجبور کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان تلوار سے مجبور کریں گے۔ مجبور کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو دھکے کھا کر مجبور ہو کر انہی اصول کے اندر پناہ ملے گی۔ جو اسلام نے لا کر رکھے ہیں۔ لوگ مجبور ہو کر قبول کریں گے۔ اس کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہے گا تو یہ حاصل ہوا کہ گھر گھر اسلام کا کلمہ داخل ہو کر رہے گا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ آج اس کی تمہید بڑھتی چلی جا رہی ہے تمدن ایک بن گیا۔ نظریات ایک بن گئے معاشرت ایک ہوتی جاری ہے۔ خود یہ سوال آئے گا کہ پھر مذہب کیوں نہ ایک ہو؟ دین کیوں نہ ایک ہو؟ ساری قومیں مل کر ایک پلیٹ فارم پر کیوں نہ جمع ہوں؟ اتحاد تو جبھی پیدا ہو گا۔ تو یہ نظریہ سامنے آنے والا ہے۔ بلکہ زبانوں پر آنے بھی لگا ہے۔ اب عمل کر آنے والا ہے چند دن کے بعد۔۔۔

عالمی دین

تو مقصد یہ ہے کہ جب دنیا بین الاقوامی ہے تو لامحالہ ایسے دین کی طرف توجہ منعطف ہو گی جو خود بین الاقوامی ہو۔۔۔ اگر دین ایک ملک کا ہو کہ دوسرے ملک کا اس کے ساتھ تعلق نہ ہو وہ بین الاقوامی نہیں ہے وہ تو ملک والوں کے لئے ہے۔ یا ایک خاندان کا ہو دوسرے خاندان کا نہ ہو تو دوسرا خاندان متوجہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ جو سارے ملکوں کا ہو سارے عالم کا ہو اس کی طرف خواہ مخواہ عالم کی توجہ ہو گی۔۔۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس کافۃ

"پہلے پیغمبر اپنی اپنی اقوام اور خاص خاص قوموں کی طرف۔۔۔ ان کو ہدایت کرتے تھے نصیحت کرتے تھے۔۔۔ تو اب یہ خاص کون ہیں؟"

تو بعض انبیاء علیہم السلام تو ایک خاندان کی طرف آئے جیسے بنی اسرائیل اس خاندان میں ہزاروں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے لیکن ہر نبی کا کام یہ تھا کہ اسرائیلی خاندان کی اصلاح کرے، انہیں دوسرے خاندانوں سے تعلق نہیں تھا جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں مگر بنی اسرائیل کے۔

خود حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں کہ یہ منتشر نہ

رہیں دوسری اقوام میں جو بھیڑیں ہیں ان سے مجھے تعلق نہیں۔۔۔ تو بعض انبیاء مخصوص خاندان کی طرف آئے۔ اسی خاندان کی اصلاح ان کے ذمے تھی۔

، بعض مخصوص ملکوں کی طرف آئے یا مخصوص قوموں کی طرف کہ جیسے حضرت یونس علیہ السلام چار قوموں کی طرف مبعوث ہوئے انہی کے اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور قوموں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اقوام خاندان اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ

"ہر قوم کے لئے ہم نے ہادی بھیجا اور ڈرانے والا بھیجا"۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

"کوئی امت ہم نے نہیں چھوڑی جس میں ڈرانے والے نہ بھیجے ہوں"۔

اور فرمایا گیا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا

"ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک رسولوں کو بھیج کر اتمام حجت نہ کر دیں"۔

دین پیش کر دیں اور وہ نہ مانیں حجت تام ہو تب ہم عذاب دیں گے ورنہ ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

تو قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی قوم اور ملک باقی نہیں ہے جس کے اندر انبیاء علیہم السلام نہ آئے ہوں۔

اب یہ حجت تام اتنا عام ہے تو کروڑوں کا ملک ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے اندر اللہ کی طرف سے ڈرانے والے نہ آئے ہوں۔

آغازِ اسلام

اور میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے پیغمبر تو ہندوستان ہی میں مبعوث ہوئے حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں ہی آئے تو ہندوستان میں ان کا نزول اور اترنا ثابت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے عربستان کا سفر کیا ہے۔ اور ایک سو بیس حج کئے ہیں چالیس حج پیدل کئے ہیں اور بقیہ حج بیل پر سوار ہو کر کئے ہیں۔ تو سب سے پہلا دار النبوت اور دار الخلافت اللہ کا ہندوستان ہے جس سے مذہب کا آغاز ہوا۔ مذہب کی تکمیل عربستان میں ہوئی مگر آغاز ہندوستان سے ہوا۔ تکمیل کے لئے تو فرمایا:

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

”حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں نے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمتوں کو تم پر پورا کر دیا ہے۔ اور میں آج اسلام کے سوا تم سے کسی اور دین پر راضی نہیں ہوں“۔

اسلام لے کر تو آدم علیہ السلام آئے ہیں۔ آغاز ان سے ہوا۔ تکمیل عربستان میں ہوئی۔ بیچ میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے۔ ہر ملک اور قوم کی طرف آتے رہے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے مگر اللہ کا دین ایک رہا شریعتوں میں چونکہ تغیر و تبدیل ہوتا رہا پچھلی شریعتوں میں ایک چیز حلال تھی تو اگلی شریعتوں میں اسے حرام کر دیا۔ یا پہلی شریعت میں حرام تھی۔ اگلی شریعت میں اسے حلال کر دیا۔ شرائع کے اندر تو تغیر و تبدل رہا۔ مگر دین ایک رہا۔

تکمیلِ شریعت

دین کے معنی اصول کے ہیں۔ اللہ کی توحید، نبی کی عظمت، آخرت کا یقین جنت و دوزخ کا ہونا۔ ملائکہ کا وجود پل صراط کا ہونا۔ عرش کرسی اور لوح و قلم کا ہونا یہ غیبی چیزیں ہیں جو سب انبیاء کے زمانے میں ایک رہی ہیں۔ البتہ حلال و حرام کے احکام جس کو ہم عملی پروگرام کہیں گے اس عملی پروگرام میں کچھ تغیر و تبدیل ہوتا رہا۔ آخیر میں آ کر وہ بھی مکمل ہو گیا۔ شریعت بھی اتنی مکمل ہو گئی کہ اب اس میں کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بچہ پیدا ہوا تو اس کے لئے کرتہ بنائیں تو بالشت بھر کا ہوگا۔ اور وہ بھی بلکہ بڑا ہوگا۔ بچہ اس میں چھپ جائے گا۔ لیکن اب جوں جوں بڑھتا جائے گا تو پیمائش بڑھتی جائے گی۔ تو بچہ تو پیدائش سے لے کر ایک ہی ہے۔ مگر لباس اسکے بدلتے رہے۔ اسی طرح سے دین ایک ہے مگر عملی پروگرام کے لباس بدلتے رہے ہیں۔

وحدتِ دین

انبیاء علیہم السلام آتے رہے تو تغیر و تبدل ہوتے رہے ہیں مگر دین سب کا ایک تھا۔

کان دین الانبیاء لا الہ الا اللّٰہ سارے پیغمبروں کا دین توحید تھا کہ ایک کو ہی مانو۔ ایک ہی کو سب کا کرتا دھرتا سمجھو ایک ہی کو نفع و نقصان کا مالک سمجھو، ایک ہی کو ہادی سمجھو، ایک ہی کو زندہ کرنے اور موت دینے والا سمجھو، نہ کسی کے بس میں موت ہے نہ حیات نہ کسی کے بس میں ہدایت و راہنمائی ہے یہ صرف اللہ کا کام ہے، نجات دینا اس کا کام ہے، تو توحید سارے انبیاء کا دین رہا۔ اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ”کوئی رسول دنیا میں ہم نے نہیں بھیجا جس نے یوں نہ کہا ہو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اسی کی عبادت کرو“۔ نہ انبیاء علیہم السلام کی عبادت کرو نہ اولیاء اللہ کی عبادت کرو نہ علماء مشائخ کی،

عبادت کے لئے سزاوار صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ ذات اللہ کی ہے اس لئے کہ زندہ کرنے اور مارنیوالا صرف اللہ ہے اگر زندہ کرنے میں معاذ اللہ اس کا کوئی شریک ہوتا کہ کچھ ہماری اور آپ کی قوت اور کچھ اللہ تعالیٰ کی قوت مل ملا کر زندہ کر دیا۔ اسی طرف موت دینے میں اللہ کے کچھ اور بھی شریک ہوتے تنہا اللہ کی قوت کافی نہ تھی ہوتی تو کچھ اور لوگوں کو ملا کر فلاں کو موت دی جاتی۔۔۔ تو اگر موت وحیات میں شرکت ہوتی تو عبادت میں بھی شرکت ہوتی تو اللہ کی بھی عبادت کرتے اور جو ان کے شریک ہوتے ان کی بھی عبادت کرتے۔

مگر زندگی موت، صحت و مرض رزق دینے والے وہ تنہا ہیں اور کل معاملات ان کے ہاتھ میں ہیں پھر عبادت بھی تنہا انہی کی ہوگی یہ کیسے ممکن ہے کہ کام تو وہ کریں اور جھکیں دوسرے کے آگے دوسروں کے آگے پیشانی رگڑیں جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کی باگ دوڑ ہے اسی کی عبادت کی جائے گی تو آیت شریفہ میں یہ بتلایا گیا کہ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا جس نے یہ تعلیم نہ دی ہو کہ دیکھو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کی عبادت کرو اسی سے ڈرو۔

اگر اس سے ڈرو گے تو سب سے ڈرنا چھوڑ دو گے۔ اگر اس سے نہیں ڈرو گے تو سب سے ڈرنا پڑے گا اگر اس کی عبادت کرو گے تو ہر ایک کی عبادت ترک کر دو گے۔ اگر اس کی عبادت نہیں کرو گے تو در در پر جھکنا پڑے گا۔

ترک توحید کی پھٹکار

آج کوئی آپ کے آگے جھک رہا ہے کوئی پتھر کے آگے جھک رہا ہے، کوئی آگ کے آگے کوئی پانی کے آگے تو میں کہتا ہوں کہ یہ شرک نہیں ہے یہ پھٹکار ہے کہ جب ایک کی عبادت نہیں کی تو ایک ایک چیز کے سامنے ناک رگڑ رگڑ کر یہاں بھی ذلیل بنو وہاں بھی ذلیل بنو انسان کو اللہ نے معظم اور مکرم بنایا تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے آگے اس کی پیشانی نہ جھکے جب اس نے اپنے آپ کو خود عزت والے سے ہٹالیا تو ایک ایک مخلوق کے آگے اسے جھکنا پڑا ذلیل ہونا پڑا۔ حالانکہ آگ پانی مٹی ہوا تو ہمارے خادم ہیں۔ یہ معبود تھوڑا ہی ہیں۔ ان سے تو ہم کام لیتے ہیں، پانی سے نجاستیں اور گندگیاں دھوتے ہیں، پھر پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے۔ آپ پانی نیچے سے آٹھویں منزل اور پائپ کے ذریعے لے گئے جانے پر یہ مجبور ہے آپ پانی سے مجبور نہیں ہیں، پانی آپ سے مجبور ہے کہ وہ نیچے کو جانا چاہتا ہے آپ اس کی طبیعت کے خلاف اس کو اوپر لے جانا چاہتے ہیں۔ آگ کی طبیعت یہ ہے کہ وہ اوپر کو جاتی ہے آپ اس کی لپٹ جب جاتی ہے تو اوپر کی طرف، نیچے کی طرف نہیں جائے گی لیکن مشینوں کے ذریعے سے آپ اس کی لپٹ کو نیچے لے جاتے ہیں، وہ مجبور ہے کہ مشین چل رہی ہے لپٹ نیچے جا رہی ہے، تو آگ نے آپ کو مجبور نہیں کیا آپ نے آگ کو مجبور کر دیا۔

زمین پر ا کو قابو ہے: زمین کو اپر قابو نہیں ہے چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِی جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوا فِی مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ.

زمین کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل بنادیا ذلیل نہیں کہا بلکہ مبالغہ کا صیغہ ذلولا فرمایا س کو کھودیں پھاڑیں، چکنا چور کریں بیچاری چوں نہیں کرتی اسی طرح اس میں پانی بہادیں نالی کھودیں چوں نہیں کرے گی تو زمین آپ کے سامنے مجبور ہے اس کے سامنے مجبور نہیں ہیں۔

یہی صورت آگ کی بھی ہے' یہ کے سامنے بجلی ہے یہ پہاڑوں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ جب انسان کے ہاتھ میں آگئی تو ایک پتلے سے تار میں باندھ رکھا ہے نہ چھوڑیں تو تار میں بند ہے۔ ذرا سوئچ نیچے دبادیں فوراً خادم حاضر ہے۔ تو جو پہاڑوں کو چکنا چور کرتی ہے انسان کے ہاتھ میں آ کر قید ہوئی تو چوں نہیں کر سکتی ہے۔ گرفتار ہے بجلی کیا ہوئی ایک خادم ہوئی۔ تو خادم کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے آگے جھکے انسان نے الٹا کام کر دیا خود اس کے آگے جھکنا شروع کر دیا کبھی آگے کے آگ کبھی پانی کے آگے کبھی درخت کے آگے یہ سب چیزیں تو تمہاری خادم ہیں تمہارے استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہیں ان کا کام ہے کہ وہ تمہاری اطاعت کریں نہ یہ کہ انسان جیسی معظم و مکرم چیز ان کے آگے جھکے اور ان کی اطاعت کرے۔۔۔ تو جھکنے کے لئے ایک ہی ذات سزاوار ہے جس کے ہاتھ میں سورج بھی ہے چاند بھی ہے درخت بھی ہیں پہاڑ بھی ہیں جیسے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِی خَلَقَهُنَّ اِن كُنتُم اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ

نہ تم سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو سجدہ کرو اس ذات کو سجدہ کرو جس نے سورج اور چاند جیسی چیزیں تمہارے سامنے بنا کر رکھ دیں، اور تمہارے لئے بنائیں۔ صبح کو سورج نکلتا ہے روشنی پھینکتا ہے تاکہ تم اپنے کام کاج کرو۔ رات کو چاند نکلتا ہے۔ اگر رات کو بھی سورج رہتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ تو رات کو وہ ستارے چمکائے جس میں ٹھنڈی روشنی ہے دن میں وہ ستارے چمکائے جس میں گرم روشنی اور چاند ناکافی ہے، تو جس نے ان کے نوروں اور روشنیوں میں فرق ڈالا وہ اللہ رب العزت ہیں تو وہ عبادت کے لائق ہیں یا یہ چاند سورج عبادت کے لائق ہیں؟ یہ تو اس قدرت کے مظاہر ہیں کہ کسی میں گرم نور اور کسی میں ٹھنڈا نور چمکا دیا پہاڑوں کو عظمت اور رفعت دیدی۔ آسمان کو بلند کر دیا مگر سب بلندیوں سے جو زیادہ بلند ہے وہ ذات بابرکات ہے سب عظمتوں پر جس کی عظمت فائق ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔۔۔ تو سارے انبیاء کا دین یہی رہا توحید اور یہ کہ ایک کو کرتا دھرتا سمجھو اور اسی کے آگے جھکو۔

تاثیرِ توحید

اسی میں قلب کی قوت تھی ہے
یک در گیر محکم گیر

ایک در کو مضبوط تھامو جو ایک کا ہو جاتا ہے اس کے قلب میں قوت آجاتی ہے کہ میرا آقا موجود ہے اور چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا ایک طرف جھکے گا اسے خطرہ ہوگا کہ دوسرا خفا نہ ہو جائے دوسرے کے آگے جھکے گا اسے خطرہ ہوگا تیسرا خفا نہ ہو جائے۔ تو چند آقاؤں کا خادم کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا۔ غلام جب خدمت کریگا ایک آقا کی کرے گا جو متعین ہو کہ اسی کے ہاتھ میں میرا امفاد ہے۔۔۔ تو حق تعالیٰ شانہ کے ہاتھ میں نفع و نقصان' وجود و عدم اور موت و حیات ہے' اس واسطے عبادت کے لائق وہ ہی ہے سارے انبیاء علیہم السلام نے یہی تعلیم دی ہے' تو میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دین سارے انبیاء علیہم السلام کا ایک رہا۔ شریعتیں کچھ مختلف ہوتی رہی ہیں' جیسے آدمی کے لباس بدلتے رہتے ہیں مگر آدمی وہی رہتا ہے' وہی بچہ جس نے بالشت بھر کا لباس پہنتا تھا وہی اب ڈیڑھ گز کا لباس پہنے گا کیونکہ اس کی عمر اب بیس برس کی ہو گئی لیکن جب اس کا نشو و نما مکمل ہو گیا۔ اب اس میں بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اب جو لباس پہنے گا اس کی پیمائش متعین ہوگی وہ نہ کم ہو سکتا نہ زیادہ اس لئے کہ کم زیادہ تو تب ہو جب انسان کے اندر بڑھنے کی گنجائش ہو کیونکہ اس کی نشو نما اور بڑھوتری مکمل ہو چکی ہے۔

اب لباس کی پیمائش متعین ہوگی۔۔۔ غرض دین تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی رہا' شریعتیں بدلتی رہی۔۔ اس لئے عبادت صرف ایک ہی ذات کی کی جائے گی۔

عبادت و تعظیم کا فرق

البتہ کسی چیز کی تعظیم کا حکم ہو تو اس کی عظمت بجالائی جائیگی۔۔۔! حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ جو صاحب کشف و کرامات بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے' دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے' مولانا پر اکثر جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔!

ایک دفعہ مولانا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ گنگا کہاں سے نکلی ہے؟ جو ایک قوم کی قوم گنگا کی عظمت کر رہی ہے' اسی وقت اٹھ کر سفر شروع کر دیا تو دیوبند سے چالیس میل کے فاصلے پر گنگا بہتی ہے' مولانا نے چالیس میل کا سفر کیا۔ اور اس موضع میں پہنچے جہاں سے گنگا کا دہانہ پھوٹا ہے' جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں ہے' گنگوتری اس جگہ کا نام ہے' سات دن وہاں ٹھہرے اس کے بعد آکر فرمایا کہ میں نے گنگا کے دہانے پر روزے رکھے' عبادتیں کیں ذکر اور تلاوت خوب کرتا رہا تو مجھے یہ منکشف ہوا کہ جہاں سے دہانہ پھوٹا ہے وہاں سے مجھے انوار نبوت محسوس ہوئے یا تو کسی نبی کی قبر ہے یا کسی نبی کی نشست گاہ ہے جہاں بیٹھ کر انہوں نے قوم کو ہدایت کی ہے' اسی برکات کے آثار اس پانی میں ہیں' اس لئے قوم کی قوم اس کی عظمت کر رہی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ ایک ہے کسی چیز کی عظمت کرنا اور ایک ہے عبادت کرنا۔ عبادت جائز نہیں

عظمت سب کی ضروری ہے۔

زمزم شریف جو آپ کے ہاں پانی ہے اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اس لئے کہ حضرت ہاجرہ علیہ السلام کیساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور چھوٹے بچے ہیں، پیاس لگ رہی ہے اور وَادٍ غَیرِ ذِی زَرعٍ جہاں بیت اللہ ہے اردگرد ریگستان ہے پانی کا نشان نہیں۔ تو بچے نے پیاس سے اندر تڑپنا شروع کیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر پر مارا اور زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا آپ اسے عظمت سے پیتے ہیں ہر پانی کے لئے بیٹھ کر پینا سنت ہے، لیکن زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا سنت ہے، یہ تعظیم کی وجہ

سے ہے اور فرمایا گیا حدیث میں:

ماء زمزم لما شرب له

"زمزم کر جو دعا مانگو گے اللہ اسے قبول کرے گا"۔

تو زمزم پینے سے پہلے کچھ اپنی مراد مانگنی چاہئے وعدہ خداوندی ہے کہ وہ مراد عطا کی جائے گی عام پانیوں میں یہ بات نہیں ہے، زمزم میں یہ خصوصیت ہے، اس لئے سارے مسلمان مل کر زمزم کی تعظیم کرتے ہیں زمزمیوں میں بھر کر لاتے ہیں اس کا قطرہ زمین پر گرنے نہیں دیتے کہ معظم و مشرف پانی ہے لیکن اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے سجدہ کے لئے صرف ایک ہی اللہ کی ذات ہے، عظمت و تعظیم اگرچہ کی جائیگی۔

تعظیمی سجدہ

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعظیم اکے اوپر فرض ہے، ذرا بے عظمتی کوئی کریگا تو اسلام سے خارج ہو جائے گا یہ بات حضور ﷺ کے بارے میں نہیں، تمام ہی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہے تو تعظیم اتنی ضروری کہ جب تک نبی کی عظمت نہ کی جائے ایمان نہیں بنتا مگر عبادت جائز نہیں کہ نبی کو سجدہ کرنے لگیں اس شریعت نے ممنوع قرار دیا۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ ایک دفعہ ایک کو صحابی حاضر ہوئے اور حضور اقدس ﷺ کو سجدہ کیا آپ نے فرمایا! تم نے یہ کیا حرکت کی؟ عرض کیا یا رسول اللہ! یہ قیصر و کسریٰ جو روم اور فارس کے بادشاہ ہیں۔ ان کے درباری جب آتے ہیں تو ان کو سجدہ کرتے ہیں تو اللہ کا رسول اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے، اس لئے میں نے سجدہ کیا۔

"آپ نے فرمایا کہ غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے اگر میں اجازت دیتا سجدہ کرنے کی تو عورتوں کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں"۔

لیکن ان کے لئے بھی ممنوع اور ناجائز ہے، اس لئے یہ حرکت کبھی نہ کی جائے نبی ہو یا غیر نبی عبادت کسی کی جائز نہیں۔۔ تعظیماً بھی سجدہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ صحابہ نے تو تعظیماً ہی سجدہ کیا

تھا عبادت نہیں کی تھی اس کو بھی حضور ﷺ نے منع ار دیا۔ تو غیر اللہ کے سامنے عبادت کی ہیئت بھی نہیں آنی چاہئے لیکن تعظیم ضروری ہے۔

معیارِ تعظیم

ہم انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی بھی تعظیم کریں گے، اگر اولیاء اللہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ بھی نکلے جو بظاہر شریعت کے خلاف ہو۔ تو اس کی تاویل و توجیہ کریں گے یہ نہیں ہے کہ گستاخی یا توہین کرنے لگیں۔ تو اولیاء کی توہین جائز نہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام؟ حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی بعض کتابوں میں تحریر فرمایا کہ ہندوؤں کے جو بڑے اور مقتدا ہیں جیسے شری گلشن جی ہیں یا شری رام چندر جی ہیں ان کا نام لے کر کبھی ان کی شان میں گستاخی نہ کرو، ممکن ہے اپنے وقت میں یہی پیغمبر اور مردان حق ہوں، اگر ہمیں سند سے معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعی پیغمبر تھے تو ہم ان پر اسی طرح ایمان لاتے جیسے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام پر ایمان لاتے۔ مگر سند سے ثابت نہیں اور احتمال ہے کہ یہ اپنے وقت کے پیغمبروں۔ اس لئے حضرت نے تحریر فرمایا۔ کہ گستاخی کا کلمہ ان کی شان میں نہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ وہ مردان حق ہوں۔ اور اللہ کی طرف سے شریعتیں لے کر آئے ہوں مگر جیسے حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی شریعتوں میں قوم نے تغیر کر دیا شریعت اپنی ذات کی حد تک تھی جو آئی، بعد میں لوگوں نے تغیر و تبدل کیا اور تحریف کی، کتابوں کے اندر ردوبدل کیا اس کا وبال قوموں پر ہے، پیغمبر اس سے بری ہیں وہ اپنے وقت میں حق تھے تو بدلنا قوموں کا کام ہے لیکن جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے وہ آسمان سے نازل ہوئیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے، جن پیغمبروں کا نام بتلایا گیا ان پر اور جن کا نام نہیں بتلایا گیا ان پر بھی بالاجمال ایمان لانا ضروری ہے۔

مِنهُم مَن قَصَصنا عَلَيكَ وَ مِنهُم مَن لَم نَقصُص عليك.

بعض وہ ہیں جن کے واقعات بیان کر دئے نام بھی لیا اور بعض وہ ہیں جن کا نام ہم نے نہیں لیا جن کا نام لے لیا ہے، ان کا نام لے کر ان پر ایمان لاؤ جن کے نام نہیں لئے ان کے بارے میں کہو کہ جتنے اللہ کے پیغمبر آئے ان سب پر ایمان لاتے ہیں

تو تعظیم اور چیز ہے عبادت اور چیز ہے، تعظیم حضرات انبیاء اور اولیاء اللہ کی بھی ہو گی اور فرض ہے علماء ربانی اور مشائخ حقانی کی بھی تعظیم کی جائے گی مگر عبادت کسی کی نہیں کی جائیگی عبادت صرف ایک اللہ رب العزت کی کی جائیگی کہ وہ مالک اور مختار ہے اسی کے ہاتھ میں وجود و عدم کی باگ ڈور ہے تو انبیا علیہم السلام جتنے بھی آتے ہیں ان سب کا دین توحید رہا ہے کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، کسی دوسرے کی طرف عبادت کے راستہ سے مت جھکو، تعظیم سے جھکو۔

اوصافِ معبودیت

اس لئے آگ ہو یا پانی ،ہوا اور یا مٹی۔ ہم ان کے توقیر کریں گے کہ یہ اللہ کے تبرکات ہیں مٹی بھی اس کا عطیہ ہے جس سے ہمارے پھل اور دوسری چیزیں پیدا ہوتی ہیں جس سے ہم خود پیدا ہوتے ہیں تو وہ ماں کی جگہ ہے اسی لئے ایک عام مثل پھیل گئی کہ "مادر وطن" یعنی وہ زمین جس پر آدمی پیدا ہوا اس کو اپنی ماں کہتا ہے اور بعض روایات میں بھی یہ لفظ آتا ہے کہ زمین مثل ماں کے ہے، تو مادر وطن کا لفظ چلا اس لئے کہ جس سے ہمارا خمیر رہا جس سے ہمارا غذا نکلی۔ اس کو ہم ماں کی جگہ سمجھیں گے تو اس کی توقیر کریں گے کہ اللہ کا ایک عطیہ ہے مگر اس کی عبادت نہیں کریں گے۔ آگ کو ایک عطیہ سمجھیں گے اس کی عبادت نہیں کریں گے سردیوں میں اس کے بغیر تاپ نہیں سکتے اسکے بغیر کھانا نہیں پک سکتا۔

اور اگر کوئی عبادت کرے گا تو میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ کیا بے عقلی کی بات ہے اس لئے آگ کے سامنے اگر جھکیں گے تو آگ کی لپٹ آئی تو سب سے پہلے اس کو ہی جھلسائے گی جو سجدہ میں پڑا ہوا ہے، جس آگ کو یہ بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا ماننے والا پجاری ہے اس کو تو بچا دوں دوسرے کو پل بھر ختم کر دوں، جس معبود کو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا ماننے والا پجاری ہے میرا عابد ہے اور یہ میرا عابد نہیں وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ اسے دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں۔

اسی طرح پانی میں آپ گئے آپ نے اس کی عبادت کی۔ جب موج آئے گی تو پہلے وہی ڈوبے گا جو عبادت کر رہا ہے۔ اس پانی کو یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ اسے نہ ڈبوؤں یہ تو میری عبادت کر رہا ہے، دوسروں کو جا کے ڈبوؤں۔۔۔ تو جس معبود کو یہ بھی تمیز نہ ہو کہ کون میرا عابد ہے اور کون نہیں؟ کون میرا مطیع ہے اور کون نہیں؟ تو وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ عبادت کے لائق وہ ہے جو علیم و خبیر ہو:

أَلَا يَعلَمُ مَنْ خَلَقَ.

وہ پیدا کرنے والا ہے جو پیدا کرنے سے پہلے جانتا ہے کہ میں کیا چیز پیدا کر رہا ہوں پیدا کرنے کے بعد بھی جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز پیدا کی۔ اس کے انجام کو بھی جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا تو اول سے لے کر آخیر تک جس کے سامنے سارا عمل حاضر ہے وہی عبادت کے لائق ہے، تو سارے انبیاء علیہم السلام نے ایک ہی چیز کی تعلیم دی اور وہ توحید ہے۔

تکمیلِ توحید

اور توحید کے لئے البتہ نبوت کا ماننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ توحید کے معنی ہیں کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو ایک ہی کی رضا حاصل کرو ایک ہی کی مرضیات پر چلو اور اس کی نامرضی چیزوں سے بچو، جس سے وہ خوش ہے اسے قبول کر دیں۔ یہ کا حاصل نکلے گا کہ مرضیات خداوندی کے مطابق عمل

کرو اور نامرضیات سے الگ رہو، جس کا حکم دیا ہے اس کو مانو جس سے روک دیا ہے اس سے بچو تو مرضی اور نامرضی کو پالینا یہی فی الحقیقت دین کی روح ہے۔۔۔ لیکن اجانتے ہیں کہ کسی کی مرضی اس کے بتلائے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دو حقیقی بھائی ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں تو ایک کے دل کے بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی جب تک کہ دوسرا زبان سے ظاہر نہ کرے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں اور فلاں چیز سے ناخوش ہوں۔ تو حقیقی دو بھائی جو ایک جنس اور ایک نوع ہیں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ایک کے دل کی خبر دوسرے کے دل میں نہیں آتی۔ جب تک بتلانے والا خود نہ بتلائے۔۔۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں ا۔ انسان جو ظلمت ہے بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے۔۔۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے وہ وراء الورراء اور یہ سافل درسافل کوئی نسبت بندے کو خدا سے نہیں اس کی مرضیات کا عمل بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں، فلاں چیز سے ناخوش ہوں فلاں چیز کو ترک کردو، اور فلاں کو اختیار کرو، یہ میرا قانون اور آرڈر ہے۔

اب ایک تو صورت یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر کہتے پھریں کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں فلاں چیز سے ناخوش ہوں ایک ایک گھر میں خود آئے اور اطلاع دی لیکن یہ اس کی شان اقدس کے لائق نہیں، دنیا کے معمولی بادشاہ جنہیں ہم بادشاہ بناتے ہیں خود ان کی بادشاہت ذات کی نہیں ہے، ہم نے ووٹ دیا تو بادشاہ بن گئے ووٹ نہ دیں بادشاہ نہیں۔ لیکن بادشاہ بن جانے کے بعد بادشاہ کو بھی اس سے عار آتا ہے کہ وہ رعیت کے گھر گھر جا کر اپنے قانون کو پہنچائے کہ دیکھو میں اس سے خوش ہوں اور اس سے ناخوش ہوں وہ اپنے وزیراعظم کو مقرر کرتا ہے، وزیراعظم گورنروں کو مقرر کرتا ہے گورنر کمشنروں کو مقرر کرتے ہیں اور تحصیلدار ایک بھنگی کو بلا کر کہتا ہے کہ منادی کردو کہ بادشاہ کا حکم یہ ہے تو پھر رعیت کے دل میں آتا ہے، تو جب دنیا کے بادشاہ جنہیں ہم ہی بناتے ہیں انہیں غیرت آتی ہے کہ گھر گھر جائیں اور قانون کی منادی کریں تو اللہ رب العزت تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کی جناب کے لائق کہاں ہے کہ وہ گھر گھر میں آ کے خود فرمائیں، وہ اپنے وزراء کو مقرر کرتا ہے وہ وزراء انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے قلوب پر اپنی وحی اتارتا ہے، وحی کے ذریعے اطلاع دیتا ہے،

یہ میرا قانون ہے، میں یکتا اور بے مثل ہوں، وحی سے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جان لیا کہ ہمارا مالک ایک ہے اور یہ اس کی شان ہے۔ فرمایا گیا:

اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ.

" موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر وحی فرمائی کہ میں اللہ ہوں۔ میرے سوا کسی کی عبادت

نہ کرو"۔

اپنی شان بیان فرمائی کہ :

لَیس کَمِثلہ شیءٌ وَھُوَ السَّمِیعُ البَصِیرُ.

"میری مانند کوئی نہیں کوئی مجھ جیسا نہیں۔نہ میرا کوئی جسم ہے نہ میرا کوئی ضد ہے نہ کوئی ند اور شریک ہے"۔

قُل ھُوَ اللّٰہُ اَحَد.

کہہ دو اے پیغمبر! اللہ یکتا ہے"۔

اَللّٰہُ الصَّمَد.

"اللہ صمد ہے"۔

صمد کے معنی یہ ہیں کہ سارے اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔۔۔زندگی نہیں مل سکتی جب تک ادھر رجوع نہ کرے موت نہیں آسکتی جب تک وہی موت نہ دے۔ہم باقی نہیں رہ سکتے جب تک وہ باقی نہ رکھے۔ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے تو ہم اپنی موت وحیات اور حدوث وبقاء میں محتاج ہیں لیکن اللہ کسی کا محتاج نہیں اس کا وجود اپنا ہے وہ کہیں وجود مانگنے نہیں گیا۔ اس کی قدرت اپنی ہے،اس نے دوسروں سے قدرت نہیں مانگی۔اس کا علم اپنا ہے اس نے دوسروں سے کب کہا تھا کہ مجھے علم دے دو۔

استحقاقِ عبودیت

علم وقدرت اس کی اپنی صفات ہیں اس کے علم کا کچھ سایہ ہم پر پڑ جائے تو ہم بھی عالم کہلانے لگے جائیں اس کی قدرت کی پرچھائیں پڑ جایں تو ہم اور آپ بھی قادر کہلانے لگ جاتے ہیں کہ ہمیں بھی کچھ قدرت اور بس حاصل ہے تو اصل میں قدرت والا ایک ہے،جس پر وہ اپنی قدرت کا نور فائز کر دے اس میں قدرت آجاتی ہے جس پر اپنا علم ڈالدے وہ عالم کہلانے لگتا ہے،جس پر اپنے اخلاق کا رنگ ڈال دے وہ درویش کہلانے لگتا ہے،عطا اور جو سب اس کی طرف سے ہے خود کسی کی ذات کے اندر کچھ نہیں۔قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ انسان کی ذات کوری ہے نہ اس میں علم ہے نہ قدرت ہے نہ کوئی اور کمال ہے کمالات کو قبول کرنے کی صرف استعداد اور صلاحیت ہے،مگر پیدائشی طور پر ماں کے پیٹ سے کوئی کمال لے کر نہیں آتا چنانچہ ارشاد ہے :

وَاللّٰہُ اَخرَجَکُم مِن بطُونِ اُمَّھٰتِکُم لَا تَعلمُونَ شَیا وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمع وَالاَبصَارَ وَالاَفئِدَۃَ لَعَلَّکُم تَشکُرُونَ.

"ہم نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں نکالا۔اس حالت میں کہ ذرہ برابر تم

علم نہیں رکھتے تھے، پیدا شدہ بچہ مضغہ گوشت ہوتا ہے، نہ اس کو اچھے کی خبر نہ برے
کی خبر، نہ سیاہ کی تمیز نہ سفید کی کوئی امتیاز اور علم نہیں تو ماں کے پیٹ سے لاعلم
پیدا ہوتا ہے"۔

یہ انسان کی ابتداء ہے۔۔۔ اور فرماتے ہیں کہ انتا کیا ہے؟ اس کے بارے میں فرمایا:

ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا.

" انجام کار ہم تمہیں ایسی ارذل عمر کی طرف لوٹا دیتے ہیں کہ عالم ہونے کے بعد تم پھر
جاہل بن جاتے ہو"۔

نوے سو برس کی عمر ہو گئی آج آنکھوں نے جواب دے دیا تو جو دیکھ کر عمل حاصل ہوتا تھا
اس کے راستے بند ہو گئے کانوں نے جواب دے دیا۔ ثقل سماعت پیدا ہوئی تو سن سن کے جو علم
حاصل ہوتا تھا وہ راستہ ختم ہوا۔ اب کچھ حافظے میں محفوظ تھا کچھ پہلی معلومات جمع تھیں۔ مگر پچھلی عمر
میں حافظہ بھی کمزور ہو جاتا ہے تو پچھلی معلومات بھی ختم ہوئیں۔ تو اگلی معلومات کا راستہ بند ہو گیا
پچھلی معلومات نسیان کی نذر ہو گئیں نتیجہ آگے واضح ہو گیا تو جیسے کورے آئے تھے ویسے ہی کورے
چلے گئے تو حق تعالیٰ شانہ، نے بتلا دیا کہ تمہاری ذات میں کوئی علم نہیں جب ہم نے چاہا ڈال دیا اور
جب چاہا نکال دیا اگر یہ چیز تمہاری ذات میں ہوتیں تو پیدائشی طور پر تم عالم ہوتے اور مرتے دم تک
عالم رہتے لیکن ذات میں نہیں ہے تو ہماری دین سے آتی ہیں۔ غرض ہمارا وجود، علم اور قدرت
سب اسکی دی ہوئی ہیں۔ تو اسی کے سامنے جھکیں گے جس نے دی ہیں۔ دوسروں نے دی نہیں تو
دوسروں کے آگے کیسے جھکیں گے؟ تعظیم و توقیر الگ چیز ہے مگر عبادت نہیں کریں ذلت اختیار
نہیں کریں گے، تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب ہماری دین ہے۔ یہ انسان کی حالت ہے کہ نہ
پیدائشی طور پر اس میں علم ہے نہ اخلاقی کمالات ہیں اور جتنے ہوں آخیر میں وہ بھی چھن جاتے ہیں
مثل مشہور ہے کہ بچہ اور بڑا ایک بن جاتا ہے۔۔۔ یعنی جیسے بچہ معصوم اور دوسروں کے ہاتھوں میں
ہے وہ بھی دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ چل نہیں سکتا جب تک کوئی چلانے والا نہیں ہوئی نہ
بیٹھ نہیں سکتا جب تک اس کو حرکت نہ دیں، غرض بالکل بچہ کی طرح دوسروں کے ہاتھ پڑ جاتا ہے،
پھر اس پر معصومیت طاری ہو جاتی ہے تو واضح ہوا کہ انسان کی ذات کوری ہے، اسمیں کچھ نہیں، جب
انسان کی ذات کوری ہے تو انسان عبادت کے لائق نہیں بن سکتا، جو اپنی ذات سے جاہل ہو وہ
معبود کیسے بن جائے معبود کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہو۔

انسان معبود نہیں بن سکتا تو اور تو تمام انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں تو کیا معبود بنیں گے
جو انسان کے نیچے ہیں، کیا آگ پانی معبود بنیں گے جن کو انسانوں خود عدم سے نکالتا ہے، دیا سلائی کھینچی
تو آگ آگئی، پاؤں سے روند دی تو آگ ختم ہو گئی تو یہ آگ معبود بنے گی؟

جب انسان معبود نہیں تو ساری چیزیں انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں وہ انسان کی خدم ہیں وہ کیسے معبود بن سکتی ہیں؟ ایک ذات سب کی معبود ہے اور ایک ہی کرتا دھرتا ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام ساری دنیا اور سارے ملکوں میں آئے اور ایک ہی چیز لے کر آئے۔

اختلاف مذہب کے اسباب

اور ابتداء میں سارے انسان ایک ہی دین پر تھے لیکن جوں جوں لوگوں نے اپنی عقلیں چلائیں تو دین کے اندر فتنے پیدا ہوتے گئے اگر محض اتباع کرتے کہ جو اللہ کے رسول نے لا کر دے دیا اس پر آنکھ بند کر کے چلتے کوئی نزاع نہ ہوتا۔ نزاع جب ہوتا ہے جب اوپر سے آئی ہوئی چیزوں میں آندھی عقلیں لڑائیں اور عقلی ڈھکوسلوں سے عقیدے بنانا شروع کریں یہیں سے آدمی کے اندر خلل پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

اس طرح کبھی انتہائی محبت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی ذات سے انتہائی محبت اور عقیدت ہے اس کو اتنی بڑائی دی کہ اس کو خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا۔

کبھی انتہائی عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی سے عداوت ہوئی کہ فلاں پر نام لے کر لعنت بھیجنی شروع کر دو نام لے کر برا کہو۔ اس کا بھی ایک غلو ہے تو کبھی غلو عداوت میں میں اور کبھی غلو محبت میں عقیدے بگڑتے ہیں؟ جیسا کہ حدیث میں آپ نے حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:

”اے علی! تمہارے بارے میں بعض لوگ محبت کی وجہ سے تباہ ہوں گے اور بعض عداوت کی وجہ سے“۔

بعض لوگوں نے انتہائی محبت کی کہ حضرت علی کو خدا تک کہا اور کہا کہ یہ خدا کا مظہر ہیں اور اتنی انتہائی عقیدت کی کہ ان کے سامنے جھکے جیسے خدا کے آگے یہ غلو محبت میں ہلاک ہوئے اور رفض کا چلا۔

اور خوارج ان کی عداوت میں ہلاک ہوئے کہ ان کو مسلمان تک بھی نہ مانا ان کا تبرا شروع کیا معاذ اللہ ان پر لعنت بھیجنی شروع کی تو بعض محبت میں اور بعض عداوت میں غلو سے تباہ ہوئے۔

یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کہ نصاریٰ ان کی محبت میں تباہ ہوئے کہ ان کو اللہ کہا اللہ کا بیٹا کہا خدائے مجسم کہا کہ ایک نورانی خدا ہے ایک جسمانی ہے نورانی خدا اوپر ہے جسمانی خدا نیچے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کے لئے علم غیب اور قدرت ثابت کی اور سارے وہ اوصاف جو اللہ کیلئے ہیں ان کے لئے ثابت کئے تو غلو محبت میں عقائد تباہ کئے۔

اور یہود عداوت میں برباد ہوئے حتیٰ کہ ان کے بارے میں کہا کہ یہ ولد غیر ہیں۔ بد ز روائے

آدمی یوسف نجار سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام پر انہوں نے تہمت لگائی۔

بہر حال عقائد میں ان دو چیزوں سے خلل پڑتا ہے اور کبھی عقل لڑانے سے اس لئے کہ للہ کی بھیجی ہوئی چیز ہو اس میں عقل کی گنجائش نہیں۔

مثلاً قرآن کریم یا حدیث میں فرمایا گیا کہ عذاب قبر برحق ہے اور وہ اپنی جگہ ہوتا ہے۔ اب لوگوں نے عقل لڑائی کہ ہم نے قبر کھود کر دیکھی ہمیں تو اس میں عذاب نظر آیا نہیں وہاں تو ایک لاش پڑی ہوئی تھی وہاں نہ کوئی آگ تھی نہ سانپ نہ بچھو۔ تو ہم اس عقیدے کو کیوں مانیں عقل لڑائی تو عقیدہ بگڑ گیا۔۔۔!

حدودِ عقل

حالانکہ یہ عمل سے بالاتر چیز ہے وہ دوسرے عالم کی چیز ہے لاش پڑی ہوئی ہو اور سب کچھ گزر رہا ہو ممکن ہے کہ آپ کو نظر نہ آئے۔

آپ ایک سوتے ہوئے آدمی کو دیکھیں کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں۔ تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا ہوں اور میرے سامنے ہزاروں غلام خدام کھڑے ہیں اور فوجیں سلامیاں دے رہی ہیں۔ مگر آپ یہ دیکھ رہے کہ یہ پڑا ہوا سو رہا ہے نہ وہاں حشم و خدم ہیں نہ سپاہی اور اس پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو نظر نہیں آ رہا۔۔۔ اس لئے کہ وہ ایک دوسرے عالم، عالم مثال سے گزر رہا ہے روح نیند کے وقت نکل کر اس عالم میں پہنچی تو وہاں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ آپ کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

جب وہ خود سویا ہوا اٹھ کر بیان کرے کہ میں نے یہ خواب دیکھا آپ اس کی تصدیق کریں گے تو خواب میں اس نے لذت و راحت بھی اٹھائی اور عزت بھی پائی آپ کو کچھ نہیں آیا مگر آپ نے یقین کیا۔ تو جیسے ایک سونے والے پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو کچھ نظر نہیں آتا تو حدیث میں ہے کہ:

النوم اخت الموت

"نیند موت کی بہن ہے"۔

تو جو چیز نیند میں گزرتی ہے وہ موت کے بعد بھی گزر سکتی ہے فرق اتنا ہے کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے آپ کو ایک لاش نظر آ رہی ہے مگر اس پر سب کچھ گزر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں جو دوسرے پر گزر رہی ہو۔

یا ایک چارپائی پر دو آدمی سو رہے ہوں ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ میں! بادشاہ بن گیا ہوں ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ سپاہی مجھے ڈنڈے مار کر جیل خانے میں لے جا رہا ہے ایک خواب میں ہنس رہا ہے اور ایک رو رہا ہے مگر ایک دوسرے کی خبر نہیں جو اس پر گذر رہی ہے اس کی دوسرے کو خبر

نہیں حالانکہ ملے ہوئے ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔۔۔ اسی طرح اگر ایک قبر میں دو مردوں کو دفن کر دیں ایک اللہ کا مطیع ہے ایک مجرم ہے۔ ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ قبر میں بہترین نعمتیں میرے سامنے ہیں اور ایک دیکھ رہا ہے کہ بدترین عذاب میرے اوپر ہے اس کی اسے خبر نہیں اس کی اسے خبر نہیں اور آپ دیکھیں گے کہ دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں نہ نعمت ہے نہ عذاب ہے۔

جب دنیا میں اللہ نے ایک نظیر رکھ دی ہے اسمیں جب نعمتیں اور مصیبتیں گزرتی ہیں تو مرنے کے بعد اگر قبر میں راحت اور مصیبت گزرے، عذاب اور ثواب ہو اس میں کون سے تعجب کی بات ہے دینا میں اس کی نظیر موجود ہے۔۔۔ لیکن اگر عقل لڑائی گے تو عقیدہ بگڑ جائیگا اس لئے کہ عقل کا وہاں کام نہیں۔

عقل ہوا مٹی آگ پانی کے اس دار فانی میں کام کرنے کے لئے ہے یہاں کی چیزوں میں عقل چلے گی۔ یہاں کی عقل سے وہاں کی چیزوں میں کام لینے لگیں تو وہاں یہ نہیں چلے گی۔

امور غیبیہ اور عقل

یہ بالکل ایسا ہے جیسے ترازو جو پیتل کی چھوٹی سی ہوتی ہے اس پر سونا اور چاندی تلتا ہے۔ ایک ذرا بڑی ہوتی ہے اس میں حلوئی تلتا ہے ایک اس سے بڑی ہے اس میں ایندھن اور سوختہ تلتا ہے اور ایک اتنی بڑی ہے کہ اس میں ہزاروں ٹن کا ریل کا ڈبہ تلتا ہے اس میں اتنے ٹن وزن ہے، دس ہزار ٹن کا ایک جہاز ہے اس میں ایک مشین لگی ہوئی ہے تو کانٹا بتلا دیتا ہے کہ اتنے ہزار کا جہاز ہے اب اگر جہاز کو کانٹے پہ تولنے لگیں تو کیا تل جائیگا؟ ایندھن تولنے کی ترازو پر ریل کے ڈبے کو رکھ دیں تو کیا وہ تل جائیگا؟ حلانکہ یہ بھی ترازو ہے وہ بھی ترازو ہے، مگر یہ ترازو سونا تولنے کی یہ گیہوں تولنے کی اور یہ ترازو لکڑیاں تولنے کی ہے۔ اور یہ ترازو ریل کا ڈبہ تولنے کی ہے ہر ترازو میں وہی چیز تلے گی جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ چھوٹی ترازوؤں میں بڑی چیز تلنے لگے۔۔۔ تو عقل بھی ایک ترازو ہے مگر اس میں محسوسات تولے جاتے ہیں وجدان اور وحی بھی ایک ترازو ہے جس میں غیبی امور تولے جاتے ہیں باطن بھی ایک ترازو ہے جس کے اندر قبر اور ثواب تولا جاتا ہے اب اگر آپ آنکھ سے قبر کا عذاب اور ثواب تولنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے سونے تولنے کے کانٹے میں ریل کے ڈبے کو تولنے لگیں وہ نہیں تلے گا بلکہ وہ ترازوں ہی ختم ہو جائے گا تو اگر عقل پر غیبی امور کا بوجھ ڈال دیا جائے تو وہ سسک کر مر جائیگی فیصلہ ان کا کیا کریگی؟ تو آپ دنیا کی ترازو سے آخرت کی چیزیں تولنے لگیں تو وہاں عقل کیا کام کرے گی؟ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے تو سونے تولنے کی ترازو میں الکڑی تولنے لگیں وہ نہیں تلیں گی۔۔۔ بہر حال کبھی عقائد میں عقل لڑانے سے بگاڑ آتا ہے کہ عقائد کی چیزیں ہیں عقل وہاں کام نہیں کرتی گویا آپ نے عقل کے کانٹے میں عقیدے کو تولنا شروع کر دیا۔

حدودِ ادراک دنیا کے اندر آنکھ کا کام نظر ہے۔ کہ صورتیں دیکھے اور رنگ دیکھنے آپ یوں کہیں کہ میں آنکھ سے خوشبو سونگھوں، نہیں سونگھ سکتے، اس کے لئے ناک ہی کام دے گی۔

ناک خوشبو سونگھتی ہے آپ ناک کے ذریعے کسی چیز کو دیکھنا چاہیں کبھی نہیں دیکھ سکتے کان آوازیں سنتے ہیں، آپ یوں چاہیں کہ کان سے رنگ دیکھ لوں کبھی نہیں دیکھ سکتے، حالانکہ ایک چہرے میں یہ ساری چیزیں جمع ہیں، آنکھ، ناک، کان، گلہ ان میں انچ انچ بھر کا فاصلہ ہے مگر ایسی سد سکندری حائل ہے کہ آنکھ کے دائرے میں کان اور کان کے دائرے میں ناک کام نہیں کر سکتی، اپنے اپنے دائروں میں کام کرتے ہیں۔ تو عقل کا بھی ایک دائرہ ہے اور باطن کا بھی ایک دائرہ ہے اب اگر میں گنگا کے کنارے پر بیٹھ کر معلوم کرنا چاہوں تو مجھے کیا معلوم ہوگا کہ گنگا کے اندر کیا برکت ہے، کون سے نبی آئے تھے کن کے آثار ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کو پتہ چل گیا۔ اس لئے کہ باطن کی آنکھ تھی ان پر منکشف ہو گیا کہ واقعی اس پانی میں کچھ برکات کے آثار ہیں اور پیغمبروں کی طرف نسبت ہے۔ اس لئے قوم کی قوم اس کی عظمت پر لگی ہوئی ہے۔

تو ہر چیز سے اس کے دائرے کی چیزیں تولی جاتی ہیں۔ عقل سے عقلی امور، آنکھ سے، رنگ و صورت، ناک سے خوشبو بدبو اور کان سے آوازیں۔ پھر ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے۔ تو اسی طرح سے ایک دائرہ وحی خداوندی کا ہے وحی بتلا سکتی ہے کہ قبر کیسی ہے، جنت و دوزخ کیسی ہے۔ پل صراط کیسا ہے۔ میزان عمل وہ جس میں اعمال تولے جائیں گے" وہ کیسی چیز ہے۔ آپ عقل سے جاننے لگیں گے نہ سمجھ سکیں گے یہ عقل سے بالاتر چیز ہے، جو وحی سے سمجھ میں آئے گی، بہر حال ہر چیز کا ایک دائرہ ہے۔

منبع عقائد تو عقیدہ کبھی عقل سے بگڑتا ہے کہ ہے غیر عقلی چیز اس میں عقل لڑانی شروع کی تو یا سچے عقیدہ کا انکار کریں گے یا غلط عقیدہ گھڑ لیں گے دین برباد ہو جائیگا۔ اور کبھی عقیدہ غلو محبت سے بگڑتا ہے کہ اپنے اعتقاد والے بزرگوں سے اتنی محبت بڑھ جائے کہ آدمی فنی بن جائے جو وہ کہیں اسی کو آدمی شریعت سمجھ لے، جو وہ کہیں اسی کا عقیدہ بنالے کیونکہ عقیدے شریعت کے ہیں ان میں اس سے بگاڑ پیدا ہوگا اور کہا جائیگا کہ عقیدے پیغمبر سے لئے جائیں گے اولیاء سے عقیدے نہیں لئے جائیں گے، علماء عقیدے بنانے والے نہیں ہیں، مشائخ عقیدہ قائم کرنے والے نہیں ہیں، مشائخ خود پابند ہیں ان عقیدوں کے جو اللہ کے رسول نے بتلائے ہیں، علماء خود ان عقائد کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول نے ارشاد فرمائے عقیدہ خدا کی خبر سے بنتا ہے، علماء کے کہنے سے عقیدہ نہیں بنتا لیکن محبت میں ان کے ہر قول و فعل کو آدمی عقیدہ بنالے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت اور دین کے اندر خلل پیدا ہوگا۔

اور کبھی غلو عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی جماعت یا کسی شخص سے عداوت پیدا

ہو جائے۔ ضد یا عناد پیدا ہو جائے' اچھی سے اچھی بات بھی کہیں گے تو یہ غلط کہے گا' اس لئے کہ بدگمانی پہلے قائم کرلی۔ وہ صحیح عقیدہ بھی بیان کریں گے تو غلط کہے گا' نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط عقیدے پر قائم ہو جائے گا' اور صحیح عقیدے سے محروم رہے گا تو عقائد کو بگاڑنے والی کبھی عقل ہوتی ہے کہ غیبی امور میں دخل دے۔

ضرورتِ اعتدال

کبھی محبت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا محبت پیدا کر لے اور کبھی عداوت کا غلو ہوتا ہے اور بے جا عداوت پیدا کرے' اس لئے شریعت نے اعتدال بتلائی۔ عربی کا ایک شعر ہے جس کا ترجمہ ہے:

''اگر کسی سے محبت کرو تو اعتدال سے کرو' افراط کے ساتھ مت کرو' ممکن ہے کہ کل کو دشمنی پیدا ہو جائے کہ آج محبت میں آ کے سارے راز کھول دیئے اور کل کو ہو گئی دشمنی تو خود اس کے ہاتھ میں آ گئے' جدھر چاہے تمہیں لے جا کے پٹخ دے' اب پچھتاؤ گے کہ محبت میں سارے راز میں نے کھول دیئے''۔

اور فرمایا کہ کسی سے عداوت کرو تو اعتدال سے کرو ممکن ہے کہ کل کلاں دوست بن جائے تو عداوت میں آ کر جو برا بھلا کہا ہے کل کو تمہاری آنکھ نیچی ہوگی کہ ہم نے بہت برا بھلا کہا تو کیوں افراط و تفریط سے چلتے ہو' محبت کرو تو اعتدال سے' عداوت کرو تو اعتدال سے' نفس کے جذبے سے محبت ہو نہ عداوت ہو' اس لئے کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

کمالِ ایمان

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا:

من احب لله و ابغض لله واعطى لله ومنع لله فقد استكمل الايمان

جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے نفس اور اپنی ذات کے جذبے سے نہیں کی رضاء خداوندی کے لئے عداوت باندھی کہ یہ اللہ کا دشمن ہے' مجھے بھی اس سے عداوت ہے۔ یہ اللہ کا دوست ہے میں بھی اس سے محبت کروں کسی کو دیا تو اللہ کی رضا کے لئے دیا اور کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے روکا۔ عطاء و منع اور محبت و عداوت سب لوجہ اللہ ہوں تو اس شخص نے ایمان کامل کر لیا تو کمال ایمان یہ ہے کہ محبت اور عداوت لوجہ اللہ ہوں' ذاتی جذبہ اور غیض کا دخل نہ ہو' دینا اور لینا وجہ اللہ ہو محض ذاتی جذبہ نہ ہو کہ فلاں سے محبت ہو گی تو سب دے ڈالو اور فلاں سے عداوت ہوئی تو روک لو نہیں بلکہ دیکھوں اللہ کے نزدیک اسے دینا پسندیدہ ہے یا نہیں۔ پسندیدہ ہو تو دو اگرچہ نفس نہ چاہئے اور اگر اللہ کے نزدیک اگر دینا پسندیدہ نہیں تو ہرگز نہ دو اگرچہ نفس دینا چاہئے تو اپنے کو ایک طرف ڈالو اللہ کی رضا کو مقدم رکھو' تو حاصل ایمان کا یہ ہے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اگر آپ زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے زندہ ہونے کو تیار ہیں اور اگر اموت دیں تو میں آپ پر فدا ہو جاؤں گا دل آپ سے اٹک چکا ہے جو آپ کریں جس سے راضی اس سے میں راضی ہوں تو بندے کا کام یہ ہے کہ رضاء خداوندی میں فنا ہو جائے کہ میری رضا کچھ نہیں جو رضاء ہے وہ اللہ کی ہے میرا لینا دینا اور محبت وعداوت سب اللہ کی رضا کے تابع ہے۔

ممنونیت اِحسان

اور خود میرے حق میں بھی نفس کے تابع نہیں ہے۔
کسی غلام سے کسی نے کہا تھا کہ تو کیا کھائے گا؟

اس نے کہا جو آقا کھلا دے۔۔۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے کام کیا کریگا؟ جو آقا کام لے۔۔۔ اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے۔ اس نے کہا کہ اگر میری اپنی مرضی ہوتی میں غلام ہی کیوں بنتا میرے غلام بننے کے معنی یہ ہیں کہ اب میری مرضی بھی غلام میرا ارادہ اور خواہش بھی غلام جو کچھ ہوگا آقا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔۔۔ وہ کھلا دیں گے تو کھالیں گے نہیں کھلائے گا تو نہیں کھائیں گے وہ کام لے تو کام کریں گے معطل چھوڑ دے تو معطل ہو جائیں گے تو ہم اپنے آقا کے تابع ہیں۔

جی ایک انسان ایک انسان کے ذرا سے احسان کی وجہ سے اتنا تابع ہوتا ہے تو رب العزت تو سارے محسنوں سے برتر محسن ہیں جب اس کا بندہ بنیں تو بندگی کے معنی ہی ہیں کہ ہر چیز اس کے تابع کر دی نہ میری اپنی مرضی نہ اپنی رضا نہ میرا ارادہ جو کچھ ہو وہ انکا ہی ہے یہ شان جب پیدا ہوگئی تو کہا جائے گا کہ آج انسان میں بندگی آگئی۔ آج اس کے اندر عبدیت آئی۔

شانِ عبدیت

اگر اپنا ارادہ اپنے عزائم ہیں تو پھر وہ بندہ کیا ہے؟ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ فلاں جگہ جاؤں اور جا کر دین پھیلاؤ رخصت ہوتے وقت اس مرید خلیفہ نے عرض کی کہ حضرت مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔

فرمایا دو نصیحتیں کرتا ہوں:

ایک خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور ایک نبی ہونے کا دعویٰ نہ کرنا۔

وہ حیران ہوا کہ حضرت کیا مجھ سے آپ کو یہ توقع تھی کہ میں خدائی کا دعویٰ کر دوں انکا مرید اور انکا نائب اور خدائی کا دعویٰ کرے۔

اور کیا آپ کے یہ توقع تھی کہ میں نبی ہونے کا دعویٰ کروں گا۔ یہ ادنیٰ مسلمان بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ آپ کا مرید اور نائب خدائی اور نبوت کا دعویٰ کرے۔

فرمایا پہلے اس کے معنی سمجھ لو خدا کے معنی ہیں کہ جو کچھ وہ فرمائیں وہ ہو کر رہے وہ اٹل ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہوگا وہ درپردہ خدائی کا مدعی ہے چاہے زبان کے واسطے سے نہ کہے۔

اور نبی کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو فرمادیں وہی صدق اور حق ہے ممکن نہیں کہ نبی کا کہنا ہوا غلط جو آدمی یوں کہے کہ یہی صحیح ہے اس کے علاوہ سب غلط فی الحقیقت نبوت کا مدعی ہے چاہے زبان سے نہ کہے اس لئے میں نے کہا کہ نہ خدائی کا دعوی کرنا نہ نبوت کا دعوی کرنا۔

انسان جب یہ دعویٰ کرے کو جو میں کہہ رہا ہوں اٹل ہے وہی ہوگا یہ درپردہ خدائی کا دعویٰ ہے جو میں کہہ رہا ہوں وہ اٹل ہے یہ درپردہ نبوت کا مدعی ہے اسے یوں کہنا چاہئے کہ جو اللہ نے کہا ہے وہی حق ہے میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں جو اللہ کے رسول نے کہا وہی حق ہے میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں جو اللہ چاہے وہی ہوگا میرا چاہا ہوا پورا نہیں ہو سکتا:

وَمَا تَشَآئُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ.

اگر یوں کہے تو ہے بندہ۔ اور اگر یوں کہے کہ میں جو چاہوں وہی ہوگا تو درپردہ خدائی کا مدعی ہے جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے باقی سب غلط ہے یہ درپردہ نبوت کا دعویٰ ہے یہ تفویض اور عبدیت کے خلاف ہے بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کہا جائے وہ اس کی رضاء کے لئے ہو حتی کہ ہر نقل و حرکت اس کی رضا کے لئے۔

جیسے مولانا رومی نے فرمایا،

"اے اللہ اگر آپ ہمیں علم دیں اور ہم علم کے میدان میں آئیں تو آپ کے محل اور ایوان و قصر میں داخل ہوگئے اور اگر آپ جہالت میں رکھیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہیں ا کے بندے علم میں لیآئیں تو آپ کے محل میں داخل ہوگئے اور اگر جیل میں لے آئیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہوگئے"۔

اگر آپ سلادیں تو ہم بے بس ہیں اور اگر آپ بیدار رکھیں تو آپ کے ہاتھ میں ہیں نہ خواب ہماری نہ بیداری ہماری جو کچھ دیا ہوا ہے وہ آپ کا ہے تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ ادھر کا منشاء ہو اس کی آدمی تابعداری کرے۔۔۔ جب آدمی اپنی بات چلائے عقل چلائے غلو محبت یا غلو عداوت چلائے تو درپردہ اوہیت و نبوت کا مدعی۔۔۔ اس کا کام یہ ہے کہ اللہ کے آستانے کے آگے جھکے توحید کے معنی ہیں یہ ہیں کہ دل سے بھی ایک ہی کو یکتا اور کرتا دھرتا سمجھے اور عمل سے بھی ایک ہی کی طرف جھکے۔

اقسامِ توحید اسی لئے شریعت اسلام نے توحید دو قسم کی بتلائی ہے ایک توحید اعتقادی اعتقاد بھی یہ کہ ایک ہی اللہ ہے جو معبود ہے وہی علیم وخبیر ہے اور رحمٰن ورحیم ، وہی آقا وہی مالک ہے یہ عقیدہ ہے عملاً یوں جھکایا کہ زندگی کا کوئی موڑ نہیں جس میں اللہ کی طرف نہ جھکایا ہو اگر آپ سونے کے لئے لیٹیں حدیث میں حکم ہے کہ دعاء پڑھو :

باسمك اللهم اموت واحى.

اے اللہ ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر صبح کو زندہ ہوں گا۔ یہ بھی ایک مجازی موت ہے اللہ کے نام پر خاتمہ ہونا چاہئے جب آپ جاگے تو پھر شریعت متوجہ ہوئی کہ پھر اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اور کہو :

الحمد لله الذى احيانا بعد ما اماتنا واليه النشور.

"حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کے جانا ہے"۔

آفتاب غروب ہو تو فرمایا ' اللہ کی طرف توجہ کرو اور یہ دعا کرو :

اللهم هذا اقبال ليلك وادبار نهارك واصوات دعاتك فاغفرلى.

"اے اللہ ! تیرے سورج کے جانے کا وقت ہے اور تیری رات کے آنے کا وقت ہے اور تیرے منادی نداء کر رہے ہیں کہ دوڑو نماز کی طرف ایسے وقت میری مغفرت فرما"۔

غرض زندگی کا کوئی موڑ آئے شریعت نے فوراً متوجہ کیا ہے کہ توجہ الی اللہ کرو تا کہ توحید میں خلل نہ پڑے ایسا نہ ہو کہ تم سورج کو کرتا دھرتا سمجھ لو ایسا نہ ہو کہ تم روشن دن کو یہ سمجھ لو کہ یہ ہمارا کام چلانے والا ہے ایسا نہ ہو کہ رات کو تم موت دینے والی سمجھ لو کہ رات آ گئی تو مر گئے سو گئے نہ دین زندگی دیتا ہے نہ رات ، جس نے رات اور دن بنائے وہی زندگی اور موت کا مالک ہے اسی طرح کھانا کھا کے فارغ ہو تو فوراً دعا کرو :

الحمد لله الذى اطعمنا و سقانا و كفانا و آوانا.

"حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے ہمیں کھلایا جس نے ہمیں پلایا جس نے ہمیں ٹھکانا دیا"۔

تا کہ ادھر توجہ نہ ہو کہ یہ کھانا کھانا زندگی کا بڑا سبب ہے کھانے نے ہمیں زندہ رکھا ہے کھانا کیا چیز ہے ؟ فاقہ مست بھی زندہ رہتے ہیں زندگی ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے روٹی میں زندگی نہیں ہے تو روٹی کیوقت متوجہ کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روٹی کو خدا سمجھ بیٹھیں اس کو خدا سمجھیں جس نے روٹی دی تو کھانا شروع کرو تو کہو **بسم الله** اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں ختم کرو تو کہو **الحمد لله كثيرا** بہت تعریف میرے پروردگار کے لئے ہے جس نے کھلایا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ اگر **بسم الله** سے کھانا شروع کرے اور **الحمد لله كثيرا** ۔۔۔ پر

ختم کرے غفرلہ ماتقدم من ذنبہ اس کے پچھلے چھوٹے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں اس کی فضیلت بیان فرمائی۔۔۔ تو حاصل یہ ہے کہ زندگی کا موڑ ایسا نہ ہو گا جس میں توجہ الی اللہ نہ ہو۔

استنجا کیلئے جاؤ

دعاء بتلائی گئی :

اللھم انی اعوذبك من الخبث و الخبائث

''اے اللہ! میں ناپاک چیزوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں''۔

شیطان ہو یا کچھ اور ہو میں پناہ مانگتا ہوں۔۔۔اور جب استنجاء کر کے نکلو پھر اللہ کو یاد کرو اور کہو۔۔ :

الحمد للّٰہ الذی اذھب عنی الاذیٰ و عافانی.

''حمد ہے اس اللہ کیلئے جس نے اذیت کی چیزیں مجھ سے دور کر دیں اور اب میں اس کی عبادت کے لئے تیار ہو گیا اور میرے قلب میں نشاط پیدا ہو گیا''۔

تو آدمی یوں نہ سمجھ جائے کہ استنجاء کرنا در حقیقت صحت ہے میری صحت استنجاء کے ہاتھ میں ہے، قبض ہو گا تو بیمار ہوں قبض نہیں ہو گا تو بیمار نہیں رہا گویا قبض وبسط کے ہاتھ میں میری زندگی ہے، تو اس سے بچانے کیلئے کہا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ تو سونے جاگنے، استنجاء کرنے اور فارغ ہونے میں سورج نکلنے اور غروب ہونے میں دن کے آنے اور جانے میں اور اسی طرح گھر کے باہر نکلنے میں بھی کہ وہاں بھی متوجہ کیا کہ اب تم کام کاج کے لئے جا رہے ہو تو اللہ کی طرف توجہ کرو اور کہو :

بسم اللہ امنا باللہ. توکلنا علی اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ.

''میں اللہ کے نام سے نکل رہا ہوں میں اللہ پر ایمان لا چکا ہوں میں نے اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے کہ جو کچھ پیش آئے گا اس کی تقدیر سے پیش آئے گا کوئی مجھے نقصان پہنچانے والا بجز ایک اللہ کے نہیں ہے''۔

اسی طرح گھر میں داخل ہو تو فوراً دعاء کرو :

بسم اللہ ولجنا وبسم اللہ خرجنا وعلی اللہ ربنا توکلنا.

اللہ ہی کے نام سے ہم گھر میں داخل ہو رہے ہیں اور اللہ ہی کے نام سے نکلیں گے اور ہمیں تو اللہ پر بھروسہ ہے کسی غیر اللہ پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے تاکہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آرام دینے والا یہ گھرانہ ہے، گھرانے آدمی سے چھنتے رہتے ہیں، آج بڑی جائداد اور کئی گاؤں کا مالک، لیکن کل کو غریب بن گیا تو وہ خدا نہیں ہے وہ دینے والا نہیں ہے، وہ اسباب کے درجہ میں ہے۔۔۔

غرض ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرائی ہے۔۔۔ تو ایک توحید اعتقادی ہے کہ دل میں یہ یقین رکھے کہ اللہ کی ذات اور ساری صفات یکتا ہوں اور ایک ہی میں ہیں دوسرا اس کا مثل

نہیں۔۔۔اور دوسری عملی توحید ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک ہی کی طرف متوجہ کیا ہے فقط نماز روزے ہی میں نہیں معاشرہ میں چلنے پھرنے میں گھر آنے جانے میں مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے میں سفر میں جانے اور آنے میں بھی ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرو یہ توحید عملی ہے تاکہ عمل کے ایک ایک گوشہ میں تم اللہ ہی کی طرف پہنچو کسی دوسرے تک نہ جاؤ۔

اسلام کا مزاج

تو جس دین نے ہمیں سونے جاگنے چلنے پھرنے میں ایک ذات کی طرف متوجہ کیا تو کیا وہ دین غیر اللہ کی طرف متوجہ کرے گا کہ ہم غیر اللہ کو سجدہ کریں اور غیر اللہ سے ہم پناہ مانگیں غیر اللہ سے ہم مرادیں مانگیں اس دین کا مزاج ہی نہیں یہ مزاج لوگوں کی عقلوں نے پیدا کیا ہے لوگوں نے غلو محبت اور غلو عداوت نے پیدا کیا ہے اور عقائد انہیں اسباب سے بگڑتے ہیں۔ تو جب عقیدہ کا معاملہ آئے تو ان سب چیزوں سے ہٹ کر اللہ کی طرف اور عشق رسول طرف رجوع کرو جو ارشاد خداوندی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے ہماری عقل اور طبعیت اس قابل نہیں تو عقائد کا مخزن قرآن کریم یا حدیث نبوی ہے جن سے عقیدہ بنتا ہے۔

عقائد صحیحہ کی پہچان

اور قرآن کریم میں اگر خلجان پیدا ہو تو حدیث اس کی شرح ہے حدیث کے سمجھنے میں خلجان پیدا ہو تو صحابہؓ کا عمل اس کی شرح ہے صحابہ کرامؓ نے جو چیز قبول کی اور جو ان کا عمل جاری ہوا اس سے ہم دیکھیں گے کہ اللہ کے رسول کا یہی مطلب ہے ورنہ تو سب سے اول قرآن کریم ہے اس کے بعد حدیث نبوی ہے اس کے بعد تعامل صحابہؓ ہے حدیث اور تعامل صحابہؓ سے کٹ کر قرآن کریم میں محض عقل لڑائے تو وہ ہمارا عقلی عقیدہ ہو گا خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ نہیں ہو گا خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ وہی ہے جسے خدا خود فرمائے اللہ کا رسول اس کی شرح کرے انکی شرح صحابہؓ کا عمل و تعامل کر دے تو اول کتاب اللہ پھر سنت رسول اللہ پھر تعامل صحابہؓ کا درجہ ہے۔

اور اعمال صحابہؓ میں اگر خلجان ہو پھر عام لسنت کا عمل ہے یعنی علماء امت اور ربانیوں کا عمل ہے کہ جو دین پہنچانے والے ہیں ان کا طریق عمل کیا رہا ہے؟ محدثین فقہاء متکلمین وغیرہ یہ حضرات کس چیز پر جمے ہوئے ہیں تو اس سے عقیدہ واضح ہو جائے گا قرآن نے اجمالاً کہا حدیث نے اس کی شرح کی فقہ نے تفصیل کی تعامل صحابہ نے اسے مضبوط بنایا اور امت کے علماء ربانی نے اس کو موکد کر دیا ان چیزوں سے مل کر عقیدہ بنتا ہے ان میں سے ایک چیز کو بھی آپ رکھ دیں گے تو عقیدہ صحیح نہیں بنے گا اس واسطے ضرورت پڑے گی کہ عقیدہ درست ہو اور عمل درست ہو۔

خیر بات دور نکل گئی، میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا یہ بیچ میں آ گئی۔

بین الاقوامی دین کی علامت

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی دین لے کر آئے ہیں اس واسطے قرآن کریم نے ہم پر واضح کیا کہ سارے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاؤ:

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ.

حکم ہے کہ مسلمانوں کو کہہ دو اعلان کر دو کہ ہم ایمان لائے اور ابراہیم علیہ السلام پر جو صحف نازل ہوئے ان پر بھی ایمان لائے کہ وہ اپنے زمانے میں حق تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد تو اس میں بنی اسرائیل کے تمام پیغمبر آ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو نازل ہوا اور دیگر انبیاء علیہم السلام پر جو نازل ہوا خواہ وہ کسی بھی ملک سے آئے ہوں ہم سب پر ایمان لاتے ہیں ہم تفریق نہیں کرتے کہ اس نبی پر ایمان لاؤ اور اس پر نہ لاؤ سب کہ ہم اللہ کا فرستادہ سمجھتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ تعصب جو پیدا ہوتا ہے وہ شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ میرا متبع ہے میں اسے مانتا ہوں اور یہ تمہارا متبع ہے میں اسے نہیں مانتا یہیں سے جھگڑا شروع ہوتا ہے اور جو سارے مقتداؤں کو مانے تو جھگڑا کہاں باقی رہا؟ اسلام نے سارے مقتداؤں کو ماننا بتلایا تو بین الاقوامی دین اسلام ہی ہو سکتا ہے اگر اسلام یوں کہے کے عرب میں جو پیغمبر آئے ہیں انہیں تو مانو، شام حجاز اور ہندوستان و سندھ میں جو آئیں انہیں مت مانو یہ تعصب ہوتا۔ یہ بین الاقوامی دین کی علامت نہیں ہوتی بین الاقوامی دین کے معنی یہی ہیں کہ تعصبات کی جڑ کاٹ دی جائے، تعصب شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے، جب ہم ساری شخصیتوں پر ایمان لائے ہیں تو ہند، سندھ میں کئی پیغمبر آئے ہوں ہمیں نام معلوم ہوں یا نہ ہوں ہم بالاجمال ایمان لاتے ہیں تو اقوام کے اندر سے غیض اور غصہ نکل جائے گا غصہ تو جب ہو جب ہم کسی پیغمبر کو برا کہیں وہ ہم سے لڑے گا ہمارے پیغمبر کو برا کہے تو ہم لڑیں گے اگر آنے والا یوں کہے کہ میں تمہارے پیغمبر کو بھی مانتا ہوں اپنا جان کر اور تم میرے پیغمبر کو بھی اپنا جان کر مانو لڑائی ختم ہو گئی، تو پہلا تعصب شخصیتوں کا ہے اسلام نے اس کو مٹا دیا یہ علامت ہے وہ بین الاقوامی دین ہے وہ پوری دنیا کے لئے آیا ہے پوری دنیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی اگر وہ برا بھلا کہتا کہ فلاں جگہ کے نبیوں کو مت ماننا اور ہند، سندھ کے پیغمبروں کو مت ماننا تو سندھ و ہند کی اقوام ہم سے الگ ہوتیں ہم ان سے الگ ہوتے ہیں اور جب سب کو مانا تو کسی کے دل میں غیض نہیں رہا۔ تو یہ بین الاقوامی دین کی علامت ہے۔۔ اور اگر کوئی یوں کہے کہ میرا پیغمبر کو مانو اور فلاں

جگہ کے پیغمبر کو مت ماننا تو یہ تعصب و تنگ نظری کی علامت ہے۔

ایک یہودی سے گفتگو

میرا افریقہ جانا ہوا تو ہمیں پرس (یعنی بٹوے) خریدنے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں افریقہ سے حجاز مقدس جانا تھا تو احرام میں گھڑی مسواک کا ہے میں ڈالتے کپڑا تو نہیں پہن سکتے۔۔۔ تو ہمارے میزبانوں نے کہا کہ پرس بنانے کی ایک بہت بڑی فیکٹری ایک یہودی کی ہے وہاں انواع و اقسام کے پرس بنتے ہیں وہاں چلیں بہتر سے بہتر پرس ملے گا چنانچہ ہم وہاں پہنچے' تو ہمارے میزبانوں نے پہلے جا کے کچھ میرا تعارف کرا دیا کہ ہندوستان سے آیا ہے اور دار العلوم دیوبند کا ذکر وغیرہ وہ یہودی جو ارب پتی تھا وہ استقبال کے لئے باہر نکلا بڑی آؤ بھگت کر کے اپنی فیکٹری میں لے گیا۔۔۔ خیر اس نے کہا کہ اپنے پرس پسند کر لیں بعد میں بیٹھ کر بات چیت کریں گے ہم نے پرس پسند کئے مگر ہم نے کہا کہ ان پرسوں میں جو ہینڈل ہے وہ چھوٹا ہے ہمیں گلے میں ڈالنے کے لئے چاہئے اس نے کہا میں ابھی بنوائے دیتا ہوں اس نے آڈر دیا کہ ان کا جو فیتا ہے وہ لمبا کر دو تاکہ گلے میں ڈالنے کے قابل ہو جائے وہ دید یجئے اور کہا کہ وہ بن کر آجائیں گے اتنے میں ہم آپس میں بات چیت کریں وہ بات چیت ہوتی رہی' اس میں اس نے کہا کہ کوئی مذہب کی بات بتائیے میں کہا کہ میں مذہب کی کیا بات بتلاؤں آپ اپنے مذہب پر ہیں میں اپنے مذہب پر ہوں لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کہنے لگے' آپ کچھ کہئے۔۔۔ میں نے کہا آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ کہنے لگا بالکل نہیں مانوں گا۔۔۔ میں نے کہا پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ہمارے دشمن ہیں ہم آپ کے دوست ہیں۔۔۔ کہنے لگا یہ کیسے؟ میں نے کہا کہ ہم تو آپ کے دوست ہیں۔۔۔ اس لئے کہ آپ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ہم ان کو اپنا پیغمبر جانتے ہیں کہ ذرہ برابر اگر موسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جائے گا اس لئے جو آپ کے پیغمبر ہیں وہ ہمارے پیغمبر ہیں۔ اس لئے ہم مسلمان بن نہیں سکتے جب تک موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائیں اور آپ یہودی بن نہیں سکتے جب تک حضور ﷺ کو نہ جھٹلائیں اور یہ نہ کہیں کہ معاذ اللہ حضور ﷺ نے جو کچھ کہا وہ غلط تھا تو آپ انہیں جھٹلائے بغیر یہودی نہیں بن سکتے ہم تصدیق کئے بغیر مسلمان نہیں بن سکتے تو ہم آپ کے دوست ہیں آپ ہمارے دشمن ہیں۔۔۔ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا۔۔۔ چپ ہو کر کہنے لگا کچھ اور کہئے۔۔۔ میں نے کہا کہ ہم ایماندار ہیں آپ بالکل ایمان سے خارج ہیں۔۔۔ کہنے لگا کہ یہ کیسے؟ میں نے کہا ایمان ماننے کا نام ہے' نہ ماننے کا ایمان نہیں ہے' ہم سب کو مانتے ہیں حضور ﷺ کو بھی حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور سارے پیغمبروں کو بھی' آپ حضور ﷺ کو مانتے ہیں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں تو نہ ماننے والے کا ایمان نہیں ہے ماننے کا نام ایمان ہے' اس لئے ایمان سے خارج ہیں ہم ایمان میں داخل ہیں۔

کہنے لگا اور کچھ کہئے۔۔۔ میں نے کہا اب رہنے دیں۔۔۔ کہنے لگا کچھ تو کہئے۔۔۔ میں نے کہا آپ کے اندر عداوت بھری ہوئی ہے' ہمارے اندر بھری ہوئی ہے۔ اس لئے کہ محبت ہے۔۔۔ آپ کے ہاں نہ ماننے کا ایمان محبت کا نام ہے جب ہم ایمان لائے تو سارے انبیاء سے محبت رکھتے ہیں۔۔۔ آپ کے ہاں نہ ماننے کا نام ایمان ہے اور عداوت کا سرچشمہ ہے' اس واسطے آپ عداوت سے بھرپور ہیں ہم محبت سے بھرپور ہیں۔

کہنے لگا! بس کافی ہو گیا اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اب میں بات چیت کرنے کو برا مانوں گا۔۔۔ تو حقیقت یہی ہے کہ ایمان ماننے کا اور محبت کا نام ہے' مومن وہی ہے جو سارے اللہ والوں کو مانے وہ مومن نہیں ہے جو بعض انبیاء علیہم السلام کو مانے اور بعض کو نہ مانے' مومن وہی ہے جو سارے اولیائے کرام کا نام عظمت سے لے' ان کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے' بعض اولیاء کو مانے اور بعض کو نہ مانے بعض کی تکفیر کر دے اور بعض کو مومن مانے' حقیقت میں یہ شخص محبت سے خالی ہے۔

بہر حال ایمان ماننے اور محبت کا نام ہے۔ اور ایمان توکل اور بھروسہ کرنے کا نام ہے' تو اللہ پر بھروسہ اور انبیاء علیہم السلام کا ماننا اور ان کی اطاعت میں سرگرم رہنا اور اطاعت بھی اس طرح کہ عقیدہ بھی درست ہو ایک ہی کو کرتا دھرتا مانے اور عمل بھی درست ہو کہ ہر موقع پر ایک ہی کی طرف توجہ ہو۔

بین الاقوامی دین کی دوسری علامت

اور جو کچھ میں نے عرض کیا کہ صبح بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ گھر سے نکلتے وقت نماز کے وقت بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ یہ سارے حضور ﷺ ہی کے اعمال ہیں' آپ سے ہی یہ ساری دعائیں منقول ہیں کہ جب آپ گھر میں داخل ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے اور جب گھر سے خارج ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے' مسجد میں جاتے تو یہ دعاء پڑھتے' تو مقصود اس سے یہی ہے کہ انسان کے قلب میں صرف ایک ذات سے محبت و تعلق ہونا چاہئے' ایک ہی کی طرف دھیان اور لگاؤ ہو۔

اور ایک سے تعلق رکھنا جب انفرادی طور پر آسان ہے ایسے ہی اجتماعی طور پر آسان ہے ایک ہی کی ذات کی نسبت سے دنیا کے تمام انسان ایک لڑی میں آ سکتے ہیں شخصیت' وطن رنگ و نسل کی نسبت سے اجتماعی وحدت پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب تک اجتماعی وحدت نہ ہو ان امور کے لحاظ سے۔۔۔ دین بھی مختلف تو کبھی بھی دین میں بین الاقوامیت نہیں آ سکتی بین الاقوامی دین وہی ہو سکتا ہے جو رنگ و نسل اور شخصیت و وطن کے بتوں کو پاش پاش کر دے اور ان سب چیزوں سے وراء الوراء کسی ایسی مقدس ذات سے انسان کو جوڑے جو سب کے لئے قابل قبول ہو اور ذات اقدس اللہ

رب العزت کی وہ ذات ہی ہو سکتی ہے اللہ رب العزت نے حقیقی پہچان اسلام دیتا ہے تو اسلام ہی بین الاقوامی دین ہو سکتا ہے کوئی اور دین نہیں ہو سکتا۔

بین الاقوامی دین کی تیسری علامت

بہر حال اسلام نے شخصی تعصب کو بھی ختم کیا اور سب کو ۔۔۔ کا حکم دیا۔ اسی طرح وطنی تعصب کو بھی ختم کیا۔ تاکہ اس کی بین الاقوامیت ہر پہلو سے واضح ہو جائے اور اس پر کوئی حرف نہ آسکے۔۔۔ چنانچہ اگر کوئی یوں کہے کہ میرا وطن بہت عمدہ ہے تمہارا وطن گھٹیا خواہ مخواہ جذبات کو مشتعل کرنا ہے میرے وطن کو برا کہہ دیا اور اپنے وطن کو اچھا کہا میری زمین کو برا کہا اپنی زمین کو اچھا کہا۔ تو اس سے آدمی میں وطنی تعصب پیدا ہوتا ہے کہ میری زمین ایسی اور تمہاری زمین گندی۔ اس سے بھی قوموں میں لڑائیں پیدا ہوتی ہیں زمین کے ٹکڑے بھی لڑائیاں کرا دیتے ہیں اس تعصب سے کبھی عقیدے اور مذہب میں خلل پڑتا ہے کہ میری زمین سے جو مذہب اگا ہے وہی مذہب ہے تمہاری زمین پر جو مذہب اگا ہے وہ ہمارا مذہب نہیں ہے بھلا مذہب کو بھی گیہوں چنے کی طرح پیداوار سمجھ لیا تو اس سے ایک تعصب پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام نے ہم وطنوں کی بھی تقدیس کی احادیث کو آپ دیکھیں یمن شام کی مدح فرمائی گئی، حجاز کی فضیلت بیان کی گئی، ہندوستان کے مناقب الگ بیان کئے ہند اور سندھ کے بارے میں بھی تعریفی کلمات فرمائے گو ہر ملک کی تقدیس کی اور ہر ملک کی خوبی بیان کی تو اسلام نے وطنیت کی جڑ نکال دی یہ مذہب کی تفریق کا ذریعہ بنتی تھی جب سارے ملک ایک ۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے اور خدا سب کا ایک ہے تو ہمارے سارے وطن! تو تعصب کہاں سے پیدا ہوگا؟ لڑائی کیسے پیدا ہوگی؟ تو اسلام نے جب وطنوں کی تعریف کی معلوم ہوا اسلام بین الاقوامی مذہب ہے اور بین الاوطانی مذہب ہے ورنہ یوں کہتا کہ صاحب! عرب کی زمین میں جو فضیلت ہے نہ ہو ہندوستان میں ہے نہ یمن میں نہ شام میں ان ملکوں کے آدمیوں سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔

افضلیت کا بین الاقوامی معیار

ہم ہر تو عرب کے لوگوں کو جانتے ہیں۔۔۔ بلکہ یہ فرمادیا گیا:

لیس لعربی علی عجمی فضل الابدین وتقوی

کسی بھی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، فضیلت ہے تو تقویٰ پارسائی اور پاکدامنی سے

ہے کہیں کا رہنے والا ہو جو متقی ہو گا وہ اللہ کے ہاں معظم اور مکرم ہے جو تقویٰ نہیں اختیار کرے گا خدا سے نہیں ڈرے گا' پاکدامن پارسا نہیں بنے گا وہ اللہ کے ہاں محبوب نہیں چاہے وہ عرب ہی کا رہنے والا ہو' تو وطنیت کی جڑ نکال دی سارے وطنوں کو اپنا وطن کہا۔ یہ دلیل ہے کہ اسلام بین الاقوامی دین ہے کوئی مقامی مذہب نہیں ہے کہ ایک زمین سے نکلا تو اس زمین والوں کے لئے ہے دوسری زمین والوں کے لئے نہیں' تو شخصیت کا تعصب مٹایا وطنیت کا تعصب بھی مٹایا۔

بین الاقوامی دین کی چوتھی علامت

کبھی رنگ سے تعصب پیدا ہو جاتا ہے جیسے افریقہ میں ہو رہا ہے کہ وہاں کالے اور گورے کی بڑی سخت تفریق ہے کالوں کی گاڑیاں الگ اور گوروں کی الگ کالوں کی بسوں میں گورے اور گوروں کی بسوں میں کالے نہیں بیٹھ سکتے گوروں کے لئے عالی شان اسٹیشن ہے اور کالوں کے لئے ایک معمولی ساویٹنگ روم بنا ہوا ہے' گورے ادھر نہیں آسکتے کالے ادھر نہیں جاسکتے ہوائی اڈے پر جو اعلیٰ ترین حصہ ہے وہ گوروں کا ہے اور ایک معمولی ہال بنا ہوا ہے اس میں کالے بیٹھتے ہیں تو اس تفریق کی وجہ سے ایک خاص تعصب وہاں پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کالے گوروں کے اور گورے کالوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں' کالوں کے بس میں آجائے تو گوروں کو گولی سے اڑا دیں اور گوروں کے بس میں آجائے تو کالوں کو ختم کر دیں تو رنگ کی وجہ سے تعصب پیدا ہو گیا۔۔۔ مگر اسلام نے اس تعصب کو مٹا دیا اور ارشاد فرمایا:

بعثت الی الاسود والاحمر۔

میں کالے اور گورے کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں' کالے بھی میرے گورے بھی میرے ہیں' جو میرے خدا کا حکم مان لے وہ میرا ہے چاہے وہ کالے رنگ کا ہو چاہے وہ گورے رنگ کا ہو۔۔۔ تو گورے اور کالے رنگ کا فرق مٹایا۔ اور شخصیتوں کا فرق الگ مٹایا' یہی تو اس دین کے بین الاقوامی ہونے کی علامت ہے کہ پورے عالم کے لئے یہ مذہب ہے اس لئے یہ فرمایا گیا کہ۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ

پہلے تو یہ کہو کہ جتنے بھی انبیاء ہیں ہم سب پر ایمان لائے ان انبیاء پر جو کتابیں نازل ہوئیں ان سب پر ہم ایمان لائے اپنے اپنے وقت میں وہ سب حق تھیں' اگر برائی پیدا کی تو اقوام نے پیدا کی' انبیاء اور کتابیں اس سے بری ہیں تغیر اور تبدل اقوام نے کیا ہے۔

پھر یہ انبیاء علیہم السلام سارے وطنوں میں آئے جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ

تو جن رسولوں پر ہم ایمان لائے جب وہ ہر وطن میں ہیں تو سارے وطن ہمارے نزدیک

مقدس ہیں۔ جس وطن میں پیغمبر آئے ہم کہیں گے وہ وطن ہمارے نزدیک مقدس ہے وہاں بھی اللہ والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اسلام سارے وطنوں کے لئے ہے کسی ایک وطن کیلئے نہیں ہے وہ سارے افراد بنی آدم کے لئے ہے کسی ایک شخص کے لئے نہیں ہے کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے وہ سارے رنگوں کو اپنا تا ہے تو اس میں کالے گورے کی کوئی تمیز نہیں تو جس میں یہ تفریقیں مٹ جائیں۔ سمجھو کہ وہ مذہب بین الاقوامی ہے جہاں یہ تفریقیں موجود ہیں سمجھو کہ وہ مقامی مذہب ہے وطنی مذہب ہے تو کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے وطن میں جا کے داخل ہو۔ یہ حق تو بین الاقوامی مذہب کو ہے کہ وہ ساری دنیا میں پھیلے۔

بین الاقوامی دین ہونے کا معیار

یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ دھڑے بندی مت کرو ایک اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ کوشش کرو کہ اللہ کا پیغام سند کے ساتھ ہمیں ملے گا۔

اس لئے کہ دین نقلی ہے اور نقل کے لئے روایت کی ضرورت ہے اور روایت کے لئے سند کی ضرورت ہے تو سند تلاش کرو مقصد یہ کہ سندی اور تاریخی طور پر کونسا دین پیغمبر تک پہنچتا ہے اور بیچ میں پہنچانے والوں کو سب کو ہم پہچانتے ہیں ہوں کہ یہ اس کا راوی ہے یہ اس کا راوی تو سند کے ساتھ جو دین پیغمبر تک پہنچ جائے وہ واجب الاعتقاد ہو گا جس کی سند نہ ہو گویا قصے اور کہانی کے طور پر آ رہا ہے ہو سکتا ہے اس میں غلطیاں داخل ہو گئی ہوں ہو سکتا ہے اس میں کچھ برائیاں داخل ہو گئی ہوں۔ لیکن سند کے ساتھ جو چیز آئے گی اس میں برائی نہیں آ سکتی۔۔۔ قرآن کو یا حدیث کو دیکھو ایک ایک آیات کی سند پیغمبر تک پہنچی ہوئی ہے مثلاً اگر میں یوں کہوں کہ میں نے قرآن کریم حضرت قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم سے حفظ کیا انہوں نے قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے حفظ کیا انہوں نے قاری عبداللہ صاحب مرحوم سے ' قاری عبداللہ صاحب نے قاری محمود صاحب مصری سے اور قاری محمود صاحب نے اپنے استاذ سے اور اس طرح سند میں نبی کریم ﷺ تک پہنچا دوں پھر نبی کریم ﷺ پر قرآن جبریل علیہ السلام سے پہنچا اور جبریل امین کے قلب میں حق تعالیٰ شانہ نے القاء کیا گویا ایک حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ تک پہنچی ہوئی ہے میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں شاید کوئی مذہب اس طرح سند نہیں پیش کر سکے گا اگر انجیل والوں سے پوچھو کہ یہ انجیل کہاں سے آئی تمہارے استاذ کو نہیں۔ ممکن ہے ایک دو اساتذہ تک بتلا دیں۔ آگے غائب۔۔۔ یہودیوں سے پوچھو کہ تورات لانے والے کون ہوں راوی کون کون ہیں؟ تاریخ ندارد ہے کیا خبر کسی نے کیا تصرف کیا۔ زیادہ کیا یا کم کیا۔ جب سندی دستاویز نہیں تو تصرفات ہو سکتے ہیں تو سب سے پہلے دیکھنے کی چیز تاریخ اور سند متصل کہ اللہ تک ملی ہوئی ہو تو قرآن و حدیث کے سوا

ہم انصافاً کہتے ہیں کہ کوئی سند ہوئی نہیں۔۔۔اس کی رو سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انجیل بھی حق ہے۔اگر قرآن نہ بتلائے تو ہمیں خبر نہیں تھی کہ انجیل حق ہے یا نہیں قرآن نے کہا کہ تورات حق ہے تو سند صحیح کے ساتھ معلوم ہوا کہ واقعی حق ہے۔ تو اسلام نے سند متصل کے ساتھ پیغمبروں کا پتہ دیا۔ ہم نے مانا' ایمان لائے۔

تو اصل چیز ایمان لانے کی سند ہوتی ہے۔۔۔اگر آج موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری ماننے کے قابل ہے تو نبی کریم ﷺ کی پیغمبری زیادہ ماننے کے قابل ہے مگر موسیٰ علیہ السلام پر اللہ نے معجزے نازل کئے کہ ہاتھ گریبان سے نکالا تو سورج کی طرح روشن۔ اور عصا پھینک دیا تو اژدھا بن گیا اور یہ ان کی نبوت کی دلیل ہے تو اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں معجزے نبی کریم ﷺ کو حق تعالیٰ نے عطا کئے۔ آپ کی انگشتان مبارک سے چشمے پھوٹ پڑے اور چودہ سو آدمیوں نے اپنے مشکیزے بھر لئے آپ کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہوا۔ آپ کو معراج کے لئے عرش تک پہنچایا گیا۔ پتھروں نے اسے سلام کیا۔ درندوں نے ا کی شہادت دی کہ :

اشھد انك رسول الله

ایسی روایات سند متصل کے ساتھ اور نقل صحیح کے ساتھ موجود ہیں جن کی سند ہم حضور ﷺ تک پہنچا سکتے ہیں مسلمانوں نے پچاس ہزار آدمیوں کی جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں ان کی تاریخ مرتب کر دی کہ یہ ان کا کیریکٹر تھا یہ ان کا خاندان تھا یہ ان کی نسل تھی یہ ان کی سچ اور جھوٹ کی کیفیت تھی ایک ایک چیز جمع کی تو آج جس سند سے ہم روایت کریں گے اس سند کے ایک ایک فرد کی تاریخ بھی بیان کر سکیں گے کہ ہمارے استاد یہ تھے تو ان کی یہ شان تھی ان کے استاد یہ تھے تو ان کا یہ کردار تھا اسی طرح آگے سلسلہ ہے اس طور پر پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ مرتب ہے جن سے قرآن و حدیث ہم تک پہنچا تو سب سے پہلی چیز سند و روایت ہے' تو قرآن کی سند سے بڑھ کر کوئی سند نہیں۔ اور کتابوں کی ہم سند ہی نہیں پاتے۔ قرآن حکیم کی سند کے ہر ایک کے زمانے میں لاکھوں افراد موجود ہیں جنہوں نے قرآن کریم حفظ کیا اگر معاذ اللہ کوئی قرآن کریم کو دریا برد بھی کر دے تو منٹ بھر میں پھر لکھا جائے گا ہزاروں لاکھوں حفاظ موجود ہیں :

بَل هُوَ اٰيٰتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

"اللہ نے یہ آیتیں اہل علم کے سینے میں محفوظ کر دی ہیں"۔

اگر صندوقوں میں قرآن محفوظ ہوتا تو صندوقوں کو دریا میں بہایا جا سکتا تھا۔ زمین میں دفن کرتے تو زمین اس کو گلا دیتی۔ ہوا میں رکھتے تو ہوا کاغذوں کو اڑا دیتی۔ اللہ نے ایسی جگہ حفاظت کی کہ نہ وہاں آگ جا سکے نہ پانی نہ مٹی اور وہ اہل علم کے قلوب ہیں ان میں محفوظ ہے اسی طرح وہاں شیطان اور جن بھی نہیں جا سکتے تو قرآن کی حفاظت یہ ہے کہ ایک وقت میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں

حدیث کی حفاظت یہ ہے کہ ایک ایک ٹکڑے کے لئے اللہ کے رسول تک سند موجود ہے۔۔۔ تو اتنا مستند کلام تو معتبر نہ ہو اور جس کی کوئی سند نہ ہو وہ معتبر ہو جائے؟ اگر وہ ماننے کے قابل ہے تو سب سے پہلے یہ ماننے کے قابل ہے۔ اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیھما السلام پر ایمان لانا ضروری ہے تو محمد ﷺ پر ایمان لانا ان سے زیادہ ضروری ہے۔

جو وہاں دلائل ہیں ان سے بڑھ کر یہاں دلائل موجود ہیں اس لئے اسی دین کو اختیار کرنا چاہئے۔

فکرِ فردا

ایسے دین کے ہوتے ہوئے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنی موت اور آخرت دیکھ کر آخرت کو سیدھا کرے، دین کا بڑا کام یہ ہے کہ آخرت درست کرے، اس لئے کہ مرنا مجھے بھی ہے تمہیں بھی یہ سارے قصے یہیں ختم ہو جانے والے ہیں، نہ کوئی بوڑھا باقی رہے گا نہ کوئی جوان بالآخر اسی پروردگار کے آگے جانا ہے جس نے پیدا کیا ہے اور جہاں سے ہم آئے ہیں:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يعيده

جس نے ہماری ابتداء کی ہے اسی کی طرف ہماری انتہا بھی ہے، وہی مبدا ہے وہی معاد بھی ہے وہیں سے چلے ہیں وہیں لوٹ کر جانے والے ہیں، تو جب ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں اللہ کے آگے کھڑا ہونا ہے، ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے، تو آدمی غور کرے اور سمجھے کہ میں وہاں کے لئے تو کچھ سامان کروں۔

اور وہاں کا سامان روٹی کا ٹکڑا تو ہے نہیں؟ وہ دین ہی ہو سکتا ہے، تو دین وہ ہو جو مستند ہو سند متصل کیساتھ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہو، جس پر آدمی یقین کر سکے کہ یہ دین ہے۔۔۔ تو غور و فکر کرنا ہم سب کا فرض ہے خواہ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ ہر ایک کو اس کے ہاں جانا ہے اور ہر ایک کو اس سے ملنا ہے۔

اور موت کا کوئی وقت ہمیں تو معلوم نہیں۔ خدا جانے کب آجائے یہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے۔ یہ خیال کرنا کہ ابھی تو جوانی ہے، بڑھاپا جب آئے گا دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ہم تندرست ہیں بیماری آئے گی تو دیکھی جائے گی کیونکہ موت تو بیماری سے آتی ہے۔۔۔ تو بھئی! موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے نہ بیماری شرط ہے نہ بچپن شرط ہے، بوڑھے بچے جوان سبھی مرتے ہیں تندرست بھی مرتے ہیں مریض بھی مرتے ہیں۔ بعضوں کے ہارٹ فیل ہو جاتے ہیں۔ اچھے بھلے تندرست ہوتے ہیں مگر منٹ بھر میں ختم ہو جاتے ہیں تو یہ شیطانی دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا تو بہ کر لیں گے اور غور کر لیں گے کیا خبر ہے بڑھاپا آئے گا یا نہیں؟ کیا پتہ پہلے ہی چلتے بنیں۔۔۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں، زیادہ موت جوانوں کو آتی ہے بوڑھوں

کو نہیں۔۔۔اس لئے کہ آپ مجمعوں پر نگاہ ڈالیں تو بوڑھے کم نظریں پڑیں گے جوان زیادہ نظر آئیں گے یہ اس کی علامت ہے جوان زیادہ مرتے ہیں اس لئے اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے تو بوڑھے مجموں میں زیادہ نظر پڑتے مگر وہاں جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے پہلے ختم ہو جاتے ہیں تو نوجوانوں کو زیادہ موت آتی ہے بوڑھوں کو کم آتی ہے، بڑھاپے تک لوگ کم پہنچتے ہیں غرض اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ جب بڑھاپا آئے گا جب سوچ لیں گے، جب بیماری آئے گی جب سوچ لیں گے موت کی جب علامتیں شروع ہوں گی جب سوچ لیں گے۔۔۔ وہ تو یکدم آجاتی ہے۔ کھڑے پیر آجاتی ہے۔

در پیش منزل

تین پیغمبر ہیں جن کو اچانک ہی موت واقع ہوئی ہے، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور یوسف علیہم السلام تینوں کی موت اچانک ہوئی ہے تو جب انبیاء علیہم السلام اس دنیا سے اچانک گزر سکتے ہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ ہم کس چیز پر غرہ کریں؟۔۔۔ بہر حال موت کے لئے ظاہری علامت ضروری نہیں کئی آدمی بیٹھے بیٹھے گزر گئے۔ ہزاروں واقعات اس قسم کے ہیں۔ اس لئے جب سب کو یہ منزل در پیش ہے تو سب کو اس کی فکر کرنی چاہئے اور اپنے ضمیر سے سوچنا چاہئے۔

دین حق کی آسان پہچان

آدمی کا دل بڑا مخلص ہوتا ہے۔ دل منافق نہیں ہوتا۔ دل آدمی کو صحیح مشورہ دیتا ہے ادھر ادھر کے دوست غلط مشورہ بھی دے دیں مگر دل مطمئن نہیں ہوتا جب تک آپ صحیح بات سوچ کر سامنے نہیں رکھ دیں گے اس لئے اپنے ضمیر سے سوچیں اور غور کریں کہ دینوں کے اندر واقعی کونسا دین حق ہے، سند اور روایت کے لحاظ سے دیکھو تو کس کی تعلیم زیادہ ستھری، منقی اور ممتاز تعلیم ہے کہ حق و باطل اس میں نکھرا ہوا ہے۔۔۔ اور جب ذہن میں آجائے اور دل گواہی دے تو فوراً آدمی کو قبول کرنا چاہئے پھر اس پر نہ رہے کہ قوم کیا کہے گی۔ اور میرے رشتہ دار کیا کہیں گے۔ وہاں نہ رشتہ دار کام آئے گا نہ قوم کام آئے گی۔ وہاں تو اپنا دین اور عمل کام آئے گی۔ اور اللہ کے آگے تو تنہا پہنچنا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آگئے تم تن تنہا ہمارے پاس جیسے ہمارے پاس سے تنہا گئے تھے

کیونکہ تمہارے پیدا ہونے کا کوئی شریک نہیں تھا۔ ہم نے تنہا بھیجا اور تم تنہا پہنچے۔ آج اسی طرح ہمارے پاس آئے ہو جیسے ہم نے پیدا کیا تھا اور جن چیزوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا تھا انہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ جن کو تم نے دوست سمجھ رکھا تھا کہ یہ ہمیں بخشوالیں گے۔ (ان سب کو پیچھے چھوڑ آئے ہو؟) آج ہم تمہارے کوئی سفارشی نہیں دیکھتے۔ کوئی مددگار نہیں دیکھتے، جن کو تم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے شریک ہیں جو اللہ کے ساتھ مل کر ہمیں نجات دلائیں گے۔ آج وہ تمہارے شفیع اور سفارشی کہاں ہیں؟ وہ سب امیدیں تمہاری قطع ہو گئیں۔ اور جو کچھ تم نے سوچ رکھا تھا وہ سب گنبد سرا ہو گیا۔

اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ دین کے بارے میں آدمی اپنے ضمیر سے غور کرے، اپنے دل سے مشورے اپنی موت اور اپنی آخرت کو سامنے رکھ کر سوچے یہ سامنے رکھ کر نہ سوچے کہ میرے ساتھ سامان کتنا ہے، میرے ساتھ مشورہ دینے والے کتنے ہیں؟ میرے عزیز کتنے ہیں؟ یہ کوئی نجات دلانے والے نہیں، نہ کوئی ساتھ جانے والا ہے، ضمیر ساتھ جائے گا۔ اعتقاد اور ایمان ساتھ جائیگا۔ عمل ساتھ جائیگا اسی لئے انہیں کو اپنے ساتھ رکھو۔

حضرت حاتم اصم کا واقعہ

حضرت حاتم اصمؒ جو حضرت شفیق بلخی کے مرید ہیں اور خلیفہ بھی ہیں۔ بزرگوں سے ہیں۔ حضرت شفیق بلخی کے ہاں تینتیس برس رہے وہیں تربیت پائی اور تعلیم باطن حاصل کی۔ تینتیس برس کے بعد شفیق بلخی نے پوچھا کہ تینتیس برس میرے پاس رہے تم نے کیا حاصل کیا؟

عرض کیا کہ میں نے آٹھ مسئلے سیکھے ہیں:

فرمایا کہ کل آٹھ مسئلے؟ عرض کیا جی ہاں کل آٹھ مسئلے!

فرمایا کہ میرا بھی وقت ضائع کیا اپنا بھی وقت ضائع کیا۔ بندہ خدا تینتیس برس میں کل آٹھ مسئلے؟ فرمایا آخر وہ آٹھ مسئلے کیا ہیں؟

عرض کیا کہ:

انتخاب محبوب

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے دنیا میں دیکھا کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی سے محبت ہے اور کہ وہ اپنی محبوب کی فکر میں ہے اور وہ مجھ سے راضی ہو اور میں اس سے مل جاؤں مجھ میں اور اس میں جدائی اور فراق نہ ہو۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سارے محبوب جدا ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی محبوب قبر میں ساتھ جاتا ہے جس سے محبت کی تھی نہ وہ دستگیری کرتا ہے اس واسطے میں نے قرآن کریم میں یہ دیکھا کہ عمل آدمی کے ساتھ جاتا

ہے تو میں نے اعمال صالحہ کے ساتھ محبت کی، اور سب سے محبت ترک کر دی تاکہ میرا محبوب قبر میں بھی میرے ساتھ رہے اور الگ نہ ہونے پائے تو ایک مسئلہ تو میں نے یہ سیکھا ہے کہ سارے محبوب چھوڑ کر ایک عمل صالح کو محبوب بنالیا ہے اس لئے کہ کوئی محبوب قبر میں ساتھ نہیں جائے گا نہ بیوی نہ دوست نہ بچہ، عمل آدمی کے ساتھ جائے گا اس لئے اس کو محبوب بنالیا اور سارے محبوبوں کو ترک کر دیا۔

تعیینِ دشمن دوسرا میں نے یہ دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک کو کسی نہ کسی سے عداوت بھی ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش اور فکر میں رہتا ہے۔ اور دوسرا اس کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا ہے تو اس میں دشمنی ٹھن جاتی ہے، لیکن سارے دشمن ایک دن ختم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ تن تنہا رہ جائے گا اب کس کی دشمنی سے آدمی بچے فوج سے بچے سپاہی سے بچے بچھو سے بچے سانپ سے بچے سارے دشمن ہی دشمن ہیں تو بچنے میں مشکل ہو گی۔ ہزاروں دشمن ہیں اور آدمی کا دل ایک ہے تو بچنے کے لئے کہاں کہاں جائے؟۔۔۔ تو میں نے قرآن کریم دیکھا۔۔۔ اس میں ہے کہ:

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا

"شیطان تمہارا دشمن ہے جو اخیر تک دشمنی کرے گا"۔

تو میں نے ایک سے دشمنی بنا کے سب سے دشمنی قطع کر لی تو میں شیطان سے لڑتا ہوں اس سے لڑوں گا تو سب دشمن ختم ہو جائیں گے سارے دشمنی کی بنیاد، شیطان ہی ہے۔ للہذا میری کسی سے دشمنی نہیں کسی سے عداوت نہیں تو دوسرا مسئلہ میں نے یہ سیکھا۔

بااعتماد ذات تیسرا مسئلہ یہ ہے میں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک نے کسی نہ کسی پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے روپے پر سہارا کر رکھا ہے کہ میرے گھر میں دولت ہے جو چاہوں گا کروں گا۔ کسی نے غلہ پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے حکومت پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے رشتہ دار پر سہارا کر رکھا ہے میں نے قرآن کریم میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سارے سہارے ختم ہو جائیں گے صرف ایک اللہ کا سہارا ہے جو باقی رہے گا۔

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ

"جو اللہ پر بھروسہ کرے اللہ اس کے لئے کافی ہے"۔

تو میں نے ایک کو سہارا بنایا باقی سہاروں کو ترک کر دیا۔۔۔ تو یہ میں نے تیسرا مسئلہ سیکھا ۔۔۔ اسی طرح سے انہوں نے اور مسائل بیان کئے۔۔۔ تو حاصل یہ ہوا کہ ایک کو اپنا سہارا بناؤ ایک

کو معبود بناؤ پھر اسی کی طرف جھکو' دنیا کی عداوت بھی چھوڑ دنیا کی محبت بھی چھوڑ واگر محبت کرو تو اللہ کے لئے عداوت باندھو تو اللہ کیلئے' جس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب تمہارا ایک ہی ہے اور مبغوض شیطان ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمن سمجھو اس سے دشمنی ٹھان لو۔ اللہ سے دوستی کرلو اور اپنے ضمیر سے فیصلہ کرالو تو مطلب یہ ہے کہ دین اور آخرت کی بات آدمی کو تنہ سوچنی ہے' اس میں کوئی سہارا نہیں خود اپنے ضمیر سے فیصلہ کرالو۔ اپنے دل سے سوچ لو اور خوب چھان بین کرلو جب حق واضح ہو جائے۔ علی الاعلان اس کو مان لو یہ نہ دیکھو کہ کون کیا کہے گا؟ کون کیا کہے گا؟ کہنے والے کہا ہی کرتے ہیں ان کی باتوں کا قطعی دھیان نہ کیا جائے' اپنے ضمیر کی آواز کو دیکھا جائے۔

صاحبِ دور کا اتباع مدار نجات ہے

تو قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ تم اپنے ایمان کو مضبوط کرو۔ ایمان کو تعصبات میں دخل نہ دو۔ نہ شخصیتوں کے تعصبات کو۔ نہ رنگ و بو کے تعصبات کو۔ نہ زمین کے ٹکڑوں کے تعصبات کو' نہ وطن اور قوم کے تعصبات کو۔ صرف ایک اللہ پر بھروسہ کرو۔ ایک نبی کی بات مانو۔ کہ اس دور میں صرف انہی کے ماننے میں نجات منحصر ہے' جس کا دور اور زمانہ ہو گا اسی کے ماننے میں نجات منحصر ہے۔ یا کوئی یوں کہے کہ موسیٰؑ کو مانتا ہوں اور نجات ہو جائے گی یہ غلط ہے' صاحب زمان نبی کریم ﷺ ہیں ان کا دور ہے' ان کے ماننے میں نجات ہے' دوسروں کے ماننے میں نجات نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

لو كان موسى حيا لما وسعه الااتباعى

آج اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو کر آئیں گے تو میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ان کی نجات بھی میرے ہی دین کے ماننے میں ہے۔ اس لئے کہ میں صاحب وقت اور صاحب زمان ہوں' میری شریعت کا دور دورہ ہے آج پریزیڈنٹ وقت فخر الدین علی احمد ہیں' ہندوستان کا قانون ان کے دستخطوں سے جاری ہو رہا ہے۔ آج پچھلے لوگ صدر نہیں اگر ان سے کوئی زندہ بھی ہو اور کوئی یوں کہے کہ میں اس قانون کو مانتا ہوں جو پچھلے صدر کے زمانے میں جاری ہوا۔ اور ان کے قانون کو نہیں مانتا تو وہ باغی سمجھا جائے گا اس کو پھانسی کی سزا ہوگی کہا جائے گا کہ آج ان کا دور ہے انہی کے قانون میں نجات ہے۔ آج کسی اور صدر کا قانون نہیں چلے گا۔

یا کوئی سابقہ صدر یوں کہے کہ میں چونکہ پریزیڈنٹ رہ چکا ہوں اب بھی میرا وہی مقام ہے' میں چاہے کسی کی مانوں چاہے نہ مانوں۔ میں اب بھی پریزیڈنٹ ہوں' گورنمنٹ رہ چکا ہوں گورنمنٹ مقدمہ کرے گی کہ آج کا پریزیڈنٹ فخر الدین علی احمد ہے آج تم نہیں ہو' تمہیں ان کا اتباع کرنا پڑے گا جو وہ قانون دیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ اب تمہاری صدارت کا زمانہ نہیں ہے۔ تو جو

صاحب دور اور صاحب زمان ہوتا ہے اس کے ماننے میں نجات منحصر ہوتی ہے تو نبی کریم ﷺ کا دور مبارک جب آ گیا اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اور اپنے شریعت اور قانون لا کے رکھا تو آج نجات اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔

آج کوئی کہے کہ میں تورات کو مانتا ہوں یا کہے انجیل کو مانتا ہوں نجات نہیں ملیگی' ان کا دور ختم ہوا۔ آج کا دور قرآن کا ہے۔ اسی کے ماننے میں نجات منحصر ہے۔

بہر حال اس آیت سے یہ مسئلہ نکلا کہ تعصبات میں دخل مت دو ایمان قبول کرو

لا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ ہم سب کے بارے میں تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں۔

انکارِ قرآن تمام کتب کے انکار کو مستلزم ہے

اور ہمیں کس نے منوایا؟ یہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہے' آپ کا ماننا سب سے پہلے ہے۔ آپ کو ماننا سب کو ماننا ہے۔ قرآن کو مانا تو انجیل اور تورات کو بھی مانا۔ زبور کو بھی مانا۔ قرآن کریم کا انکار کیا تو کسی چیز کو بھی نہ مانا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی تو سند صحیح موجود ہیں اور تورات و انجیل کی سند موجود نہیں۔ یہ تو قرآن کریم نے بتلایا کہ یہ آسمانی کتابیں ہیں اس لئے قرآن کے ذریعے ان کو بھی مانیں گے' اس لئے قرآن کریم نے فرمایا۔۔۔۔ومہیمنا علیہ

قرآن کریم تمام کتب سماویہ کا محافظ

قرآن کریم تمام پچھلی کتابوں کا محافظ ہے' اور ان کے اندر جو تعلیم حق ہے وہ قرآن نے جاری کر دی' اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔

اس لئے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا عیسائی بنے گا عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا۔ اسی طرح جو مسلم بنا وہ صحیح معنی میں موسائی بنا۔ کہ اس نے سند متصل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔ وہی ابراہیمی بنا وہی آدمی بھی بنا۔ یعنی آدم علیہ السلام کو مانا۔ تو سند متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے' اس نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا' اس کا ماننا سب کا ماننا ہے اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے اس واسطے ہم سب کا فرض ہے کہ دین کے بارے میں تعصبات کو چھوڑ دیں۔ دین کے بارے میں اس بات کو چھوڑ دیں کہ فلاں کیا کہتا ہے' فلاں کیا کہتا ہے' خود اپنے ضمیر پر غور کریں اور اگر ماننے کی چیز ہے تو مانیں اور برملا اس کا اظہار کریں۔

یہ چند باتیں اس آیت کی روشنی میں مجھے عرض کرنی تھیں خدا جانے کہ میں اس میں کامیاب ہوا کہ نہیں اور آیت کے سلسلہ میں جو مقاصد ہیں وہ پیش ہو سکے یا نہیں؟ مگر بہر حال جو استطاعت تھی وہ چند جملے میں نے عرض کر دیئے 'خدا کرے کہ نافع ہوں۔

اور جب آیت میں آپ غور کریں گے تو یہ باتیں منکشف ہو کر آپ کے ذہن میں گھومیں گی جتنا سوچیں گے اور انشاء اللہ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور اس سے اچھے نتائج اخذ کریں گے بہر حال یہ چند باتیں میں نے عرض کر دیں دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کا حق دکھلائے اور باطل کو باطل دکھلائے۔

اللهم ارنا الحق حقاو ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ربنا لاتزع قلوبنا بعد اذهدتينا وهب لنا من لدنك رحمه انك انت الو هابُ.

اللهم انا نعوذبك من الحور بعد الكور

اللهم لا تنزع منا صالح ما اعطيتنا ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فى امرنا وثبت اقدامنا وانصرناعلى القوم الكفرين...(آمین)

۱۴۔ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ

بر سبیل تذکرہ

۷۔۸ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۱۔۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء دارالعلوم حقانیہ کا وہ عظیم الشان سالانہ دستار بندی اجلاس منعقد ہوا۔ جو ظاہری و معنوی امتیازات و برکات کے لحاظ سے دارالعلوم کی تاریخ میں امتیازی اور افادی حیثیت سے دور رس نتائج کا حامل رہے گا۔ اپنی روایتی آب و تاب، مسلمانوں کے بے پناہ خلوص و محبت، اکابرین و عمائدین ملک وملت کی بزرگانہ و مخلصانہ ہمدردیوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الاسلام فخر الاماثل مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم کی شمولیت بابرکت نے اجلاس کی رونق افادیت اور کامیابی کو اوج کمال تک پہنچادیا۔ اللہ تعالیٰ کے بے پناہ انعامات و اکرامات ہی کا ثمرہ ہے کہ ابتداء تاسیس دارلعلوم حقانیہ نے اپنے مادر علمی گہوارہ علم و عمل مرکزِ عقیدت، حصن حصین اسلام دارلعلوم دیوبند کے رشتہ محبت اور وابستگی کی سعادت وفلاح کامیابی و ترقی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھا ہے، چنانچہ اس سال جب سالانہ اجلاس دستاری بندی کے لئے حضرت المخدوم المعظم قاری صاحب مرحوم کو دعوت دی گئی تو انہوں نے شرف پذیرائی بخشتے ہوئے مذکورہ تاریخیں مقرر فرماکر ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو دارالعلوم میں قدم رنجہ فرمایا۔ ۲۱ اکتوبر کو فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی فرمائی اور جامع مسجد دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا۔ ان تقریبات میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کے علاوہ پاکستان کے اکثر اکابر "جیسے شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غور غشتی" حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی، شیخ الحدیث و التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی مولانا محمد مفتی نعیم لدھیانوی مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی اور بے شمار ارباب علم و فضل موجود تھے۔ ۲۱۔۲۲ اکتوبر کی درمیانی رات کو حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی وہ بہترین سحر انگیز حکیمانہ تقریر ہوئی جس نے اہل علم و فضل ارباب فکر و فہم اور عامتہ المسلمین کے ہزاروں کے مجمع کو گھنٹوں تک یکساں محو رکھا تھا۔ ہر ہر جملہ میں حضرت حجتہ الاسلام سیدنا الامام محمد قاسم النانوتوی کے انوار و تجلیات کی جھلک اور قاسمی علوم و معارف کا شان استدلال و عقلیت نمایاں تھا مظہر انوار قاسمیہ حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے اپنے اس مخصوص روایتی دلکش خطاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں عقل و درایت کی پختگی کے ساتھ فلسفیانہ مگر عام فہم انداز میں کائنات عالم کے اس اشرف و اعلیٰ نوع مخلوقات انسان کی حقیقت اور پھر اس کے مقاصد و منافع تخلیق اور وجوہات افضلیت اور امتیازی خصوصیت پر سیر حاصل بحث فرمائی اور اس ذیل میں بے شمار اسرار و حکم کی طرف رہنمائی کرکے فکر و نظر کے لئے ایک شاہرہ کھول دی۔ الحاد و دہریت سائنس اور مادیت کے اس ہیجانی وطوفانی دور میں ایسے ہی استدلال زور بیان اور تجربہ و حقائق

سے مادیت اور مغربیت زدہ پریشان اذہان و افکار کو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور گم گشتہ راہ انسانیت کو اپنی حقیقت و مقام سے شناسا کرایا جاسکتا ہے آخر علوم الٰہی ربانیہ کے سواوہ کون سی خوبی ہو سکتی ہے جو اس ادنی و ضعیف مخلوق خاکی انسان کو خلافت ربانی کے مقام جلیل پر کھڑا کر سکتی ہے؟ معارف نبوت و رسالت کے سواوہ کون سی روشنی ہے جس کو لے کر انسان ہدایت وسعادت کی بام رفع "نیات نبوت" پر فائز ہو سکتا ہے؟

انہی حقائق و معارف کی جانب حضرت قاری صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں ہماری رہنمائی کی ہے، بیان کی دلکشی، تقریر کی جاذبیت، مضامین کی افادیت اور جامعیت اور خود حضرت موصوف کی جامع الکمالات پر کشش شخصیت نے مجمع میں کان علی رئوسھم الطیر کا منظر پیش کر دیا۔

اور جلسہ کے اختتام کے فوراً بعد ملک کے اطراف واکناف سے اس تقریر کی مانگ شروع ہو گئی خود دارالعلوم حقانیہ نے بھی ضروری سمجھا کہ ان ارشادات کو افادہ عام کے لئے شائع کیا جائے دوران تقریر میں بعض حضرات خصوصاً برادر عزیز مکرم و محترم مولانا شیر علی صاحب فاضل و مدرس دارالعلوم حقانیہ نے حتی الوسع بلفظہ قلم بند کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ضبط بیان میں قدرے اجمال و کوتاہی ہونی لازمی تھی۔ جسکی وجہ سے ضروری سمجھا گیا کہ حضرت قاری صاحب مسودہ تقریر پر نظر ثانی فرمادیں، چنانچہ اسی غرض سے تیار شدہ مسودہ حضرت موصوف کی خدمت میں دیوبند بھیج دیا گیا، حضرت قاری صاحب مرحوم نے توالئی اسفار، کثرتِ مشاغل کے باوجود گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر مسودہ پر نظر ثانی فرمائیں۔ اور توضیح تعبیرات تفصیل مضامین کے لئے خود حضرت کے الفاظ میں "باوجود غیر معمولی مصروفیت کے رات دن لگ کرا سے مرتب کیا اور گویا سارا مسودہ از سر نو خود ہی لکھنا پڑا"۔

اس بنا پر اب یہ بصیرت افروز تقریر ایک گرانمایہ تصنیف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اگرچہ کچھ دیر سے شائع ہو رہی ہے لیکن قیمتی انسانوں اور بے شمار فوائد کی بنا پر یہ تکوینی تاخیر، خیر و حسن کا موجب بن رہی ہے، رب جلیل اس علمی و تبلیغی احسان کے بدلے حضرت قاری صاحب کو تمام اہل علم اور مسلمانوں کی جانب سے اجر جزیل عطا فرمادے شکر اللہ مساعیھم اور قارئین کو فرمان خداوندی وھدوا الی الطیب الایہ کے مصداق زمرہ ہمیں شامل کر دے، برادر محترم مولانا سید شیر علی شاہ صاحب شکریہ کے مستحق ہیں جن کی شبانہ روز سعی و محنت سے یہ گنج گرانمایہ قارئین کے ہاتھ تک پہنچ رہا ہے۔ تسہیل فہم اور ترتیب مضامین کے لئے عنوانات ضروری سمجھے گئے جو ناچیز کے لگائے ہوئے ہیں اس لئے تعبیر مفہوم میں نقص و کوتاہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب کی اہمیت و عظمت کے بناء پر اسے ظاہر خوبیوں سے بھی

آراستہ کیا جائے تاہم ناتجربہ کاری کی بناء پر پورے طور پر کامیابی نہیں ہو سکی۔ دوسرے ایڈیشن میں انشاءاللہ العزیز اس کا تدارک کیا جائے گا۔

یہ مجموعہ حضرت قاری صاحب کے تجویز کردہ نام "انسانی فضیلت کا راز" سے موسوم کیا جاتا ہے

والکتاب یقرء من عنوانه؎

داد یم تراز گنج مقصود نشان
گر ما نرسیدیم شاید تو برسی

والحمد لله اولاً واخراً والیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه

محمد سمیع الحق کان اللہ لہ
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
۳ شعبان ۱۴۰۷ھ۔ ۱۲ فروری ۱۹۹۵ء

تہنیت

(تبریک ودعوت)

نحمدو و نصلی علی رسوله الکریم
وعی الله واصحابه اجمعین

آج بتاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ احقر حسب دعوت حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک حاضر ہوا۔ اور دارالعلوم ہی میں قیام کیا۔ آٹھ سال کے بعد اس سرچشمہ علم میں حاضری کا یہ دوسرا موقعہ ہے۔ ۱۹۵۰ء میں احقر اس وقت حاضر ہوا تھا جب کہ اس مدرسہ کے لئے نہ کوئی مستقل جگہ تھی نہ مکان۔ ایک مسجد میں غریبانہ انداز سے اساتذہ وتلامذہ نے کارِ تعلیم شروع کر دیا تھا لیکن آٹھ سال کے بعد آج دارالعلوم کو اس شان سے دیکھا کہ اس کے پاس شاندار عمارت بھی ہے۔ وسیع میدان بھی ہاتھ میں ہے۔ اس کے وسیع نظم ونسق کے لئے مختلف انتظامی شعبہ جات بھی ہیں۔ شعبہ تعمیر مستقل حیثیت میں اپنا کام بھی کر رہا ہے۔ اور تعمیرات بھی روزافزوں ترقی پر ہیں۔ طلبہ کی کثرت ہے۔ اساتذہ ماہر فنون کافی تعداد میں جمع ہیں۔ ۲۶۰ طلبہ فارغ التحصیل کی دستار بندی بھی ہوئی جن میں مختلف پاکستانی علاقوں کے علاوہ کابل وقندھار کے طلبہ بھی ہیں ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد بھی رکھی جا رہی ہے۔ خلق اللہ کا رجوع ہے اعتماد ہے اور وہ پورے بھروسہ کے ساتھ پروانہ وار اس شمع علم کے ارد گرد فدائیت وعقیدت کے ساتھ ہجوم کر کے آ رہے ہے

ہیں۔ حتیٰ کہ مدرسہ کے جلسہ نے ایک "عظیم الشان علمی جشن" کی صورت اختیار کرلی ہے اور بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج اسے صوبہ سرحد کی سب سے بڑی اور مرکزی درسگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سات سال کی مختصر مدت میں یہ ظاہری و باطنی ترقیات بجز اس کے کہ کارکنوں کے اخلاص و للّٰہیت کا ثمرہ کہا جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ ان مخلصین میں رئیس المخلصین حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑوی ہیں جن کے اخلاص و ایثار کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہر فن استاد کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بہ مجبوری اٹک میں مقیم ہوئے اور دارالعلوم دیوبند آج تک ان کی جدائی پر نالاں ہے۔ ان کی سادہ لوح اور مخلصانہ طبیعت اور خدمت ہی نے اس سات سال کی قلیل مدت میں اس مکتب کو مدرسہ اور مدرسہ سے دارالعلوم بنادیا ہے۔ اس دارالعلوم کے احاطہ میں پہنچ کر احاطہ دارالعلوم دیوبند کا شبہ ہونے لگتا ہے اور بالآخر یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اس نے اپنی صورت و سیرت میں دارالعلوم دیوبند کی صورت و سیرت کو محو کرلیا ہے اور وہ دارالعلوم دیوبند ہی بن گیا ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس سرچشمۂ فیض اور اس کے بانی کو اپنے فضل و کرم کے سایہ میں تادیر قائم رکھے اور مسلمانان پاکستان کے لئے یہ مدرسہ نور ہدایت اور مینارہ روشنی ثابت ہو!

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

محمد طیب عفرلہ

مدیر "دارالعلوم دیوبند" وارد حال اکوڑہ خٹک

انسانی فضیلت کا راز

ذی شعور مخلوق، ملائکہ، جنات، حیوانات، انسان میں سے علم صرف انسان کو بخشا باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہوا تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطے سے ہوا۔ سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے۔ شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبیعہ، علوم وہبیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیت نہیں۔ یہ اور انواع کو بھی میسر ہیں کیونکہ یہ تمام علوم اپنے اندر اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں اور وہ قویٰ جانداروں میں کم و بیش رکھے گئے ہیں۔ عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبیعت ہر ایک چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی کو بندھے گا۔ اس سے خود اس کے نفس کی مرضی و نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آ سکتی ہے اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوت و رسالت کے ذریعہ آتا ہے۔ اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کی خصوصیت علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الہیہ یعنی علوم نبوت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسر نہیں۔ اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور فضیلت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تو وہ علوم شرعیہ ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ...... اَمَّا بَعْدُ.........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى

وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ. صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ.

دار العلوم کا موضوع اور مقصد

بزرگان محترم!

یہ اجتماع دار العلوم حقانیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا ہے جس میں آپ اور ہم سب اس جگہ جمع ہوئے ہیں دار العلوم کا موضوع اور مقصد سب جانتے ہیں کہ مسلمان کو ظلمت جہالت سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف لے جانا ہے۔ اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے موزوں و مناسب یہی تھا کہ میں تقریر کے لئے علم ہی کا موضوع اختیار کروں اور غالباً اسی مناسبت سے اور حضرات مقررین نے بھی اپنی تقریروں میں اب تک علم ہی کا موضوع اختیار کیا ہے اور اسی موضوع پر تقریریں ہوتی رہی ہیں تا کہ علم کی ضرورت، فضیلت اور مطلوبہ تعلیم کی نوعیت پر روشنی پڑے، اسی مناسبت سے میں نے یہ آیتیں اس وقت تلاوت کی ہیں جن میں ان مذکورامور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن میں اللہ تعالیٰ نے علم کی مطلوبہ نوعیت واہمیت بیان فرمائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ علوم کی لائن میں وہ کون سا علم ہے جو مطلوبہ اور نافع ہے؟ اور کیا اس کے آثار ہیں؟

اس وقت ان کی مختصر الفاظ میں آپ حضرت کے سامنے شرح کرنا مقصود ہے، خدا کرے آپ سمجھ سکیں میری زبان اردو ہے اور اوپر کی کچھ طالب علمانہ بھی ہے۔ جس میں طبعی طور پر کچھ عربی الفاظ بھی آئیں گے۔ ممکن ہے کہ اس کے سمجھنے میں صوبہ سرحد کے بھائیوں کو کچھ دقت ہو۔ تاہم میں سعی کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ سہل الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کروں اور بات کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کروں۔ امید ہے کہ اگر کوئی خاص لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آ سکے تو مجموعی طور پر مطلب ضرور سمجھ میں آجائے گا۔ ورنہ اور بھی کچھ نہیں تو ثواب تو بہر حال مل جائے گا۔ جو سمجھنے پر موقوف نہیں صرف سنتے رہنے پر موقوف ہے۔!

مقدمہ و تمہید

قبل اس کے کہ میں ان آیات کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کروں ایک مختصر بات جو بطور مقدمہ و تمہید ہوگی بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جس سے آیات کے مقصد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے مالک نے یہ کائنات بنائی تو اسے پوری طرح سجایا اور آراستہ بھی کیا اور اس میں طرح طرح کی ضرورتیں بھی مہیا فرمائیں۔ زمین کا فرش بنایا اور اطلاع فرمائی کہ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا زمین کو فرش بنایا اور فرش پر آسمان کا خیمہ تانا اور اسے ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ چنانچہ بتلایا کہ:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا.

اور ہم نے بنایا آسمان کو محفوظ چھت اس چھت میں روشنی کے قندیل لٹکائے تا کہ اس مکان کی فضائیں روشن رہیں اور فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا

برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج رکھے اور ان میں روشن چراغ (سورج) اور روشنی بخش چاندر کھا۔ پھر ان ستاروں کو چھت کیلئے سامان زینت بھی کر دکھایا اور اطلاع دی کہ :

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْكَوَاكِبِ

ہم نے آراستہ کیا آسمان دنیا کو زینت سے جو ستارے ہیں۔ پھر اس فرش خاک کو بستر بنا کر ایک وسیع ترین دستر خوان بھی بنایا جس سے ہر قسم کے غلے ترکاریاں پھل غذائیں اور دوائیں اگائیں۔ جس سے ہر قسم کے میٹھے کھٹے نمکین اور دوسرے ذائقوں کے پھل اور دانے نکلتے چلے آتے ہیں اور مطلع فرمایا کہ :

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ

ان سبزیوں کو نمایاں کرنے اور حیات بخشنے کے لئے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں رکھیں اور فرمایا کہ :

وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ.

پھر زمین کو فرش اور خوان نعمت بنانے کے ساتھ راہ دار بھی بنایا جس میں جگہ جگہ چلنے پھرنے کے راستے رکھے اور فرمایا کہ :

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا.

مقصود تخلیق کائنات

غرض یہ کائنات ایک عظیم ترین بلڈنگ اور رفیع الشان قصر کی حیثیت سے تیار فرمائی جس میں کھانے پینے چلنے پھرنے رہنے سہنے سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم فرمائے اس کائنات کی یہ ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز پکار پکار کر زبان حال سے بتا رہا ہے کہ ضروریات زندگی سے لبریز یہ مکان کسی ضرورت مند مکین کے لئے بنایا گیا ہے خود مقصود نہیں ہے یعنی اس میں کسی کو بسانا مقصود ہے محض مکان بنانا مقصود نہیں اور بلاشبہ کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو ان سامانوں کا حاجت مند بھی ہو اور اس میں ان سامانوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہو تا کہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس مکان کی آبیاری اور زینت ہو کیونکہ مکان مکین کے بغیر ویران اور بے رونق ہوتا ہے سو اس عالم میں ارادی کاروبار اور اختیاری تصرفات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں بسنے والی ذی شعور اور حساس مخلوق جو اس کائنات کو استعمال کر سکتی ہے۔ چار ہی قسم کی ہے۔

ذی شعور اور حساس مخلوق کی چار اقسام

ایک حیوانات ہیں جن میں سینکڑوں انواع گھوڑا گدھا بیل، بکری طوطا مینا شیر، بھیڑیا سانپ بچھو

چرند پرند درند وغیرہ ہیں۔ دوسرے جنات ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر آثار سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اور بلحاظ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسرے ملائکہ ہیں جو نوری ہونے کے سبب لطیف اور نادیدہ ہیں۔ مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں اور نر و مادہ ہونے اور نسل کشی سے بری ہیں اور چوتھے نبی نوع انسان ہیں جو زمین کے ہر خطہ میں بسے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ یہی چار مخلوقات ہیں جو اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اندر احساس شعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی بلڈنگ کے باشندے اور جائز وارث ہونے کی مستحق ہیں۔ اس زمین آسمان میں ان کے حقوق ہیں اور وہ مالک کائنات کی طرف سے ان کے حق دار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کے حقوق کو پامال کرے۔ یا انہیں منافع دینے سے بے حق کر دے۔ غذا، مکان، تن پوشی اور رہن سہن وغیرہ میں ان سب کے حقوق قائم ہیں۔ انہیں حق ہے کہ رہنے کے لئے مکان تلاش کریں۔ غذا کے لئے مناسب حال کھانا مہیا کریں۔ اندریں صورت جو بھی ان میں سے کسی کے جائز حق میں رخنہ انداز ہوگا وہ بلاشبہ مجرم اور مستحق سزا ہوگا۔

ہر نوع کے مستقل حقوق اور اسلام میں ان کی حفاظت

چنانچہ شریعت اسلام نے جس طرح انسان کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ اسی طرح حیوانات کے حقوق کی بھی پوری پوری حفاظت و رعایت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اونٹ آنحضرت ﷺ کو بلبلاتا ہوا حاضر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی حضور ﷺ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور بلبلاتا رہا آپ نے فرمایا، بلاؤ اس کے مالک کو، مالک حاضر کیا گیا، فرمایا یہ اونٹ تیری شکایت کر رہا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لادتا ہے، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ شکایت بجا ہے واقعی میں اس جرم کا مرتکب ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

دربار رسالتؐ میں اس کی چند مثالیں

بعض صحابہؓ چڑیا کے بچے پکڑ لائے اور وہ ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی پریشان حال اڑ رہی تھی۔ آپؐ نے وہ بچے چھڑوا دیئے کہ کیوں ان کی آزادی سلب کرتے ہو اور کیوں ان کی ماں کو ستاتے ہو۔

کیڑے، مکوڑے، زمین میں سوراخ کر کے اپنے رہنے کا ٹھکانا کرتے ہیں تو احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ کسی سوراخ کو تاک کر اس میں پیشاب مت کرو۔ اس میں جہاں تمہاری یہ مصلحت ہے کہ اس سوراخ سے کوئی کیڑا مکوڑا نکل کر تمہیں تکلیف نہ پہنچا دے۔ وہیں اس جانور کی بھی یہ مصلحت ہے کہ بے وجہ اس کے گھر کو خراب کر کے اسے بے گھر مت بناؤ اور اس کے ٹھکانے کو گندہ مت کرو کہ اس کا تمہیں حق نہیں۔

آنحضرت ﷺ ایک دن مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک دیہاتی کے یہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی جو آپ کو دیکھ کر چلائی کہ یا رسول اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے

پہاڑی میں میرے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیجئے کہ میں انہیں دودھ پلا آؤں۔ آپ نے فرمایا تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی! عرض کیا یارسول اللہ! میں سچا وعدہ کرتی ہوں۔ آپ نے اسے کھول دیا اور وعدہ کے مطابق دودھ پلا کر فوراً واپس آگئی آپ نے اس کے گلے میں وہی رسی پھر ڈال دی۔ اور اسے بدستور باندھ دیا اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اسے کھول کر آزاد کر دے۔ چنانچہ اس نے کھل دیا اور وہ اچھلتی کودتی اور حضور کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جا ملی"۔

اس واقعہ سے واضح ہے کہ حضورؐ نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی جانور کی رعایت تو اس کو کھول دینے سے فرمائی تاکہ ہرنی کی مامتا کی رعایت ہو اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اس کا دل نہ دکھے' بچوں کی رعایت ان کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضائع نہ ہوں۔ انسانی حقوق کی رعایت یہ ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس ہونے پر دوبارہ باندھ دیا تاکہ واضح ہو کہ انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے۔ جس میں رخنہ نہیں ڈالا جا سکتا اور اس ساتھ اس میں وفائے عہد کی بھی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک پر وفائے عہد لازم ہے۔ اس عقل مند انسان پر کیوں نہ ہو گا؟

حیوانات کے حقوق

فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ شہر کے پالتو جانوروں اور کام کاج کے حیوانات کے لئے فناءِ مصر (شہر کے قرب وجوار) میں لازمی ہے کہ کچھ زمینیں خالی چھوڑی جائیں جن میں کھیتی باڑی کچھ نہ ہو تاکہ جانور اس میں آزادی سے چریں اور گھاس اور پانی استعمال کر سکیں اور انہیں ان کا جائز حق ملتا رہے اور ان کی آزادی برقرار رہے۔

نیک طبیعت اور پاک نہاد انسانوں نے ہمیشہ ان جانوروں کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ ہمارے دار العلوم دیوبند کے محدث حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب کھانا کھانے کے بعد روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے اور کنے تو چھتوں پر ڈلوا دیتے تھے یہ پرندوں کا حق ہے اور کھانے کے ذرات اور بھورے کو چیونٹیوں کے سوراخوں پر رکھوا دیتے تھے یہ ان نہتے اور ضعیف جانوروں کا حق ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کا دل دکھانا اور اسے ستانا ہرگز جائز نہیں۔ ایک نیک شخص محض اس لئے جہنم میں جھونک دیا گیا کہ اس نے بلی کو کوٹھڑی میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیا تھا اور ایک فاحشہ عورت محض اس لئے جنت میں پہنچا دی گئی کہ اس نے ایک تڑپتے ہوئے پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچا لی تھی۔ جیسا کہ احادیث میں اس کا تفصیل سے واقعہ آتا ہے۔

شریعت اسلام نے جانوروں کے ذبیحہ میں اس کی رعایت کا حکم دیا ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح مت کرو کہ اس کا دل دکھے اور وہ اپنے بنی نوع کے فرد کو ذبح ہوتے دیکھ کر دہشت سے خشک ہو نے لگے بہرحال حیوانات کے اس دنیا میں رہنے سہنے کھانے پینے اور امن و آزادی

کے حقوق ہیں' جن کی حفاظت کا حکم اوران کے ضائع کرنے کی ممانعت ہے۔

ہاں کوئی جانور شریر اور موذی ہو تو اسے بے شک بند کرنے یا مار دینے کے حقوق بھی دیئے گئے ہیں' سو یہ جانور ہی کے ساتھ مخصوص نہیں' شریر انسان کیلئے بھی حدود قصاص' حبس دوام' قید و بند اور قتل وغارت وغیرہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ موذی جانور مثل سانپ اور بچھو کو حرم میں بھی پناہ نہیں دی گئی اور قتل الموذی قبل الایذاء کا معاملہ رکھا گیا ہے مگر اس سے حیوانات کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنات کے حقوق

اسی طرح جنات بھی اس جہان کے باشندے ہیں' جن کے حقوق ہیں' انہیں مکان غذا اور رہنے کا حق دیا گیا ہے جسے پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ جس طرح وہ ویرانوں میں رہتے ہیں ویسے ہی انہیں حق دیا گیا کہ ہمارے گھروں میں بھی بود و باش اختیار کریں' احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں بھی جنات بسے ہوئے ہیں چونکہ وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ہم اپنے کام میں' اس لئے ہمیں پتا نہیں چلتا کہ کوئی جن ہمارے گھر میں آباد ہے' البتہ جو بد طینت اور شرف فسادی ہوتا ہے اور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ فلاں گھر میں آسیب کا اثر ہے اور عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ عملیات سے اس جن کو بند کریں یا جلا ڈالیں۔ بہرحال جب جنات بدی پر آجائیں تو پھر ان کا مقابلہ' بلکہ مقاتلہ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

جنات میں مختلف صفات و مذاہب

ورنہ جہاں تک نیک اور مومن جنات کا تعلق ہے ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے گھروں سے انہیں نکالنے کی فکر میں رہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اور نیکی سے خود ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ رہی بدی اور ایذا رسانی سو وہ انسان کی بھی گوارا نہیں کی گئی چہ جائیکہ جنات کی کی جاتی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جنات میں ہر قسم کے افراد ہیں' نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ مسلم بھی ہیں غیر مسلم بھی' مشرک بھی ہیں یہودی و نصرانی بھی چنانچہ قرآن کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جنات آسمان کے دروازوں تک آجا سکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگو سے وحی خداوندی کے کچھ الفاظ اچک لاتے تھے' جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کر کے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے۔ حضور کی بعثت کے وقت ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بند کر دیا گیا تو انہیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا ہے' جس نے ہم پر یہ بندش عائد کر دی اور یہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے جس کی بدولت ہم پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کچھ جنات اس وجہ کی تلاش میں نکلے اور مشرق و مغرب میں گھومے۔ کسی نے مغرب کی راہ لی اور کسی نے مشرق کی' کسی نے شمال کو چھانا اور کسی نے جنوب کو' ان میں سے ایک جماعت کا گزر مکہ میں ہوا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اس کا طرز و انداز نرالا اور بادینہ دیکھ کر اور

یہ سمجھ کر کہ اس ہدایت کی زد ٹھیک ہمارے شر کے اوپر ہے۔ سمجھ گئے کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے ہم پر اور ہمارے شری افعال پر یہ پابندی عائد کر دی گئی۔ انہوں نے جا کر اپنے بھائیوں کو اطلاع دی کہ:

اِنَّا سَمِعنَا قُرانًا عَجَباً یَهدِی اِلَی الرُّشدِفَاٰ مَنَّا بِه.

''ہم نے تو عجیب قسم کا کلام پڑھا ہوا سنا ہے جو نیکی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے' سو ہم تو اس پر ایمان لائے''۔

جس سے معلوم ہوا کہ ان میں کافر بھی تھے جو بعد میں ایمان لائے تو ان میں کافر و مومن کی دونوں نوع نکلیں پھر آگے فرمایا:

وَلَن نُشرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا.

''اور ہم اب ہرگز شرک نہیں کریں گے نہ آئندہ کسی چیز کو اس کا شریک ٹھہرائیں گے''۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان میں موحد و مشرک کی تقسیم بھی تھی کچھ مشرک تھے اور کچھ موحد' آگے فرمایا۔

وَاَنَّه تَعَالٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لاَ وَلَدًا

'' اور یقیناً ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند ہے' اس سے کہ اس کی کوئی بیوی اور بیٹا ہو''۔

معلوم ہوا کہ ان میں بعض عیسائی تھی تھے' جو عقیدہ زوجیت اور ابنیت کے قائل تھے' آگے فرمایا۔

وَاَنَّه كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا

''اور ہم میں سے بیوقوف اللہ تعالیٰ پر حد سے زیادہ جھوٹ اور افتراء باندھتے تھے''۔

معلوم ہوا کہ ان میں ملحد بھی تھے۔ جو اپنی سفاہت اور بد عقلی سے خدا پر جھوٹ باندھ کر غیر دین کو دین باور کراتے تھے' اور وحی الٰہی کے نام سے اپنے تخیلات فاسدہ پھیلانے کے عادی تھے بہر حال اس سے واضح ہوا کہ جنات میں مختلف فرقے اور مختلف خیالات و عقائد کے افراد پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس سے ان کے قدرتی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ بدکاروں کو سزا و سرزنش کی جائے جیسے انسان کو کی جاتی ہے' لیکن ان کے حقوق کو نہیں روکا جا سکتا۔

جنات کے ساتھ رشتہ زوجیت؟

حتی کہ ان سے زوجیت کا رشتہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فقہاء میں یہ بحث ہے کہ مسلم جن عورت سے شادی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء نے اس نکاح کو جائز کہا ہے بعض نے ناجائز' جس کی نظر اس پر ہے کہ نکاح جنس سے ہوتا ہے نہ کہ غیر جنس سے' وہ یہ نکاح جائز نہیں قرار دیتے کیونکہ یہ نکاح ایسے ہی ہو گا جیسے آدمی بکری یا گائے سے نکاح کرے جانور بوجہ غیر جنس ہونے کے محل نکاح ہی نہیں اس لئے نکاح نہ ہو گا' اور جن کی نظر اس پر ہے کہ جنات میں شعور ہے اور شریعت کے مخاطب اور احکام کے مکلف ہیں نیز انسانی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ نکاح جائز قرار دیتے

ہیں۔ بہر حال جنات کے مختلف حقوق ہیں، کچھ غذا کے حقوق ہیں۔ کچھ پڑوسی ہونے کے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ رشتہ زوجیت کے بھی ہیں۔ ان کی رعایت لازمی ہے۔

جنات کو وعظ و تبلیغ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں نصیبین کی جنات کا ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا! یا رسول اللہ ہمارے بھائیوں کی ایک جماعت فلاں جگہ جمع ہوئی ہے، آپ تشریف لا کر انہیں وعظ و نصیحت فرمائیں اور ان سے متعلق مسائل بیان فرمائیں ان کے کچھ سوالات بھی ہیں، جن کا حل چاہتے ہیں، حضور علیہ السلام تشریف لے گئے حضرت ابن مسعودؓ بھی ساتھ تھے حضور علیہ السلام پہاڑ کے دامن میں پہنچے جس پر جنات کا یہ جلسہ جمع ہوا تھا تو آپ نے ایک دائرہ کھینچا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا کہ اس دائرہ سے باہر نہ نکلیں عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عجیب عجیب تماش کے لوگ اس دائرہ کے باہر سے گزر رہے ہیں، لیکن دائرے کے اندر نہیں آسکتے۔ ان کی آوازیں بھی آتی تھیں بہر حال حضور علیہ السلام ان کے مجمع میں پہنچے اور وعظ فرمایا اور مسائل بتلائے اسی میں فرمایا کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجا نہ کرے اور وجہ یہ فرمائی کہ:

فانها زاد اخوانكم من الجن.

کیونکہ یہ تمہارے جنات بھائیوں کی خوراک ہے، جس سے واضح ہوا کہ ان کی غذا کے حقوق کو تلف کرنا جائز نہیں پھر حدیث ہی میں ہے کہ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کھا لیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنات کو "گوشت" ہو کر ملتی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انسان ہڈی سے استنجاء کرتے تھے جس پر جنات نے حضور علیہ السلام سے شکایت کی تو حضورؐ نے ہڈی سے استنجاء کی ممانعت فرمائی جس سے جنات کے غذائی حقوق کی حفاظت ثابت ہوئی اور یہ کہ ہمیں ان کے حقوق تلف کرنے کا کوئی حق نہیں، اسی طرح مکانات سے بے وجہ انہیں اجاڑنا جائز نہیں جب تک کہ وہ تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔

حقوق ملائکہ

یہی صورت ملائکہ کی ہے وہ بھی اس مکان کے باشندے ہیں، کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں، کچھ زمین میں، اور ان کے بھی حقوق ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ چار انگل جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور مشغول عبادت نہ ہوں عالم بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالم سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے، وہاں سے انہیں تکلیف دے کر اٹھانا جائز نہیں مثلاً ملائکہ کو نفرت ہے بدبو سے اور رغبت ہے خوشبو سے اس لئے ایسے مکانات جو ملائکہ کے اجتماع کے ہیں، انہیں بدبو سے آلودہ کرنا جائز نہیں، مساجد ملائکہ کے اجتماع کی جگہ ہے تو وہاں خوشبو کا مہکانا مطلوب ہے اور بدبو سے بچانا مطلوب ہے، مساجد میں بخور اور ہر خوشبو کا جلانا شرعاً مطلوب ہے تاکہ ملائکہ کو راحت پہنچے اور پیاز کھا کر بلا منہ صاف کئے مسجد میں جانا مکروہ ہے تاکہ انہیں اذیت نہ ہو، حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لئے ملائکہ استغفار کرتے ہیں، جب تک ان کی ریح خارج نہ ہو اور وضو نہ ٹوٹے ایسا ہوتے ہی استغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس سے ملائکہ کو

تکلیف پہنچتی ہے اور وہ ایسے بندوں سے رخ پھیر لیتے ہیں گویا ہم بدبو سے انہیں ان کے مکان سے اجاڑ دیتے ہیں جس کا ہمیں حق نہیں۔

ملائکہ کی بدبو اور جھوٹ سے نفرت

حدیث میں ہے کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے فرشتہ وہاں سے دور چلا جاتا ہے گویا جھوٹ کی گندگی پھیلا کر ان سے ان کا مکان چھین لیتے ہیں۔ تو آپ کو کیا حق ہے کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی پر بھی ہوں اور اپنی مقررہ جگہ پر متمکن ہوں تو آپ ان کو بھگا دیں اور ان کی جگہ چھین لیں البتہ جن ناپاک افراد کو پاک مکانوں میں آنے کا حق نہیں ہے انہیں نکالا جائے تو بات انصاف کی ہوگی جیسے حدیث میں ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے تو اسے بھگا ہی دینا چاہئے بہر حال اسی طرح ملائکہ کی غذا ذکر اللہ ہے تو اس ذکر اللہ سے روکنے کی حرکت کرنا ان سے غذا چھین لینا ہے جیسے پہلے آچکا ہے کہ گندگی پھیلانا یا غفلت کی باتیں کرنا جس سے انہیں تشویش اور اذیت ہو بہر حال ملائکہ کے حقوق بھی جنات اور حیوانات کی طرح ہیں، جن کا تلف کرنا جائز نہیں۔

انسان کے حقوق

چوتھی باشعور مخلوق انسان ہے تو اللہ نے اسے بھی زمین آسمان میں حقوق دیئے ہیں، کھانے کا حق، اوڑھنے کا حق، غذا کا حق، مکان کا حق، آزادی کا حق اسے بھی حق تعالیٰ نے اس زمین پر آباد کیا ہے، پس زمین ان چاروں مخلوقات حیوان، جن، فرشتہ اور انسان کا مکان ہے، جس پر وہ آباد ہیں، ان چاروں مخلوقات سے حق تعالیٰ کا معاملہ الگ الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے وہ جنات سے الگ الگ ہے حیوان سے جو معاملہ ہے وہ انسان سے نہیں۔ مثلاً جانوروں سے معاملہ یہ ہے کہ انہیں قابل خطاب نہیں سمجھا گیا اور کوئی امر و نہی انہیں نہیں دیا۔ کوئی قانون ان کے لئے خطابی رنگ میں نہیں اتارا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو کیونکہ انہیں فہم خطاب کا مادہ ہی نہیں نہ عقل ہے نہ فہم اور ہے تو بہت ہی ادنیٰ جو مثل نہ ہونے کے ہے اور وہ بھی صرف اپنے مقاصد سمجھنے کے لیئے ہے اور اپنی غذا رہنے کی جگہ اور دیگر ضروریات کو سمجھ سکیں اور مہیا کریں۔

حیوانات کی پیدائش سے متعلقہ مقاصد

مگر وہ امور کلیہ اور اپنی تمام بنی نوع کے مفاد کلی کو سمجھنے کیلئے کوئی اہلیت نہیں رکھتے صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس؟

سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو فہم و عقل مل جاتا تو کیا حرج تھا؟

جواب یہ ہے کہ جن مقاصد کے جانوروں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ان میں عقل و فہم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ عقل حارج ہوتی ہے اور وہ مقاصد کبھی پورے نہ ہو سکتے ان سے متعلقہ مقاصد یہ نہیں

اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، قرآن حکیم نے فرمایا:

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ

"ہم نے چوپایوں کو پیدا کیا کہ ان میں تمہارے گرمی کا سامان ہے اور سردی دفع کرنے کی صورت مہیا ہے"۔

چنانچہ تم ان حیوانات کے اون سے گرم کپڑے ٹوپی اور کمبل وغیرہ بناتے ہو ان کی کھالوں میں تمہارے لئے کئی قسم کے منافع ہیں اوڑھنے کے بچھانے کے زینت کے خیمے بنا کر رہنے سنے اور مِنْهَا تَأْكُلُونَ اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو یعنی ان کے گوشت سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ. اور تمہارے لئے ان جانوروں میں رونق و جمال کا سامان ہے کہ تم ان سے اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر کی شانیں قائم کرتے ہو سرکاری قومی اور گھریلو تقریبات میں ان کا جلوس نکالتے ہو۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر بیش قیمت زین، قیمتی ہودے اور زرین جھولے کس کر اپنا جاہ و حشم دکھلاتے ہو جو ایک انتہائی زینت کا مظاہرہ ہے۔

وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ

"اور ان کے ذریعہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سامان منتقل کرتے ہو جس کو تم ان کے بغیر مشقت کثیر سے بھی مشکل ہی سے منتقل کر سکتے"۔

حیوانات کو عقل و فہم سے محروم رکھنے کی حکمت

ان منافع اور حیوانات کی خلقی مقاصد پر غور کرو۔ تو ان کے لئے فہم و عقل کی ضرورت نہ تھی بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی کیونکہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان ان پر سوار ہوتا زین رکھتا یا بوجھ لادتا تو عقل مند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آجاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے بلکہ ممکن ہو جاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل بات ہوتی ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا نہ بیل کھیت جوت سکتا نہ گھوڑے سواری لے جا سکتے نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جا سکتا سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہو جاتے اور انسان کو ان حیوانوں کے مناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی اور یہ ساری خرابی حیوان کو عقل و فہم ملنے سے ہوئی پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی وہ علم حاصل کرنے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے، کتے سب جمع رہتے بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے تو آپ کو علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہو جاتے ہیں اس لئے شکر کیجئے کہ اللہ نے انہیں

عقل وفہم نہیں دیا۔ جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔

بے عقلی بھی نعمت ہے

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عقل نعمت ہے اسی طرح بے عقلی بھی نعمت ہے حیوانات کی بے عقلی ہی سے انسان فائدہ اٹھاتا رہا ہے حتی کہ جو انسان بے عقل اور بے وقوف ہیں وہ عقلمندوں کے محکوم ہیں۔ جس سے لیڈروں کی حکمرانی چل رہی ہے بے وقوف نہ ہوتے لیڈروں کو غذا نہ ملتی اگر بے فہم نہ ہوتے تو لیڈری کی دکان نہ چل سکتی۔ پس کہیں عقل نعمت ہے تو کہیں بے عقلی نعمت ہے اس لئے جانوروں میں مادہ عقل نہ ہونا ہی نعمت ہے جس سے ان سے مختلف قسم کے کام بلا بحث ومجادلہ نکال لئے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر ان میں عقل ہوتی تو یہ تمام منافع جو انسان ان سے لیتا ہے پامال ہو جاتے۔ حاصل یہ نکلا کہ جانوروں کی پیدائش سے جو مقاصد متعلق ہیں۔ ان میں عقل کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کو ان کے فرائض کی وجہ سے بے سمجھ رکھا گیا تا کہ وہ انسان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں اور جب عقل وفہم ان کو نہیں دیا گیا تو ان سے خطاب کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ان کے لئے کوئی شرعی قانون اتارا جاتا اور وہ مخاطب اور مکلف بنائے جاتے پس ان کے لئے نہ امر ہے نہ نہی نہ شریعت آئی نہ کوئی تشریعی قانون صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے جس سے وہ کام پر لگے رہیں اور لگے رہتے ہیں اور روز وشب مشغول ومنہمک ہیں۔

ملائکہ کو خطابِ خدا کی نوعیت

ملائکہ کو خطاب تو کیا مگر خطاب تکلیفی نہیں کیا کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو بلکہ خطاب تشریفی کیا جو اعزازی اور تکریمی ہے جیسے بادشاہ کسی مقرب سے باتیں کرتے تو اس سے اس کی عزت بڑھانی اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ پابند بنانا۔ پس ملائکہ سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا کلام بھی فرمائی گفتگو بھی کی مگر ان پر کوئی شریعت نہیں اتار کیونکہ احکام دو ہی قسم کے ہوتے ہیں یا کرنے کے یا بچنے کے کرنے کے کام خیر کے ہوتے ہیں جن سے خیر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور بچنے کے شر کے ہوتے ہیں جیسے شر کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے جیسے بدکاری دغا بازی رشوت ستانی زناکاری شراب خوری چوری سرزوری بغاوت تمرد سرکشی وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر اور برائی کا مادہ ہی نہیں رکھا گیا تو انہیں بچنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی وہ بدی نہیں کر سکتے تو ان میں بدی سے بچنے کا حکم دینا عاجز کو امر کرنا تھا جو سراسر خلافِ حکمت ہے اور حق تعالیٰ حکیم مطلق ہیں وہ خلاف حکمت بات سے بری اور منزہ ہیں رہی خیر تو وہ ان کا طبعی تقاضا ہے جسے وہ بہ تقاضائے طبیعت کرنے پر مجبور ہیں اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مصرف رہتے ہیں۔ عبادت بھی کرتے ہیں۔ سجدہ بھی کرتے ہیں اور اپنی طبع پاک ہی سے منشاء خداوندی کو پہچانتے ہیں۔ اس لئے ان کو شریعت کے ذریعے پہنچوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں امر خیر کرنے کے لئے کسی قانون

سے تنبیہ کی جاتی۔ پس جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا طبعی بات ہے اسی طرح تمام امور خیر عبادت نیک، پاکدامنی صفائے باطن و ظاہر اور سلامتی ملائکہ کے حق میں طبعی بات ہے شریعت آئے یا نہ آئے وہ اپنے تقاضائے طبع سے ہمیشہ نیکی کریں گے اس لئے امور خیر کیلئے بھی کسی شرعی تکلیف اور قانونی خطاب کی ضرورت نہ تھی بہر حال ملائکہ کو نہ امر شرعی کی ضرورت نہ نہی شرعی کی اس لئے ان سے خطاب تکلیفی نہیں کیا گیا ملائکہ کو خطاب کیا گیا مگر تکلیفی خطاب نہیں کیا گیا۔

جنات کو تکلیفی خطاب کیا گیا مگر مستقل نہیں

رہے جنات تو ان کو خطاب بھی کیا گیا اور تکلیفی خطاب کیا گیا مگر خطاب مستقل نہیں کیا گیا یعنی خود ان پر براہ راست کوئی شریعت نہیں اتاری گئی اور نہ براہ راست ان کی نوع کو کوئی شرعی تکلیف دی گئی ' بلکہ انسان کے واسطے سے انہیں بھی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور دین میں انسانوں کے تابع رکھا گیا چنانچہ ان میں جو یہودی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں تو راۃ خود ان کی نوع پر نہیں اتری جو عیسائی ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اتری اور جو مسلمان ہیں وہ حضرت محمد ﷺ کے تابع فرمان بنائے گئے ہیں خود قرآن براہ راست ان پر نہیں اتارا گیا پس جو شریعت انسانوں کے لئے آئی ہے وہ ان کے لئے بھی آئی مگر بواسطہ انسان کے انہیں پابندِ شریعت بنایا گیا۔

جنات میں نبوت نہ رکھنے کی وجہ

بالفاظ دیگر ان میں نبوت نہیں رکھی گئی وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ اور شر کالعدم ہے، جنات میں شر کا غلبہ ہے اور خیر کالعدم ہے اور نبوت کے لئے غلبہ ہی نہیں خیر محض کی ضرورت تھی ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بد فہمی یا بد عملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا اس لئے انہیں تابع انسان بنایا گیا تا کہ اس کی شریعت سے وہ علم اور عمل اور عمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں اس لئے جو انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنات کو خطاب تکلیفی کیا مگر خطاب بالاستقلال نہیں فرمایا۔

انسان کو مستقلاً تشریعی خطاب کیا گیا

اور انسانوں کو خطاب بھی کیا۔ تکلیف شرعی بھی دی اور مستقلاً خطاب فرمایا یعنی اپنی وحی کے ذریعے خود ان سے کلام فرمایا ان میں نبی اور رسول بنائے کبھی براہ راست خود خطاب فرمایا۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام سے طور پر اور نبی کریم ﷺ سے شب معراج میں اور کبھی بزبان ملکی خطاب فرمایا۔ پھر فرشتہ کبھی اپنی ملکیت پر رہتا اور انبیاء بشریت سے ملکیت کی طرف منتقل ہو کر فرشتہ سے ملتے اور کبھی فرشتہ اپنی صورت ملکی کو چھوڑ کر صورت انسانی میں آتا اور انبیاء بشری چولہ میں اسے دیکھتے جس

کو قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْياً اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُوْلاً فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ

پہلی صورت فرشتہ کے قلب پر وارد ہونے کی ہے، جس میں وہ اپنی اصلیت پر رہتا ہے لیکن پیغمبر کو بشری اصلیت سے ملکیت کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے اس لیے یہ صورت حضور پر نہایت بھاری اور شدید ہوتی تھی دوسری صورت حق تعالیٰ کیساتھ براہ راست کلام فرمانے کی ہے جو پس پردہ رہ کر ہوتی تھی یعنی نگاہیں حق تعالیٰ کو نہیں دیکھتی تھیں صرف کان کلام حق سنتے تھے اور تیسری صورت فرشتہ کی انسانی صورت میں آکر پیغام خداوندی سنانے کی ہے جس میں پیغمبر اپنی بشری اصلیت پر قائم رہتے تھے فرشتہ کو ملکی چولہ چھوڑ کر بشری چولہ میں آنا پڑتا تھا یہ تینوں صورتیں وحی الٰہی کی تھیں۔

علمی الٰہی کے لئے انسان کا انتخاب

حاصل یہ ہے کہ وحی الٰہی اور نبوت و شریعت کی دولت کے لئے مخلوق میں بجز انسان کے اور کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا اور ظاہر بات ہے کہ وحی علم کے اتارنے ہی کو کہتے ہیں وحی کے ذریعہ علم تو رسول کو دیا جاتا ہے اس لئے دوسرے لفظوں میں علمی الٰہی کی نعمت مستقلاً انسان کی کو دی گئی ہے جس کو اس کی بنیادی خصوصیت اور امتیازی شان سمجھنا چاہئے کیونکہ خصوصیت کے معنی یہی ہیں کہ اس کے سوا کسی دوسرے میں نہ پائی جائے اس لئے دوسرے لفظوں میں انسانیت کی خصوصیت علم وحی نکل آتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی خصوصیت اس میں سے نکال دی جائے تو وہ چیز وہ چیز باقی نہیں رہ سکتی۔

انسانیت کا جوہر علم وحی ہے

اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انسان کو علم وحی حاصل نہ ہو تو وہ انسان انسان نہ رہے گا انسانیت کی خصوصیات اس میں نہ آئی یا نہ رہی۔ گو اس کی صورت انسان جیسی ہو سو ظاہر ہے کہ انسان نام انسانی صورت کا نہیں بلکہ انسانی جوہر کا ہے اور انسانیت کا جوہر یہ علم وحی ہے اس لئے جو انسان علم وحی کا حامل نہیں وہ دلائل بالا کی رو سے انسان نہیں صرف صورت انسان ہے اور محض صورت کہ جس میں حقیقت نہ ہو کوئی قدر و قیمت نہیں اگر ہم گھوڑے کا مجسمے بالکل اصلی گھوڑے جیسا بنالیں کہ دیکھنے میں اصل و نقل میں ذرا بھر فرق معلوم نہ ہو تو کیا اسے گھوڑا کہیں گے؟ اور کیا وہ گھوڑے کی طرف سواری کا کام دے سکے گا؟ اور کیا اس کی قیمت بھی ہزار پانچ سو روپیہ اٹھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔۔۔ کیونکہ وہ گھوڑا نہیں گھوڑے کی محض تصویر ہے اسی طرح اگر انسان کا اصلی مجسمہ سامنے ہو مگر اس میں انسانی جوہر اور انسانی خصوصیت (علم) نہ ہو تو وہ صورت انسان ہے انسان نہیں۔ اور قدر و قیمت انسان کی ہوتی ہے صورت انسان کی نہیں۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ انسانی صورتیں پلاسٹک کی بنی ہوئی چند پیسوں میں

دستیاب ہو سکتی ہے، چاہئے کہ انسانوں سے قطع نظر کر کے ان پلاسٹک کے انسانوں سے انسانوں کے کام لینے لگیں اور اصل انسان کے پیچھے نہ پڑیں مگر ایسا نہیں ہو سکتا جس سے واضح ہوا کہ دنیا میں قدر و قیمت انسان کی ہے، تصویر انسان کی نہیں اور آدمی حقیقت آدمیت کو کہتے ہیں محض صورت آدمیت کو نہیں ۔

گر بصورت آدمی انسان بدے
احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے
اینکہ می بینی خلاف آدم اند!
نیستند آدم غلاف آدم اند!
از بروں چوں گور کافر پر حلل
واندروں قہر خدائے عزو جل

علم مطلق انسان کی خصوصیت نہیں

یہاں ایک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ انسان کی خصوصیت مطلق علم نہیں۔ یعنی ہر قسم کے علم کو انسانی خصوصیت نہیں کہا جائے گا کیوں کہ مطلق علم یعنی علم کی کوئی نہ کوئی نوع تو قریب قریب ہر مخلوق کو حاصل ہے، حتی کہ جانور بھی علم سے خالی نہیں اس لئے مطلق علم انسانی خصوصیت نہیں کہلائی جا سکتی اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت و شرافت اور مخلوقات میں افضلیت نمایاں ہو سکتی ہے جب تک کہ اسے کوئی ایسا علم حاصل نہ ہو جو اس کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ آج کی دنیا میں علم کی رائج شدہ جتنی بھی قسمیں ہیں ان میں سے کوئی بھی انسان کی خصوصیت نہیں جانوروں کو بھی ان سے حصہ ملا ہوا ہے۔ اس لئے بھی انسان اپنی افضلیت اور مخلوقات میں اپنی برتری ان غیر مخصوص علوم سے نہیں جتا سکتا۔

فن انجینئری انسان کے ساتھ مخصوص نہیں

آج اگر انسان دعوی کرے کہ میں اس لئے افضل المخلوقات ہوں کہ میں انجینئری کا علم جانتا ہوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائنوں کی کوٹھیاں اور بلڈنگیں تیار کر سکتا ہوں تو یہ دعوی قابل سماع نہ ہوگا کیونکہ انجینئری کے علم سے جانور بھی خالی نہیں ہیں وہ بھی دعوی کر سکیں گے کہ ہم بھی انجینئر ہیں اور اپنے مناسب حال راحت دہ مکانات بناتے ہیں۔
بیا (جو ایک چھوٹی سی چڑیا ہے) اپنے لئے عجیب و غریب قسم کا گھونسلا بناتی ہے، جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں ماں باپ کا الگ اور بچوں کا الگ ہے کہ اس میں بچے جھولتے ہیں گویا مختلف درمز ہوتے ہیں۔ یہ گھونسلا گھاس سے بنایا جاتا ہے اور تین چار تاروں سے کیکر وغیرہ کے درخت میں لگا ہوا اور لٹکا ہوا ہوتا ہے اور مضبوط اتنا کہ آندھی آئے طوفان آئے مگر اس مکان پر کوئی زد نہیں پڑتی آپ کا مکان گر جائے گا مگر اس کا گھونسلہ محفوظ رہے گا کیا یہ اعلیٰ ترین صنعت نہیں ہے چڑیا کیوں

یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں بھی بھی انجینئر ہوں؟ ضرور کر سکتی ہے، تو پھر انجینئری انسان کے حق میں مخصوص کہاں رہی جو اسکی افضلیت اس چڑیا پر ثابت ہو۔ شہد کی مکھی اپنا چھتہ بناتی ہے اس کے ہشت پہلو سوارخ اس قدر مساوی ہوتی ہیں کہ آپ پرکار سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بنا سکتے پھر اس میں ان کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں جو نہ بارش سے خراب ہو نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہے کیا یہ انجینئری اور کاریگری نہیں ہے؟ اگر ہے اور بلاشبہ ہے تو آپ کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ انجیئری کا فن اپنی نوع کے ساتھ مخصوص بتلا کر اس مکھی پر اپنی افضلیت و برتری ثابت کر سکیں؟ سانق اپنی "بلمی" مٹی سے بناتا ہے اور اوپر سے برجی دار گبند کی مانند ہوتی ہے اور اس کے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ بنی ہوئی جنمیں سانق اور ان کے بچے رینگتے ہیں کیا اسے انجینئری اور صنعت کاری نہیں کہیں گے؟ رہا یہ کہ آپ کہیں کہ صاحب ہم عمارتیں بڑی عالیشان بناتے ہیں جن کی خوشنمائی اور نفاست ان گھونسلوں اور بھٹوں سے کہیں زیادہ اونچی اور اعلیٰ ہوتی ہے، اس لئے ہم اور یہ جانور انجینئری میں برابر کیسے ہو سکتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ مکان کا عمدہ ہونا مکین کی ضرورت اور راحت کے لحاظ سے ہوتا ہے جانور اپنی ضرورت کی رعایت کرتا ہے آپ اپنی ضروریات کی جانور آپ کی کوٹھی کو للچائی ہوتی نظروں سے دیکھتا تو آپ اپنی برتری کا دعویٰ کر سکتے تھے، لیکن جیسے آپ اس کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ آپ کے مکان سے نفرت اظہار کرتا ہے، اگر آپ سانپ یا بیا یا شہد کی مکھی کو اپنی کوٹھی میں آباد کرنا چاہیں وہ کبھی بھی آمادہ نہ ہوں گے بلکہ اپنا ہی مکان بنا کر رہیں گے اس سے واضح ہے کہ مکان کی صنعت میں دونوں برابر ہیں اور اپنے اپنے رنگ کے ماہر ہیں اس لئے انجینئری کے بارے میں آپ کو دعویٰ افضلیت کا کوئی حق نہیں۔

انسان اور علمِ طب

اس طرح مثلاً علم طب ایک تجرباتی علم ہے، یہ علم جس طرح انسان کو حاصل ہے، اسی طرح حیوانوں میں بھی یہ علم اپنی بساط کی بقدر پایا جاتا ہے، آپ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ہم طبیب ہیں اور ہمیں ہی اس عمل کا شرف حاصل ہے لہذا ہم ہی اس فن کی رو سے اشرف المخلوقات ہیں غلط ہے، جانور بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم بھی علم طب میں مہارت رکھتے ہیں فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ آپ پر زیادہ بیماریاں آتی ہیں تو آپ دواؤں کی زیادہ اقسام جانتے اور استعمال کر سکتے ہیں جانوروں کو بیماریاں کم لاحق ہوتی ہیں اس لئے وہ دوائیں بھی کم جانتے ہیں لیکن اس کمی بیشی کے فرق سے علم طب صرف آپ کی خصوصیت قرار نہیں پا سکتا۔

مجھے ایک ہندو ریاست اندر گڑھ میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا میرے بعض اعزہ وہاں اونچے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس ریاست میں بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی، اس لئے بندروں کی تعداد ہزاروں کی حد تک تھی بندروں کی جبلت میں شرارت اور چالاکی بلکہ ایذارسانی داخل ہے، اس لئے وہ کافی نقصان کرتے تھے، کبھی برتن اٹھا کے بھاگ جاتے کبھی کپڑا اٹھا لے جاتے۔ اور صرف لے

جاتا ہی نہ تھا بلکہ ایسا موذی جانور ہے کہ اسے لے جانا اور منڈیر پر بیٹھ کر اسے دکھا دکھا کر چیرنا پھاڑنا جس سے ایک تو کپڑا جانے کی تکلیف ہوتی۔ اسے ضائع ہوتا دیکھ کر اور بھی زیادہ دکھ ہوتا۔ اس لئے ہمیں ایک بار غصہ آیا اور ہم نے سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہئے جس سے سو پچاس بندر ایک دفعہ مر جائیں تو کچھ تو نجات مل جائے گی اس لئے ہم نے دو روپیہ کا سنکھیا خریدا اور اسے آٹے میں ملایا اور روٹیاں پکوا کر چھت پر پھیلا دیں تاکہ وہ آتے جائیں، روٹیاں کھاتے جائیں اور مرتے جائیں، اور ہم خوش ہوتے جائیں اس لئے ہم روٹیاں چھت پر ڈال کر خود ایک پناہ میں بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے کہ ابھی بندر آکر ان روٹیوں کو کھائیں گے، اور مریں گے اور ہمارے لئے خوشی کا سامان ہوگا یعنی اگر انہوں نے ہمارے دس کپڑے پھاڑ دیئے ہیں تو دس بیس کو ہم بھی مرتا ہوا دیکھیں جس سے کچھ تو دل کو چین کو آئے۔ چنانچہ دو تین بندر آئے مگر ان روٹیوں سے دور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا کہ روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ بات ہے، ورنہ روٹیاں یوں نہیں بکھیری جا سکتیں، اس لئے روٹی کو غور سے دیکھا اور پھر سونگھا اور سوچا یہ نیا حادثہ کیوں پیش آیا ہے۔ پہلے تو ہم ایک روٹی بھی چھت پر پڑی ہوتی نہیں پاتے تھے۔ اب یہ روٹیوں کا ڈھیر کیوں لگا ہوا ہے؟ اس میں ضرور کوئی راز ہے؟ بالآخر انہوں نے روٹی کو ہاتھ نہیں لگایا اور چلے گئے ہم سمجھے کہ تدبیر فیل ہو گئی لیکن بندروں کا یہ چالاک قافلہ جا کر پھر اپنے ساتھ اور بندروں کو لے آیا اور چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر ان کے ساتھ آئے اور وہ روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اور مشورہ شروع ہوا کہ روٹیاں اس مقدار میں یہاں کیوں پڑی ہوئی ہیں۔ خدا جانے انہوں نے باہم کیا کیا اشارے کئے ایک آگے بڑھا اور اس نے روٹیوں کو سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا، اس نے ایک روٹی توڑی اس کے ٹکڑوں کو سونگھا اور روٹیاں چھوڑ کر سب بھاگ گئے اب ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ کچھ سمجھ گئے ہیں اور ہماری ساری تدبیر ناکام ہو گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تقریباً ساٹھ ستر بندروں کا ایک قافلہ آیا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ننھی تھی، جن میں ہرے ہرے پتے تھے۔ انہوں نے آکر پہلے روٹیوں کو توڑا ان کے ٹکڑے کئے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کئے جتنے یہ بندر تھے، تاکہ روٹیوں میں ہر کو حصہ ملے گویا پوری جماعت میں یہ اصول پیش نظر تھا کہ ۔

نیم نانے گر خورد مرد خدا
بذل درویشان کند نیمے دگر

بندر بانٹ تو مشہور ہے۔ آخر کار انہوں نے وہ ٹکڑے باہم بانٹ لئے اور ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھا کر اوپر سے وہ پتے چبا لئے جو ہر ایک اپنی ٹہنی کے ساتھ لایا تھا اور دندناتے ہوئے چلے گئے اور ہم دیکھتے رہے یعنی بے وقوف ہم رہے کہ دو روپیہ کا آٹا بھی گیا سنکھیے کے دام بھی بٹے کھاتے گئے کپڑا تو پہلے ہی جا چکا تھا اور اوپر سے وقت بھی ضائع ہوا اور ہوشیار یہ بندر رہے کہ سب کچھ انہیں کا ہو کے رہا، اندازہ یہ ہوا کہ یہ پتے جو وہ ساتھ لائے تھے زہر کا تریاق تھے۔ جوان بندروں کو معلوم تھا بلکہ پیش بندی کر کے بیماری کو پہلے ہی سے روک دیتے ہیں، تو فن طب میں

ان کا دخل معلوم ہوا۔ پھر آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہے کہ صرف ہم ہی اطباء ہیں اور فن طب کی وجہ سے جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ اور بندر نفسِ فن میں برابر ہو گئے گو کچھ خصوصیات کا فرق بھی سہی۔

فن سیاست بھی حیوانات میں ہے

پھر اگر آپ یہ کہیں کہ طب نہ سہی فن سیاست سہی ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی ملت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بارہ میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فن سیاست بھی انسانی خاصہ نہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز سے اس میں ہشت پہلو سوراخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ امیر منتخب کرتی ہیں، جس کا نام عربی زبان میں یعسوب ہوتا ہے، یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر --- کی اطاعت کرتی ہیں، اندرون قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتہ کے ایک حصہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں، اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے، حتی کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے، آپ نے دیکھا ہو گا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہے، کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتہ پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ لیکر آئی ہو جس سے بنے ہوئے شہد میں سمیت کا سرایت کر جانا یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اسے فوراً مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتہ کے اندر گھسنے نہ پائے تاکہ اس کے زہریلے مادہ سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک جان لے کر اگر پوری قوم کو بچا لیا جائے تو کوئی جرم نہیں۔ یعنی اس کی سیاست اسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ

شہد کی مکھیوں میں قانون قصاص اور مکافاتِ جرم

یعنی ایک کی موت سے اگر پوری قوم کی حیات بچ جائے تو اس کی موت میں کوئی مضائقہ نہیں، اس قتل نفس پر مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے۔ نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خوشدلی سے امیر کے اس فعل قتل پر گردن جھکا دی جاتی ہے، اور کسی کو خلجان نہیں گزرتا کہ یہ کیوں ہوا۔ بلکہ تمام قوم سر اطاعت جھکا کر مان لیتی ہے تو اولوالامر کا انتخاب ' پھر اس کے سامنے سمع و اطاعت، پھر قوم کی انتظامی تشکیل اور نظم کے تحت مکانات کی تقسیم ' پھر بے راہی پر مجرم کا قتل ' اگر سیاست نہیں

ہے تو اور کیا ہے؟

ضلع بجنور کے ایک قصبہ نجیب آباد میں شہد بکثرت ہوتا ہے اور وہاں شہد کی مکھیوں کو پالنے کا خاص انتظام ہوتا ہے، وہاں ہم نے ایک محاورہ سنا کہ فلاں نے اپنی بیٹی کو تین مکھیاں جہیز میں دیں فلاں نے چار مکھیاں جہیز میں بیٹی کو دیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ جہیز میں پلنگ پٹیریاں میز کرسی زیور، کپڑا وغیرہ تو دیا جاتا ہے یہ مکھیاں جہیز میں دینے کے آخر کیا معنی ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ جب وہ لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں اور کسی خاص جگہ شہد کا چھتہ لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر مکھی کو یعنی یعسوب کو پکڑ کر اس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہی چھتہ بناتی ہیں اور وہاں شہد تیار ہو جاتا ہے۔ اس گر کو سامنے رکھ کر وہاں کے شہد کے کاروباری مکھیاں چار امیر مکھیا پکڑ اور ڈبیہ میں بند کر کے بیٹی کو جہیز میں دے دیتے ہیں وہ لڑکیاں ترکیب جانتی ہیں تو چار مکھیاں جہیز میں دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار دھڑی شہد جہیز میں دے دیا گیا۔ شہد کی مکھیوں کی اطاعت شعاری اور نظم پسندی اور تنظیم ملت کی اعلیٰ ترین سیاست کے ہوتے ہوئے آپ کو خواہ مخواہ ہی دعوئی ہوگیا ہے کہ صرف انسان ہی سیاست دان ہیں یہ مکھیاں بھی دعوی کر سکتی ہیں کہ ہم بھی سیاست دان ہیں تو اگر آپ بھی کسی امیر کے تحت رہ کر تقسیم عمل کرلیں کہ کوئی غذا مہیا کرے کوئی تعلیم کا کام کرے، کوئی فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی حفاظت کرے، تو کام بلاشبہ عمدہ ہے، ضروری بھی ہے، مگر محض انسان کی خصوصیت نہیں مکھیاں بھی کر سکتی ہیں اس لئے یہ تنظیم کوئی وجہ فضیلت نہیں کہ انسان اپنے کو حیوانات سے برتر سمجھے۔

بطخوں میں سیاست و تنظیم

بطخوں میں بھی سیاست پائی جاتی ہے جب بطخیں سوتی ہیں تو ان کا امیر ان کی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا ہے جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے، تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرہ سے آگاہ کرتا ہے ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں اور پر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز میں اٹھ کر پرواز میں آجاتی ہیں اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اڑتی ہیں جدھر امیر جاتا ہے ادھر تمام بطخیں وہیں اتر پڑتی ہیں یہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اس سے بہتر سیاست اور تنظیم کیا ہو سکتی ہے؟ اپنی رعایا اور ماتحت قوم کو ہر خطرہ سے آگاہ کرنا اور بچانا خود بیدار رہنا ان کو چوکنا رکھنا کیا اعلیٰ ترین ترقی یافتہ سیاست نہیں؟

اس لئے سیاسی تدابیر اور جوڑ توڑ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں اصول سیاست میں حیوانات بھی اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں مکھیں کہیں گی کہ ہم بھی سیاست دان ہیں زیادہ سے زیادہ آپ کی سیاست شاخ در شاخ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ملت میں جرائم زیادہ ہیں اس لئے روک تھام کی تدابیر بھی زیادہ ہیں مکھیوں اور بطخوں میں جرائم کی انواع آپ سے کم ہیں تو تدابیر بھی کم ہیں۔ سو اس سے کچھ ان مکھیوں اور بطخوں کی افضلیت آپ پر ثابت ہوگی نہ کہ کمتری اور اصل

سیاست میں برابری ثابت ہو گی تو یہ دعوٰی بھی آپ کا غلط ہے کہ چونکہ فنِ سیاست سے واقف ہیں اس لئے افضل الحیوانات ہیں۔

مکڑی کی صنعت کاری

اگر آپ کہیں کہ ہم کپڑا بننے کا فن جانتے ہیں۔ لہٰذا ہم سب جانداروں میں افضل ہیں تو مکڑی آکر کہے گی کہ یہ کام تو میں بھی جانتی ہوں، دیکھئے مکڑی سفید رنگ کا خیمہ تنتی ہے، جس کی طنابیں چاروں طرف کھنچی رہتی ہیں وہ اتنا صاف باریک اور ملائم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کی ململ بھی اتنی صاف اور باریک نہیں ہوتی اور اتنا مضبوط جس کو آندھی اور ہوا کے سخت جھونکے اور بڑی سے بڑی بارش بھی نہیں ہلا سکتی اس کی طنابیں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں سرکتیں آپ تو سوت سے کپڑا بنتے ہیں وہ خدا جانے کس مادہ سے اپنا گھر بناتی ہے، آپ کا کپڑا پھٹ جائیگا مگر اس کا بنا ہوا خیمہ یہ کپڑا اور خیمہ نہیں پھٹے گا۔ آپ کا بنایا ہوا کپڑا میلا ہو جائیگا۔ جسے آپ پانی سے دھوئیں گے۔ صابن سے صاف کریں گے مگر مکڑی کے اس خیمہ کے کپڑے کو صاف کرنے اور دھونے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہم اپنی غذا کے لئے پرندے پھانسنے کے لئے جال بناتے ہیں مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال بنتے ہیں۔ تو ہماری تدبیر کو کون پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیر نوع کو قابو میں لانے کیلئے سوت کے تاگوں سے کام لیتے ہیں تو مکڑی آگے بڑھ کر کہے گی کہ میں اس سے بہتر جال بن سکتی ہوں وہ جالا تانتی ہے تو اس میں مکھیاں پھنس جاتی ہیں ہزار بھنبھناتی رہیں چلاتی ہیں مگر اس جال سے نہیں نکل سکتیں تو کیا یہ غیر نوع کا قابو میں لانا نہیں۔ اور اتنا باریک تار بناتی ہے کہ آپ کا سوت اتنا باریک نہیں ہوتا۔ غرض آپ فنون طبعیہ میں سے کون سے فن کو اپنی خصوصیات کہہ سکیں گے ضروریات زندگی کا کوئی فن ایسا نہیں جو حیوانات میں نہ ہو۔ ہم جس قدر بھی ضروریات زندگی سے متعلق علم رکھتے ہیں حیوانات بھی اپنی ضروریت زندگی سے متعلق سمجھ بوجھ اور صنعت کاری کا علم رکھتے ہیں۔

ضروریات زندگی کا ہر فن حیوانات میں موجود ہے

حتی کہ اگر آپ سائنس کی مدد سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتے ہیں۔ تو ایک کوا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے اپنے پروں سے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ آپ پیتل تانبے اور دیگر معدنیات کے بنائے ہوئے مصنوعی پروں اور خلقی طاقت سے اڑتے ہیں اور چیل کوے وغیرہ پرندے اپنے بنے بنائے پروں اور خلقی طاقت سے اڑتے ہیں آپ ان مصنوعی پروں میں معدنیات کے محتاج ہیں اور ہوائی جہاز بنانے میں خون پسینہ ایک کرتے ہیں تب کہیں اڑتے ہیں اور یہ پرندے خود ہوائی جہاز ہیں۔ غرض آپ اگر اڑ گئے تو پرندے بھی اڑتے ہیں۔ یعنی پرواز کا جو فعل آپ نے کیا وہی پرندوں نے بھی کیا آپ نے کپڑا بن کر تن پوشی کی اور بدن کو کپڑے سے چھپایا تو ہر چرند پرند بھی اپنی کھال اپنے پروں سے اپنے تن بدن کو چھپاتا ہے۔ آپ کا لباس مصنوعی ہے اس کا قدرتی ہے، آپ رہنے کے لئے مکان

بناتے ہیں۔ جانور بھی اپنا بھٹ اور گھونسلا بناتے ہیں۔ وہ بھی اپنی غذا تلاش کرنے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہیں وہ گھاس دانہ کھاتے ہیں آپ گوشت پکا کر کھاتے ہیں۔ وہ اس مصیبت سے بری ہیں کچا ہی کھا لیتے ہیں آپ اگر ان کے گھاس دانہ سے نفرت کرتے ہیں تو وہ آپ کے زردہ پلاؤ سے نفرت کرتے ہیں۔ غرض کوئی طبعی فن ایسا نہیں۔ جن میں وہ آپ کی ہمسری کا دعوی نہ کر سکیں۔ آپ سیاست کے مدعی ہوں گے تو شہد کی مکھی اور بطخ سامنے آ کر اس دعوائے خصوصیت کو باطل کر دیں گی آپ کپڑا بننے اور جال بنانے کا فن کا دعوی کریں تو مکڑی سامنے آ کر بولے گی کہ یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ آپ فن طب کی مہارت کا دعوی کریں گے تو بندر اچھل کر کہے گا کہ جڑی بوٹی کی خاصیتیں کچھ میں بھی جانتا ہوں۔ اور میں زہر کا تریاق جانتا ہوں۔ آپ فن پرواز کے مدعی ہوں تو پرندے سامنے آ کر کہیں گے ہم اس فن میں تم سے زیادہ ماہر ہیں۔ آپ انجینئری اور فن خانہ سازی کے مدعی ہوں گے تو ہر چرند پرند اور درند آپ کے مقابلہ میں آ کر کہے گا کہ یہ کام ہم سب جانتے ہیں۔ رہنے سہنے لباس پہننے علاج کرنے مکان بنانے اور تنظیم وسیاست وصنعت کاری کرنے میں شریک ہیں۔ تو ان فنون کی وجہ سے تو انسان ان جانوروں سے افضل نہیں ہو سکتا۔ افضلیت کسی خصوصیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو اس میں ہو اوروں میں نہ ہو۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں میں ہے اور اس کے سوا اور کسی میں نہیں۔ وہ علم شرائع اور علم احکام خداوندی ہے جس سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے اور انسان اس علم کے ذریعے سعادت کے درجات طے کرتا ہے اور نیابتِ خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے یہ علم کسی بھی غیر انسان میں نہیں پایا جاتا۔ نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے نہ جنات اس علم سے آراستہ ہیں۔ نہ حیوانات واقف ہیں تو جمادات ونباتات کیا واقف ہوتے ہیں؟ یہ علم خصوصیت ہے انسان کی۔ علم بغیر پیغمبری کے نہیں آ سکتا۔ کیونکہ یہ علم اللہ کی مرضیات ونامرضیات کے جاننے کا علم ہے اور کسی کی مرضی بلا اس کے بتلائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ ہر کس وناکس کو اپنے اندر کی بات نہیں بتلاتا سو اس کے لئے اس نے نوع انسان کو مخصوص فرمایا اور اس میں بھی برگزیدہ تر طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا تو اس نے انہیں اپنی مرضیات ونامرضیات سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوتا ہوں۔ اسے کرو اور فلاں چیز سے ناخوش ہوتا ہوں اسے نہ کرو یعنی امر ونہی بتلایا پس امر ونہی کے قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کے علم کے لئے نبوت رکھی اور یہ نبوت نوع بشری ہی کے ساتھ مخصوص رکھی اور نبوت کے علوم صرف انسان کو دیئے۔

انسانیت کا مدار ہی علوم الٰہیہ ہیں

یعنی چار ذی شعور مخلوق ملائکہ، جنات، حیوانات، انسان۔ میں سے علم صرف انسان کو بخشا باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہو تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطہ سے ہوا سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعوئی بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہو کہ علم طبعیہ، علوم وھمیہ، علوم خیالیہ، علوم

عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیات نہیں یہ اور انواع کو بھی میسر ہیں کیونکہ یہ تمام علوم اپنے اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں اور وہ قویٰ جانداروں میں کم و بیش سب میں رکھے گئے ہیں عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبیعت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا اس سے خود اس کے نفس کی مرضی اور نامرضی اور خواہش و طلب کھلے گی۔ خدا کی مرضی نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آسکتی ہے، اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوت و رسالت کے ذریعے آتا ہے اور صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کی خصوصیات علوم طبیعہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہی ہیں علوم نبوت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسر نہیں اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور افضلیت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تو وہ علوم شرعیہ کے ذریعے کر سکتا ہے۔۔۔۔ نہ کہ علوم طبیعہ و عقلیہ، وہمیہ کے ذریعہ کہ یہ علوم انسان کے سوا اوروں کو بھی میسر ہیں، دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہی کہ اس علم سے انسان کی برتری اور فضیلت ہی ثابت ہوتی ہے، بلکہ اس کی انسانیت کا مدار بھی اس علم پر ہے، کیونکہ جب یہ علم ہی انسان کی خصوصیات ٹھہرا کہ یہ علم نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں تو اس کا حاصل یہ کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ اس علم سے بہرہ ور نہ ہو کیونکہ جس چیز کی خصوصیت ختم ہو جائے۔ جس سے وہ چیز وہ چیز تھی تو پھر شی وہ شی نہیں رہتی۔ اگر آپ میں خصوصیات باقی نہ رہے تو آپ آپ نہ رہے، اگر خصوصیت انسان انسان میں ہو تو انسان انسان کہلائے گا ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں وہ مکان بنانے، کھانے پینے علاج معالجہ کرنے میں انسان کے برابر ہیں، پس جب انسان کی خصوصیات یہ علم الٰہی ہے جب انسان میں ہو گا تو انسان ہو گا ورنہ ایک کھاتا پیتا حیوان رہ جائے گا کیونکہ کھانے پینے پہننے کو کتنا ہی خوش نما بنائے اور علمی رنگ میں نمایاں کرے تب بھی رہے گا جانور ہی کیونکہ جانور بھی یہ علوم اپنے اندر رکھتے ہیں جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے، بہر حال یہ بات صاف ہو گئی کہ نہ کھانا انسانیت ہے نہ سیاست و تنظیم اگر کوئی ماہر فن پچاس منزل کی بلڈنگ بھی بنائے تب بھی وہ اس کی وجہ سے حیوانیت سے نہیں نکل سکتا کہ یہ کام یعنی مکان سازی اس کی خصوصیت نہیں۔ حیوانیت کی خصوصیت ہے اور اگر مکان سازی پارچہ بافی نظم کاری میں عقل کو بھی لگا دیا جس سے یہ اشیاء مزین ہو گئیں تو گو بظاہر تو وہ جانوروں سے ممتاز اور افضل ہو گیا۔ مگر حقیقت میں ان سے اور زیادہ گھٹ گیا کیونکہ عقل جیسے پاک جوہر کو اس نے اپنی طبعیت کا خادم اور غلام بنا دیا اور سب جانتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے، اور عقل سرچشمہ شعور ہے۔ تو ایک بے شعور کا حاکم بنا کر گویا جاہل کو بادشاہ اور عالم کو غلام کر دیا یہ کہاں کی عقل ہے۔ بلکہ بد عقلی ہے، جانور اس بے ہودگی سے بری ہیں اس لئے ایسا کر کے انسان اونچا تو کیا ہوتا جانوروں سے کہیں زیادہ نیچا اور کم رتبہ ہو گیا کہ جانور طبع حیوانی کو استعمال کرتے ہوئے عقل کو اس کا غلام نہیں بناتے اب خواہ ان میں عقل بالکل نہ ہو یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ انہوں نے طبیعت جیسے جاہل اور بے شعور حاکم کو اس کی جاہلانہ کارروائیوں کا عالم و فاضل نہیں بنایا اور یہ انسان

طبعی حرکات کرتا ہے اور عقل سے انہیں مزین بنا کر حیوانی حرکات کو انسانی بلکہ ملکی حرکات ثابت کرنا چاہتا ہے، تو جانور سے زیادہ احمق ثابت ہوا۔

طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے

نیز یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ طبعی تقاضوں کو پورا کرلینا کوئی کمال کی بات نہیں۔ بلکہ طبعی تقاضوں کے خلاف کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں کیونکہ میں کھانا کھایا کرتا ہوں تو لوگ کہیں گے کہ احمق یہ کون سی کمال کی بات ہے، جانور بھی کھانا کھاتے ہیں! یہ تو طبعی تقاضا ہے اس میں نہ محنت ہے نہ مشقت اور نہ ہی اس سے انسان کی کوئی جوانمردی اور جفاکشی ظاہر ہوتی ہے وہ سارے جانور بھی فضلاء اور باکمال ہوں گے یا اگر کوئی کہے گا کہ میں بڑا فاضل آدمی ہوں کیونکہ میں رات کو پڑ کر سوتا ہوں تو بھی کہا جائے گا کہ یہ تو ایک غیر اختیاری اور طبعی فعل ہے جانور بھی کرلیتے ہیں تو اس میں کمال کی بات کیا ہوئی؟

کمال نام ہے خلاف طبع کرنے کا اس میں انسان کی محنت جفاکشی اور تحمل وصبر کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی کو بتایا جائے کہ وہ مہینوں کھانا نہیں کھاتا تو لوگ اسے باکمال سمجھ کر اس کے پیچھے ہولیتے ہیں کہ واقعی خلاف طبع پر قابو پالینا کمال ہے نہ کہ طبع کا غلام بن کر طبعی تقاضوں کو پورا کرلینا کمال ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حجۃ الاسلام سیدنا الامام حضرت نانوتویؒ کا بصیرت افروز واقعہ

ابھی جس بزرگ کا نام نامی آپ کے سامنے لیا گیا تھا یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جن کا علم وفضل اور کمال ظاہری وباطنی معروف ہے، ان کا زمانہ اور پنڈت جی دیانند سرسوتی کا زمانہ ایک ہے۔ پنڈت دیانند ہندوؤں کے فرقہ آریہ سماج کے بانی ہیں۔ انہوں نے قصبہ رڑکی میں اسلام پر اعتراضات کئے علماء نے دندان شکن جوابات دیئے اور کہا کہ اگر جرات ہے تو میدان میں آکر بحث کرو۔ اس نے کہا کہ تم لوگ میرا مقابلہ نہیں کرسکتے تو میں صرف "مولوی قاسم" سے بحث کروں گا۔ چنانچہ رڑکی کے علماء نے حضرت کو خط لکھا۔ کہ ایسا واقعہ درپیش ہے آپ تشریف لاویں باوجودیکہ حضرت مولانا قاسم بیمار تھے۔ مگر مذہب اسلامی کی حفاظت واشاعت کی خاطر اپنے چند شاگردوں کے ساتھ رڑکی تشریف لے گئے جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب محدث دارالعلوم دیوبند مولانا محمد حسن صاحب محدث امروہی۔ مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری اور دیوبند کے مشہور ادیب منشی نہال احمد وغیرہ حضرت کے خدام خاص شریک سفر تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں کل ڈیڑھ ذہین ہیں یا پورے ذہین حکیم مشتاق احمد صاحب اور آدھے ذہین منشی نہال احمد ہیں ان میں سے جب کوئی میرے وعظ میں بیٹھ جائے تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔

حضرت نانوتوی رڑکی پہنچے۔ تو انہوں نے منشی نہال احمد کو پنڈت دیانند کے پاس بھیجا کہ تاکہ وہ پنڈت جی سے مباحثہ کی شرائط طے کریں۔ جب منشی صاحب پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی کے لئے ایک بڑی لمبی چوڑی (پیتل کی سینی) میں کھانا آیا۔ جس میں تقریباً چار پانچ سیر پوریاں، دو ڈھائی سیر حلوا اور اسی مقدار میں ترکاری تھی گویا دو تین دھڑی کا ملبہ سینی میں دیکھا گیا جو پنڈت جی کے لایا گیا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ پرات صاف ہو کر باہر آئی جس میں ایک حبہ بھی باقی نہ تھا، منشی صاحب سمجھے کہ پنڈت جی کے ساتھ کھانے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے کیونکہ ایک آدمی بھلا اتنا کہاں کھا سکتا ہے، منشی صاحب کمرہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اکیلے پنڈت جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید لوگ کسی دوسرے دروازے سے نکل گئے ہوں گے، مگر دیکھا کہ کمرہ میں کوئی دروازہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے خادم سے پوچھا بھئی کہ اس کھانے میں کیا اور بھی پنڈت جی کا شریک تھا؟ اس نے کہا کہ نہیں صرف پنڈت جی ہی نے کھانا کھایا ہے۔ منشی صاحب حیران رہ گئے کہ یا اللہ ایک آدمی اور اتنا کھانا بہر حال پنڈت جی سے مباحثہ کے متعلق گفتگو ہوئی اور منشی صاحب نے واپس آکر حضرت سے ساری گفتگو نقل کر دی، اس سلسلہ میں سنانا یہ ہے کہ منشی جی حضرت کے پاس سے الگ ہو کر جب اپنے ہم جولیوں میں بیٹھے تو منشی صاحب نے کہا کہ بھائی مجھے ایک بات کا بڑا فکر ہو گیا وہ یہ کہ اگر مسائل میں پنڈت جی سے مناظرہ ہوا تو یقین ہے، ہمارے حضرت جیت جائیں گے، کیونکہ بحمد للہ حق پر ہیں۔ لیکن یہ فکر ہے کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیونکہ پنڈت جی تو پندرہ سیر کھا کے بھی دم نہیں لیں گے اور ہمارے حضرت آدھی چپاتی ہی کھا کر بیٹھ رہیں گے تو یہ بات کیونکر بنے گی۔ بات ہنسی کی تھی۔ تمام احباب سن کر ہنس پڑے اور بات ختم ہوگئی۔ لیکن شدہ شدہ یہ بات حضرت تک پہنچ گئی تو منشی جی کو بلایا اور کہا کہ آپ نے کیا کہا تھا۔ ! منشی جی گھبرائے فرمایا کہ میں بات سن چکا ہوں مگر پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اس کا جواب دینا ہے، منشی جی نے ڈرتے ڈرتے اپنا مقولہ دہرا لیا۔ فرمایا کہ اس کے دو جواب ہیں۔ اول الزامی جواب ہے وہ یہ کہ کیا ساری باتوں کا مناظرہ کر لیا ہے جو دوسرا جواب تحقیقی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت نے ذرا چیں بہ چیں ہو کر فرمایا) تم اتنے دن صحبت میں رہے، تمہارے ذہن میں یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہالت میں ؟ کھانا بھی میت کی علامت ہے اور بھی میت جہالت کا شعبہ ہے تو جہالت بھیمیت میں مناظرہ ہوا تو ہم بہائم مقابلہ کے لئے پیش کر دیں گے ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے کو پیش کریں گے اونٹ کو پیش کریں گے اور بات بڑھی تو ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھاؤ کتنا کھاتے ہو؟

پھر فرمایا کہ مناظرہ علم کا شعبہ ہے نہ کہ کھانا تو تمہارے ذہن میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیونکہ مناظرہ علم کے دائرہ کی چیز ہے اس کا مناظرہ ہوا تو انسان پیش کیا جائے گا جو ذی علم ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو ہم کہیں گے کہ کھانا کھانے کے بعد ہمیں بھی اور پنڈت جی کو بھی ایک

مقفل کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینہ کے بعد کھولا جائے اور جو تر و تازہ نکلے سمجھئے کہ وہ حق پر ہوگا۔

ذکر اللہ کا ذریعہ حیات

اس سلسلہ میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ نے وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ اب مجھے بقاء حیات کے لئے بحمد اللہ کھانے پینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اتباع سنت کے لئے کھاتا پیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ذکر اللہ رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تو وہ ہی ذریعہ حیات بن جاتا ہے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان ہے کہ وہ اظہار عبدیت اور امت کے لئے نمونہ عمل چھوڑنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی اس سے واضح ہوا کہ طبعی تقاضوں کی مخالفت اور ان کے ترک کا نام کمال ہے، جو جوانمردی ہے۔ طبعی تقاضے پورا کر لینے کا نام کمال نہیں۔ یہ کمال ہے تو ہر جانور میں ہے۔

ایسے ہی فنون طبیعہ میں بڑھ جانے اور ترقی کر جانے کا نام علم اور کمال علم نہیں ہے یہ طبعی علوم بقدر بساط حیوانات میں بھی ہیں۔ علمی کمال یہ ہے کہ اللہ سے باتیں کر کے علم حاصل کیا جائے جو طبیعت کے تقاضوں سے بالاتر ہے اور وہ علم وحی ہے، جو صرف پیغمبروں کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے، نہ کہ نفس میں خیالات پکا کر انہیں خوبصورت طریقوں سے نمایاں کر دینے سے ملتا ہے وہ صورت علم کہلائے گا حقیقی علم نہیں اور جب یہ علم الٰہی ہی انسان خصوصیت ہے، تو انسان کے معنی ہی علم الٰہی کے حامل ہونے کے نکلے، اس لئے انسان نام جیسے کپڑے پہننے، گھر بنا کر رہنے اور کھانا کھانے کا نام نہیں۔ ایسے ہی دو کان، دو آنکھ ایک ناک اور مخصوص صورت زیبا کے نہیں بلکہ سیرتِ زیبا کے ہیں۔ جو علم لدنی اور علم الٰہی سے بنتی ہے۔ انسان وہ ہے جس سے علم و حکمت کا چشمہ پھوٹے یا اس چشمہ سے سیراب ہو یا اس کا حامی ہو اس لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا:

الدنیا ملعون ملعون مافیھا الا عالم او متعلم۔

دنیا میں بھی ملعون جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون سوائے عالم کے یا متعلم کے یا ان کے حامی اور دلدادہ کے اور وہ علم جو عالم یا متعلم سیکھتا سکھاتا ہو کتاب و سنت کا علم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

انما العلم آیۃٌ محکمۃٌ اوسنۃٌ اوفریضۃٌ عادلۃٌ

بس علم یا محکم آیت (قرآن) ہے یا سنت قائمہ ہے یا فریضہ عادلہ جو کتاب وسنت کے مشابہ ہو یعنی قیاس مجتہد یہ علم صرف انبیاء سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ عقل و طبع یا وہم و خیال سے۔

علم نبوی محنت اور مجاہدات سے ہی حاصل ہوتا ہے

مگر یہ علم آتا ہے محنت اور خلاف طبع مجاہدے اور ریاضت کرنے سے کیونکہ یہ علم علوم طبعیہ وعقلیہ کی طرح طبعی نہیں اس لئے سب علوم سے افضل

ہے کیونکہ امور طبعیہ کا انسان سے سرزد ہونا عجیب نہیں۔ عجیب یہ ہے کہ اس میں ایک چیز نہ ہو اور وہ آجائے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے سوال فرمایا۔

بتاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضور ﷺ نے فرمایا ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت وہ تجلیات ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنت دوزخ ان کے سامنے ہے وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نبیاء ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن توان پر ملائکہ اترتے ہیں اللہ کی وحی ان پر آتی ہے جلال وجمال خداوندی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے معجزات ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

تو پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تمہیں کیا ہوا جو تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبر تمہارے سامنے ہے معجزات تم بچشم خود دیکھتے ہو۔ وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟ تو پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ ورسولہ اعلم۔ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے؟ تب حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ نہ پیغمبران کے سامنے ہوں گے نہ معجزات ان کے مشاہدہ میں آئیں گے اور اوپر سے شکوک وشبہات ڈالنے والے ہزاروں ہوں گے مگر پھر بھی ایمان لائیں گے اور اس پر جمیں گے تو ان کا ایمان عجیب ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز موانع کی کثرت اور رکاوٹوں کے ہجوم میں حاصل کی جاتی ہے وہی زیدہ عجیب ہوتی ہے ورنہ اگر کسی چیز کے معدات اور مؤیدات بکثرت ہوں اور اس کی طرف جھکانے والے اسباب بہت ہوں رکاوٹ بالکل نہ ہو تو اس کا حاصل کرلیا جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا اس بناپر کہا گیا ہے کہ ملائکہ اگر عبادت میں مصروف ہیں تو اس کا حاصل کرلیا جانا زیادہ عجیب بات نہیں کیونکہ تجلیات الٰہیہ تو ہمہ وقت سامنے ہیں اور رکاوٹیں بالکل نہیں۔ نہ ان کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا نہ بیوی بچوں کا دھندا نہ شہوت وغضب کا قصہ تو عبادت ان کے حق میں امر طبعی ہے اور طبیعت کے تقاضوں کا پورا کرلینا کوئی حیرت ناک اور عجیب نہیں ہے پس جیسے انسان کے حق میں کھانا پینا سونا جاگنا عجیب نہیں کیونکہ طبعیت کا تقاضا ہے ایسے ہی عبادت کرنا فرشتوں کے حق میں طبعی بات ہے جس کو بجا لانا عجیب نہیں۔ عبادت اگر عجیب ہے تو انسان کے حق میں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ساری نفسانی خواہشات اور طبعی تقاضوں کو پامال کرکے اور بالفاظ دیگر اپنے نفس کو قتل کرکے رکوع وسجود میں لگتا ہے۔

انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے بدرجہا افضل ہے انسان کا ایک سجدہ فرشتوں کی ہزاروں برس کی

عبادت سے عجیب بلکہ افضل ہے کیونکہ وہ نفس کشی پر مبنی ہے نہ کہ نفس کے تقاضوں پر وہ صبح کے

وقت گرم لحاف میں سے اٹھ کر اور خواہشات نفس کے خلاف سردی میں پانی سے وضو کر کے اور
پرے سے اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگتا ہے۔ نفس اسے نیند
کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ نرم نرم بستر سے نہ اٹھے۔ ہاتھ پیر کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے۔ سرد
ہواؤں میں سکڑتا ہوا مسجد کی طرف نہ جائے۔ مگر وہ ان ساری طبعی خواہشات پر لات مار کر محض
اپنے مالک کی رضا کے لئے جاتا ہے اور مسجد میں پہنچ کر خداوند کریم کے حکم کی تعمیل دل و جان سے
کرتا ہے تو یہ مخالفت نفس ملائکہ میں کہاں؟ اور یہ نفس کشی اور جہاد نفس ملائکہ کو کہاں میسر؟ کہ
وہاں نہ نفس امارہ ہے نہ ہوائے نفس ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جہاں کے نفس کو پچھاڑا جائے
اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ملائکہ کی توہین کر رہا ہوں۔ العیاذ باللہ۔ وہ اللہ کے مقدس بندے ہیں۔
بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں جن سے کبھی بھی گناہ و معصیت
کا صدور ممکن نہیں لَايَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُؤْمَرُوْنَ ان کی توہین کفر ہے اور ان پر
ایمان لانا واجب ہے۔ یہ صرف بیان حال ہے کہ ان کی عبادت بلا مزاحمت نفس ہے۔

انسان کی عبادت پوری مزاحمت نفس ہے

اور انسان کی عبادت پوری مزاحمتِ نفس سے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طبیعت
کے تقاضوں کو پورا کرنا کمال نہیں بلکہ خلاف طبیعت کرنا کمال ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی طبیعت
اس کی متحمل نہیں کہ اس میں علم آئے بلکہ جہالت اس کی طبیعت کا تقاضا ہے اس کی جبلت میں جہل
ہے علم نہیں۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے ہنر لے کر نہیں آتا۔ محنت و ریاضت سے ہنر پیدا
کرتا ہے طبیعت کو مار کر علم حاصل کرتا ہے جو عجیب بھی ہے۔ اور کمال بھی ہے۔ کمال اس لئے
ہے کہ مجاہدے سے اسے حاصل کیا جس سے اس کے اندرونی قوٰی کی قوت اور کارگزاری نمایاں ہوتی
ہے اور عجیب اس لئے ہے کہ وہ انسان جو ایک گندے قطرہ سے بنایا گیا ہے۔ اور جماد لایعقل مادہ
(نطفہ) سے تیار ہوا۔ نہ نور سے بنا نہ نار سے۔ بلکہ پامال خاک سے جس میں شعور کا نشان نہیں اور پھر
ایسا باشعور نکلا کہ دنیا بھر پر فوقیت لے گیا۔ نوری ملائکہ پر فائق ہوا اور ناری جنات پر غالب آ گیا محض
علم کے کمال سے۔

انسان اور ملائکہ کے عمل کا فرق!

تو علم کا ان گندے مادوں اور کثیف جسموں میں اتار
لینا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اس عجیب و
غریب کمال سے اگر وہ ساری کائنات سے بازی لے جائے تو اس تامل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ پس
ملائکہ میں اگر علم آتا ہے تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے اور ان کے اندرون سے ہے اور اندرون میں رہتا
ہے۔ اس لئے پھیل نہیں سکتا جتنا ہے اتنا ہی رہے گا لیکن انسان مجاہدہ سے علم حاصل کرتا ہے اور
جو چیز اس کے اندر نہیں ہے۔ وہ باہر سے لاتا ہے اور اسی علم حاصل کرنے کیلئے مشقت و مجاہدہ کے
ساتھ کتنے ہی راستے تحصیل علم کے لئے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور کتنی ہی منزلوں سے گزر کر وہ علم

کے مختلف درجات و مراتب اور علمی مقامات تک پہنچتا ہے اس لئے اس کا علم پھیلتا ہوا ہوتا ہے اس میں تدبر و تفکر شامل ہوتا ہے۔ جس سے من بھر علم دس من ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔ پس ملائکہ کا علم عطائی قسم کا علم ہے، جس میں پھیلاؤ نہیں اور انسان کا علم تدبر و تفقہ لئے ہوئے ہوتا ہے جس میں پھیلاؤ ہوتا ہے، یعنی فرشتے کو اگر چار مسئلے معلوم ہیں وہ چار کے چار ہی ہیں اور انسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ تدبر و اجتہاد کے ذریعے ان چار میں دس بیس مسائل اور علوم پیدا کر لیتا ہے اور نئے نئے علوم نکال لیتا ہے۔ اس لئے ملائکہ نے بمقابلہ آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا۔

انسانی علم کی فضیلت

سُبحَانَكَ لاَ عِلم لَنَا اِلاَّ مَاعَلَّمتَنَا

اور انسان کے استنباط کو اور اجتہاد کو اس کے خدا نے سراہا کہ :

وَاِذَا جَآءَ هُم اَمرُ مِّنَ الامن اَوِالخَوفِ اَذَاعُوابه وَلَو رَدُّوهُ اِلَى الرَّسُولِ وَاِلىٰ اُولِى الامرِ مِنهُم لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَستَنبِطُونَه مِنهُم

پس علمی لائن میں انسان کی برتری ملائکہ پر ایک تو کمیت علم کے لحاظ سے ہے کہ اسے تمام اسماء کی تعلیم ملی۔

جو ملائکہ کو نہیں ملی اور دوسرے کیفیت علم کے لحاظ سے ہے کہ ملائکہ اپنی معلومات میں تفقہ و اجتہاد سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتے اور انسان کرتا ہے، پس اللہ نے انسان کو سب سے زیادہ علم بھی دیا اور اسمیں زیادہ علم کی صلاحیتیں بھی رکھ دیں۔

استنباط وارتقائے علم صرف انسانی علوم کا خاصہ ہے

پس علم اور ارتقائے علم در حقیقت انسان ہی کی خصوصیت ثابت ہوئی جو دوسری مخلوقات میں نہیں اور ظاہر ہے کہ جامع علم شاہیت کی شان ہے کیونکہ بادشاہ کا کام مزدوری کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی مملکت کا علم رکھنا ہے تاکہ احکام دے سکے۔ اس لئے جب انسان کو سب سے زیادہ علم دیا گیا تو قدرتی طور پر نیابت و خلافت خداوندی بھی اسی کا کام ہو سکتا تھا جو اسے مل گیا۔ اور اس کائنات کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ نائب الٰہی بن کر اس کی کائنات پر حکم چلائے کائنات سے کام لے۔ اور اس میں حسب منشاء تصرفات کرے۔ اس لئے وہ حیوانات سے الگ کام لیتا ہے۔ جمادات سے الگ بیگار لیتا ہے، زمین سے آسمان تک اس کے تصرفات چلتے ہیں۔ وہ اس مادی کائنات کے مادوں میں علم کی طاقت جوڑ توڑ کر نئی نئی ایجادات کرتا ہے اور اس طرح اپنے علم کی وسعت کا ثبوت دیتا رہتا ہے، سب سے پہلے علم یہ ہے کہ شی کا نام معلوم ہو کیونکہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر عمل وصنعت میں نئی نئی اختراعات کرنا نہ فرشتوں سے بن پڑا نہ جن وحیوان سے۔

استعداد علم کی ترقی

بلکہ صرف انسان سے۔ تو حق تعالیٰ کی ازلی عنایت اس پر متوجہ ہوئی

اور اسی کو اس نے اپنی توجہ و عنایت سے تدریجی طور پر علم سکھلایا۔ چنانچہ علم کا بالکل ابتدائی مرتبہ شی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اگر نام ہی معلوم نہ ہو تو اسکی طرف توجہ ہی محال ہے اس لئے کہ مجہول مطلق کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے سب سے پہلے شاگرد حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام سکھلائے۔ جو علم کی ابتدائی منزل ہے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا شی کا نام معلوم ہو جانے پر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ میں اس کو دیکھ بھی لوں۔ جس کا نام سنتا آرہا ہوں تو پھر حق تعالیٰ نے وہ ناموں والی کائنات پہچنوائی کہ وہ معلوم الاسماء اشیاء فلاں فلاں ہیں۔ تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے انہیں پیش کیا۔ پس ان کے خواص و آثار بتلائے۔ پھر ان کے نتائج و غایات پر مطلع فرمایا۔ پھر ان سے کام لینا سکھلایا اور پھر ان سے نفع حاصل کرنے کے طریقے سکھلائے۔ غرض درجہ بدرجہ عالم بشریت علمی ترقی کرتا رہا اور انبیاء علیہم السلام یکے بعد دیگرے معلم بن کر آتے رہے۔ اور علم کے مراتب کی درجہ بدرجہ تعلیم دیتے رہے۔

تکمیل علم و خلافت

یہاں تک کہ جب انسانی استعداد جامع علم کی متحمل ہو گئی اور قرنہا قرن گزرنے اور علمی مشق کرنے کے بعد وہ ہمہ گیر علم کے لئے مستعد ہو گئیں تو آخری معلم حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کو بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے حقائق الٰہی کی تعلیم دی اور علم کو کامل کرتے ہوئے اس کے ہر ہر حکم کی علت اور لم پر مطلع فرمایا۔ جس سے انسان نے حقیقت علم کا سراغ پایا اور وہ قرآن حکیم کے جامع علم سے روشن ضمیر بنا۔ پس وہ خلافت جو آدم علیہ السلام کے دور میں اپنی۔۔۔ ابتدائی منزل میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور اس پر مبنی شدہ خلافت بھی ابتدائی ادوار میں رہی اور وہی علم جب ترقی کر کے حد کمال پر پہنچ گیا کہ اس کے بعد کسی نبی کے آنے کی گنجائش نہ رہی۔ جو کوئی نیا علم اور نئی شریعت لے کر آئے تو خلافت بھی حد کمال پر پہنچ گئی۔ چنانچہ خلافت ظاہری تو حقائق کائنات کی تسخیر ہے جس کے ذریعے عناصر اربعہ کے عجائبات نمایاں ہوں۔ اور خلافت باطنی حقائق الٰہی کی تحصیل ہے۔ جس کے ذریعہ روحانیات کے عجائبات نمایاں ہوں۔ سو ظاہر ہے کہ دور محمدی میں یہ دونوں ہی خلافتیں حد کمال کو پہنچ گئیں۔ ایک سے ایک محیر العقول مادی ایجادات انتہا کو پہنچ رہی ہیں۔ جو عقل و نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ اور ایک سے ایک حیرت ناک علمی و روحانی اجتہادات انتہا کو پہنچے جو تفقہ نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ غرض تعقل اور تفقہ یا عقل نفسانی اور فقہ روحانی دونوں حد کمال کو پہنچ گئے۔ کیونکہ علم جامع دنیا کے سامنے آگیا۔ اس لئے خلافت صوری و اسمی بھی مکمل ہو گئی اور خلافت حقیقی و معنوی بھی تکمیل کو پہنچ گئی۔

اختصاصِ خلافت

لیکن صورت بلا حقیقت ناپائیدار اور بے معنی ہے۔ اس لئے مادی خلافت بغیر روحانی خلافت کے بے معنی اور جسم بلا روح کی مانند ہے۔ جس کے لئے نہ بقا ہے۔ نہ پائیداری اس لئے اصل خلافت وہی علمی خلافت کہی جائے گی جس سے انسان کا کامل امتیاز ساری کائنات پر نمایاں ہوگا۔ تاہم یہ دونوں خلافتیں انسان کو ہی دی گئیں نہ

ملائکہ کو ملیں نہ جنات وحیوانات کو کیونکہ علم کا یہ مقام اور کسی کو نہیں ملا۔ ہاں یہ علم انسان ہی میں ترقی کر سکتا تھا اور بہائم یا جنات یا ملائکہ میں ترقی پذیر نہیں ہو سکتا تھا اور نہ وہ بھی دونوں قسموں کی خلافتوں کے مستحق ہو جاتے۔

مادی ترقی عناصر کے تصادم و ٹکراؤ کا نتیجہ ہے

سو اس کی بناء یہ ہے کہ علم کی ترقی ہو یا صنعت و عمل کی۔ بغیر تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی نام ہی ٹکراؤ اور تصادم کا ہے کہ اس کے بغیر علم اور قدرت کے مخفی راز آشکارا نہ ہو سکتے کیونکہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ بسیط مادہ میں ترقی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اسے اس کی ضد سے ترکیب دے کر ٹکرایا نہ جائے۔ مثلاً محض آگ میں کوئی ترقی نہیں۔ جس طرح ہزاروں سال پہلے وہ جلتی اور بھڑکتی تھی اسی انداز میں آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہزار دس ہزار برس کے بعد اس کی لپٹ اور رنگ نے ترقی کر کے کوئی نئی صورت یا جدت پیدا کر لی ہو۔

اس کے کسی انداز میں نہ اضافہ ہے نہ ترقی۔ اس طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں۔ سمندر کئی ہزار سال پہلے جس طرح ٹھاٹھیں مار کر اچھل کود کرتا تھا۔ اسی طرح آج بھی کر رہا ہے۔ نہ اس کے تموج نے کوئی جدت پیدا کی نہ جزر و مد نے وہی تموج آج بھی ہے' جو دس ہزار سال پہلے تھا۔ نیز سمندر بھی وہیں کا وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ اب بھی ہے جو پہلے تھا۔ کوئی رخ تبدیل نہیں۔ نہ اس کا رخ بدلا نہ دھارا بدلا اسی طرح ہوا جیسے پہلے چل رہی تھی۔ اب بھی اسی انداز سے چل رہی ہے۔ زمین جیسے پہلے ایک ذرۂ خاک تھی۔ اب بھی ہے نہ اس میں کوئی جدت ہے نہ ندرت نہ ترقی ہے۔ نہ ارتقاء لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے ٹکرا دو ترقی وہیں شروع ہو جائے گی۔ مثلاً پانی کو ایک برتن میں بھر کر اور بیچ میں ایک پردہ دے کر دوسری طرف آگ دھکا دیں کہ آگ پانی پر حملہ آور ہو۔ اور پانی آگ پر وہ اسے ٹھنڈا کر دینا چاہے اور یہ اسے گرما دینا چاہے اور یہ اسے گرم کر دینا چاہئے۔ تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جائے گی۔ جیسے بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں اور اس سے کلیں اور مشینیں چلنے لگیں گی۔ اور تمدنی ترقی شروع ہو جائے گی اگر آگ کو پانی سے ٹکر نہ دی جاتی تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ تو تمدنی ترقی دو عنصروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہے' جو تنہا ایک عنصر سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہوا کو آگ سے ٹکرا دیا جائے اور فضا میں مثلاً آفتاب کی گرمی سے برسنے والی آگ ہوا کے جھکولوں سے متصادم ہوتی ہے تو شہاب ثاقب اور گرجنے والے رعد و برق پیدا ہوتے ہیں جن سے جو کے عجائبات نمایاں ہوتے ہیں اور ـــــ ساکن فضاء میں نئے نئے حوادث رونما ہوتے ہیں جو محض آگ یا محض ہوا سے نمایاں نہیں ہو سکتے اسی طرح مثلاً مٹی اور پانی کو ملا دیا جائے کہ مٹی تو پانی کے سیلان اور رقت کو ختم کر دینا چاہتی ہے اور پانی مٹی کے جماؤ اور انجماد کو مٹا دینا چاہتا ہے تو ان دونوں کی ٹکر سے گارا پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے اینٹیں بننے لگیں گی جن سے مکانات کی تعمیر ممکن ہو گی پھر اس گارے سے برتن بننے لگیں گے جن سے تمدن کی ترقی ہو گی اور نئے نئے ڈیزائن کے ظروف و مکان اور سامان

تیار ہو جائیں گے۔ اگر تنہا مٹی اور پانی اپنی اپنی جگہ پڑے رہیں تو یہ ترقی کبھی بھی رونما نہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ اعیان میں لو تو دو پہلوان مثلاً فن کشتی و سپہ گری کے ماہر ہوں۔ لیکن کبھی بھی زور آزمائی نہ کریں اور کبھی بھی باہم کشتی نہ لڑیں تو ان کے فن اور داؤ پیچ میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوانوں کو باہم ٹکرا دیا جائے اور وہ کشتی لڑ پڑیں۔ تو ہر ایک کوشش کرے گا کہ ایک دوسرے کے داؤ کی کاٹ کرے تاکہ مغلوب نہ ہو تو ہر وقت نئے سے نیا داؤ اپنے فنی قواعد کے تحت ایجاد کرے گا اور اس طرح فن کے مخفی گوشے کھل کر فن ترقی کرے گا۔ اور دنیا کے سامنے نئے نئے داؤ پیچ کھلتے رہیں گے۔

علم و جہل، و باطل کے تصادم کی حکمت

اسی طرح ایک عالم کتنا ہی بڑا علم رکھتا ہو۔ اس کے علم میں خود بخود کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس عالم سے کسی جاہل کو لڑا دو جو اس پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ کر دے تو اس کے علم میں سے نئے نئے گوشے جوابوں کی بدولت پیدا ہو جائیں گے جن سے اس کے علم میں زیادتی ہوگی جو بغیر اس علم و جہل کی ٹکر کے کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اسلام حق ہے اس کا علم اور قانون سچا ہے لیکن اگر اس کے مقابلہ پر کفر نہ ہو اور وہ اس سے ٹکر نہ لیتا ہو تو اسلام کی قوتوں کے مخفی گوشے اور اس کے حقائق کے سربستہ راز جو اس میں پنہاں ہیں کبھی نہیں کھل سکتے۔ اور نہ ہی اس کی قوت نمایاں ہو سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسلام کے مقابلہ پر کفر، اخلاص کے مقابلہ پر نفاق، سچ کے مقابلہ پر جھوٹ، علم کے مقابلہ پر جہل، دیانت کے مقابلہ خیانت، ملائکہ کے مقابلہ پر شیاطین، انبیاء کے مقابلہ پر دجال رکھ دیئے کہ یہ اضداد ان اصول سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح ان کی پاکیزہ قوتیں اس ٹکراؤ سے نمایاں ہو کر ان کی صداقت کھولتی رہیں۔

قوموں کے باہمی تقابل میں درسِ عبرت

اس طرح وہ قوتیں کتنی ہی جاہ و جبروت کی حامل ہوں۔ لیکن اگر ایک کی دوسری قوم سے ٹکر نہ ہو تو ان کے مخفی جوہر جو مقابلہ ہی کے وقت کھل سکتے ہیں۔ کبھی نہ کھلیں۔ اس لئے جب دو قومیں لڑتی ہیں تو غالب و مغلوب کے ملنے سے ہمیشہ نئے نئے نظریات اور نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں تاکہ دنیا کی وہ ترقیات جو عقل انسانی اور علم روحانی سے وابستہ ہیں اپنے اپنے وقت پر ان تصادموں سے نمایاں ہوں۔ اور ہر قوم کے دماغی اور قلبی جوہر کھل کر اگلی نسلوں کے لئے مزید ترقیات کا درسِ عبرت بنیں۔ ورنہ ہر قوم ماء راکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح سڑ کر اپنے جوہروں کو کھو دے اور اقوام میں اس بے فکری سے سستی، کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جائے اور عالم میں فساد پیدا ہو جائے۔ اس لئے عوام کو ٹکرا کر ایک دوسرے کے لئے تازیانہ عبرت بنا دیا جاتا ہے تاکہ بے فکری سے اپنے خلقی جوہروں کو ضائع نہ کرنے پائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے اقوام کے تصادم کو خدا کے فضل و کرم سے تعبیر کیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کائنات ہے سربستہ راز ہی

واشگاف ہو سکتے ہیں نہ اقوام میں بیداری اور مستعدی پیدا ہو سکتی ہے، جو قدرت نے اس میں ودیعت رکھی تھی۔ فرمایا:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْفَضْلٍ عَلَی الْعَالَمِیْنَ

ٹھیک اسی طرح سمجھیں کہ انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیت ہے، جنات میں صرف شیطنیت ہے اور ملائکہ میں صرف ربانیت ہے۔ اسی لئے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں کوئی محض آگ کی مانند ہے جیسے جنات۔ کوئی محض ہوا کہ مانند ہے جیسے ملائکہ کوئی محض مٹی یا پانی کی مانند ہے جیسے بہائم۔ سو نہ جنات میں کوئی ارتقائی شان ہے۔ کسی جن نے آج تک نہ کوئی ایجاد کی جس سے دنیا میں سجاوٹ پیدا ہو جاتی نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا کہ نیا منہاج اور نئی شریعت پیدا ہو جاتی نہ کسی بہیمیت نے آج تک کوئی نیا راستہ ڈالا جس سے دنیا کو کوئی رہنمائی ملتی۔ جنات و شیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ و فریب اور فساد انگیزی کرتے تھے۔ اسی نوعیت کا آج بھی کرتے ہیں۔ بہائم کھانا پینا چرنا اور نسل بڑھانا جیسا پہلے کرتے تھے وہی آج بھی کرتے ہیں۔ نہ بیل کے گھاس کھانے اور نہ نر و مادہ کے ملنے کا کوئی جدید طریقہ نکلا نہ فرشتہ کی نیکی کرنے کا کوئی نیا راستہ نکلا۔ نہ شیاطین کے مکر و زور میں کوئی جدت پیدا ہوئی۔ بلکہ ہزارہا ہزار برس پہلے ان انواع کے جو طبعی افعال تھے وہی کے وہی آج بھی ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں کیونکہ یہ سب نوعیں اپنے اندر ایک ہی مادہ رکھتی ہیں اور ان کے اندرون میں تصادم کی کوئی صورت نہیں جو ترقی کی بنیاد تھی۔

تقابل صفات سے ترقی

بخلاف انسان کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرمادیں اس میں ملکیت بھی ہے۔ بہیمیت بھی ہے اور شیطنیت بھی ہے تو لازمی تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو جو اکہری قوتوں سے نہیں ہو سکتا تھا مثلاً بہیمیت کا کام کھانا پینا اور نسل بڑھانا تھا لیکن جب اس کے ساتھ ملکیت ٹکرا جاتی ہے تو تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو عفت کہا جاتا ہے اور اس سے جائز و ناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز فلاں حرام فلاں نسل کشی حلال اور فلاں حرام فلاں چیز پینی جائز اور فلاں ناجائز غرض تمدن کے ہزاروں گوشے عفت و پاک دامنی کی بدولت کھلتے ہیں جس سے دین و دیانت ترقی کرتے ہیں اور عفت در حقیقت بہیمیت اور ملکیت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جیسے آگ پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ تھا۔ جس سے تمدن ترقی کرتا تھا۔ اسی طرح شیطنیت کا کام دھوکہ، فریب، دغا بازی اور مکاری ہے اس کے ساتھ اگر ملکیت کی عقل ٹکرا دو تو تدبیر و تدبر پیدا ہو گا جس سے مکر و فریب کی بجائے عقل خیز تدابیر کا ظہور ہو گا اور مخفی تدبیروں کا حسن نمایاں ہو گا اور حملہ آوری اور بچاؤ کے نئے نئے نظریات سامنے آئیں گے درندوں میں قوت غضبیہ ہے جس کا ثمرہ تخریب اور چیر پھاڑ ہے۔

کمال کا ظہور اور مادی و روحانی ترقی

لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی متانت و بردباری کو ٹکرا دیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ جس میں عقل و ہوش کے ساتھ جوش دکھایا جاتا ہے اور بہادری کے ساتھ دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال شہوت، غضب اور مکر و فریب کے ساتھ اگر قوت عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور علمی و اخلاقی اور دینی ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں جو صرف انسان ہی سے ممکن ہیں۔ جن و ملک اور حیوان سے ممکن نہیں کیوں۔ متضاد قوتوں کا مجموعہ انسان ہی ہے۔ اس لئے ترقی کی راہیں بھی انسان پر کھل سکتی ہیں۔ نہ کہ ان تین مخلوقات پر اس لئے اگر ایجادات سے دنیا کو سجایا تو انسان نے سجایا۔ ریل، تار، فون، بجلی، اسٹیم جہاز، کشتی سواری، مکان، ظروف، تجارت، حرفت، حکومت، انسان کے سوا کسی نے کر کے نہیں دکھلائی اور ادھر اجتہادت اور نقل و روایت کی استنادات، دین، شریعت، مذہب، مشرب، ذوق وجدان حدس، تجربہ، علم، معرفت، رب، اطاعت، بشریت بھی انسان کے سوا کسی نے حتی کہ کسی پاکباز فرشتہ نے بھی کر کے نہیں دکھلائی یعنی انسان اس ترقی اور ان متضاد مادوں کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ ارتقاء کی بدولت فرشتوں سے کہیں زیادہ اونچا پہنچا اور جبریل کی رسائی سے بھی آگے تک اس کی رسائی ہوئی جہاں ملائکہ بھی پر نہیں مار سکتے یہ اس کی قوت عقلیہ کے قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ، قوت سبعیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔

قوائے شر کا عقل پر غالب ہونے کا نتیجہ

ہاں اگر اس ٹکراؤ میں عقل مغلوب ہو جائے اور قوتیں بمقابلہ عقل کے غالب آجائیں یعنی عقل ان مادوں کی خادم بن جائے اور ان کے تقاضوں کو اپنی تدبیر سے پورا کرنے کی نوکر بن جائے تو پھر یہ بہائم سے چار ہاتھ آگے کا بھیمہ اور شیاطین سے درجوں اوپر کا شیطان بن جاتا ہے جس سے بہائم اور شیاطین بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اگر اس کی عقل بھیمیت کا آلہ کار بن جائے تو بہائم کو وہ عیاشی اور بدکاری نہیں سوجھ سکتی جو اسے سوجھے گی۔ یہ زنا اور سیاہ کاری کی ایسی نئی نئی شکلیں ایجاد کرلے گا جو بہائم کے باپ کو بھی نہیں سوجھ سکتیں۔ اس کے ہاں عیاشی کے اڈے بن جائیں گے۔ زنا کے چکلے تیار ہو جائیں گے۔ فحاشی ایک فن اور ایک ہنر بن جائے گی اور حیوانات کے خواب میں بھی وہ حیوانیتیں نہ آئیں گی جو اس کا فحاش دماغ اور عیاش دل اختراع کرے گا اور اگر اپنی عقل کو مکر و فریب کی قوتوں کا غلام بنا دیا تو پھر اسے وہ حیلے اور جعلسازیاں سوجھیں گی کہ شیطان کو صدیوں غور کر کے بھی نصیب نہ ہوں گی۔ غرض ان خلقی قوتوں کے ٹکراؤ میں اگر عقل غالب رہی تو یہ احسن تقویم کا ثبوت پیش کرے گا اور اگر عقل پر شہوت و غضب اور درندگی غلبہ آگئی تو پھر انسان اسفل سافلین کھڑا نظر آئے گا۔

لیکن غور کرو تو یہ عقل ان قوتوں کا ساتھ دے گی اور انہیں اپنا کام کرنے کے نئے نئے راستے بتلائے گی لیکن عارف عقل جسے علم نے چمکا دیا ہو۔ ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی اور پھر ہر شعبہ زندگی میں انسانی کمالات کا ظہور ہوگا۔ اس لئے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات پر

عقل محض سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ علم سے ثابت ہوتی ہے اور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہو اور نرا عقلی بھی نہ ہو بلکہ ربانی علم ہو جو بذریعہ وحی کے ذات حق کی طرف آتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے۔ عقلوں کو جلا دیتا ہے۔ ذہنوں کو رسا کرتا ہے۔ دماغوں کو صیقل کرتا ہے اور بالفاظ دیگر آدمی کو آدمی بناتا ہے ورنہ ؎

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

اس لئے ہمارا فطری اور عقلی فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الہی علم کو حاصل کریں جس سے ہماری روشنی وابستہ ہے۔

شریعت کی حکمرانی

اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اسی علم سے ہدایت حاصل کریں یعنی خلوت اور جلوت، انفراد اور اجتماع دوستی اور دشمنی حکومت اور غلامی خوشی اور غمی، راحت اور مصیبت، موت و حیات ہر مرحلہ پر اسی علم سے جس کا دوسرا نام شریعت ہے، رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی عقل کو اس کے خادم کی حیثیت سے ساتھ رکھیں۔ یہی قوتیں جو جہالت میں کام کرتی تھیں۔ اب علم میں کام کریں گی۔ وہی بھیمیت جو جہالت کے ساتھ عیاشی، فحاشی بدکاری اور بے ایمانی پر لاتی تھی اب شریعت کے تابع ہو کر عفت و عصمت، پاکی، پاک دامنی اور نیکوکاری پر لے آئے گی وہی قوت شیطنیت جو بحالت جہل مکاری ڈپلومیسی عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھی۔ اب تابع فرمان الٰہی ہو کر تدبیر و دانائی دانش و بینش اور عاقبت شناسی کی طرف لے آئے گی۔ اور بالفاظ دیگر جبلت نفسانی سے نکال کر فطرت روحانی کی طرف نکال لائے گی۔ اس لئے خلاصہ یہ ہوا کہ طبیعت پر تو حکومت عقل کی قائم کر دی جائے اور عقل پر حکمرانی شریعت اور علم الٰہی کی کر دی جائے۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا معنی

تو انسان مزکیٰ، مصفا اور مجلی ہو جائے گا ورنہ ایک بہیمہ یا ایک شیطان یا ایک درندہ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ شریعت انسان کے کسی خلقی مادہ کو ضائع کرنے یا پامال کرنے کے لئے نہیں آئی۔ بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آئی ہے۔ تاکہ ہر قوت کو اس کا صحیح مصرف بتلا کر اس میں استعمال کرائے۔ یہی معنی ہیں اس کے دین فطرت ہونے کے کہ اس نے ہر قوت کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب۔ سبعیت ہو یا شیطنیت کسی کو بھی بے کار نہیں ہونے دیا بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلا دیا ہے، نیکی تو بجائے خود ہے، اس نے تو کسی بدی کو بھی علی الاطلاق نہیں مٹایا۔ بلکہ اپنے اشاروں پر چلایا ہے، مثلاً جھوٹ گناہ کبیرہ ہے۔ انسان کی جبلت میں جوش کے وقت مبالغہ آمیزی اور خلاف واقعہ کلام کر جانا داخل ہے، شریعت نے اسے کلیتہً نہیں مٹایا۔ بلکہ فرمایا کہ اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بھول کر بھی صلح کرا دو تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ملے گا۔ اور ایسا اجر جو نماز روزہ پر ملتا ہے۔ دو بھائی باہم لڑ رہے تھے۔ آپ نے ایک بھائی کے پاس جا کر کہہ دیا کہ

میاں تم کس کا مقابلہ کر رہے ہو وہ تو تمہاری جدائی سے بے حد غمگین اور سوگوار ہے اور رات تو وہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور روتا تھا کہ ہائے میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا۔ ادھر دوسرے بھائی کے پاس گئے اور اس سے بھی ایسی ہی باتیں کہیں، جس سے دونوں کے دل نرم ہو گئے اور مصالحت کو آمادہ ہو گئے۔ اور صبح کو دونوں نے معانقہ کر کے باہم صلح کر لی۔

شریعت نے جبلی و طبعی قویٰ شر کو خیر کی طرف موڑا

تو اس جھوٹ پر ثواب اس سچ کی نسبت یقیناً ملے گا جس سے فتنہ کا بیج بو دیا گیا اور دو ملے ہوئے بھائیوں کو لڑا دیا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کو بھی شریعت نے مٹایا نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے اشاروں پر چلایا ہے گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر شریعت کے اشاروں سے ہو اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت بن جاتی ہے۔ غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی کے عیب واقعی کو اس کی پس پشت بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ شریعت نے اس سچ کی ممانعت فرمائی ہے اور اسے حرام رکھا۔ حالانکہ غیبت سچی بات کو کہتے ہیں اور جھوٹ ہو تو وہ افتراء ہوگا غیبت نہ ہوگی تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ :

اَیُحِبُّ اَحَدُکُم اَن یَّاکُلَ لَحمَ اَخِیہِ مَیتاً فَکَرِھتُمُوہ۔

یعنی غیبت کرنا ایسا گندہ فعل ہے جیسے اپنے بھائی کے مردار گوشت کو نوچ نوچ کر کھانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے اور نہ جھوٹ معصیت بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے اور نہ ماننا معصیت ہے۔۔۔ یہی نماز تین اوقات میں حرام ہے۔ سورج طلوع ہوتے وقت۔ غروب ہوتے وقت اور استواء یعنی سر پر ہوتے وقت ان اوقات میں اگر نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔

عبادت کی حقیقت تسلیم و رضا ہے

ماہ رمضان میں روزہ فرض ہے اگر بلا عذر ترک کیا جائے تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں۔ لیکن یہی روزہ عید کے دن حرام ہے اگر روزہ رکھ لے گا تو گناہ گار ہو جائے گا جس سے واضح ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے، کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم کہیں 'روزہ رکھو جب ترک کرائیں ترک کرو' اپنی تجویز کو دخل مت دیں کہ یہ اطاعت در حقیقت عبادت ہے یہ نماز روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں۔ حقیقتِ عبادت اطاعت اور تسلیم و رضا ہے۔

خود کشی حرام اور بہت بڑا جرم اور گناہ ہے مگر جہاں میں اپنے کو قتل کے لئے پیش کر دینا اور سر کو ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے، اس سے واضح ہے کہ نہ جان دینا عبادت ہے۔۔۔ نہ جان بچانا عبادت ہے۔ کہنا ماننا اور بر وقت تعمیل حکم کرنا عبادت ہے۔ یہی قتل نفس اپنی نفس کے لئے کیا جائے تو معصیت ہے کہ خلاف اطاعت ہے اور یہی قتل نفس اگر حفاظت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کیا جائے تو شہادت اور دین عبادت ہے کیونکہ یہ نفس اور بدن آپ کی ملکیت

نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے اس کو آپ اپنی مرضی سے ضائع نہیں کر سکتے ہاں مالک کے حکم پر رکھ بھی سکتے ہیں اور کھو بھی سکتے ہیں' وہ رکھوائیں تو اس کار کھنا اور بچانا عبادت ہے وہ خود ہی اسے تلف کرائیں تو تلف کر دینا ہی عبادت ہے۔ لوٹ مار اور غارت گری نہ معصیت ہے نہ اس سے بچنا عبادت ہے کہنا ماننا عبادت ہے اگر کہے کے مطابق لوٹ ماری بھی ہو تو عبادت اور کہے کے خلاف امن دامان دینا بھی معصیت ہے' زمین پر اکڑ کر سینہ تان کر اور مونڈھے ہلا کر چلنا کبر نفس ہے۔ جس کو قرآن نے حرام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ۔

لَاتمشِ فِی الْاَرضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَن تَخرِقَ الْاَرضَ وَلَن تَبلُغَ الجِبَالَ طولاً

"خدا کی زمین پر تکبر کی چال مت چلو۔ کیونکہ تم اکڑ کر اور ابھر ابھر کر زمین کو چیر نہیں دو گے۔ اور اونچے ہو کر طول میں آسمان تک نہیں پہنچ جاؤ گے"۔

پھر کیوں یہ اینٹھ کر چلنے کی مصیبت بھر رہے ہو جس سے صاف واضح ہے کہ اینٹھ مروڑ کے ساتھ چلنا معصیت اور جرم ہے لیکن حج کے موقع پر جس طواف کے بعد سعی صفا و مروہ ہو اس میں ابتدا کے چار پھیروں میں اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجب اور جزو عبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ اکڑ کر چلنا معصیت ہے نہ جھک کر چلنا عبادت ہے۔ بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے' پس اصل چیز اطاعت چیز اطاعت حق نکلی اگر اطاعت کے خلاف ہے تو نماز روزہ بھی معصیت بن جاتے ہیں اور اگر کہے کے مطابق ہے تو جھوٹ' لوٹ مار' تکبر کی چال اور غارت گری بھی عبادت بن جاتی ہے۔ بس اس طرح تمام خلقی قوتوں کو شریعت کے موافق استعمال کیا جائے تو وہ سب اطاعت بنتی چلی جائیں گی اور خلاف حکم استعمال کیا جائے تو معصیت ہوتی چلی جائیں گی۔ اس سے عبادت کی دو نوعیں نکلتی ہیں ایک افعال خیر جن کا کیا جانا ضروری ہے' اور ایک افعال اثم جن سے بچنا ضروری ہے۔

بر و تقویٰ پہلی نوع کو شریعت کی اصطلاح میں بر کہتے ہیں جیسے فرمایا۔

لَیسَ الْبِرَّ اَن تُوَلُّوا وُجوھَکُم قِبَلَ المَشرِقِ وَالمَغرِبِ وَلٰکِنَّ البِرَّ مَن آمن بِاللّٰہِ (الآیہ)

اور دوسری نوع کو تقویٰ کہتے ہیں جس کے ذریعہ گناہ سے بچا جاتا ہے۔ عبادت کی ان نوعوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو تو انسان ملائکہ سے علم ہی میں نہیں بڑھا ہوا ہے بلکہ عبادت میں فائق ہے' کیونکہ تقویٰ کی عبادت ملائکہ میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ تقویٰ کہتے ہیں شر سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر کا مادہ ہی نہیں۔ وہ شر کے افعال کر ہی نہیں سکتے' تو ان سے بچنے کے لئے کہا بھی نہیں جا سکتا ہے اور اس کار کنا عبادت بھی قرار پا سکتا ہے اور وہ ارادۃً رکتا ہے' فرشتہ میں نہ شر کا مادہ ہے نہ اس کے شر سے بالا رادہ رکنے کا سوال ہی پیدا ہو سکتا ہے' اس لئے تقویٰ کی نوع کی عبادت ہی فرشتہ کے لئے نہیں۔ یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے تو انسان اس نوع عبادت میں ملائکہ سے بڑھ گیا اب جو عبادتیں کرنے کی ہیں۔ ان میں معاشرت' معاملات اور خانگی زندگی کی عبادت بھی فرشتوں کے لئے نہیں کیونکہ ان میں نسل کا قصہ ہی نہیں کہ ان کے عزیز و اقارب پیدا ہوں' اور معاملات لین دین' آشتی و صلح اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے بر کا دو تہائی حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص کھلا اب رہے اعتقادات سو یہ بھی

انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اعتقاد کی اصل ہے کہ ایمان کا مکلف قرار دیا جائے اور ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لئے اعتقادات کا حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ اب اگر رہ جاتا ہے تو دیانات کا رہ جاتا ہے۔ یعنی نماز روزہ زکوٰۃ وغیرہ سو مال کی ضرورت معاشرت کے لئے ہے۔۔۔ فرشتوں میں معاشرت ہی نہیں۔ کہ نسل نہیں اس لئے مال کے لین دین کا بھی سوال نہیں ہو سکتا تو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہی رہا روزہ کے معنی اپنی ارادہ ونیت سے کھانا پینا اور لذت نساء کو ترک کرنا ہے فرشتہ کے لئے نہ بیوی ہے نہ کھانا پینا تو وہاں اس عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس لئے لے دے کر نماز رہ جاتی ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ فرشتہ کی طبعی بات ہے اور طبعی تقاضوں سے کسی کام کا کرنا عجیب نہیں۔ انسان کا ایک سجدہ جو خلاف طبع کو برداشت کر کے ہوتا ہے۔ فرشتہ کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیانات و عبادات میں بھی انسان ہی فرشتہ سے افضل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں بھیمیت اور شیطنیت والی قوتیں ہیں جن کی بدولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ فرشتہ میں یہ دونوں قوتیں نہیں۔ اس لئے وہ دو تہائی دین سے الگ تھلگ ہے۔ اب انسان میں قوت عقلی ہے۔ جو فرشتہ میں بھی ہے مگر اس عقل کے کتنے ہی مصرف جس سے عقلی قوت کی تفصیلات کھلتی ہیں۔ صرف انسان میں ہیں ملائکہ میں نہیں۔ اس لئے وہ اطاعت و عبادت میں بھی وہ انواع پیش نہیں کر سکتا جو انسان پیش کر سکتا ہے غرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند ہیں اور انسان پر کھلے ہوئے ہیں۔ اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانون خداوندی کے ماتحت گزارنا ہے سو جو جامع زندگی انسان کو ملی ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملیں۔ اس لئے اسلام اور تسلیم و رضا بھی اس کی جامع اور حاوی ہو سکتی ہے۔ جو کسی دوسری نوع کے لئے ممکن نہیں ابراہیم کو جب حکم ہوا۔ اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ۔ ے ابراہیم مسلم بن جاؤ تو یہ مطلب نہ تھا کہ معاذ اللہ کفر سے اسلام میں داخل ہو جاؤ بلکہ یہ تھا کہ پنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو اور گردن جھکا دو تو عرض کیا۔

اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

"میں مسلم بن گیا۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اعلان کر دو کہ میری زندگی اور موت۔ میری نماز اور عبادت سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ رضائے نفس کے لئے نہیں۔ مجھے اسی کا حکم کیا گیا ہے اور میں اوّل مسلمین میں سے ہوں"۔

پس اسی تفویض و تسلیم کو اسلام کہتے ہیں کہ رضائے حق کے لئے جئے اور رضائے حق ہی کے لئے مرے اسی کی خوشنودی کے لئے صلح کرے اسی کے لئے لڑے اسی کے لئے محبت کرے اسی کے لئے عداوت باندھے اسی کے لئے دے اور اسی کے لئے ہاتھ روکے۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ہے۔

من احب لله وابغض لله واعطى لله و منع لله فقد استكمل الايمان

"جو اللہ ہی کے لئے محبت کرے اسی کے لئے عداوت کرے اسی کے لئے دے اور اسی کے

ہاتھ روک لے تو اس نے ایمان کامل کر لیا“۔

اور ظاہر ہے کہ یہ افعال فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں شہوت ہے نہ شیخیت نہ غفلت ہے نہ نخوت۔ اس لئے جو اطاعت انسان کر سکتا ہے وہ فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں وہ مادے ہی نہیں۔ جن کی روک تھام سے عبادت کی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔ اس لئے فرشتہ کو ان علوم کی ضرورت بھی نہ تھیں جو انسان کو تھی۔ اس لئے کہ جتنی مادی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں۔ اتنے ہی دفاع و مدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لئے ضروری ہے۔

بنیادِ خلافت

اس سے واضح ہوا کہ انسان کا علم بھی فرشتوں کی نسبت کامل اور جامع ہے اور اسکی عبادت بھی ان کی نسبت کامل اور جامع ہے اور بوجہ مدافعت جتنی عبادت انسان کی مضبوط ہے فرشتہ کی نہیں ہو سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم بھی اس کا کامل۔

تو ساری کائنات میں سے صرف یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائب خداوندی بنے کیونکہ کمالات خداوندی لامحدود ہونے کے باوجود دو ہی نوعوں میں اصلاً منحصر ہیں کمالات علم اور کمالات عمل اور انہی دو میں انسان ساری مخلوقات حتیٰ کے فرشتوں سے بھی بڑھ کر نکلا تو خدا کا نائب بھی ان کمالات میں وہی ہو سکتا تھا اور عمل چونکہ علم کے تابع ہے اس لئے اصل بنیاد خلافت علم ہی ٹھہر جاتی ہے۔ جو انسان ہی میں حد کمال تک پہنچا ہوا ہے: اس لئے اسی کو خلیفہ الٰہی بنایا گیا۔

خلافتِ انسان کے بارے میں ملائکہ کا سوال

اسی لئے جب فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں کیوں نہ خلیفہ بنا دیا جائے کہ ہم سے زیدہ آپ کی تقدیس و تسبیح کرنے والا کون ہے؟ تو حق تعالیٰ نے اولاً حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملہ کو ہم جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا کہ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دے کر ملائکہ کو چیلنج کیا کہ ذرا تم اشیاء کائنات کے نام تو بتا دو وہ نہ بتا سکے تو آدم سے فرمایا تم بتاؤ۔ انہوں نے فر فر گنوا دیئے تو بتا دیا گیا کہ علم کا ابتدائی مرتبہ علم اسماء ہے جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لے جا سکے تو اسماء کے بعد صفات اشیاء پھر خواص اشیاء پھر حقائق اشیاء وغیرہ کے علوم ہیں تم ان سے کب بازی لے جا سکو گے اس لئے مستحق خلافت انسان ہی ہے۔

بارگاہ الٰہی سے قولی و عملی جواب

رہا عملی میدان تو اس میں ملائکہ نے نوعِ انسان کی مذمت کی تھی کہ وہ سفاک ہوگا۔ مفسد ہوگا تو قدم قدم پر حق تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے اعمال اول تو ملائکہ ہی سے لکھواتے ہیں تا کہ قیامت تک ان کے اس شبہ کا جواب عملی ہوتا رہے اور وہ انسان کی نیکی پر گواہ بنتے رہیں اور ساتھ ہی حدیث میں ہے کہ جب کہیں مجلس خیر وعظ نصیحت وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے اس مجلس پر نازل

ہوتے ہیں جو اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں جیسا کہ یہ مجلس ہے جس میں آج ہم اور آپ جمع ہو کر ذکر حق کر رہے ہیں۔ اس میں بلاشبہ کروڑوں فرشتے تشریف فرما ہیں۔ جب یہ مجلس خیر ختم ہو گی۔ تو وہ فرشتے آسمانوں میں چڑھتے ہیں اور انہیں حق تعالیٰ سے قرب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں تم کہاں گئے تھے۔ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں کی مجلس میں فرماتے ہیں تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد میں مصروف تھے آپ کی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے خائف تھے۔ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے جنت دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں انبیاء سے سن کر ایمان لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر جنت و نار کو دیکھ پائیں تو کیا کریں؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ پائیں تو سوائے جنت مانگنے اور دوزخ سے پناہ مانگنے کے انہیں کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔ جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ جنت بخشنا تھا تو ان اربوں کھربوں فرشتوں کے نازل فرمانے اور انہیں آسمان پر چڑھا کر ان سے پوچھنے اور انہیں گواہ بنا کر مغفرت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے بغیر بھی مغفرت فرما سکتے تھے؟ پھر یہ کہ ایسی مجلسیں دنیا میں نہ معلوم کتنی ہو رہی ہوں گی جیسی مجلس یہاں ہو رہی ہے اور ہر جگہ ملائکہ کا ان مجلسوں پر اترنا اور چڑھنا اور پھر گواہ بننا آخر کیا ضروری تھا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ملائکہ کا عملی جواب دینے کے لئے ہے کہ جس کے بارے میں تم کہتے تھے کہ:

اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ

تم نے دیکھا کہ وہ کس درجہ عمل صالح اور برو تقویٰ میں لگا ہوا ہے اور کس درجہ صالح بن کر دین کو پھیلانے اور اس پر خود جمے رہنے کی سعی بھی کر رہا ہے

انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت

کیا یہ فساد ہے؟ کیا یہ سفاکِ دماء ہے؟ پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت و اطاعت میں اسے فرشتوں سے اونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اس کی نیکی پر گواہ بنایا تاکہ اس کی سفاکی اور فساد کا تخیل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بصدق دل اس کی خلافت کے معترف ہو جائیں، چنانچہ ہر خیر و عبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج وزیارت کرتے ہیں، طواف و سعی میں دوڑتے ہیں۔۔۔ منیٰ و عرفات میں ٹھہرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے منہ موڑ کر سر سے کفن باندھ کر اپنی لذت و آرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ سب میری خوشنودی و رضا کے لئے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ تم گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔ حقیقت میں یہ فرشتوں کو وہی عملی جواب ہے کہ وہ انسان جس کے متعلق تم نے اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا کہا تھا۔ دیکھو کیسا اطاعت و عبادت اور ترک لذات میں اپنے رب کی خاطر

مصروف ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ دن کے اعمال لکھنے والے ملائکہ الگ ہیں اور رات کے الگ۔ دن والے فرشتے عصر کی نماز کے وقت اوپر چڑھتے ہیں اور اعمال نامے رات والے ملائکہ کے حوالے کر دیئے ہیں اور رات والے فرشتے صبح کی نماز کے وقت دن والوں کو چارج دے کر اوپر چڑھتے ہیں غرض دونوں وقتوں کے ملائکہ کا عروج و نزول کا وقت فجر اور عصر کی نمازوں کے وقت کیا گیا۔ ان کے چڑھنے پر حق تعالیٰ جب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا تو جواب میں عرض کرتے ہیں کہ۔

ترکناھم وھم یصلون

”جب ہم نے انہیں چھوڑا جب بھی نماز میں مصروف تھے۔ اور جب ہم نے جا کر دیکھا جب بھی نماز ہی میں مشغول عبادت ہیں۔ یہ معاملہ روزانہ صبح اور شام ہوتا رہتا ہے۔ گویا صبح وشام ملائکہ کو عملی جواب دے کر انسان کی برتری ان پر جتائی جاتی ہے، تاکہ روزانہ ان کو عملی جواب ملتا رہے اور وہ انسان کی فضیلت اور اس کی خلافت کے معترف ہوتے ہیں۔

احوال و کیفیات میں انسان کا تفوق

پھر نہ صرف علم و عمل ہی انسان کا فرشتوں سے بالا و برتر ہے بلکہ احوال و کیفیات بھی دیکھی جائیں۔ جو قرب الٰہی اسے حاصل ہوتی ہیں۔ سو وہ ان احوال میں بھی ملائکہ سے بالا و برتر ہے آخر جو احوال و کیفیات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ پر طاری ہوتی ہیں وہ فرشتوں پر نہیں آسکتیں۔ کیونکہ نہ ملائکہ علم و عمل کے ان میدانوں سے گزرتے ہیں۔ جس سے انسان گزرتا ہے۔ نہ ان پر وہ کیفیات عشق و محبت طاری ہوتی ہیں۔ جو انسان پر ہوتی ہیں اور جب علم، عمل، حال سب ہی میں انسان ملائکہ سے فائق ہے تو انسان ہی کا حق تھا کہ اسے نیابت کی نعمت سے نوازا جائے۔ اور خلیفہ خداوندی بنایا جائے کہ بناء خلافت یہی دو چیزیں تھیں علم خداوندی اور اخلاقِ خداوندی وہ دونوں جب اس میں علی وجہ الاتم ثابت ہوتے ہیں۔ تو خلافت بھی علی وجہ الاتم اس میں آسکتی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تکمیلِ خلافت دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں ہوگی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بنائے خلافت جب کہ علم کامل اور عمل کامل ہے تو یہ علم و عمل جب تک کہ اسی انداز کا نہ ہوگا۔ جس انداز کا خود حق تعالیٰ کا ہے اس وقت تک اس انسان کی علمی و عملی خلافت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

تکمیل خلافت آخرت میں ہو گی

اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے علم اور عمل وصنائع کی شان یہ ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا علم بھی اسباب سے بے نیاز ہے یہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے کوئی کتاب پڑھ کر یہ علم حاصل کر لیا۔ (معاذ اللہ)

بلکہ علم کا سرچشمہ خود اس کی ذات ہے۔ یعنی علم خود اس کی ذات بابرکات سے ابھرتا ہے

ایسے ہی اس کی صناعی بھی وسائل و آلات کی محتاج نہیں بلکہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو فرمادیتے ہیں کن (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے اس لئے وہ پل بھر میں جہان بنا دیتے ہیں اور ان کے ارادہ ہی سے وہ چیز خود بخود معرض وجود میں آجاتی ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

اس صورتحال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیت اس میں جنت میں داخل ہو کر پیدا ہوگی۔ چنانچہ علم تو یہ ہوگا کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہو جائیں گی۔ کسب و محنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جس جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آ جائے گی۔ اسی کو یوں قرآن میں فرمایا گیا:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (الآیہ)

یعنی ماضی و مستقبل سب کچھ انسان پر روشن ہو کر اس کے علم میں آجائے گا اگلے پچھلے تمام کئے ہوئے اعمال اس کے سامنے آجائیں گے اور یہ علوم اسے خود بخود حاصل ہوں گے نہ کوئی استاد ہوگا۔ نہ کتاب بلکہ نفس انسان، خود مدرک بن جائے گا اور ہر عمل کی یہ کیفیت ہوگی کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہو جائیں گی۔ کسب و محنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی جتنی جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی اسی کو قرآن میں فرمایا گیا:

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ

گویا کن فیکون کی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ جو چاہا وہی ہو گیا۔ نہ اسباب کی ضرورت نہ وسائل کی اور جب علم انسانی اسباب سے مستغنی ہو جائیگا۔ اور عمل کسب و ریاضت سے مستغنی ہو کر محض قوت ارادہ کے تابع ہو جائیگا۔ بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے علم و صنعت کے مشابہ ہو جائے گا تو اس وقت انسان کی علمی و عملی خلافت مکمل ہوگی کہ وہ اور اس کے علم و عمل سے مشابہ اس کا علم و عمل ہو جائیگا۔ اور جب کہ بنائے خلافت بھی علم و عمل تھا۔ جب علم و عمل خداوندی کے مشابہ بن گیا تو خلافت بھی صحیح معنی میں اس وقت مستحکم اور مضبوط ہوگی مگر جنت میں یہ استحکام خلافت جب ہی ہوگا جب دنیا میں علم و عمل ہو جائیگا۔ اور جب کہ بنائے خلافت بھی علم و عمل کے اسباب و وسائل اختیار کر کے اسے جزو نفس بنانے کی انسان نے سعی کی ہوگی۔ ورنہ یہاں کی محرومی سے وہاں بھی محرومی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کامل بن جانے کے بعد حق تعالیٰ ان بندوں کو انہیں القاب و خطابات سے یاد فرمائیں گے جو القاب و خطابات خود ان کے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو نشاط میں ڈالنے کے لئے ان کے نام خطوط بھیجیں گے۔ فرشتے خط رسانی کا کام کریں گے۔ ان خطوط کے لفافوں پر یہ پتہ لکھا ہوگا۔

من العزیز الرحیم الی العزیز الرحیم

عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے یعنی القاب بھی وہی دے دیں گے۔ جو خود ان کے سرکاری خطابات ہیں۔ پس اس عالم میں انسان صورۃً خلیفہ خداوندی ہے۔ اور محض خلافت کے راستہ پر ہے، آخرت میں پہنچ کر حقیقی معنی میں خلیفہ خداوندی بن جائے گا مگر یہ منزل

جب ہی آئے گی جب اس کا راستہ دنیا میں اختیار کر لیا جائے گا اگر یہاں نیابت نہ کی یا ظاہری صورت اختیار نہ کی جو اطاعت و عبادت سے بنتی ہے۔ تو وہاں تکمیل کس چیز کی ہوگی۔ اور کیسے ہو جائیگی؟ بہرحال یہ واضح ہو گیا کہ جنات ملائکہ اور حیوانات میں سے اس خلافت کے عہدہ کے لئے کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا۔ آیا تو صرف انسان کا آیا۔

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

سو ان میں سے حیوانات تو قابل خطاب ہی نہ تھے۔ اس لئے قابل ذکر بھی نہ تھے۔ قابل ذکر ملائکہ۔ جنات اور انسان ہی تھے۔ سو ان ہی کا اللہ نے اس آیت میں جو میں نے ابتداء میں تلاوت کی تھی ذکر فرما کر ہر ایک کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملائکہ کا ذکر فرما کر ان کی علمی کم مائیگی پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ علم کے میدان مقابلہ میں انسان سے ہار گئے۔ شیطان کا ذکر فرما کر جو جنات میں سے ہے اس کے فہم و عمل کی کوتاہی پر روشنی ڈالی کہ وہ امر خداوندی کے معارضہ پر اتر آیا اور سرکشی پر آمادہ ہو گیا جو اس کی بدفہمی اور بدنیتی تھی۔ پس نہ کم علم خلیفہ الٰہی بن سکتا تھا نہ بدفہم اور بدنیت، انسان نے علم کا ثبوت دیا کہ جنت کی سکونت کا حکم دیا گیا تو وہاں جا داخل ہوا اور علم اسماء سے اس کا علم ترقی کر گیا۔ جس سے زندگی اس کی جامع ہوئی اور ان ناموں کے ذریعہ اس نے تمام اشیاء زندگی پر قابو پالیا اور کائنات اس کے لئے مسخر ہوئی۔ ملائکہ اس کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور شیطان کو مردود بنا کر اس کے مقابلہ پر چھوڑ دیا گیا کہ چوکنا رہے اور اس کا مقابلہ کر کے اپنی مخفی علمی اور عملی قوتوں کا ثبوت دے، اور اسی طرح اس کی خلافت روز افزوں چمکتی رہے۔ یہ علم انبیاء کو دیا اور انبیاء نے یہ علم جو بنائے خلافت ہے بنی نوع انسان کو سکھایا پس انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے تو شاگرد ہیں اور کائنات کے استاد اور مربی ہیں حق تعالیٰ نے ان پاکباز استادوں کا گروہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد میں بھیجا۔ اور دنیا کو حکم دیا۔ کہ ان سے علم سیکھے اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ پس یوں سمجھو کہ یہ پوری دنیا ایک مدرسہ ہے جس کا فرش زمین ہے چھت آسمان ہے۔ اس پر ستاروں سے چاندنا کیا۔ انسان و جنات اس مدرسہ کے طلبہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام استاد ہیں اور ملائکہ خدام مدرسہ نگران اور منتظم ہیں طلبہ کے لئے وظیفہ کی ضرورت تھی تو اس زمین کو دستر خوان بنا دیا تاکہ طلبہ وظیفہ پا سکیں اور ان کی ضروریات پوری ہوں اور وہ ہمہ تن علم کی تکمیل میں لگ کر استحقاق خلافت کو مکمل کریں اور اس طرح انسان کی فوقیت باقی تینوں ذی شعور انواع پر واضح ہو گئی جس کی بنا علم ہے۔

خلافت نبوت یہ علمی اور عملی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام اولین خلفاء ربانی ہیں۔ ان کے بعد ان کے وارث خلیفہ ہوتے ہیں جو علمائے ربانی ہیں اور ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے۔

یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین (الحدیث)

پھر ہر صدی پر مجدد دین کا وعدہ دیا گیا ہے جو علماء راسخین فی العلم ہوں گے یہ حضرات علماء اس علم الٰہی سے غلو کنندوں کی تحریفوں باطل پسندوں کی دروغ بافیوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جو شکوک و شبہات اہل باطل اور زیغ اس میں ڈالیں گے۔ یہ اہل علم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ پس یہ امت لاوارث امت نہیں کہ جس کا جی چاہے اس کے دین و علم کا حلیہ بگاڑ دے۔

اور کسی بھی مفسد و عیار کی دین میں پیش نہ چلے گی۔ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا:

کیف تهلك امة انا اوّلها.

والمهدی وسطها والمسیح اخرها.

آپ نے ارشاد فرمایا:

لاتجتمع امتی علی الضلالة

وراثت نبوت

آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

لاتزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لایضرهم من خاذلهم ولامنخالفهم حتی یاتی امر الله۔

پس جس امت میں اتنی انواع کے اخلاف رشید کے وعدے دیئے گئے ہوں۔ وہ امت لاوارث امت نہیں ہو سکتی۔ اس پشت کی پناہی اللہ و رسول کی طرف سے برابر جاری رہے گی جیسا کہ رہتی آرہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

مثل امتی کمثل المطر لایدری اولها خیر ام اخرها؟

پس انبیاء علیہم السلام کا ترکہ اس وارث امت کو ملتا رہے گا جب تک اپنا روحانی نسب حضورؐ سے جوڑے رکھے گی اور وہ ترکہ بھی علم ہے کیونکہ انبیاء روٹی اور کرسی وراثت میں نہیں چھوڑتے بلکہ علم و معرفت۔۔۔ چھوڑتے ہیں۔ اسی علم و معرفت سے آدمی آدمی بنتا ہے اور انسانیت اسی علم پر موقوف ہے اگر دنیا میں انبیاء علیہم السلام تشریف نہ لائے تو انسان گھوڑوں ڈنگروں کا ایک گلہ ہوتا جو بقول ملائکہ سفاکی اور مفسدہ پردازی کے سوا دوسرا کام نہ جانتا۔

انسانی ترقی

پس مادی تعلیم اور سائنس وغیرہ عمدہ عمدہ سامان تو پیدا کر سکتی ہے۔ مگر عمدہ انسان پیدا نہیں کر سکتی، عمدہ انسان صرف انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ سائنس سے باہر تو چاندنا ہوتا ہے مگر اندر اندر اندھیرا ہوتا ہے نہ تقوائے ظاہر ہوتا ہے نہ تقوائے باطن۔ ظاہر مادیت کی ترقی ہو رہی ہے مگر اندر کے جوہر تباہ ہو رہے ہیں۔ انسان نے نئی نئی ایجادات میں اپنی تمام طاقتوں کو گم کر دیا اور اس کی محتاجگی بڑھ گئی اگر وہ اڑنا چاہے تو وہ بے لکڑی پیتل کا محتاج ہے اگر بعید مسافت پر خبر دینا چاہے تو ٹیلی سکی اور وائرلیس کا محتاج۔ اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا چاہے تو ریل موٹر کا محتاج خود اپنے نفس کی اندرونی طاقتوں سے یہ کام نہیں

کر سکتا بلکہ ان آلات ووسائل کا دست نگر ہے۔ مرد وہ تھے جنہوں نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ ہزار رہا میل کی مسافت پر بلا لاسلکی کے آوازیں پہنچائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بیت اللہ کے بن جانے کے بعد حج کرنے کی ہدایت کی آواز لگائی تو وہ سارے عالم میں گونجی۔ فاروق اعظم نے مسجد نبویؐ سے سار یہؓ کو آواز دی تو وہ ڈھائی سو میل پر بلا ریڈیو کے پہنچی۔ انہوں نے بلند پرواز دکھلائی وہ کسی ہوائی جہاز کے محتاج نہ ہوئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر پہنچے۔ اور حضرت محمد مصطفی ﷺ ساتوں آسمانوں سے گزر کر مستویٰ تک پہنچے۔ مگر محض اپنی اندرونی روحانی قوتوں سے نہ کہ مادی وسائل سے اس لئے اپنے اندر جوہر پیدا کر ڈلو ہے، پیتل کے محتاج بن کر مت رہ جاؤ۔ اسباب کے بندے نہ بنو۔ مسبب الاسباب کے بندے بنو۔

آج کی ترقی انتہائی محتاجگی کی ترقی ہے۔ حالانکہ انسان کی ترقی استغناء کی ترقی ہے۔ لوہے، پیتل اور دیگر معدنیات کا غلام بن جانا ترقی نہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو اپنی غلامی پر مجبور کر دینا ترقی ہے۔ آج کا انسان صرف اس جگہ باکمال ہے، جہاں مشینیں ہوں، بجلی ہو۔ پاور ہاؤس ہو، پٹرول ہو جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہ عاجز، بے بس اور بے کس ہے۔ انسان کامل وہ ہے کہ اگر زمین پر ہو تو بھی باکمال ہو اور اگر زمین کے اندر ہو تو بھی باکمال۔

نورِ قلب

شیخ شہاب الدین سہروردی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس کو مولانا رومی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ رومیوں نے کہا کہ ہم اچھے صناع اور کاریگر ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم ہیں۔ بادشاہ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے کہا۔ تم اپنی صناعی دکھلاؤ۔ اس وقت دونوں صناعیوں کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ کی گئی کہ بادشاہ نے ایک مکان بنوایا اور اس کے درمیان پردہ کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ چینیوں سے کہا نصف مکان میں تم اپنی کاریگری دکھلاؤ اور رومیوں سے کہا کہ دوسرے نصف میں تم اپنی اپنی صناعی کا نمونہ پیش کرو۔ چینیوں نے تو دیواروں پر پلاستر کر کے قسم قسم کے بیل بوٹے اور پھول پتے رنگ برنگ کے بنائے اور اپنے حصہ کے کمرہ کو مختلف نقش و نگار اور رنگارنگ بیل بوٹوں سے گل و گلزار بنا دیا۔ ادھر رومیوں نے دیواروں پر پلاستر کو صیقل کرنا شروع کر دیا اور اتنا شفاف اور چمک دار کر دیا کہ اس میں آئینہ کی طرح صورت آنے لگی۔ جب دونوں نے اپنی اپنی کاریگری اور صناعی ختم کر لی تو بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ آئے اور حکم کیا کہ درمیان سے دیوار نکال دی جائے جونہی دیوار بیچ میں سے ہٹی، چینیوں کی وہ تمام نقاشی اور گلکاری رومیوں کی دیوار میں نظر آنے لگی اور وہ تمام بیل بوٹے رومیوں کی دیوار میں منعکس ہو گئے۔ جیسے رومیوں نے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا بادشاہ سخت حیران ہوا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے کیونکہ ایک ہی قسم کے نقش و نگار دونوں طرف نظر آ رہے تھے۔ آخر کار اس نے رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ ان صناعی اعلیٰ ہے کیونکہ انہوں نے اپنی صناعی بھی دکھلائی اور ساتھ چینیوں کی کاریگری

بھی چھین لی۔

مولانا روم نے اس قصہ کو نقل کر کے آخر میں بطور نصیحت کے فرمایا کہ اے عزیز! تو اپنے دل میں رومیوں کی صناعی جاری کر، یعنی اپنے قلب کو ریاضت و مجاہدہ سے مانجھ کر اتنا صاف کر لے کہ تجھے گھر بیٹھے ہی دنیا کے سارے نقش و نگار اپنے دل میں نظر آنے لگیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر و سرو و چمن در آ

تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن در آ

یعنی تو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھول دے کہ اس میں سے ہر قسم کا مادی میل کچیل نکال پھینک اور اسے علم الٰہی کی روشنی سے منور کر دے تو تجھے دنیا اور آخرت کے حقائق و معارف گھر بیٹھے ہی نظر آنے لگیں گے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء

بے کتاب و بے معید و استا

برکتِ عمل مگر یہ شان مادی علوم کی نہیں۔ صرف روحانی اور شرعی علوم کی ہے جب کہ ان پر عمل کیا جائے حدیث میں ہے۔

عمل کی برکت سے حق تعالیٰ قلب میں وہ علوم ڈالتا ہے جو پہلے سے اس میں نہ تھے اس لئے انسان اگر انسانیت چاہتا ہے تو اولاً عالم بنے پھر عامل بنے تب آخر کار علم لدنی کا وارث بنتا ہے۔ پس ابتدائی علم علم دراست ہے اور انتہائی علم علم وراثت ہے۔ یہ کتابوں کے درس و مطالعہ کا علم علم دراست ہے۔

من عمل بما علم ورثہ اللہ علم مالم یعلم

انسانیت کی فیکٹریاں اور اس کی عملی مشق سے پیدا شدہ بصیرت و گہرائی علم وراثت ہے مگر علم وراثت نصیب ہوتا ہے علم دراست ہی سے۔ پس یہ مدارس علم دراست سکھاتے ہیں۔ اور علم وراثت کا راستہ صاف کرتے ہیں۔ اگر یہ مدارس دینیہ نہ ہوں علم درست ملے نہ علم وراثت۔ پس یہ مدارس اس لئے قائم کئے جا رہے ہیں کہ جو علوم ہمیں انبیاء سے وراثت میں ملے ہیں ان کو انسانوں تک پہنچا کر انسانوں کو انسان بنایا جائے۔ اس لئے یہ مدارس گویا سچے انسانوں کو ڈھالنے کی فیکٹریاں ہیں۔ پس سائنس کی فیکٹریاں اور مشینریاں سامان ڈھالتی ہیں اور یہ مدارس کی فیکٹریاں انسان ڈھالتی ہیں۔ جس کے ظاہر و باطن علوم انبیاء سے روشن ہوں۔ مادی علوم محض ظاہر کی ٹیپ ٹاپ اور نمائش سکھاتے ہیں اور یہ حقیقی علوم (علوم شرعیہ) باطن کی آراستگی سکھاتے ہیں مادی علم صورت کا جمال بخشتا ہے اور روحانی علم سیرت کا جمال عطا کرتا ہے۔

صورت اور سیرت میں فرق اور محض صورت کا جمال ایک عارضی حسن و جمال ہے جو جاتا آتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن مٹ جائے گا اسے دو دن بخار ہی آ کر مٹا دیتا ہے۔ یہ تمام رعنائی اور زیبائی ختم ہو جاتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بڑھاپے

سے یہ ظاہری جمال کے سارے نقش و نگار زائل ہو جاتے ہیں اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں وہ تو ساری صورتیں اور خوبصورتیاں مٹا کر رہتی ہے البتہ سیرت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ سیرت دنیا میں جیسی بھی بنالی جائے۔ اسے موت نہیں مٹا سکتی وہ قبر میں حشر میں اور اس کے بعد برابر قائم رہتی ہے۔

حدیث میں شریف میں فرمایا گیا ہے:

تحشرون کما تموتون و تموتون کما تحیون

حشر تمہارا اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی اور موت اس حالت میں آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے۔ آج کل نوجوان صورت بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اس چیز کے بنانے سے کیا فائدہ جو بنی ہے بگڑنے کے لئے۔

میرا ایک دفعہ حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب کے ہاں لدھیانہ جانا ہوا ان کی مسجد میں ایک کتبہ آویزاں دیکھا جس کے الفاظ یہ تھے کہ:

"مردہ ہے جسے دیکھ کر رعب طاری ہو۔ مردہ نہیں ہے جسے دیکھ کر شہوت ابھرے"۔

یعنی محض صورت آرائی شہوت رانی ہے۔ اور سیرت آرائی مردانگی ہے۔ پس آپ صورت کو کہاں تک بنائیں گے جو صورت بگڑنے کے لئے ہی بنی ہے اس کہ کہاں تک بنائیں گے سنواریں گے بنانا اس چیز کا ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاق فاضلہ اور علوم و کمالات ہیں۔

معیارِ کمال قبول سیرت ہے نہ صورت

دنیا میں صورت فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے اور سیرت عزہ جاہ کا یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں ڈالے گئے مصر کے بازار میں کھوٹے داموں بیچے گئے۔ زلیخا کے غلام بنے۔ پھر جیل خانہ میں قید ہوئے۔ یہ سارے فتنے حسنِ صورت نے پیدا کئے لیکن جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا تو وہاں سیرت نے کام کیا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی حکومت کا مطالبہ کرتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ:

اجعلني على خزائن الارض انی حسین جمیل

بلکہ انی حفیظ علیم کہا تھا یعنی علمی اور عملی سیرت پیش کی تھی جس سے حکومت ملی۔ صورت پیش نہیں کی تھی جس سے غلامی اور جیل کی قید و بند ملی تھی۔ پس حسنِ صورت فتنہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ سیرت عز و جاہ اور کمال پیدا کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی سیرت کے سنوارنے کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں صورتوں کی آرائش کرانے کے لئے نہیں۔

ان الله لاینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا اس کی نظر تمہارے دلوں اور اعمال پر ہے۔ وہاں یہ معیار نہیں کہ جو دولت مند اور خوبصورت ہو اسے قبول فرمالے اور جو غریب و مفلس ہو اسے رد کردے۔ یہی معیار انبیاء علیہم السلام کے ہاں بھی ہے کہ وہ آدمی کا رد و قبول حسنِ صورت

سے نہیں بلکہ حسن سیرت سے کرتے ہیں۔ دنیا والوں کے یہاں ردو قبول کا معیار حسن صورت اور دولت ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ صورت کے سیاہ تھے۔ غلام حبشی تھے۔ مگر حضرت عمرؓ ان کو ہو سیدنا و مولانا فرماتے اور صحابہؓ کی گردنیں بلال کے آگے جھک جاتیں حسنِ صورت کی وجہ سے نہیں کہ وہ تھا ہی نہیں۔ بلکہ حسنِ سیرت کی وجہ سے کہ وہ بحدِ کمال ان میں موجود تھا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے تھے:

مارایت افضل من عطاء ابن ابی رباح

حالانکہ وہ صورت کے کالے تھے وہ صورت کی تعریف نہیں تھی۔ سیرت کی تھی جس نے کالوں کو گوروں اوپر حاکم بنایا اور سیرت دو ہی چیزوں سے بنتی ہے قوّتِ علم اور قوّتِ اخلاق (یعنی قوّتِ عمل) ان ہی دونوں قوتوں سے آدمی باقی مخلوق پر فائق ہوتا ہے اور اسے خلافت ملتی ہے۔ قربِ حق نصیب ہوتا ہے اور صورت دو چیزوں سے بنتی ہے، دولت سے اور جہالت سے۔

مدارس دینیہ کی سیرت سنوارنے کے لئے ہیں

پس یہ مدارس دینیہ انسانیت کے ان ہی دو جوہروں کے پیدا کرنے کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں اگر یہ مدارس نہ ہوں تو انسانیت دنیا سے ختم ہو جائے کالج اور یونیورسٹیوں میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں مگر وہاں انسانیت نہیں سکھائی جاتی۔ صرف صورت انسانی بنائی جاتی ہے۔

زہد و قناعت

لیکن ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں۔۔۔ میں جن کا نام مدرسہ اور خانقاہ ہے۔ حقیقت انسانیت دکھلائی جاتی ہے اور زہد و قناعت انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلنے حتی کہ فقر و فاقہ تک سے بھی انسانیت حاصل کر لینی سکھلائی جاتی ہے۔ زہد و قناعت اسی علم کی بدولت قائم ہے۔ یہ علماء سو پچاس روپیہ کی تنخواہ پر بخوشی گزارہ کر لیتے ہیں۔ ورنہ آج کل سو روپیہ کیا وقعت رکھتے ہیں۔ یہ اسی سیرت کی خوبی کا کمال ہے۔۔۔ کہ یہ لوگ اس تھوڑے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی اس شعر کو بار بار پڑھتے اور لذت لے لے کر پڑھا کرتے تھے کہ۔

ما ہیچ نداریم غم ہیچ نداریم
دستار نداریم غم پیچ نداریم

اور کبھی فرماتے۔

لنگکے زیر و لنگکے بالا
نے غم دزد و نے غم کالا

اور کبھی فرماتے۔

کس نیاید بہ خانہ درویش
کہ خراجِ زمین وباغ بدہ

کل تک ہم زہد و قناعت کی فضیلت محض شرعی تعلیم پیش کر کے بتلاتے تھے لیکن آج زمانہ نے اس کی خوبیوں کا خود دنیا والوں کا مشاہدہ کرادیا ہے۔ ہزاروں من غلے والے غیر مطمئن ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ والے پریشان حال اور نالاں ہیں انہیں ہر وقت مارشل لاء کے قوانین نے ڈرا رکھا ہے لیکن جن کے پاس غلہ ہی نہیں یا بقدر ضرورت ہے وہ مطمئن ہیں پس دنیا کی کثرت اور سرمایہ داری کی افراط حسن نہیں۔ ایمان اور تقویٰ حسن ہے ؎

بقدر ضرورت یسارے بُود
کند کار ارمردِ کارے بُود

ورنہ دنیا کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ جب آتی ہے جب بھی مصیبت لے کر آتی ہے۔ اور جب جاتی ہے، جب بھی مصیبت چھوڑ کر جاتی ہے۔

اذا ادبرت كانت على المرء حسرة وان اقبلت كانت كثيرا همومها

"جب دنیا جاتی ہے تو حسرت چھوڑ جاتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غم ساتھ لاتی ہے"۔

بہر حال اس کے بٹورنے کی مساعی کی جگہ اگر آپ اپنی سیرت کو بنانے کی فکر کریں تو دنیا ہاتھ سے نہ جائے گی اور آخرت بھی درست ہو جائے گی اور یہ ان ہی مدارس کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان مدارس کی اگر آپ نے امداد کی تو آپ نے ان مدارس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کیونکہ یہ چندہ حقیقت میں آپ نے قرضہ دیا ہے جو آپ کو مع سود کے واپس ملے گا۔ دنیا میں تو قرضہ دے کر نفع لینا سود ہے جو حرام ہے مگر وہاں آخرت میں سود جائز ہے، جو ملے گا اور ایک کے بدلے سات تو سو تک اور اس بھی زائد ملے گا پس آپ نے اگر ان مدارس کو چندہ دے دیا تو گویا آپ نے خدائی بینکوں میں رقم جمع کر دی۔ اگر آپ کے چندہ سے یہ مدارس قائم رہے اور ان کے ذریعہ آدمی آدمی بنتے رہے تو آپ ہی کی قوم بنے گی۔

احسانِ عظیم

یہ مدارس صرف علم نہیں سکھلاتے بلکہ ملک میں امن وامان کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ان مدارس کی بدولت اگر متدین خدا ترس آدمی پیدا ہوں گے تو نہ ڈکیتی ہوگی۔ نہ چوری نہ زنا کاری ہوگی۔ نہ شراب نوشی۔ تو امن کے ساتھ گورنمنٹ کے کروڑوں روپیہ کی بچت ہوگی اور پولیس اور فوج کی غیر معمولی بھرتی کی حاجت نہ رہے گی۔ ہر شخص اپنے حق میں خود پولیس مین بن جائے گا۔ پس یہ مدارس امن وامان چاہتے ہیں اور صحیح معنوں میں ملک کی خدمت کر رہے ہیں اور پورے ملک کے یہ محسن ہیں۔ ان مدارس کی تقویت وبقاء میں آپ کی تقویت وبقاء ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیتیں بیان کی ہیں۔

خاتمہ

کہ انسان کو علم ہی کی وجہ سے افضلیت اور نیابت ملی اور کائنات کی ساری ذی شعور مخلوقات پر بازی لے گیا۔ اس لئے اس افضلیت کو اپنے حق میں باقی کر لیجئے اور جو منصب حق تعالیٰ نے بلا قیمت عطا فرما دیا ہے۔ اس کے تحفظ کی سعی کیجئے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ علم بھی حاصل کریں اور عمل سے بھی آراستہ ہوں۔ آمین!

ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذهديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب ربنا افرغ علينا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا على القوم الكافرين. اللهم اعذنا من الفتن ماظهر منها وما بطن اللهم اعذنا من الفواحش ماظهر منها وما بطن امين!

محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم دیوبند انڈیا حال اکوڑہ خٹک

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء

مقصد نعمت و مصیبت

"جب ہماری روح میں معصیتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسی اور بری حرکت کے دنبل نکل آتے ہیں۔ حق تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں در حقیقت آپریشن ہیں کہ ان سے مادہ فاسد نکالنا ہوتا ہے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کا اخلاق درست ہو جاتا ہے۔ جب عیش و طرب کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے"۔

از حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِینُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَ شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃِ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ. بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً　اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَّاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ. صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

دار الامتحان

بزرگان محترم!

یہ دنیا جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں یہ پوری کی پوری امتحان گاہ ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے ہماری جانچ اور آزمائش کے لئے ہمیں بھیجا ہے۔۔۔ یہاں کی آزمائش کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا کہ یہ کیسے ہیں۔ اچھے ہیں یا برے ہیں؟ قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ ان کو سب معلوم ہے۔ ان کا علم ازلی اور ابدی ہے۔ جانچ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ نے جو

جو ہر پیدا کئے ہیں، ان کو کھول دے اور نمایاں کر دے یعنی ہر چیز کی خاصیت کو ظاہر ہونے کا موقع دے۔۔۔ اگر ایک شخص قوی القلب ہے تو اس کو مصائب میں ڈالتے ہیں تا کہ اس کی قوۃِ قلب واضح ہو جائے اور اگر ضعیف القلب ہے تو اس کا ضعف واضح ہو جائے تو حق تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب استعلام (یعنی علم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ پہلے سے علم نہیں تھا۔) نہیں ہے۔ بلکہ جو ان کا علم جس کے متعلق ہے، اسکو نمایاں کرنا چاہتے ہیں تا کہ پوری دنیا میں واضح ہو جائے کہ فلاں چیز میں یہ اثرات تھے اور فلاں میں یہ خاصیتیں تھیں۔۔۔ اس لئے دنیا میں جو آیا وہ در حقیقت جانچ کے لئے آیا ہے۔ کہ جو بھی جو ہر اس میں رکھے گئے ہیں ان کو کھولا جائے۔

مقصدِ امتحان

اور جانچ کے لئے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دو سلسلے قائم کئے ہیں، ایک سلسلہ نعمتوں کا اور ایک سلسلہ مصیبتوں کا۔ دونوں سے مقصد انسان کی جانچ اور آزمائش ہے۔ نعمتیں دے کر اس لئے آزماتے ہیں کہ آیا نعمتوں میں گھر کر یہ آدمی نعمت دینے والے کو بھی یاد رکھتا ہے یا نعمتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔۔۔ اگر ایک انسان اپنی نعمتوں میں اپنی عیش میں الجھ کر رہ جائے۔ اور اسے یہ یاد نہ رہے کہ یہ نعمت کس نے دی تھی تو کہا جائے گا کہ اس بندے کے قلب میں کفرانِ نعمت کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ وہ کھول دیا گیا اور ظاہر ہو گیا۔ کل کو اگر اس کے لئے کوئی سزا تجویز کی جائے گی تو اس کو یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ مجھے پہلے جانچ تو لیا ہوتا۔ آزمائش کا موقع تو دیا ہوتا۔ بلکہ خود اس پر نمایاں ہو جائے گا کہ اس جانچ میں پڑ کر میں نے اپنے بارے میں کیا ثبوت دیا۔۔۔ اس طرح سے نعمت دنیا میں خود ایک مستقل آزمائش کی چیز ہے۔ خواہ وہ دولت ہو' خواہ وہ عزت ہو۔

امتحان بطریقِ نعمت

اس سب کا مقصد اپنا امتحان پیش کرنا ہے کہ تمہارا فرض کس درجہ پر ہے تم نعمت کو دیکھتے ہو؟ نعمت دینے والے پر نظر ہے یا خود نعمت پر نظر ہے۔ اگر دین والے پر نظر ہے تو بے اختیار انسان کی زبان سے شکر نکلے گا اور کہے گا۔۔۔ اے نعمتوں کے دینے والے تیرا فضل ہے کہ تو بندے نے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی نعمت دی گئی تھی۔ اس نے نعمت کا حق ادا کر دیا۔ تو نعمت کا حق فقط یہ نہیں ہے کہ آدمی نعمت کو استعمال کرے۔ بلکہ نعمت کے استعمال کے ساتھ ساتھ نعمت دینے والے کی طرف توجہ اس کی دین اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنا یہ بھی اس کا حق ہے۔۔۔ گویا نعمت دیئے جانے کے بعد دو طرح سے آدمی آزمایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نعمت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے۔ دوسرے یہ کہ اس نعمت پر نعمت دینے والے کا شکر ادا کرے، نگاہ اس کی طرف رہے۔ کیونکہ جس کا دینا آتا ہے اس کو چھیننا بھی آتا ہے۔ جو دے سکتا وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔ غرض جانچتے ہیں کہ اگر دینے والے پر نگاہ ہے اور شکر کرو گے تو دینے والے کے خزانے لامحدود ہیں وہ نعمتوں کو بہاتا رہے گا۔ اگر کفرانِ نعمت اختیار کیا معلوم ہوا کہ نعمت کی قدر کرنی نہ آئی۔ وہ اپنی نعمت کو واپس لے لے گا۔ تو واضح ہو گیا کہ نعمتوں کا

دینا در حقیقت آزمائش اور جانچ کے لئے ہے اور جوہروں کے کھول دینے کے لئے ہیں۔

امتحان بطریقِ مصیبت

اسی طرح سے کبھی کبھی مصیبتوں سے بھی آزمایا جاتا ہے۔۔۔ مصیبت سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ مصیبت میں گھبر کر آیا آدمی مصیبت ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے، واویلا جزع فزع اور پریشان ہو کر رہ جاتا ہے یا اس کی نگاہ مصیبت کے بھیجنے والے پر بھی ہوتی ہے کہ اس نے میری کسی مصلحت کے سبب اسے بھیجا ہے۔۔۔ اگر مصیبت پر نگاہ ہے مصیبت بھیجنے والے پر نہیں تو اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی کا بے صبرا پن ظاہر ہوگا۔ اللہ کی شکایت ظاہر ہوگی کہ میں ہی آزمائش کے لئے رہ گیا تھا۔ اور میں ہی مبتلا کرنے کے لئے رہ گیا تھا۔۔۔ لیکن اگر مصیبت تو بے شک سخت ہے مگر بھیجنے والا ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے اس لئے یہ مصیبت میرے ستانے کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے، ایمان کی جانچ کے لئے بھیجی گئی ہے۔ پھر بندہ صبر کرے گا اور صبر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے گا۔۔۔ تو نعمت سے آدمی کی شکر گزاری کا امتحان ہوتا ہے اور مصیبت سے آدمی کے صبر و تحمل کا امتحان ہوتا ہے کہ کون بندہ ثابت قدم ہے اور کون ضعیف القلب۔۔۔ جو نعمت اور مصیبت کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوا وہی بندہ فی الحقیقت بندہ ہے۔ اور جو کامیاب نہ ہو وہ بندہ نہیں۔ یا نعمت کا بندہ ہے یا مصیبت کا بندہ ہے انہیں دو طرف جھکتا ہے۔

مقامِ آدمیت

ہمارے آپ کے ہندوستان کے آخری بادشاہ ظفر اس نے حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے ایک قطعہ کہا ہے، کچھ تو ظفر بادشاہ مزاج ہی صوفیانہ رکھتا تھا اور کچھ حالات نے اس کو درویش بنا دیا تھا۔ جس کی سلطنت چھنتی ہے وہی جانتا ہے کہ اس کے قلب پر کیا گزری ہے۔۔۔ تو اس نے ایک قطعہ کہا ہے اور خوب کہا ہے کہتا ہے کہ ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

کتنا ہی عقلمند اور ہوشیار ہو مگر آدمی نہ سمجھنا ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تو دینے والے کو نہ بھولے نہ اسے عیش اللہ سے غافل کرے نہ طیش اسے اللہ سے غافل کرے۔۔۔ ہر ایک حالت میں رجاء و امید اور شکر گزاری پیش نظر رہے۔۔۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس دنیا میں انسان کو جانچنے اور آزمائش کے دو سلسلے رکھے ہیں۔ ایک نعمتوں کا سلسلہ اور ایک مصیبتوں کا سلسلہ۔

مقدارِ امتحان

اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہے کہ جتنی زیادہ نعمت دی جاتی ہے۔ جس پر زیادہ مصیبت آتی ہے اس کے قلب کی اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے۔۔۔ چھوٹی موٹی مصیبت کو آدمی جھیل جاتا ہے۔ صبر بھی کر جاتا ہے۔ جب بڑی مصیبت آئے اس وقت ثابت قدم رہے تو کہا جائے گا کہ ایمان بھی مضبوط قلب بھی مضبوط۔۔۔ بڑی نعمت دیدی جائے پھر ثابت قدم اور نعمت دینے والے کو نہ بھولے تو کہا جائے گا کہ یہ قوی القلب ہے اور امتحان میں کامیاب ہے۔

امتحان کی عمومی روش

پھر اسی کے ساتھ مصائب میں آدمی کی زیادہ جانچ ہوتی ہے، نعمتوں میں اتنی نہیں ہوتی۔ اللہ نے اس عالم میں مصیبتیں بے شمار رکھی ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ آدم علیہ السلام کا پتلا جب اللہ نے بنایا اور مٹی کو پانی میں بھگویا ہے تو چالیس دن اس پر پانی پڑا ہے۔ اور چالیس دن اس پر مہینہ برسایا گیا۔۔۔ تو روایات میں ہے کہ اس مٹی پر انتالیس دن غم کا مینہ برسا ہے اور ایک دن خوشی کا۔۔۔ اس لئے دنیا میں خوشی کم ہے اور مصیبت زیادہ۔۔۔ انسان پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ زیادہ تر عیش اور بے فکری میں کم ہوتا ہے۔۔۔ چنانچہ فرمایا گیا لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ ہم نے آدمی کو مصائب ہی کے اندر پیدا کیا ہے۔ اور اوّل سے لے کر اخیر تک مصائب کا ایک سلسلہ ہے۔ جس آن انسان پیدا ہوتا ہے پیدائش کی گھڑی مصیبت ہی کی ہوتی ہے۔ آدمی روتا ہوا آتا ہے۔ چلاتا ہوا آتا ہے۔ کوئی بچہ بھی دنیا کے اندر ہنستا ہوا نہیں آتا۔۔۔ تو دنیا میں پریشانی کی حالت میں آیا۔۔۔ پھر جوں جوں عمر بڑھتی چلی جاتی ہے مصائب کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔۔۔ انسان تمنائیں بہت باندھتا ہے، تو تمناؤں میں سے ایک پوری ہوتی ہے ننانوے میں ناکامیاب رہتا ہے۔ یہ ننانوے میں جو ناکامیابی ہے یہی اس کے حق میں مصیبت ہے تو اس کی تمنا اور طبیعت کے خلاف ہونا یہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اور یہ انسان کے لئے لازم ہے۔

مقصدِ نعمت و مصیبت

اس دنیا کو حق تعالیٰ نے فقط عیش کی جگہ بنایا نہ فقط مصیبت کی جگہ بنایا عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے۔ گو عیش کم ہے مصیبت زیادہ ہے۔ جہاں فقط عیش ہے۔ مصیبت کا نام نہیں، اسی عالم کو ہم جنت کہتے ہیں اور جس جہان میں مصیبت ہی مصیبت ہے عیش کا نشان نہیں اسی کو ہم جہنم کہتے ہیں جہاں عیش کا کوئی تخیل بھی نہیں باندھ سکتا تو دونوں کو عیش کچھ مصیبت سے ملا کر دنیا کو بنایا گیا جس میں عیش بھی ہے تو کچھ جنت کی نعمتوں کے نمونے ہیں اور کچھ جہنم کی مصیبتوں کے نمونے ہیں تاکہ انسان جب عالم آخرت میں پہنچے تو جب تک دنیا میں گزارے اسے اس عالم کا تصور ہو جہاں سے عیش آئی ہے اگر اسے عیش پسند ہے تو اس عالم کے لئے سامان کرلے اور اگر مصیبت ناپسند ہے کہ اس جہان کی مصیبتوں سے ڈرنے اور بچنے کا آدمی اہتمام کرے۔۔۔ تو عیش اور مصیبت اس لئے رکھی تاکہ انجام پر نظر رہے عیش کی جگہ کی طلب

میں رہے اور مصیبت کی جگہ سے بچنے کا بندوبست کرتا ہے اس لئے اللہ نے یہ دونوں سلسلے جاری کئے۔

موت وحیات کی کشمکش

مصیبتوں کی انتہا موت پر ہوتی ہے اور نعمتوں کی انتہاء زندگی پر جا کر ہوتی ہے، زندگی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور موت مصیبتوں کا سرچشمہ ہے، موت کے معنی در حقیقت سلب حیات ہے۔ یعنی زندگی چھین لی جائے بس یہ موت ہے تو عیش کو چھین لیا جائے یہ عیش کی مصیبت یہ بھی موت ہے صحت کو چھین لیا جائے بیماری آجائے تو یہ صحت کی موت ہے مرض اور بیماری کی مصیبت مسلط ہو گئی تو جس طرح انسان کی ذات پر موت آتی ہے اسی طرح سے اس کے احوال پر موت آتی ہے ایک حال آتا ہے ایک جاتا ہے جو حال جاتا ہے اس کی موت واقع ہو گئی۔ جو حال آیا اس کی زندگی ہو گئی صحت گئی تو صحت کی موت آ گئی عیش چلا گیا تو عیش کی موت آئی تو اس طرح ہر قدم پر انسان موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ نعمتیں آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں۔

پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ خود ہی چلا جاتا ہے، اس کے احوال پر روزانہ موت طاری ہوتی رہتی تھی مگر خود اس کی ذات پر طاری نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو آخری سانس ہے اس کی ذات کی موت ہے، وہ بھی بالآخر چلا جاتا ہے تو پوری دنیا موت وحیات کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہے۔

ذرائعِ امتحان

تو اس آیت کریمہ کے اندر اس سلسلے کو بتلایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کا مصائب سے امتحان لیا۔ اور اس کے صبر و تحمل کا ہم نے امتحان لیا تو فرمایا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ۔

یہاں عربیت کے قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ میں واو لائے جو تاکید کے لئے ہوتا ہے لام لائے جو تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ پھر نون ثقیلہ تاکید لائے جو خود تاکید کے لئے ہوتا ہے، پھر اس ضمیر خطاب یعنی کم کی طرف منسوب کیا۔ تو کئی تاکیدیں لائی گئیں۔ اس کے معنی یہ نکلے کہ ہم ضرور بالضرور تمہاری جانچ کر رہے ہیں۔ یہ خیال مت کرنا کہ نعمتیں دیکر تمہاری جانچ اور آزمائش چھوڑ دیں گے لازمی طور پر تمہیں آزمائیں گے تاکید کے الفاظ لائے گئے ہیں اس لئے آدمی احتمالی بات نہ سمجھے۔ جانچ ضرور واقع ہو گی۔

پہلا ذریعہ "خوف"

کا ہے سے واقع ہو گی ۔۔۔ تو فرمایا بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ کبھی تو ہم دشمنوں کا خوف مسلط کریں گے چہار طرف سے خسرہ ہے نہ ادھر نہ جان چلی جائے۔ ادھر سے کوئی حملہ نہ کر دے۔ ادھر سے کوئی غنیم نہ چڑھ آئے۔ کوئی دشمن نہ آجائے، ہر وقت ایک فکر لگا رہتا ہے۔

خوف سے آزمانے کی غرض کیا ہوتی ہے۔ تاکہ انسان چوکنا رہے، وہ جو تدبیر کرنے کا مادہ ہے وہ معطل نہ ہونے پائے۔ اگر بے خوف ہو کر آدمی بیٹھا رہے گا تو وہ جو بچاؤ کی تدبیروں کے

جو ہر رکھے گئے ہیں وہ سب ملیامیٹ ہو جائیں گے اور سب آدمی میں چھپے رہ جائیں گے اس لئے خوف مسلّط کرتے ہیں تاکہ بیداری اور تیقظ سے آدمی کام لے اور وہ تدابیر اختیار کرے جن سے بچا جاتا ہے تاکہ دل کے جوہر کھلیں کہ یہ کتنا مدبّر اور دانا تھا۔ اور کتنا اس نے بچاؤ کا ثبوت دیا۔

دوسرا ذریعہ "فقر"

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ ۔اور کبھی ہم۔۔۔ بھوک دے کر آزماتے ہیں۔۔۔ کبھی اس طرح سے آزمائش ہوتی ہے فقر و فاقہ مسلط کر دیا۔ ایمان کی جانچ کرنا منظور ہے اور قلب کی قوت کی جانچ کرنا منظور ہے۔ اس کے لئے کبھی خوف دیا کہ خوف اور گھبراہٹ میں آدمی ہمارا نام لیتا ہے ہے یا محض پامال ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر ہمارا نام لیا تو فرماتے ہیں کہ ہم مدد کے لئے تیار ہیں ہم اس کی مدد کے لئے آئیں گے

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔۔۔ اور اللہ کی مدد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دین کی مدد کی جائے۔ اور دین کی سب سے پہلی مدد یہ ہے کہ خود آدمی دین پر ثابت قدم رہے۔۔۔ دین کوئی تصویر یا مجسمہ نہیں ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ دین کی مدد کے یہ معنی ہیں کہ دین کو اپنے میں سمو لے ہر حالت میں دین کی مدد ہے۔ اور اللہ کی مدد ہے۔ فَاذْكُرُونِي مجھے یاد کرو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ تم مجھے بھلا دو گے تو میں بھی تمہیں بھلا دوں گا۔

بندۂ تسلیم و رضا

غرض کبھی تو آدمی خوف سے آزمایا جاتا ہے۔۔۔ اور کبھی فقر و فاقے سے آزمایا جاتا ہے کہ تنگ دستی مسلط کر دی۔۔۔ لیکن تنگدستی کے باوجود تو بندہ یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے تو جس حالت میں رکھے میں بندہ ہوں بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو حال بھی آجائے آدمی شاکر اور صابر رہے تسلیم و رضا کے ساتھ گردن جھکا دے۔۔۔ اگر اپنی تجویز پیش کرنے لگا کہ آپ نے میرے اوپر غم بھیج دیا۔ آپ کو تو خوشی بھیجنی چاہئے تھی۔ آپ نے میرے اوپر بھلا خوف کیوں مسلط کیا۔ میرے اوپر تو اطمینان بھیجنا چاہئے تھا۔ تو یہ تجویز ہے بندہ بندگی کے لئے آیا ہے۔ بندگی کے معنی تفویض یعنی سونپ دینے کے ہیں کہ جس حالت میں آپ رکھیں میں راضی ہوں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی تجویز چھوڑ دے خود اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرے جو ادھر سے آجائے اس کے لئے راضی رہے تو آزماتے ہیں کہ اس میں تفویض یعنی سونپ دینے کا اس کے قلب میں مضمون ہے یا اپنی تجویز اور خود رائی کا مضمون ہے۔ خود رائی اگر ہوئی تو یہ بندگی کے خلاف ہے رائے کو ترک کر دیا تو یہ بندگی ہے۔ کہ جو حق تعالیٰ چاہیں میں اسی پر راضی ہوں۔ گویا اس طرح سے آدمی بن جائے جیسا کہ نہلانے والے کے ہاتھ میں میت ہوتی ہے کہ جدھر کو چاہے کروٹ دیدے جدھر کو چاہے پلٹ دے، میت یہ نہیں کہتا کہ ادھر مجھے کیوں کروٹ دی ادھر کو کیوں نہ دی؟ بس بالکل غسال کے ہاتھ میں ہے۔ یہی شان بندے کی اپنے پروردگار کے ہاتھ میں ہونی چاہئے کہ ادھر سے جو حالت آئے اسی پر لگ جائے اور راضی

ہو جائے۔ مانگنا تو رہے اطمینان مگر پیش جو کچھ آئے اس پر رضامندی کا اظہار کرے بندگی اسی کا نام ہے۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا تھا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنادے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دے دے۔۔ تو اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں ہوتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا ارادہ ہے وہ آقا کا۔ وہ آقا ہے اور میں غلام ہوں۔۔۔ تو ایک انسان جب ایک انسان کا خادم اور غلام بن جاتا ہے، حالانکہ اس آقا نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ اس کی زندگی اور نعمت ومصیبت آقا کے ہاتھ میں نہیں۔ مگر بہر حال نام کا تو غلام بن گیا۔ تو آدمی اس درجہ اپنے کو جھکا دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ نہ میری مرضی نہ میری خواہش نہ میرا ارادہ۔۔۔ تو اللہ رب العزت کا بندہ جس کے ہاتھ میں جان بھی ہے اور جس کے ہاتھ میں اس کا ایمان بھی ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں اس کی عزت و آبرو ہے۔ اس کے سامنے کوئی تجویز رکھے اور دعویٰ کرے کہ میں بندہ ہوں تو یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو آپ چاہیں وہی ٹھیک ہے اسی میں میری رضا ہے۔ تو اس تسلیم و رضا کا پیدا ہو جانا اور اور بندۂ رضا بن جانا یہی فی الحقیقت 'بندگی ہے۔۔۔ تو اس غلام نے کر کے دکھلایا کہ اس سے کہا گیا کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔

جوہر قلب کا امتحان

یہی حال بندے کا ہونا چاہئے کہ اگر پوچھا جائے ایک انسان سے کیا تو خدا کا بندہ ہے؟ کیا معنی ہیں تیرے بندہ ہونے کے؟ وہ یوں کہے کہ اگر عیش میں رکھے تو میں اس کا بندہ اگر وہ مصیبت میں رکھے تو میں اس کا بندہ۔۔۔ اگر وہ اطمینان دے تب بھی میں اس کا بندہ اگر وہ فکر میں مبتلا کر دے تب بھی میں اس کا بندہ تب تو ہے بندگی۔۔۔ اگر یوں کہے کہ نعمت آتی تب تو میں خدا کا بندہ اور نعمت چھین لی تو پھر میں بندہ نہیں پھر تو شکایت کروں گا۔ تو وہ خدا کا بندہ نہیں ہے وہ نعمت کا بندہ ہے۔ نعمت اس کا معبود ہے۔ اگر وہ آگیا ہے تو یہ راضی ہے نعمت چلی گئی وہ ناراض ہو گیا۔ اس دنیا میں آدمی خدا کی بندگی کرنے آیا ہے۔ نعمت کی بندگی کرنے نہیں آیا۔

اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم آدمی کے اس جوہر کو جانچتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا بندہ ہے۔ مصیبت ہو یا نعمت ہو کس حد تک ہماری طرف جھکتا ہے اس لئے نعمت و مصیبت کا یہ سلسلہ قائم کر دیا۔

طہارت روح

حدیث میں ہے کہ اگر ایک انسان کے گناہ زیادہ ہوں اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اس کو اعلیٰ مقام اور مقام کریم عطاء کریں۔ اس کے اعمال میں سکت نہیں۔ معاصی اور گناہوں کی کثرت ہے تو اس کو اس مقام کے لائق بنانے کے لئے ہم اس پر بیماری مسلط کر دیتے ہیں۔ جوں جوں بیماری بڑھتی ہے وہ صبر و تحمل کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اے اللہ! تو جس

حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ اس بیماری کی مصیبت سے اس کے گناہ کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اور مقامِ کریم کے قریب پہنچ رہا ہے۔۔۔ اگر اس کے گناہ نپٹ گئے۔ اس مقام تک پہنچ گیا تو بہتر' اور پھر بھی اگر اس کے گناہ باقی رہ گئے تو بیماری کے ساتھ میں ناداری بھی مسلط کر دیتا ہوں۔ بیمار پہلے سے تھا مفلس اب ہو گیا۔ ہاتھ میں پیسہ نہیں کہ غذا استعمال کرے' دوا استعمال کرے۔ تو بیماری بھی ہے مگر علاج کے لئے پیسہ نہیں۔ اور فاقہ بھی ہے مگر غذا کے لئے پیسہ نہیں لیکن اس حالت میں بھی ثابت قدم ہے۔ کہتا یہی ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔۔۔ فرماتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اس کے قلب میں جو گناہوں کا میل کچیل بھرا ہوا تھا وہ اب مٹ رہا ہے۔۔۔ اگر گناہ نمٹ گئے فبہا نہ نمٹے تو فرماتے ہیں کہ اس پر موت مسلط کر دیتا ہوں کہ اس کا کوئی عزیز میں چھین لیتا ہوں۔۔۔ بیماری پہلے سے بھی' ناداری بعد میں آئی موت اب مسلط ہو گئی۔ عزیز قریب چلے جا رہے ہیں۔۔ یہ تھی اس لئے کے کفارہ سیئات ہے جتنا اس پر غم پڑے گا۔ اتنا ہی اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گا۔ اتنا ہی اس کو قربِ خداوندی نصیب ہو گا۔ اتنا ہی اجر ملے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک انسان کو ایک کانٹا بھی چبھ جاتا ہے اور اس کی تکلیف پہنچی ہے تو اس چبھن پر ایک نیکی نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں اور ایک بدی مٹا دیتے ہیں۔ اگر دس دفعہ کانٹا چبھ تو دس نیکیاں مل گئیں اور دس بدیاں مٹ گئیں۔ اور یہ ادنیٰ مصیبت پر ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اگر بڑی مصیبت پڑے تو نیکی بھی بڑی دی جائے گی اور بڑی سے بڑی مصیبت کا کفارہ بھی کیا جائے گا۔ تو یہ مصائب کا سلسلہ کفارہ کے لئے ہے کہ مصیبتیں گھٹ جائیں اور نیکیاں بڑھ جائیں اس کے درجات بلند ہو جائیں اور اس مقام کریم کے قابل ہو جائے۔۔۔ اگر یہ بدیاں نمٹ گئیں اور روح میل کچیل سے صاف ہو گئی تو فبہا۔ اور اگر پھر بھی صاف نہ ہوئی تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میں نزع میں شدت کر دیتا ہوں۔ جان کندنی شدید ہوتی ہے۔ یہ خود ایک مستقل مجاہدہ انسان کو ہوتا ہے۔۔۔ لیکن وہ اس میں بندۂ صبر و رضا بنا ہوا ہے۔ جانتا ہے کہ میں قاہر و جابر کے ہاتھ میں ہوں' مجھے راضی رہنا چاہئے وہی میرا مالک ہے۔۔۔ اس سے اگر برائیاں نمٹ گئیں اور کفارہ ہو گیا تو فبہا۔۔۔ اور اگر نہ ہوا تو پھر قبر کی اندر کچھ ہولناک حالات پیش آتے ہیں۔ قبر کا فتنہ ہے' قبر کا دبانا ہے منکر نکیر کا آنا ہے' سوال و جواب ہے۔ آزمائش اور امتحان ہے۔ یہ بھی حقیقت کفارے کے لئے ہے۔ اگر یہاں بھی گناہ نہ نمٹے تو پھر میدان محشر کے ہولناک حالات سے گزرنا پڑے گا۔ دھوپ کی تیزی ہو گی' سرگردانی ہو گی' اللہ رب العزت کے سامنے کھڑے ہونے کا ایک دہشت ناک مقام ہو گا۔ اگر وہاں گناہ نمٹ گئے تو فبہا۔ اگر نہ نمٹے تو آگے پل صراط ہو گا وہ ایک مصیبت ہے۔

حدیث میں ہے کہ پل صراط جو جہنم کے اوپر باندھا جائے گا۔ پندرہ ہزار سال کا اس کا راستہ ہو گا۔ پانچ ہزار برس چڑھائی کے' پانچ ہزار برس اترائی کے اور پانچ ہزار برس برابر چلنے کے۔ اس کے اوپر سے انسان گزارا جائے گا۔ یہ خود ایک مستقل مصیبت ہو گی۔۔۔ یہ دراصل کفارہ کے لئے ہو گا کہ جو کچھ روح کا میل کچیل ہے وہ نکل جائے۔۔۔ پھر بھی اگر نہ نکلا اور مصیبتیں باقی رہ گئیں تو پل سے کٹ کر آدمی جہنم میں جا گرے گا۔ مومن کو جہنم میں کفارہ سیئات کے لئے ڈالا جائے

گا۔ کافر کو تو ایندھن کے طور پر ڈالا جائے گا۔ مومن کو صاف کرنے کے لئے ڈالا جائے گا۔۔۔ جیسا کہ

سونار بھٹی میں۔۔۔ کوئلہ بھی ڈالتا ہے اور سونا بھی ڈالتا ہے۔ کوئلہ ڈالتا ہے تاکہ آگ روشن ہو اور سونا اس لئے ڈالتا ہے کہ اس کا میل کچیل جل کر سونا کندن ہو کر نکل آئے' مومن کو اس لئے ڈالتے ہیں کہ اس کے ایمان پر جو معصیتوں کا خس و خاشاک رہ گیا تھا۔ اور اس کی روح میں میل کچیل رہ گیا تھا۔ وہ جل جلا کر روح صاف ہو جائے اور کندن بن کر نکلے اور اس مقام کریم کے لئے لائق ہو جائے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔۔۔ غرض اس مقام تک پہنچانے کے مصیبتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ پیدائش لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر برزخ تک اور قبر لے کر حشر تک اور حشر سے لے کر پل صراط تک ایک مصیبتوں کا سلسلہ ہے' سارا سلسلہ اس لئے ہے۔ کہ انسان جل جلا کر کندن ثابت ہو۔ اس کے اندر جو غل و غیظ کی کدورتیں بھری ہوئی ہیں۔ اعمال بد اور معصیتوں کی کدورتیں ہیں وہ سب جل جلا کر صاف ہو جائیں۔ اور وہ کسی اعلیٰ مقام کے لائق ہو۔

مصائب کفارہ سیئات ہیں

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ایک بہت عمدہ صاف ستھرا لباس پہن رکھا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس پر میل کچیل آنا شروع ہوا۔ ہفتہ بھر میں اتنا میلا ہو گیا کہ وہ برا معلوم ہونے لگا تو آپ نے بیزاری کے ساتھ اتار کر غسل خانے میں پھینک دیتے ہیں۔ اس قابل بھی نہیں سمجھتے۔ ہاتھ بھی لگائیں بلکہ نفرت سے دیکھتے ہیں۔ اگر مکان میں سامنے میلے کپڑے ڈالدئے جائیں۔ اگرچہ وہ آپ ہی کے ہوں۔ آپ گھر والوں سے کہیں گے کیا حماقت ہے میلی کچیلی چیزیں، سامنے ڈال دیں۔ ان کو کہیں ایک طرف کونے میں ڈالو۔ تو آپ کو خود نفرت ہو جاتی ہے اس لئے۔ ان پر میل آگیا۔ کپڑا تو وہی ہے' قیمت بھی اس کی وہی ہے۔ اتنا تو فرق ہوا کہ میل اس پر آگیا بدبو اٹھنے لگی۔ آپ کو نفرت ہو گئی۔

اب دھوبی اس کپڑے کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ سب سے پہلے لے ایک نہر یا تالاب کے کنارے ایک لکڑی کا پٹڑا اچھال کر زور زور دے کر مارنا شروع کرے گا۔ اتنی اس کپڑے کو سزا مل رہی ہے کہ بھگو بھگو کر مارا جا رہا ہے اگر کپڑے کے زبان ہو اور وہ دھوبی سے یوں کہے کہ ظالم میں نے تیرا کیا قصور کیا تھا؟ تو مجھے پٹخ پٹخ کر مار رہا ہے۔ تجھے ذرا ترس نہیں آتا۔ تو دھوبی کہے گا کہ احمق تیرے ہی نفع کے لئے دے دے کر مار رہا ہوں۔ تیرا میل کچیل نہیں نکل سکتا۔ جب تک تجھے اس طرح دے دے کر نہ مارا جائے تو پٹڑے پر دے دے کر اسے مارا تو پوری سزا دی۔

اسی پر بس نہیں کی' بھٹی چڑھا کر اس کے نیچے آگ جلا کر اس کپڑے کو ڈالدیا۔ پانی آگ کی وجہ سے ساں ساں کر رہا ہے۔ گویا زبان حال سے کپڑا چلا رہا ہے۔ کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوا کہ اب تک تو مجھے پٹخ کر مارا گیا تھا اب مجھے بھٹی میں آگ کے اوپر رکھدیا۔ وہ جل رہا ہے

یہاں تک کہ اس بھٹی میں نکالا گیا اور اسے نچوڑا گیا۔ اس میں سے بہت سا میل نکلا۔ پھر دھوبی اس پر قناعت نہیں کرتا۔ یہاں سے جانے کے بعد اس پر استری کرتا ہے' ایک لوہے یا پیتل میں آگ ڈال کر اسے تپا کر پھیرتا ہے۔ تاکہ اس کپڑے کے بل بھی نکل جائیں۔ جو رسل پڑے ہوئے تھے وہ بھی باقی نہ رہیں۔ پھر اس پر ابرک کوٹ کو جمایا گیا۔ جس سے اس میں چمک پیدا ہوئی۔ پھول سا بنا کر مالک کے پاس وہ کپڑے کو لایا تو اب یہ مالک کا سلوک نہیں ہوگا کہ وہ کہے اسے پرے پھینکو۔ اب عزت کے ساتھ اگر عمامہ ہو تو سر پر جگہ دی جائی گی' چوغہ ہے تو اسے بغل میں ڈال دیا جائے گا کرتہ ہے تو اس کو گلے میں پہنیں گے۔

اور جس مجلس میں بیٹھیں گے اس کے مناقب بیان ہوں گے کہ بڑا نفیس کپڑا ہے اس کی کتنی قیمت ہے' لوگ پوچھیں گے کہ کہاں سے منگوایا ہے تو آپ منہ بھر کر کہیں گے کہ فلاں کارخانہ کا بنا ہوا ہے' اتنا بہتر ہے اس کے اوصاف یہ ہیں دھلنے کے بعد ایسا ہوتا ہے' ایسا ہوتا ہے' تو مجلس میں اس کے مناقب بیان کئے جارہے ہیں 'اس کی خوبیاں بیان کی جارہی ہیں۔۔۔ مالک کے سر پر جگہ ملی اور وہ عمامہ بن کر سر پر پہنچا! کہ اس میں سے میل کچیل نکل گیا میل کچیل نکالنے کے لئے مصیبتوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا' دے دے کر الگ مارا گیا۔ بھٹی میں الگ جلایا گیا۔ استری جلتی ہوئی گرم الگ اسپر پھیری گئی۔ دھوپ میں الگ تپایا گیا۔ ان مصیبتوں سے گزرنے کے بعد اب وہ مقام عزت پر پہنچا۔ اور اس کی تعریفیں کی جانے لگیں۔

اب اگر اس کپڑے کو عقل ہو تو وہ دھوبی کا شکریہ ادا کرے گا کہ میری بڑی خیر خواہی کی کہ مجھے ان مصیبتوں سے گزارا۔ اگر میں نہ گزرتا تو یہ عزت کا مقام نہ پاتا۔

بعینہ یہی صورت انسان کی بھی ہے کہ اللہ نے اس کو صاف ستھرا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ کل مولود یولد علی الفطرۃ ہر انسان صاف' صحیح فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ گناہ گار بن کر نہیں آتا لیکن جوں جوں جوانی چڑھتی ہے اور اسباب عیش مہیا ہوتے ہیں معصیتوں میں اور نفسانی جذبات میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اس کو بھول کر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ نعمتیں کس نے مجھے دی تھیں۔ یہ انعامات کس نے کئے؟ اگر ایک آدمی ایک سجدہ کرتا ہے' تو مجھ کو اللہ نے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ مجھ کو ایک ہزار سجدے کرنے چاہئیں۔ جس کے پاس جتنی نعمت ہو اتنا ہی اس کو شکر ادا کرنا چاہئے مگر اس کو یہ خیال نہیں آتا۔ معصیتوں اور گناہوں کا میل کچیل اس کی روح میں بھرا رہتا ہے۔

مالک الملک کی طرف سے اسے تکلیف دی جاتی ہے لیکن متنبہ نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ مصائب کے سلسلہ میں ڈالتے ہیں جیسے دھوبی نے کپڑے کو مصیبتوں کے سلسلہ میں ڈالا تھا لیکن دھوبی کا منشا کپڑے کو ستانا نہیں تھا' مقام بلند تک پہنچانا تھا۔۔۔ اس طرح سے حق تعالیٰ کا منشاء ان مصیبتوں سے بندے کو بلند مقام تک پہنچانا ہے۔ اس کو مصیبتوں کی بھٹیوں میں ڈالتے ہیں۔ کبھی بیماری مسلط کر کے' کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے کبھی فقر و فاقہ مسلط کر کے کبھی غم و الم مسلط کر کے' کبھی عزیزوں کو چھین کر کے اور کبھی موت کو مسلط کر کے یہ سب چیزیں اسلئے ہیں کہ اس

کے قلب میں جو میل کچیل ہے وہ نکلے اور قلب میں توجہ الی اللہ اور نورانیت پیدا ہو۔ جب یہ پیدا ہو جائے گی تو مقام کریم پر پہنچا دیا جائے گا۔

تو حاصل یہ نکلا کہ نعمتیں ہوں یا مصیبتیں۔ دونوں سلسلے جانچ کے لئے ہیں اور جانچ اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا (معاذ اللہ) بلکہ علم تھا۔ اس علم کو ظاہر کرنے کے لئے کہ بندہ بھی محسوس کرے کہ میں نے کیا کیا تھا اور اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ مصیبتوں کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ شاید میرے ساتھ برائی کی جا رہی ہے، لیکن اگر اس کے دل میں فکر ہے اور دماغ کی خوبی ہے تو وہ کہتے گا کہ میرے ساتھ برائی نہیں کی جا رہی ہے۔ میرے ساتھ بھلائی کا سامان کیا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ کو مجھے مقام عزت تک پہنچانا مقصود ہے، اسی لئے مجھے مصیبتوں کی بھٹی میں ڈالا ہے۔

عملِ جرّاحی

بالکل اس کی مثال یہی ہے جیسا کہ کسی بچے کو کوئی پھوڑا پھنسی نکل آئے تو آپ ڈاکٹر کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب علاج کیجئے۔ اگر ڈاکٹر نے مرہم لگایا تو معمولی پھوڑا پھنسی اس سے درست ہو جاتا ہے۔۔۔ لیکن اگر بڑا دنبل نکلا ہوا ہے۔ تو ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپریشن کیجئے۔۔۔ ڈاکٹر نے نشتر لگایا، بچہ روتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے باپ کو شاید میرے ساتھ دشمنی پیدا ہو گئی۔ جیتی جاگتی کھال کٹوا دی اور باپ ہے کہ ڈاکٹر سے کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! دیکھئے ذرا گہرا نشتر لگایئے ایسا نہ ہو کہ مادہ فاسد باقی رہ جائے پھر کل کو ابھرے، ایسا آپریشن کیجئے کہ صاف ہو جائے۔۔۔ اس نے چھا چھا کر گہرا نشتر لگایا۔ اور بچہ چلا رہا ہے کہ باپ اس تو قصائی ہو گیا اس کے اندر رحم و کرم باقی نہیں رہا مگر باپ کی کوئی فریاد نہیں سنتا۔

اور جب ڈاکٹر نشتر لگا کر فارغ ہو چکتا ہے تو ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔۔۔ بچہ اور ناخوش ہوتا ہے کہ ایک تو اس نے میری کھال کاٹ دی اوپر سے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

لیکن جب زخم درست ہو جاتا ہے اور عقل درست ہوتی ہے تو اب وہ بچہ باپ کا شکر گزار ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نشتر نہ لگواتے تو زندگی خطرہ میں رہتی اگر نشتر نہ لگتا اور مادہ فاسد باقی رہ جاتا تو وہ پھیل کر تمام اعضاء کو خراب کر دیتا جڑیں بڑھ جاتیں اور موت واقع ہو جاتی اس سے بچاؤ کی یہی تدبیر تھی کہ آپریشن کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح۔۔۔ جب ہماری روح میں مصیبتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسیاں اور بری حرکات کے دنبل نکل آتے ہیں۔ حق تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں درحقیقت آپریشن ہیں۔ کہ ان سے مادہ فاسدہ نکلنا ہوتا ہے۔

مصائب کے ذریعہ اصلاحِ اخلاق

یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ جب عیش و طرب

کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے، حق تعالیٰ اس کا علاج کرتے ہیں کہ کچھ نعمتیں چھین کر بتاتے ہیں۔ اگر دانشمند ہو تو فوراً متوجہ ہو کر توبہ کی طرف لگ جاتا ہے، تو نتیجہ نکل آتا ہے کہ اسے متوجہ کیا گیا تو یہ متوجہ ہو گیا تو نعمت دوبارہ واپس کر دیتے ہیں۔۔۔ لیکن اگر نہیں مانتا تو پھر دوسرا آپریشن کرتے ہیں۔۔۔ یہ ساری مصیبتیں درحقیقت بندے کے حق میں آپریشن ہیں۔ اس لئے مصلحت ہیں اور خوبی کا ذریعہ ہیں اس کے انجام کی بھلائی پیش نظر ہوتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ شانہ، ان مصائب کے نشتر کے ذریعہ جو مادہ فاسدہ بھرا ہوا ہے اس کو خارج کرتے ہیں۔

میرا مقصد یہ ہے کہ اگر مصیبتیں آئیں اور مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت موت کی ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آئے تو آدمی یہ نہ سمجھے کہ یہ میرے ستانے کا سامان کیا گیا ہے۔ یہ منجانب اللہ خیر و برکت کا سامان اور عبرت دلانے کا سامان ہے۔

آپ غور کر کے دیکھئے ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوگا کہ جس گھر میں میت ہوتی ہے، قلوب میں اس درجہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی بے ثباتی ہر شخص کے سامنے ہوتی ہے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہی کچھ میرے لئے بھی درپیش ہے، مجھے بھی اس راستہ سے جانا ہے، وہ جو ایک بے فکری طغیانی اور سرکشی تھی وہ خود بخود گھٹ جاتی ہے، برسوں کے مجاہدے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو ایک جنازہ سامنے آنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔

حق تعالیٰ نے موت و حیات کا سلسلہ اس لئے رکھا ہے تاکہ انابت کا مضمون پیدا ہو اور قلب کی بے فکری ہٹ جائے۔

مقصدِ موت

اور اگر یہ شخص رونے دھونے میں لگ جائے اور رات دن میت کو یاد کر کے روئے تو اس سے نہ میت کو فائدہ ہوگا اور نہ خود اس کو۔ موت اس لئے بھیجی گئی تھی کہ اس کو دیکھ کر آدمی اپنی موت کو یاد کرے، نہ یہ کہ دوسرے کی موت میں الجھ کر رہ جائے۔۔۔ تو اصل مقصد موت کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے عبرت حاصل کی جائے اور اپنے اخیر وقت کو یاد کیا جائے اور ایسے سامان پیدا کئے جائیں کہ ہمارے لئے بھی نافع ہو اور میت کے لئے بھی نافع ہو۔

اس لئے مثلاً تلاوت قرآن کریم بتلائی گئی کہ ایصال ثواب کریں، ایصال ثواب سے اس کو بھی راحت پہنچے گی اور آپ کے قلب کو بھی تسکین ہوگی۔

اور اس کے لئے بہترین تدبیر یہ دعاء ہے جو اس آیت کریمہ میں بتلائی گئی اور فرمایا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

"ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے، کبھی بھوک اور فقر و فاقہ مسلط کر کے، کبھی مال گھٹا کر اور خسارہ دے کر اور کبھی جانوں کو کم کر کے یعنی موت مسلط کر کے تو مختلف طریقوں سے آزمائیں گے"۔

دعاءِ تسکین لیکن فرماتے ہیں ان مصیبتوں کے بعد جو صبر کر گیا اور تحمل سے کام لیا اپنے پرور دگار پر نگاہ رکھی۔۔۔ تو فرماتے ہیں:

وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ

"بشارت دیدو صبر کرنیوالوں کو"۔

جب ان پر مصیبت آتی ہے وہ تسکین کی یہ دعاء پڑھتے ہیں۔ وہ دعاء یہ ہے:

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

تسکینِ عقل اس میں تسلی کس طرح سے دی گئی دو جملے فرمائے گئے:

ایک انّا لِلّٰہ۔۔۔ اور ایک اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ انا للّٰہ۔۔۔ کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں۔۔ جب ذہن میں یہ تصور آگیا تو آدمی سمجھے گا کہ مالک کو اختیار ہے اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کرے، مالک اگر یہ چاہے کہ میں اپنی چیز کو اوپر رکھ دوں تو حق ہے اگر یہ چاہے کہ میں اسے نیچے کے کمرے میں رکھ دوں یہ بھی اس کا حق ہے اور اگر وہ یہ چاہے کہ زمین سے نیچے کی تہہ میں قبر تک پہنچانا چاہئے۔ یہ بھی اس کو اختیار ہے، قبر سے آگے کسی اور عالم میں بھیج دے یہ بھی اس کا اختیار ہے، تو اس۔۔۔ کا مطلب اللہ کی مالکیت کا تصور ہے کہ وہ مالک اور ہم مملوک ہیں وہ ہمارا آقا اور ہم اس کے خادم۔ اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے تو عملی طور پر انسان میں صبر آگیا۔ عقل نے سمجھا دیا کہ جب تو مِلک ہے تو تجھے واویلا کرنے سے کیا مطلب؟ حق تعالیٰ مالک ہیں۔ اور مالک کو اپنے میں تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے، تو عقلی طور پر صبر آگیا۔

تسکینِ طبع لیکن طبعی طور پر ابھی غم مسلط ہے، عقل بے شک سمجھا رہی ہے کہ مالک نے اپنی ملک میں تصرف کیا ہے، یہ بندہ اس کی ملکیت تھا۔ اس نے اس کو اٹھالیا۔

بہرحال طبعی طور پر رونے کا جذبہ موجود ہے تو دوسرے جملہ اس کا علاج کر دیا گیا۔

وانا الیہ راجعون ہم سب لوٹ کر اسکی طرف جانے والے ہیں اس میں یہ بتلا دیا گیا کہ جہاں یہ گیا وہاں تم بھی پہنچو گے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو چند دن کی جدائی ہے۔ اس کے بعد جہاں یہ ہوگا وہاں تم ہوگے۔

اگر ہمارا کوئی عزیز سفر پر چلا جائے یا ملازمت پر ایک ہزار میل کے فاصلے پر چلا جائے۔ بعض دفعہ دس دس برس ملاقات نہیں ہوتی لیکن آدمی یوں نہیں گھبراتا کہ جب موقع ہوگا وہ چلا آئے گا۔ ملنے کا امکان ہے، تو اس امکان کی وجہ سے جدائی کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔۔۔ یہاں امکان نہیں

بلکہ قوت یقین سے یہ چیز حاصل ہے کہ جہاں یہ گیا وہاں ہم بھی پہنچنے والے ہیں۔ امکان پر اگر صبر آجاتا تھا تو یقین سے صبر کیوں نہیں آئے گا؟

تو انا الیه راجعون سے انسان کو طبعی طور پر بھی صبر آجاتا ہے تو انا للہ سے عقلی طور پر اور وانا الیه راجعون سے طبعی طور پر صدمہ گھٹ جاتا ہے۔ طبیعت اور عقل دونوں بتلا دیتی ہیں کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جو واقعہ پیش آیا ہے وہ تمہارے لئے بھی پیش آنا ہے۔

تو اس آیت کریمہ اور دعاء میں سبق دیا گیا۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی ادنیٰ بھی مصیبت آئے تو فوراً کہو

انا للہ وانا الیه راجعون

صرف میت ہی پر یہ دعا نہیں پڑھی جاتی بلکہ اگر یہ ایک پیسہ بھی گم ہو جائے تو بھی پڑھی جائے۔ کوئی کپڑا بھی گم ہو جائے جب بھی پڑھو۔

تاثیرِ دعا تسکین

اس دعا کی برکت سے صبر بھی حاصل ہوتا ہے۔ مالک کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے اور بدل بھی مل جاتا ہے۔۔۔ نعم البدل ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ اس دعا کی خاصیت ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مصائب کے سلسلہ میں جزع فزع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صبر ہی کرنے سے سب کچھ ملتا ہے صبر و تحمل سے اپنے کو بھی ملتا ہے دوسرے کو بھی ملتا ہے۔

حضرت جابرؓ کا واقعہ ہے کہ ان کا بیٹا آٹھ نو سال کا تھا بہت خوبصورت اور ہونہار تھا۔۔۔ اور ظاہر بات ہے کہ ماں باپ کی توقعات اولاد ہی سے وابستہ ہوتی ہیں، اولاد ان کی زندگی کا سہارا ہوتی ہے۔ غرض ان کو بہت زیادہ محبت تھی اور توقعات بھی تھیں اور صورت شکل سے ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ یہ بچہ بیمار ہوا۔ اس زمانے میں جو علاج ہوتا تھا۔ حضرت جابرؓ نے فرمایا۔ لیکن بیماری بڑھتی گئی اس حالت میں انہیں ایک دو دن کا سفر پیش آیا اور سفر بھی کوئی ضروری تھا۔ اس لئے جانے پر مجبور ہوئے تو بیوی سے یہ فرمایا کہ بچے کی تیمارداری پوری کی جائے اور علاج معالجے میں کوئی کمی نہ کی جائے اور میں پرسوں تک آجاؤں گا۔۔۔ حضرت جابرؓ روانہ ہو گئے۔۔۔ ان کی غیبت میں ان کے آنے کا دن تھا کہ بچے کا انتقال ہو گیا۔ تو بیوی بھی صحابیہؓ تھیں۔ صاحب نسبت اولیاء میں تھیں انہوں نے بچے کی لاش کمرے میں رکھی اور چادر سے ڈھانک دی اور باہر آکر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد حضرت جابرؓ پہنچے تو عرب کے قاعدے کے مطابق بیوی نے آگے بڑھ کر خاوند کا استقبال کیا۔ مصافحہ کر کے حضرت جابرؓ کے ہاتھ چومے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ تو فرمایا کہ : **الحمد للہ بعافیة و خیر**

خدا کا شکر ہے بڑے عافیت اور خیریت میں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ مطمئن ہو گئے۔ ان کو کھانا کھلایا۔

کھانا کھاتے ہوئے حضرت جابرؓ سے کہا کہ مجھے آپ سے شریعت کا ایک مسئلہ پوچھنا

ہے۔۔۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے اور اس کی ایک میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے بعد میں اپنی یہ چیز یا پیسہ واپس لے لوں گا۔۔۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ ٹھیک مقرر وقت پر ادا کر دینا چاہیے۔ تو کہا ہم دیر لگائیں اور ٹال مٹول شروع کر دیں۔

فرمایا کہ ہمیں کوئی حق نہیں۔۔۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ خیانت ہے اور امانت داری کے خلاف ہے۔

کہا اگر ہم نے وقت پر ادا کر دیا۔۔۔ مگر دل میں گھٹن پیدا ہوئی کہ ہم نے کیوں ادا کیا رکھ ہی لیتے۔۔۔ فرمایا گھٹنے کا تمہیں کیا حق ہے وہ چیز تمہاری کب ہے۔ اپنی چیز پر آدمی گھٹے۔ دوسرے کی چیز پر گھٹن لانے کا کیا حق؟ بلکہ فرمایا کہ شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ٹھیک وقت پر امانت سے ادا ہو گئے۔ کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ جس کی چیز تھی اسے پہنچ گئی۔ کہا کہ شریعت کا مسئلہ یہ ہے۔۔۔ فرمایا۔۔۔ مسئلہ تو یہی ہے اس کے بعد فرمایا کہ:

"وہ جو آپ کا بیٹا تھا وہ اللہ کی امانت تھی۔ اس نے ٹھیک آٹھ برس دو مہینے کے لئے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ جب میعاد پوری ہو گئی تو قاصد آیا اور کہا کہ میری امانت میرے حوالے کرو۔ ہم نے حوالے کر دی۔ اب ہمیں بیٹھ کر گھٹنا چاہیے؟ ہمیں غم میں مبتلا ہونا چاہیے؟"۔

بیوی کے ہاتھ چومے اور فرمایا کہ خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے میرے دل کو ایسا صبر دیا کہ بجائے غم کے مجھے خوشی ہے کہ امانت امانت داری کے ساتھ ادا کر دی گئی۔ وقت مقررہ پر ہم سبکدوش ہو گئے۔ اور امانت مالک کو پہنچا دی۔

حقیقت حال یہی ہے کہ اللہ جب کسی نفس کو واپس لیتا ہے۔ تو طبعی طور پر صدمہ اور غم ضرور ہوتا ہے۔۔۔ مگر عقل اور طبیعت دونوں بتلاتی ہیں کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا حق تھا طبیعت کہتی ہے کہ جدائی کا غم ہے یہ تو چند روزہ جدائی ہے پھر ہم بھی وہیں جانے والے ہیں اس سے آدمی کے اندر صبر اور سکون پیدا ہوتا ہے۔

اجرِ صبر

اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اجر شروع ہو جاتا ہے۔ تو دنیا بھی بنتی ہے آخرت بھی بنتی ہے اس لئے میت کا اس لئے تذکرہ کرنا کہ غم تازہ ہو۔ یہ منشاء شریعت کے خلاف ہے ہے۔ صورت یہ ہونی چاہیے کہ جب غم تازہ ہو تو وہ افعال انجام دینے چاہئیں جس سے ہمیں نفع ہو۔ اور میت کو بھی نفع ہو۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ یہ دعاء پڑھے: **انا للہ وانا الیہ راجعون**

دوسری چیز پھر ایصال ثواب ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت میں آدمی لگے تو قلب کو تسکین الگ ہو گی۔ میت کو ثواب پہنچے گا اور اس کے درجات الگ بلند ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ میت عالم برزخ میں پہنچ کر ہر رشتہ دار، عزیز اور پس ماندوں کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ کون میرے لئے کیا کرتا ہے۔ اس کی مثال دی گئی کہ جیسے دریا میں کوئی ڈوبتا ہوا

ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے کہ شاید میں اس کی وجہ سے ڈوبنے سے بچ جاؤں میت کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ تو عزیز واقارب کی طرف اس کی آس لگی رہتی ہے کہ کوئی مجھے یاد کرتا ہے یا نہیں؟ کوئی اجر پہنچاتا ہے یا نہیں؟

برزخ میں آثارِ نعمت

حدیث میں فرمایا گیا کہ مردوں کو اجتماع کا کچھ وقت دیا جاتا ہے تو جب وہ جمع ہوتے ہیں تو اگر کسی کے پاس زیادہ ثواب پہنچتا ہے تو وہ دوسرے مردوں کے اوپر فخر کرتا ہے کہ میرے عزیز تھے جو مجھے یاد کرتے تھے اور اگر کسی کا کوئی عزیز نہیں ہوتا تو وہ کہتا کہ میرا بھی کوئی عزیز ہوتا تو مجھے یاد کرتا تو اس کو خجالت اور ندامت ہوتے ہے۔ اور اس کا سر اونچا نہیں ہوتا۔۔۔ تو جو دنیا میں کیفیت تھی کہ نعمت زیادہ بنتی ہے تو آدمی کا سر اونچا ہوتا تھا۔ مصیبت آپڑتی تھی تو سرنگوں ہو جاتی تھے۔ یہی کیفیت برزخ میں بھی رہتی ہے، فرق اتنا ہے کہ وہاں راحت اور مصیبت کمائی نہیں جاتی۔ یہاں سے بھیجی جاتی ہے، یا یہاں کا کیا ہوا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ تو اگر کوئی ثواب پہنچا دیتا ہے تو اس کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے اور وہ دوسروں سے کہتا ہے کہ تمہارے عزیز قریب تو کچھ نہیں بھیج رہے تو یہ ہے وہ چیز جس سے اپنے قلب کو بھی تسکین ہوتی ہے اور میت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔۔۔ لیکن محض رونا یا غم میں مبتلا رہنا ہمارے لئے بھی تکلیف دہ ہے اور میت کے لئے بھی تکلیف دہ ہے نہ اس کے لئے فائدہ نہ ہمارے لئے فائدہ۔

میت اور پس ماندگان کا باہمی نفع

تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ اس گھرانے پر جو ایک سال میں دو صدمات واقع ہوئے۔ ایک باوانی صاحب مرحوم کی وفات اور ایک ان کے داماد ستار بھائی صاحب کی وفات حقیقت میں یہ دو بڑے صدمات ہیں۔۔۔ ایک سال کے اندر اتنے بڑے صدمات کا پڑنا کہ دو گھروں کے دو وارث اٹھ جائیں یہ کوئی کم صدمہ نہیں ہوتا۔ لیکن جتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے اس سے اگر آدمی چاہے تو اتنی ہی بڑی آخرت کمائی جاسکتی جتنا دل میں غم ہو اور صدمہ ہو اتنا بڑا صبر ہوگا اور اتنا ہی بڑا اجر ہوگا۔

وقتِ صبر

اور صبر اپنے وقت پر ہوتا ہے مدت کے گزر جانے پر تو ہر ایک کو صبر آجاتا ہے۔ وہ باعثِ اجر نہیں ہوتا۔ صبر وہی باعثِ اجر ہے جو ارادہ و اختیار سے مصیبت کو دبانے کے لئے کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا۔ نبی کریم ﷺ ادھر سے گزرے۔ بڑھیا واویلا فریاد اور بین کر کر کے رو رہی تھی۔ آپے سے باہر تھی۔ آپ نے فرمایا۔ بڑی بی! صبر کرو۔ حق تعالیٰ کو یہی منظور تھا تحمل کرو۔

اس نے جذبے میں کہا کہ تمہارے اوپر گزرتی، جب میں جانتی۔ میرا تو جوان بیٹا مر گیا تم

مجھے کہہ رہے ہو صبر کرو۔ اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ نبی کریم علیہ ﷺ ہیں۔۔۔ غرض جواب دے دیا اور کہا کہ مجھ سے نہیں صبر ہوتا۔۔۔ فرمایا اچھا تو جان۔ تیری مرضی۔۔۔ اور آپ آگے گزر گئے۔

اسے بعد میں معلوم ہوا یہ نبی کریم علیہ ﷺ تھے۔۔۔ تو بے چاری پریشان اور نادم ہو کر نبی کریم علیہ ﷺ کی طرف دوڑی اور مسجد نبوی میں جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ صبر کی تلقین فرما رہے تھے۔ اب میں صبر کرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا:

الصبر عند الصدمة الاولی

"جب صدمہ پڑ رہا ہو جب صبر کیا جائے وہ صبر ہے"۔

وقت گزر جانے کے بعد مجبوری کا صبر ہوتا ہے۔ اس پر اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔۔۔ جب آدمی غم میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس وقت آدمی تحمل کرے اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرے تو یہ صبر ہے تو اتنے بڑے صدموں کا یقیناً غم بھی زیادہ ہوگا اس غم میں جتنا صبر کیا جائے گا اتنا ہی اجر بھی زیادہ ملے گا۔

مشترکہ غم

اور پھر اس پر غور کیا جائے کہ کوئی بڑی شخصیت گزرتی ہے تو وہ کسی ایک گھرانے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ وہ ہزاروں کا صدمہ ہوتا ہے۔۔۔ باوانی صاحب مرحوم ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بہت سے لوگوں کے وارث بنے ہوئے تھے۔ بہت سوں کے باپ بنے ہوئے تھے۔ ہزاروں کو ان سے فائدہ تھا۔

ہزاروں کو ان سے نفع ہو رہا تھا۔۔۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ سننے میں آیا جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ باید و شاید ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ہر شخص ان کا مرہون منت تھا۔ کوئی اخلاق کا کوئی دولت کا کوئی انعام کا کوئی اکرام کا اپنے اپنے غم میں ہر کوئی رو رہا تھا۔ تو ایسی شخصیت کا غم کسی ایک خاندان کا غم نہیں ہوتا۔ کسی ایک گھرانے کا غم نہیں ہوتا، یہ پورے ملک کا غم ہوتا ہے۔ پورے شہر کا غم ہوتا ہے۔

تو جب غم اٹھانے والے بہت سے ہوں تو دو چار گھر والوں کو ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ غم کے اندر ڈوبیں۔ وہ تو کہیں گے ہمارا غم تو سب نے مٹا دیا۔ سب کے اندر بٹ گیا۔۔۔ تو واقعہ یہ ہے کہ سب غم زدہ ہیں۔

خیر الناس ایسی شخصیتوں کے گزنے سے جو خیر الناس من ینفع الناس ہوں جن سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہو۔ وہ بہترین خلائق سمجھے گئے ہیں۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ:

خیر الناس من ینفع الناس.

بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے۔ فرمایا گیا بہترین انسان وہ ہے جو مفتاح للخیر ہو اور مغلاق للشر ہو۔ یعنی اس کے ذریعے خیر کے دروازے کھلتے ہوں اور شر کے دروازے بند ہوتے ہوں۔ دنیا کے اوپر برائیوں کے دروازے بند کرتا ہو اور بھلائیوں کے

دروازے کھولتا ہو۔ وہ درحقیقت پوری دنیا کا وارث اور ولی بن جاتا ہے۔ اس لئے اس کا غم بھی ساری دنیا کا غم ہوتا ہے۔

تو باوانی صاحب مرحوم یا ستار بھائی مرحوم درحقیقت ایسے لوگ تھے جو اپنی دولت سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ اپنے دین سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔۔۔ ستار بھائی کو میں نے دیکھا کہ تبلیغی سلسلے میں رات دن منہمک کبھی ڈھاکہ جارہے ہیں۔ اور کبھی ادھر ادھر گویا دین پھیلانے کا ان کے دل کے اندر ایک جذبہ موجود تھا۔ تو جس جس تک ان کی آواز پہنچی 'انہوں نے اس کو دین کا فائدہ پہنچایا۔ تو کوئی دین کا نفع پہنچانے والا تھا۔ کوئی دنیا کا یہ خیر الناس میں داخل تھے۔۔۔ یقیناً ایسے لوگوں کو صدمہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مگر ایسے صدمے میں جتنا تحمل اور صبر کیا جائے اتنا ہی بڑا اجر بھی ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ؎

یادداری وقت زادن تو ہمہ خنداں تو گریاں

شاعر انسان کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تجھے یاد ہے جب تیری پیدائش کا وقت تھا کہ تو تو روتا ہوا آیا تھا اور ساری دنیا خوشی خوشی ہنس رہی تھی ؎

آنچناں زی کے وقت مردن تو گریاں خنداں

ایسی زندگی گزار کہ تو ہنستا ہوا جائے اور دنیا تیرے لئے رو رہی ہے تو نیک لوگ جب جاتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ تو ہنستے ہوئے جاتے ہیں اور رونے والے پیچھے سے روتے ہیں۔

رونے کی حقیقت

لیکن یہ رونا درحقیقت ان کی موت کا رونا نہیں ہوتا۔ اپنے نفع کے گم ہو جانے پر رونا ہوتا ہے۔۔۔ ورنہ میت تو اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے' تو اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی وجہ سے کسی کو غم تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس زمانے میں مثلاً رمضان میں ہو تو یہ کہہ کر تسلی دیا کرتے ہیں کہ میاں! غم کرنے کی کیا بات ہے خوش ہونا چاہئے کہ موت کا، کتنا اچھا زمانہ ملا۔۔۔ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس مقام پر مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ (زادهما الله شرفا و كرامة) میں ہو جائے لوگ وارثوں کو تسلی دیتے ہیں' غم کرنے کی بات نہیں خوش ہو جاؤ کہ پاک مقام مل گیا۔ مدینہ طیبہ کی زمین نے اس قبول کر لیا معلوم ہوا کہ موت غم کی چیز نہیں نہ کوئی موت پر غم کرتا ہے نہ روتا ہے۔ رونا اپنی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے یہ شخص چھین گیا۔ خود تو وہ بہت اچھے مقام پر پہنچ گیا کہ آج باوانی صاحب مرحوم اگر نہیں ہیں کہ موت واقع ہو گئی۔ موت تو ہمیں بھی آئے گی جتنے ہم ہیں ہم سب کو آئے گی' اس پر کیا رونا؟۔۔۔ بلکہ اس بارے میں تو خوش ہونا چاہئے کہ ایک اعلیٰ ترین زندگی گزار کر ایک اچھے مقام پر انشاءاللہ پہنچ گئے تو ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ یہ جو غم اور رونا ہے یہ ان کی جدائی پر ہے کہ ہم سے ایک ذات چھن گئی۔۔۔ حقیقت میں آدمی اپنی غرض اور اپنے منافع کو روتا ہے نہ کہ مرنے والے کو تو مرنے والے کے انجام کو جب دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ بڑا اچھا خاتمہ ہوا۔

اچانک موت

اب جیسے باوانی صاحب مرحوم کا میں نے سنا کہ ۔۔۔ اچانک موت واقع ہوئی اور ہارٹ فیل ہوا۔ حدیث میں فرمایا گیا موت الفجاءة الخ اچانک موت کافر کیلئے عذاب ہے اور مومن کے لئے رحمت ہے۔ تو اللہ کی فرمائی چیز ہے تو یہ یقینی ہے کہ ان کے لئے رحمت واقع ہوئی۔ اس لئے کہ بحمد اللہ وہ مومن تھے اور مسلم تھے اور مسلم پر جب اچانک موت آتی ہے وہ رحمت بنتی ہے۔ تو موت خوشی کی چیز ثابت ہوئی کہ رحمت نے انہیں قبول کر لیا۔ آگے غم اپنا ہے کہ وہ ہم سے چھن لئے گئے۔ ہم سے وہ جدا ہو گئے تو اس جدائی ۔۔۔ کی تسکین یہ ہے کہ ہم ایصال ثواب کریں۔ ان کو یاد رکھیں تو ہم سے قریب رہیں ہم ان کے قریب رہیں۔ کبھی کبھی ان کے مزار پر جا کر زیارت کر لیں۔

آدابِ زیارت

حدیث میں ہے کہ جب قبر کی زیارت کی جاتی ہے تو آداب زیارت میں سے فرمایا گیا کہ آدمی قبلہ کی طرف پشت اور میت کی طرف منہ کرے، اس لئے کہ میت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے، جو پہچان دنیا میں تھی وہی برزخ میں جا کر رہتی ہے، پچھلا علم سلب نہیں ہوتا۔ چھن نہیں جاتا۔ جو جذبات اور جان پہچان دنیا میں تھی وہ وہاں بھی باقی رہتی ہے تو جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے وہاں بھی قائم رہتا ہے، جس سے جتنی جان پہچان تھی وہ قائم رہتی ہے، تو اس تعلق کو نبھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مرنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا جائے اور ایصال ثواب کے جائز طریقے اختیار کر کے ان کو نفع پہنچایا جائے ۔۔۔ اس میں مرنے والوں کا بھی نفع ہے اور پس ماندگان کے لئے بھی تسکین ہے۔

انہی چند کلمات پر تقریر ختم کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور نافع فرمائے۔ (آمین)

اللهم ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذهديتنا و هب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب

اللهم احسن عاقبتنا فى الامور كلها واجرنا من خزى الدنيا و عذاب الاخرة وصلى الله تعالى على سيدنا محمد واله واصحابه اجمعين برحمتك ياارحم الراحمين

☆☆☆☆☆☆☆☆

افاداتِ بخاری نمبرا

"دنیا میں انسان ایمان کا مکلف تھا۔ پھر اسلام کا پھر اعمال کا پھر معاملات کا ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی مقبولیت پیدا ہو گی؟ تو اس حدیث پر لا ختم کیا کہ تسبیح و تہلیل پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ تو دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا کر ختم کیا۔۔۔ یہ ایک عجیب و غریب صنعت ہو گئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہاء میں قیامت اور یوم حشر کے ثمرات اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا　اَمَّا بَعْدُ

فاَعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ‘بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ربط بین الابواب

یہ بخاری کی آخری حدیث ہے۔ جس پر امام ہمام نے اپنی کتاب کو ختم کیا۔ پہل تو امام کی اس صنعت پر غور کیا جائے کہ ابتداء بھی عجیب انداز سے فرمائی اور انتہاء بھی عجیب انداز سے کی محدثین کرام کا طریق یہ ہے کہ اگر کسی نے جامع لکھی تو "کتاب الایمان" سے ابتداء کرتے ہیں اور اسکے بعد دوسرے ابواب لاتے ہیں اور اگر سنن کی کتاب ہے تو عموماً ابتداء "کتاب الطہارت" سے کی جاتی ہے اور پھر نماز زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے ابواب لاتے ہیں۔ تو سنن کا بھی ایک طریقہ ہے اور جوامع کا بھی ایک طریقہ ہے۔

وحی سے ابتداء کی وجہ

لیکن مصنف نے کتاب "الایمان" سے ابتداء کرنے کے بجائے باب بدء الوحی سے کی ہے کہ وحی کی ابتداء جناب

نبی کریم علیہ السلام پر کس طرح ہوئی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جتنے دین کے ابواب ہیں ان کا مادہ در حقیقت وحی ہے۔ وحی مادہ شریعت ہے اور اس مادہ کی بھی شاخیں ہیں۔ کوئی شاخ کتاب الایمان ہے کوئی شاخ کتاب الصلوۃ ہے۔ کوئی شاخ کتاب الزکوۃ ہے۔ تو ان سب میں وحی جلوہ گر ہے۔ قدر مشترک وحی ہے اور اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ وہی وحی کبھی نماز کی صورت میں نمایاں ہوئی اور وہی وحی کبھی حج کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ اور وہی کبھی دوسرے ابواب کی صورت میں "ظہور پذیر ہوئی" تو مادہ شریعت کا وحی خداوندی ہے، اس لئے مصنف نے ابتداءً مادہ شریعت کو ذکر کیا۔ اس کے بعد پھر اس کی شکلوں کو ذکر کیا" اور ظاہر بات ہے کہ مادہ کا وجود شکل پر مقدم ہوتا ہے"۔

بنیاد علم ایمان ہے

تو سب سے پہلے کتاب لاایمان کو لاتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام اعمال کی مقبولیت کا دارومدار ایمان پر ہے۔ ایمان نہ ہو تو کوئی عمل مقبول نہیں ہو سکتا گویا ایمان تمام علوم کا مدار علیہ اور موقوف علیہ تھا۔ اس لئے پہلے کتاب لاایمان لائے اب آدمی کو ایمان حاصل ہو گیا اعتقاد حاصل ہو گیا۔ حق تعالیٰ کی یکتائی پر، نبی اکرم علیہ السلام کی حقانیت پر، تو سب چیزوں پر یقین ہو گیا۔

ضرورت علم

لیکن یقین کے بعد علم کی ضرورت پڑتی ہے، کہ اس یقینی چیز کو ہم کس طرح انجام دیں ظاہر ہے کہ اس کیلئے علم کی ضرورت ہے، جہالت سے کوئی چیز انجام نہیں دی جاسکتی تو کتاب لاایمان کے بعد کتاب العلم لائے ہیں تا کہ علم کی عظمت اور علم کی نوعیت واضح ہو جائے۔ گویا اب آدمی میں ایمان بھی ہے اور علم بھی حاصل ہو گیا۔

مقصدِ تخلیق

اس کے بعد پھر عبادات شروع کئے ہیں جو انسان کی پیدائش کا اصل مقصد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ تو مقصد اصلی یہ ہے کہ انسان عبادت کرے۔ عبادت کے معنی ہیں کہ بندے کا ربط اللہ سے اور عبد کا معبود سے رابطہ کیا ہے؟ اس رابطے اور جوڑ کو عبادت کہتے ہیں۔ کہ جس سے بندہ قربت حق حاصل کر سکے۔ اور حق تعالیٰ سے تقرب پیدا کر سکے۔

عبادات کے بعد معاملات

جب بندے اور خدا کا رشتہ جڑ گیا۔ اس کے بعد بندوں سے بندوں کا کیا واسطہ ہے۔ تو معاملات" کے ابواب" لائے جس میں نکاح بھی ہے، جس میں بیع وشراء بھی ہے، ہبہ اور میراث بھی ہے، اوقاف بھی ہیں یہ تمام معاملات لائے ان تمام کو جب بیان کر لیا۔ اس کے بعد ان تمام چیزوں کو فتنوں سے بچانے کی کیا صورت ہے؟ ساری معلومات حاصل ہیں۔ سارے ابواب سامنے ہیں مگر فتنہ اتنا ہے کہ ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ضرورتِ جہاد

تو پھر کتاب المغازی لائے اس کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ ہے تاکہ دین کو فتنوں سے محفوظ رکھا جائے اور فتنہ مرتفع ہو پھر اس کے بعد جب جہاد بھی آگیا تو ان مجاہدین کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ تو حضرات صحابہ کرامؓ کے احوال انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں ذکر کیں کہ اصل مجاہد تو یہ حضرات تھے ان کی پیروی میں دوسرے جہاد کریں گے۔

طریقِ عمل

لیکن طریق عمل کیا ہوگا؟ جس سے علم پر عمل کرے، ظاہر ہے کہ وہ طریقہ نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے اس لئے اس کے بعد باب اتباع السنۃ لاتے ہیں کہ سنت کی پیروی ہوگی تب اس پر علم ہوگا۔ اور عمل پر عمل نصیب ہو جانا جب مؤثر ہوگا۔ جب پہلے ایمان ہوگا تو پہلے کتاب الایمان لائے پھر کتاب العلم لائے اور پھر کتاب اتباع السنۃ لائے۔

فضیلتِ امتّ محمدیہؐ

ان تمام ابواب کو اس امت کی فضیلت پر لا ختم کیا اور آخر میں یہ حدیث لائے جس کی آپ نے تلاوت کی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ مصنف نے دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا کر کتاب ختم کیا۔

ندرتِ سند

دنیا میں انسان ایمان کا مکلف تھا پھر اسلام کا پھر معاملات کا ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا، اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی مقبولیت پیدا ہوگی؟ تو اس حدیث پر لا ختم کیا کہ تسبیح، تہلیل پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے تو دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا ختم کیا یہ ایک عجیب وغریب صنعت ہوگئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہاء میں قیامت اور یوم حشر، اس کے ثمرات اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے۔

عظمتِ سند

تو جیسے کتاب جلیل القدر ہے اور جیسے مصنف جلالت والے ہیں اسی طرح سے ان کی صنعت بھی جلالت قدر رکھتی ہے، کہ مصنف علام نے عجیب وغریب صنعت اختیار کی ہے۔ یہ تو میں نے ابتداء بخاری کے بارے میں عرض کر دیا

اوصافِ حدیثِ متعلقہ

اب اس کے بعد یہ حدیث آئی جو تلاوت کی گئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

كلمتان خفيفتان على اللسان ثقيلتان في الميزان حبيبتان الى الرحمن سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم.

اس میں تسبیح سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم کا ذکر ہے۔ حدیث میں اس کے تین

اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں ایک معنوی چیز ہے اور ایک اخروی چیز ہے تو تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

حسی وصف اول

پہلی صف یہ بیان کی گئی ہے کہ **خفیفتان علی اللسان** یہ کلمے زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ ان کے پڑھنے میں کوئی دشواری اور پیچیدگی نہیں کہ زبان کو اینٹھنا پڑے **بلسان عربی مبین** عربی زبان جیسی خفیف اور اخف زبان کے یہ کلمات ہیں زبان بھی ہلکی پھلکی ہے اور یہ کلمات "خاص طور پر" اس میں اور ہلکے پھلکے ہیں جن کے ادا کرنے میں نہ کوئی دشواری پیش آئے اور نہ اینٹھنا پڑے، بہت ہی ہلکے پھلکے ہیں۔

سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم

فضیلتِ عربی

اور بناء اس کی یہ ہے کہ خود عربی زبان بہت ہی خفیف اور ہلکی بھی ہے، اس کے کلمات جن معانی کو ادا کرتے ہیں وہ کلمات ایسے لطیف ہیں ان کے بغیر وہ حقیقت ادا نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہی کلمہ نہ پڑھا جائے ان کلمات کو دوسری زبان میں ادا کرنا ہو تو دوسری زبانوں میں کلمات نہیں ملتے جو اس پوری حقیقت کو ادا کر دیں۔ تو زبان پاکیزہ اور نہایت خفیف ہے، لسان اللہ بھی ہے، حق تعالیٰ اسی میں کلام فرماتے ہیں اللہ نے اسی زبان کو اپنے معجزے کے اظہار کے لئے منتخب فرمایا۔ قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا یہ کلام نہیں کر سکتا۔ تو اس شانِ اعجاز کا کوئی دوسری زبان تحمل نہیں کر سکتی' نہ انگریزی نہ ترکی نہ پنجابی اعجاز اور معجزے کا تحمل اگر کسی زبان نے کیا ہے تو وہ عربی زبان ہے کہ کلمات بہت تھوڑے اور حقائق اس میں بہت زیادہ بھرے ہوئے ہیں زبان کے لحاظ سے خفیف بھی اور لطیف بھی ہے اور معجزے کا تحمل کرنے والی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ :

لسان اھل الجنة عربی

"اہل جنت کی زبان عربی ہوگی"

اہل برزخ کی زبان

برزخ کی زبان تو سریانی ہے۔ جس میں میت کلام کرے گا اور ملائکہ علیہم السلام سے خطاب کریں گے زبان تو سریانی ہے، لیکن میدان محشر سے جو زبان شروع ہوگی تو وہ عربی زبان ہوگی۔ پھر جنت کی وہی زبان رہے گی۔ اور ابدالآباد تک وہی زبان رہے گی۔ تو قرآن کی زبان عربی حق تعالیٰ شانہ کا کلام عربی اہل جنت کی زبان عربی تو یہ عربی

زبان کی فضیلت وخفت اور اسکا ہلکا پھلکا ہونا دلیل سے واضح ہو گیا۔

سابقہ کتب کی زبان ابتداء میں حق تعالیٰ کی کتابیں عبرانی اور سریانی زبانوں میں نازل ہوئیں عبرانی ثقیل ہے، جب اس کو ہلکا پھلکا کیا گیا تو اس کی شکل عربی ہو گئی، ورنہ ابتداء وہ ثقیل تھی مثلاً توراۃ عبرانی زبان میں اتری ہے' ایک آیت ہے اس سے اندازا کیجئے کہ اس میں زبان کو کتنا اینٹھنا پڑتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضور ﷺ کی جہاں پیشن گوئی کی تو فرمایا کہ :

نابی بخر بحاما خوخا یا خیم نی یخو خاد جسمهم

اس میں سوائے خا "خ" کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا جب اس کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ معنی نہیں بلکہ لفظاً تو یوں ہو گیا نابی سے نبی ہو گیا۔

یعنی خرحنا یعنی من قربک. بخر بخا کی جگہ آگیا: من توبلك ماخوخا یعنی من اخيك يا خيم لخا يعني يقيم لك يخوخا الهك فتسمون.

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیشن گوئی فرمائی گئی کہ نبی آئیں گے تمہارے قریب کے ہوں گے تم بنی اسرائیل ہو وہ بنی اسماعیل ہوں گے چچا تائے کے بھائی ہوں گے نابی بخیر بخا یعنی نبی من قوبلك ما خوخاً یعنی من اخيك تمہارے بھائی ہوں گے یا خیم لخا یعنی بقیم لك وہ اللہ کی الوهیت کو قائم کریں گے اور اللہ کی عظمت وبزرگی اور اس کی عبادات کو قائم کریں گے تو اب کہاں نابی بخوخایا خیم لخا یاخوخا ہے۔ اور کہا نبی من قربك من اخيك يقيم لك الهك تو لطافت کا فرق نمایاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں تو زبان کو ذرا اینٹھنا پڑتا ہے اور ایک میں زبان ہلکی پھلکی چلتی ہے، چونکہ زبان خود خفیف تھی اور اس میں یہ کلمات اور بھی زیادہ خفیف اور اخف ہیں تو فرمایا خفیفتان علی اللسان ان دو کلموں کو ادا کرو تو زبان پر بھاری نہیں بلا بہت ہلکے پھلکے ہیں نہ کچھ وقت لگتا ہے نہ کوئی پیچیدگی بلکہ پل بھر میں کلمات ادا ہو جاتے ہیں۔۔۔ تو ایک صفت تو یہ بیان کی گئی کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے ہیں، یہ صفت حسی یعنی جب آپ سنیں گے تو کان محسوس کریں گے کہ بڑی ہلکی پھلکی چیز ہے۔

وصفِ ثانی وزنِ اعمال اور ان کی کیفیت

دوسری صفت ثقیلتان فی المیزان زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں وزنی اور بھاری اجر اتنا بڑا ہو گا کہ آدمی بظاہر کتنا ہی پڑھے اتنا اجر نہیں ملیگا جتنا ان دو کلموں کے پڑھنے سے ملے گا تو میزان عمل میں وزنی اور ثقیل ہوں گے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت

وزن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک جسمانی وزن اور ایک معنوی ہے جسمانی وزن تو اجسام کا یہ ہے کہ سیر بھر کا وزن کم ہے دو سیر کا زیادہ اور تین سیر کا اس سے بھی زیادہ اور دھڑی بھر کا اس سے زیادہ اور من کا اس سے زیادہ۔تو ایک تو مادی ہے جو مادیات سے متعلق ہے جتنی مادی چیز ضخیم ہو گی اور بڑی ہوتی جائے گی وزن بڑھتا جائے گا۔ اور ایک معنوی وزن ہے تو ان دو کلمات میں معنوی وزن ہے۔ترازو میں تولنے لگو تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کے معنی پر غور کرو تو نہایت باعظمت معنی ہیں جس کا بوجھ پڑتا ہے۔بوجھ فقط مادی نہیں ہوتا بلکہ روحانی بھی ہوتا ہے۔جیسے کہتے ہیں کہ فلاں عالم آئے تو میرے دل پر بوجھ پڑا۔ان کے آنے سے کیا بوجھ؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ سیر کا وزن رکھا گیا؟ نہیں بلکہ ان کی عظمت کا بوجھ پڑا۔ان کے اندر جو روحانی قوت تھی اس کی ہیبت پڑی اور میرا دل بیٹھنے لگا اور انکی عظمت کو مان لیا۔۔۔ تو حق تعالیٰ کی عظمت جو دلوں میں ہے وہ معنوی عظمت ہے کہ بوجھ ہے اور وہ بوجھ معنوی ہے' حق تعالیٰ مادیات سے بری ہیں۔اسی طرح ان کا کلام بھی مادیات سے بری ہے۔روحانی اور لطیف ہے اس کا بوجھ قلوب کے اوپر پڑتا ہے۔۔۔ اگر کوئی جاہل کلام کہے تو آپ کے دل میں قطعی احسان نہیں ہو گا کہ بھائی یہ بھی کوئی سننے کی چیز ہے اگر کوئی عالم کلام کرے تو آپ غور کریں گے اور کہیں گے کہ بڑا وزنی کلام ہے دل میں بیٹھتا نہیں ایک دفعہ اور سنادو ایک دفعہ اور سنادو تا کہ دل میں پوری طرح بیٹھ جائے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ جب حضرت مولانا تھانویؒ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا کہ ان کے آنے سے میرے دل پر ان کی عظمت کا بوجھ پڑا'یہ بوجھ مادی وزن نہیں تھا روحانی وزن تھا جو باعظمت ہوتا ہے اس کے اثر کو روح قبول کرتی ہے' دل قبول کرتے ہیں' کاغذ کے اوپر اگر آپ یہ

کلمہ لکھ دیں تو کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ لیکن جب پڑھنے لگیں۔ اور عظمت خداوندی سامنے آئے تو جی لرزنے لگے گا جیسے کسی چیز کو اٹھایا نہیں جاسکتا تو یہ معنوی بوجھ ہوتا ہے، تو یہاں مراد معنوی بوجھ ہے، کہ میزان عمل میں جب اس کلمے کو تولا جائے گا تو میزان عمل اس کی عظمت کے بوجھ سے جھک جائے گی۔

وزنِ روحانی جیسا ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایک بندہ حاضر ہوگا اور اس کے ساتھ اس کی بدکاریوں کے انبار ہوں گے۔ ایک دفتر کو پھیلاؤ تو زمین و آسمان جھک جائیں۔ وہ حاضر ہوگا تو حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔ کہ اے بندے اپنے اعمال کو تلواؤ۔۔۔ وہ عرض کرے گا۔ کہ اللہ میں کاہے کو تلواؤں میرے پاس تو بدیاں ہیں۔ تولنے کی ضرورت تو تب ہو جب ایک طرف نیکی ہو اور دوسری طرف بدیاں ہوں۔ یہ تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ فرمایا کہ نہیں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ننانوے دفتروں میں ایک پرچی نکلے گی کہ پوری عمر میں ایک مرتبہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کلمہ طیبہ پڑھا ہوگا تو وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ ان ننانوے دفتروں کے مقابلہ میں اس پرچی کی کیا حیثیت ہوگی؟ میں تو جہنم کا مستحق ہوں۔ مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے، میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ مقام کریم تک پہنچ سکوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ إِنَّ اللهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے، ذرے ذرے کا حساب ہوگا تو تلوا اور اپنی نگرانی میں تلوا کہیں تو یوں نہ کہے کہ ملائکہ علیہم السلام نے کوئی زیادتی کردی ہے کم تول دیا یا زیادہ تول دیا۔ وہ ننانوے دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اس کو جناب نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ۔ اللہ کے نام سے زیادہ وزنی نام کون سا ہوسکتا ہے جس کی اندر عظمت کا بوجھ ہو تو اسی کے نام پاک کا یہ کلمہ بھی ہے سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ کہ اس کی عظمت سے میزان کا پلڑا جھک جائے گا اگرچہ لاکھوں بدیاں اور برائیاں ہوں مگر اس کی عظمت غالب آجائیگی اور وہ جھک جائیگا، تو مطلب یہ کہ ایک وزن مادی ہوتا ہے اور ایک وزن روحانی اور علمی ہوتا ہے۔ یہاں روحانی اور علمی وزن مراد ہے۔

درود شریف کی برکت

نیز حدیث میں جیسے فرمایا گیا کہ اس امت کے ایک فرد کو جہنم کا حکم دے دیا جائے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس کو جہنم کی طرف لے جارہے ہونگے اور وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوگا کہ کوئی مددگار ہے یا نہیں؟ تو حضرت آدم علیہ السلام کی نگاہ اس پر پڑے گی تو حضرت آدم علیہ السلام پکاریں گے کہ۔ یا احمد یا احمد آپ عرض کریں گے لبیک یا ابا البشر حاضر ہوں۔ تو وہ فرمائیں گے آپ کی امت کا ایک آدمی ہے۔ جسے جہنم کی طرف لے جایا جارہا ہے تو آپ ملائکہ کا پیچھا کریں گے اور ان سے فرمائیں گے رک جاؤ وہ کہیں گے ہمارا نام زبانیہ ہے ہم جہنم کے ملائکہ ہیں اور ہم امر خداوندی کے مامور ہیں ہم آپ کا حکم نہیں مان سکتے 'امر خداوندی آچکا ہے' تو آپ بہت ہی تاسف سے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیریں گے 'اور جا کر عرش کے نیچے سجدہ کریں گے اور عرض کریں گے میرا امتی ہے بے شک گنہگار ہے مگر آپ کی رحمت وسیع ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم آپ کو رسوا نہیں کریں اور ادھر سے آواز دی جائے گی۔ لا تعجلوا جلدی مت کرو ملائکہ رک جائیں گے آپ تشریف لائیں گے اور اپنی جیب میں سے ایک پرچہ نکالیں گے جیسے اس وقت کی جیب ہوگی جیسا لباس ہوگا خدا بہتر جانتا ہے پرچہ نکالیں گے اور بسم اللہ کہہ کر آپ اس کو میزان عمل میں ڈالیں گے ایک دم نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا اور اس کی نجات ہو جائیگی۔

وہ شخص نبی کریم علیہ السلام کو پہنچانتا نہیں ہوگا تو آکر عرض کرے گا اے نیک نہاد! آپ کون ہیں جو اس آڑے وقت میں میری امداد کی اور مجھے جہنم سے بچلیا' آپ فرمائیں گے: انا احمد میں تیرا نبی ہوں میرا نام احمد ہے تو جھک جائے گا اور کہے گا' سبحان اللہ یہ آپ نے آکے کیا کیا۔ میرا تو پلڑا ہلکا پڑ گیا تھا۔ تو آپ فرمائیں گے کہ تو نے ایک دفعہ نہایت ہی کمال اخلاص کے ساتھ درود بھیجا تھا وہ درود کی پرچی میرے پاس جیب میں محفوظ تھی۔ وہ اتنے اخلاص سے بھرا ہوا تھا کہ جب میں نے وہ پلڑے میں ڈالی تو اس اخلاص کی برکت سے وہ ساری بدیاں ہلکی پڑ گئیں۔ ظاہر بات ہے کہ درود شریف کو اگر پرچی پر لکھ کر جیب میں ڈال لیں تو کوئی وزن محسوس نہیں ہوگا لیکن روح اس کے وزن کو محسوس کریگی۔ اس میں جو اخلاص کا وزن ہے وہ روح محسوس کرے گی تو حق تعالیٰ شانہ قیامت کے دن اعمال کے ڈھانچوں کو نہیں دیکھیں گے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر اخلاص کتنا ہے سچائی کتنی ہے محنت خداوندی کتنی ہے درحقیقت اس کا وزن ہوگا حدیث میں اس کی طرف اشارہ

کیا گیا کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں اپنی معنویت کی وجہ سے بھاری ہیں تو یہ دوسرا وصف ہوا یہ وصف حسّی نہیں ہے بلکہ وصف روحانی ہے اس کو ارواح و قلوب محسوس کریں گے۔

تیسرا وصف

تیسرا وصف ذکر کیا حبیبتان الی الرحمن یہ دونوں کلمے وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں ظاہر بات ہے کہ جب کسی کے پاس اس کی پسندیدہ چیز ہدیے میں لے جائیں گے تو توجہ بہت ہوگی۔ فطرت کا تقاضہ ہے کہ کوئی ایسا ہدیہ لے جائیں جس سے اگلا کراہت محسوس کرے تو پسند نہیں کرے گا قبول نہیں کرے گا کوئی ایسی چیز لے جائیں جو مرغوب ہے تو شکریہ بھی ادا کرے گا اور خوش بھی ہوگا تو یہ کلمات حق تعالیٰ شانہ کو محبوب ہیں محبوب چیز کا جب ہدیہ پیش ہوگا تو عنایات متوجہ ہو جائیں گی۔ محبوب کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں الوہیت کے مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقامِ الوہیّت

مقاماتِ الوہیّت چار ہیں جو خصوصیات خداوندی ہیں اور ظاہر بات ہے کہ اس میں شرک کی گنجائش نہیں ہے۔

پہلا مقام

سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے تنزیہہ کے معنی ہیں۔ اللہ کی پاکی بیان کرنا ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے پاک ہر نقص سے بری و بالا۔ کوئی ادنیٰ درجے کے نقص کا شائبہ یا عیب کا شائبہ ممکن نہیں۔ تصور میں بھی نہیں آسکتا تو سب سے پہلی چیز حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی وہ تمام عیوب سے پاک ہے اللہ ہر عیب سے ہر ذم سے یعنی برائی اور کوتاہی سے پاک ہے تو تسبیح کے معنی در حقیقت تنزیہہ کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے اور سب چیزوں سے بالا ہے جس کو قرآن حکیم میں مختلف عنوانات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کہیں فرمایا گیا: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اس لئے کہ یہ تھکن کی علامت ہے اور تھکن ضعف کی علامت ہے اور وہ قوی ہے اس کا ضعف سے کیا کام کہیں فرمایا: **لا یضل ربی ولا ینسی** میرا پروردگار نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے بھول اور بھٹک ضعف کے سبب ہوتی ہے اور حافظہ

قوی نہ ہو۔ اور وہ تو قوی ہے ہے وہاں بھول چوک کا کیا کام؟ تو یہ آیتیں تنزیہہ کیلئے ہیں لایضل ربی ولاینسی' لا تاخذہ سنۃ ولا نوم نہ وہاں نیند ہے نہ وہاں اونگھ ہے اور نہ وہاں معاذ اللہ بھکنا ہے اور نہ وہاں نسیان ہے۔ ہر چیز سے وہ بری و بالا ہے اس کا علم قطعی اور محیط ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں تو ساری چیزیں "سبحان" کے نیچے آتی ہیں کہ اللہ نوم سے، اونگھنے سے، بھکنے سے اور بے راہ چلنے سے بھی پاک ہے تو سبحان کا کلمہ تنزیہہ کے لئے رکھا گیا ہے اور جگہ جگہ قرآن کریم نے اس طرف دعوت دی ہے، کہیں فرمایا فسبحان للہ حین تمسون و حین تصبحوحون اللہ پاک ہے تم صبح کر دیا شام کرو یعنی صبح و شام تغیر کی علامت اور تغیر ضعف کی علامت ہے اور وہ ان سب سے بری ہے سارے تغیرات تمہارے اندر ہیں۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی اور مسجد اقصیٰ سے سموات کی طرف رجوع فرمایا"۔

کہیں فرمایا:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی.

اور کہیں فرمایا:

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ. سَبَّحَ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ.

تو جگہ جگہ قرآن کریم نے تسبیح کا لفظ استعمال کیا ہے، جہاں تنزیہہ بیان کرنی مقصود ہے کہ وہ ہر کوتاہی ہر عیب، ہر شئی سے منزہ ہے تو حق تعالیٰ شانہ' کی ذات کا پہلا مقام تنزیہہ ہے کہ وہ ہر عیب سے بری و بالا ہے۔

دوسرا مقام اس کے بعد دوسرا مقام اس کی عظمت شان کا ہے کہ اس کی شان سب سے بڑی اور نرالی ہے اور لامحدود عظمتوں کا وہ مالک ہے اس کے لئے شریعت نے حمد کا کلمہ رکھا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

حمد کے معنی یہ ہیں کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور تعریف کبھی برائی پر تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ کمال پر ہوتی ہے تو جب ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سارے کمالات اسی کے لئے ہیں وہ سارے کمالات کا مصدر ہے۔ ہر خیر اور ہر برکت اس کی طرف

سے ہے، ہر کمال اس کا۔ ہر علم اس کا ہے، ہر خوبی اسکی ہے وہ تمام کمالات کا سر چشمہ ہے۔ تو کمالات کا سر چشمہ ہونے سے ظاہر کیا ہے کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں تو سارے کمالات بھی اس کے لئے ہیں اس لئے کہ حمد کسی جمیل اختیاری پر ہوتی ہے کہ کوئی عمل اور کام ارادی اور اختیاری اتنا اعلیٰ ہو کہ جی چاہتا ہو کہ اس (کے صانع) کی تعریف اور حمد کریں۔ تو اس حمد کے ظاہر کرنے کے لئے شریعت اسلامیہ نے حمد کا کلمہ رکھا ہے۔

اَلحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ . اَلحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرَ السَّموٰاتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰئِکَةِ رُسُلاً اولِیَ اَجْنِحَةٍ مَّثْنیٰ وَثُلٰثُ وَرُبٰعَ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرِ. اَلحَمْدُ لِلّٰهِ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ

تو جگہ جگہ حمد کا کلمہ استعال کیا ہے۔ بعض سورتیں کلمہ حمد سے شروع ہوتی ہیں تو غرض تنزیہ ہے کہ پاکی بیان کی جائے اس کے لئے سبحان کا کلمہ ہے اور تحمید ہے، یہ الوہیت کا دوسرا مقام ہے۔

تیسرا مقام اور ظاہر بات ہے کہ جو ذات ایسی ہو۔۔۔ ہر عیب سے پاک اور کمال کا سر چشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی اس کے سوا کس کی ہو سکتی ہے؟ ساری برکتیں اس کی ساری عظمتیں اس کی اسی لئے فرمایا گیا:

وَلَهُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں اس کو ظاہر کرنے کے لئے اسلام میں تکبیر کا حکم ہے، وہ اکبر ہے یعنی ہر چیز بالا عالم الغیب المتعال الکبیر المتعال وہی عالی اور بلند ہے اس کیلئے تکبیر کا حکم ہے اللہ اکبر یعنی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ ہر بڑائی اس کے سامنے حقیر ہے ہر عظمت اس کی عظمت کے سامنے چھوٹی ہے۔ اب کوئی سورج کے سامنے چراغ جلادے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ تو انوار ربانی کے سامنے کوئی نور نہیں چلتا سب مدہم ہو جاتے ہیں۔۔۔ اسی طرح انوار ربانی کے سامنے کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔

تو کبیر کے معنی یہ ہیں کہ بلندی، برتری اور بالائی سب اسی کے واسطے ہیں جن کو وَلَهُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے تعبیر کیا کہ آسمانوں اور زمینوں میں اسی کے واسطے بڑائی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی فیھما قصمته'.

تکبر اور بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا تو میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچے دکھاؤں گا۔ اس لئے جو بھی کسی مجلس میں بڑا بول بولتا ہے تو یقیناً اسی مجلس میں اس کی حقارت کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہر گناہ کے لئے کچھ نہ کچھ سمائی (معافی) ہے۔ لیکن کبر اور نخوت جب ہوگی تو ہاتھ کے ہاتھ اس کو جواب ملے گا۔ اس کی مغفرت نہیں یہ قابل برداشت نہیں۔ اس لئے کہ گناہ بندے کا اپنا فعل ہے اور اپنی صفت ہے اور کبریائی و بڑائی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جو اس کی بڑائی میں حصہ دار بننا چاہے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا اس کو نیچا دکھایا جائے گا۔ ذلیل و رسوا کیا جائے گا عظمت و کبریائی تیسرا وصف ہے۔

چوتھا مقام حق تعالیٰ کی تمجید یعنی عظمت اس کی بزرگی بڑائی کے لئے تکبیر کا کلمہ رکھا گیا ہے کہ اللہ اکبر من کل شیٔ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے اب ظاہر بات کہ جو عیب سے پاک ہے اس سے توحید پیدا ہوتی ہے اس کے لئے تہلیل کا حکم رکھا گیا لاالٰہ الا اللہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کے آگے جھکیں گے اسی کے آگے فریاد کریں گے اسی سے مدد مانگیں گے اور اسی کی طرف رجوع کریں گے وہی دافع امراض ہے ہر عبادت اسی کے لئے ہوگی۔ یہ دعویٰ توحید چوتھا مقام ہے۔

دعویٰ توحید کی تکمیل اس سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ توحید کا دعویٰ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ تین مقام سامنے نہ ہوں تنزیہہ مکمل ہو کہ ہر عیب سے پاک ہو تنزیہہ ہو کہ ہر خوبی کا مالک ہو تکبیر مکمل ہو کہ ہر عظمت اس کی ہو جب یہ تین چیزیں ثابت ہونگی تب توحید کا وجود ہوگا۔ اگر کوئی اللہ کی تنزیہہ نہ کرے اس میں مخلوق کی صفات مان لے یا مخلوق میں خالق کی صفات مان لے تو وہ کبھی بھی توحید کا دعویٰ نہیں کر سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ ہوگا توحید کا پہلا قدم تنزیہہ کہ ہر عیب سے اس کی پاکی بیان کرو لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ. نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ اس کی کوئی اصل ہے وہ خود اصل ہے نہ وہ کسی کو جنے گا کہ اس کا کوئی بیٹا ہو کوئی

اس کی بیوی ہو یا کوئی کفو اور برابر ہو۔ تو ان سب چیزوں سے آدمی پاکی بیان کرے گا تب توحید کے مقام پر پہنچے گا۔ اللہ کے باپ ہونے کا قائل ہو جائے اس کے لئے کسی برابری کا قائل ہو جائے اس کیلئے کسی شریک ہونے کا قائل ہو جائے۔ وہ کبھی توحید کا مدعی نہیں بن سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا ہو گا اس لئے کہ توحید کا پہلا قدم تنزیہہ ہے۔۔۔ تو چاہے نصاریٰ توحید کا دعویٰ کریں چاہے مشرکین کریں مگر وہ زبانی دعوئ ہے حقیقت اس میں کچھ نہیں کیونکہ ان کے پاس تنزیہہ نہیں اس طرح سے تنزیہہ کہ یعنی ساری عظمتیں بڑائیاں اس کی ذرہ برابر اس میں نقص نہیں اگر حق تعالیٰ کی ذات میں ادنی درجے کا نقص مان لے گا تو وہ تنزیہہ کے خلاف ہو گا اور توحید کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ جیسے یہود نے بندوں کی ناقص صفات اللہ میں تسلیم کیں اور کہا کہ جب طوفان نوح آیا تو حق تعالیٰ بیٹھ کر رونے لگے۔ ہائے میری مخلوق ڈوب رہی ہے تو معاذ اللہ اس کی اتنی قدرت نہیں تھی کہ بچالے تو رونے بیٹھ گئے۔ اتنے روئے کے آنکھیں دکھنے آگئیں اور فرشتے مزاج پرسی کو پہنچ گئے کہ حضرت اب آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟ تو معاذ اللہ معاذ اللہ یہود نے خالق کے اندر مخلوق کی ناقص صفات مان لیں اور نصاریٰ نے خالق کی صفات مخلوق میں مان لیں حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تین معبودوں میں سے ایک ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام علم غیب کلی رکھتے ہیں۔ کہ سب سے پہلا دعویٰ نصاریٰ کا ہے کہ وہ محیط الکل ہیں، مقتدر اعلیٰ پیدا کرتے ہیں، چاہے موت دیدیں یا زندگی جو الوہیت کی خصوصیات تھیں وہ بندے میں مان لیں جو بندے میں مانی نہیں جاسکتی تھیں اور یہود نے جو بندوں کی ناقص صفات تھیں وہ خدا میں مان لیں۔ تو انہوں نے جو حدود تھیں توڑ دیں۔ خالق اور مخلوق کا فرق اٹھا دیا تو جب اللہ کی تنزیہہ نہ رہے تو بھی توحید کو آدمی نہیں پا سکتا۔

خصوصیت الوہیت

اس کے بعد تیسری چیز تکبیر ہے کہ ساری عظمتیں اس کی ہیں جسمیں بھی عظمت ہے تو وہ اس کی عظمت کا جلوہ اور پرتو ہے فی ذاتہ کسی میں عظمت نہیں ہے بذاتہ عظمت صرف ذات حق میں ہے وہ کسی کو عظمت عطا کر دیں تو وہ عظمت والا بن جائے گا چھین لیں تو وہ بے عظمت بن جائے گا کسی کو حکومت دیں تو وہ حاکم کہلائے گا حکومت چھین لیں تو حاکم باقی نہیں رہے گا۔ کسی کو ملک دیدیں تو وہ ملک کہلائے گا۔ کسی سے چھین لیں تو وہ ملک باقی نہیں رہے گا۔ لیکن اللہ کا ملک ہونا ازل سے لے کر ابد تک ہے۔ اس کو کسی کی دی ہوئی

حکومت نہیں وہ بالذات ملک ہے اس کی ملکیت بالذات ہے یہ نہیں ہے کہ اس کی ملکیت کو اس سے کوئی چھین لے ہر ایک ملکیت چھن سکتی ہے ہر ایک کا ملک جاسکتا ہے ہر ایک کا اقتدار جاسکتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے آتا بھی ہے جاتا بھی ہے۔۔۔ لیکن ازل سے لے کر ابد تک جس کی قدرت محیط ' جس کا اقتدار محیط ' جس کا ملک محیط۔ وہ صرف حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں اس لئے عظمتوں کی مالک صرف اللہ کی ذات ہے اسی لئے نمازوں میں سبحان ربی العظیم پڑھتے ہیں تاکہ عظمت نمایاں ہو یہ چار مقام ہوئے یہ مقام توحید کا انتہائی درجہ ہے ابتدائی درجہ تنزیہہ کا ہے پھر تنویہ کا پھر تکبیر کا پھر جاکر توحید کا مقام آتا ہے ان تینوں کو پھلانگ کر کوئی توحید تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر دعویٰ کرے گا تو غلط ہوگا۔

حدیثِ متعلقہ

حدیث مذکورہ میں یہ چاروں مقام بیان فرمائے گئے ہیں سبحان اللہ میں تنزیہہ آگئی کہ ہر کمال کا وہ مالک ہے ہر عظمت کا مالک وہ ہے ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں سارے کمالات اس کیلئے ہیں اس لئے وہ سارے عیبوں سے بری اور بالا ہے تو التزامی طور پر یکتا ہی ہوگا۔ لاالہ الااللہ بھی اس سے نکل آیا۔

اور ایک حدیث میں تو ان چاروں باتوں کو عبارۃ بیان کیا گیا ہے جیسے فرمایا گیا کہ احب الکلمات الی اللہ اربع سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کو چار کلمے ہیں۔ سبحان اللہ والحمد للہ و لا الہ الا اللہ واللہ اکبر. ان چاروں کلموں کو محبوب کہا گیا ہے۔ تو یہاں عبارت کے اندر چاروں کلمے ہیں۔ سبحان اللہ بھی الحمد للہ بھی اللہ اکبر بھی لاالہ الااللہ بھی۔ تو اس کلمہ (یعنی حدیث مذکورہ فی الباب) میں تین عبارۃً موجود ہیں اور ایک اقتضاء ہے کہ عبارت از خود اس کا تقاضا کرتی ہے ' اور وہ اس طرح کہ سبحان اللہ میں تو تسبیح آگئی اور وبحمدہ میں حمد آگئی۔ العظیم میں عظمت آگئی اور ان تینوں کے مجموعے سے لازم آگیا کہ ایک ایسی ذات جو یکتا ہے تو اس سے لاالہ الا اللہ نکل آیا۔ تو وہاں عبارت میں چاروں مقامات موجود ہیں اور یہاں تو تین تو عبارت النص میں موجود ہیں اور ایک اقتضاء النص سے نکلتا ہے یہ چاروں کلمے اللہ کو محبوب ہیں۔ محبوب کیوں ہیں؟ اس لئے کہ یہ کلمات اس کے مقام کے ترجمان ہیں اور فطرت ہے کہ جس میں کسی کی واقعیت بیان کی جائے تو وہ اس کو پسند ہوگی آپ کسی کی بیٹھ کی تعریف کریں تو بڑے غور سے سنے گا اور بہت خوش ہوگا اور اگر برائی کریں تو رنجیدہ ہوگا بھلائیاں بیان کریں خوش ہوگا کیوں خوش ہوگا؟ اس لئے کہ وہ بھلائیاں اس کے اندر موجود ہیں تو وہ خوش ہوگا کہ اس کے سنانے والے موجود ہیں۔ اس کو بیان

کرنے والے موجود ہیں۔ تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی کی خوبی بیان کی جائے تو وہ خوبی والا فطرۃً خوش ہوتا رہے گا اس لئے کے دلیل کی حاجت نہیں حق تعالیٰ کی خصوصیات جب کوئی بیان کریگا تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں وہ پسند ہونگی۔ وہ چیزیں ان کے سامنے محبوب بنیں گی یہ الوہیت کی خصوصیات تھیں، اس لئے جب بندہ انہیں ادا کرے گا تو یہ کلمے بھی محبوب بنیں گے اور ادا کرنے والا بھی محبوب بنے گا۔

حدیث میں مذکور اوصافِ ثلثہ اور صفتِ علم کی فوقیت

تو اس سے میں نے عرض کیا کہ تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک حسّی وصف ہے ایک معنی وصف ہے اور ایک غیبی وصف ہے حسّی وصف تو یہ کہ زبان پر ہلکے پھلکے ہیں ہر ایک محسوس کرے گا۔ معنوی وصف یہ ہے کہ میزان عمل میں وزنی اور ان کی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے اور غیبی وصف یہ ہے کہ حبیبتان الی الرحمن اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں تو امام بخاریؒ کی صنعت قابل داد ہے کہ سب سے پہلے وحی کا ذکر کیا کہ وہ پسندیدہ چیز ہے چونکہ وحی کی حقیقتِ علم ہے اور علم سب سے بڑی صفت ہے تمام صفات نے اس لئے کہ جتنی بھی صفات ہیں وہ اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہیں لیکن علم اپنے کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ سب سے اول ارادہ ہے ارادہ آپ جب کریں گے جب مراد کا علم ہو جائے گا۔ اگر مراد ہی معلوم نہیں تو آپ کس کا ارادہ کریں گے اسی طرح قدرت ہے۔ قدرت جب آپ استعمال کریں گے جب اس مقدور کا علم تو ہو کہ مجھے قدرت کا ہے میں صرف کرنی ہے اگر اس مقدور کا علم ہی نہ ہو تو آپ قدرت کا بے جا صرف کریں گے۔ تو قدرت اپنے کام کرنے میں علم کی محتاج ہوتی ہے۔ ارادہ اپنے کام لانے میں محتاج ہے۔ اسی طرح اقتدار ہے۔ یہ اس کا محتاج ہے کہ وہ مقتدر چیزیں جن پر آپ کو اقتدار حاصل ہوگا۔ پہلے سے معلوم ہوں ایک ملک پر آپ اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس ملک کا علم تو ہو کہ وہ کہاں ہے تا کہ میں جا کر اس پر اقتدار کو قائم کر سکوں تو اقتدار نہیں آسکتا جب تک مقتدر کا علم نہ ہو تو ارادہ بھی علم کا محتاج قدرت بھی علم کی محتاج اور اقتدار بھی علم کا محتاج ـــ اسی طرح آپ کسی چیز کی حفاظت کریں تو پہلے اس شئی کا علم تو ہو جس کی آپ حفاظت کر رہے ہیں اور اگر شئی معلوم نہ ہو تو آپ حفاظت کس کی کریں تو حفیظ کی صفت کام نہیں کرے گی جب تک کہ پہلے علیم کی صفت نہ ہو تو ہر صفت اپنے کام میں علم کی محتاج

ہے لیکن علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج۔

آپ ریل میں جارہے ہیں تالاب آگیا' آپ ارادہ کریں یا نہ کریں آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ تالاب ہے یہ نہیں کہ آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ تالاب ہے یہ نہیں کہ آپ ارادہ کریں تو یہ معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے اور اگر ارادہ نہ کریں تو کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ تو ارادہ کی احتیاط نہیں جب شئی سامنے آجائے گی تو آپ کو علم ہو جائے گا۔ آپ نے شہر دیکھ لیا علم ہو گیا کہ یہ شہر ہے۔ علم اس کا محتاج نہیں ہے کہ پہلے آپ شہر پر اقتدار حاصل کرلیں اور پھر معلوم ہو (کہ شہر ہے) تو آپ کو اس پر اقتدار حاصل ہو نہ ہو۔ جب شہر سامنے آئے گا تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ فلاں شہر ہے۔ تو علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج ورنہ ساری صفات علم کی محتاج ہیں تو علم اُم الصفات ہے سب سے اونچی صفت ہے اور ظاہر بات ہے۔ کہ جب علم سب سے زیادہ اونچی صفت ہے اور تمام صفات اس کی محتاج ہیں تو وحی بھی حقیقتِ علم ہی تو ہے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر وحی فرمائیں اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہی ہے کہ اپنا علم القاء کر دیا۔ تو وحی کے دوسرے معنی علم خداوندی کے ہیں تو وحی بھی محبوب چیز ہوئی کیونکہ علم انسان کو محبوب ہے تو محبوب چیز سے اپنی کتاب کی ابتداء کی۔ یعنی بدء الوحی سے اور محبوب ہی چیز پر کتاب کو ختم کیا **سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم**.

"اب ظاہر بات ہے کہ جو کتاب محبوبات سے شروع ہو اور محبوبات پر ختم ہو تو بیچ کی ساری باتیں محبوبات میں داخل ہو جائیں گی"۔

"اول و آخر نسبت دارد" ہر اوّل کو اپنے آخر سے نسبت ہوتی ہے اور بیچ کی چیزیں اول یا آخر کے تابع ہوتی ہیں۔ کتاب کی ابتداء بھی محبوب چیز سے ہوئی وہ علم خداوندی ہے اور کتاب کی انتہا بھی ایک ایسے عمل سے ہوئی کہ وہ عمل محبوب خداوندی ہے یعنی سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم پڑھنا یہ عمل محبوب ہے' تو امام بخاریؒ کی صنعت بھی واقعی نرالی اور انوکھی ہے جہاں ان کا دل اور قلب پہنچا دوسرے نہیں پہنچ سکے امام بخاریؒ کی جلالت شان اور ان کا کمال وہ اسی کا مقتضی تھا کہ کتاب بھی اتنے ہی کمالات سے بھری ہوئی ہو۔

صحتِ بخاری | تو امام بخاریؒ روایت کرنے میں یکتا ہیں کہ صحیح بخاری کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ ان کی شرائط پر منطبق ہیں وہ نہایت ہی اونچی حدیثیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں

ہے کہ صحیح کسی اور کتاب میں نہیں ہے مسلم میں بھی صحیح حدیثیں ہیں ترمذی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔ نسائی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔ اور کتابوں میں بھی ہیں مگر جن شرائط اور محتاط طریقے سے امام بخاریؒ قبول کرتے ہیں ان سب سے نیچے نیچے ہیں۔ ان کی نہایت پکی شرطیں ہوتی ہیں۔ وہ ان میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تو امام بخاریؒ نے ایسی شرطیں راویت میں لگائی ہیں کہ وہ اور صحیحوں سے بڑھ کر روایت میں صحیح ہیں جن کو امام بخاریؒ نے روایت کر دیا۔۔۔ اسی لئے امت کا اس پر اجماع ہے:

اصح الکتب بعد کتاب اللہ

کہ اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب بخاری ہے۔ کتاب اللہ کے بعد اس کا درجہ رکھا گیا۔ اول تو طبعاً بھی بعد میں اس کا مرتبہ ہونا چاہئے اس لئے کہ کتاب اللہ اسے میں تو اللہ کا علم ہے۔۔۔ کتاب اللہ کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کا حکم ہو اور یہ صحیح بخاری درحقیقت کتاب الرسولؐ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسول کا درجہ تو اللہ کے بعد ہی ہے اس لئے رسول کی کتاب کا درجہ بھی اللہ کی کتاب کے بعد ہوا۔ تو اعلیٰ ترین صحت کتاب اللہ کی ہے کہ اس عالم میں کسی آسمانی کتاب کو وہ صحت نصیب نہیں ہوئی جو کتاب مبین کو ہوئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کلام درحقیت صرف یہی ہے۔

سابقہ کتب سماوی کی حیثیت

توراۃ حقیقی معنی میں کلام اللہ نہیں ہے انجیل بھی حقیقی معنی کے لحاظ سے کلام اللہ نہیں اس لئے کہ کلام کہتے ہیں مایتکلم بہ جس کو بولنے والا بولے وہ کلام کہلاتا ہے لکھ کر دیدے اس کو خط تو کہیں گے لیکن کلام نہیں کہیں گے یوں مجازاً آپ کلام کہہ دیں۔

آپ نے کوئی مضمون اپنے دل کا حکمت سے دوسرے کے دل میں ڈال دیا تو اسے کلام نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ آپ نے زبان سے تو وہ کلام نہیں کہا۔ موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دی گئی مگر پڑھ کر حق تعالیٰ نے نہیں سنائی توراۃ کو الواح کے اوپر لکھ کر حوالے کر دیا تو توراۃ کتاب خداوندی ہے کلامِ خداوندی نہیں ہے مجازی طور پر اس کو کلامِ خداوندی کہیں تو کہہ سکتے ہیں حقیقی معنی میں کلام نہیں ہے اسی طرح کتاب انجیل ہے۔

حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القا فرمایا۔ انہوں نے اپنے

مبارک الفاظ میں اس کو ادا کیا جیسے حدیث ہے کہ یہ وحی ہے مضمون حق تعالیٰ کا ہے اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہیں۔ وحی متلو وہ ہے جو قرآن ہے اور وحی غیر متلو یہ حدیث رسول ہے۔ وہاں الفاظ بھی اللہ کے ہیں اور مضمون بھی۔ انجیل میں مضمون تو حق تعالیٰ کا ہے لیکن اس میں الفاظ عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں۔ اس لئے انجیل کو مضمون خداوندی کہا جائے گا کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے تکلم نہیں کیا۔ مجازاً آپ کہہ دیں کہ کہ یہ بھی کلام خداوندی ہے ہے لیکن قرآن حکیم حقیقی معنی میں کلام خداوندی ہے، حق تعالیٰ نے پڑھ کر سنایا بھی ہے تو ما یتکلم بھی ہے یعنی کلام بھی اللہ نے کیا اور مضمون تو اس کا ہے ہی اور لوح محفوظ میں لکھا بھی ہے تو یہ کتاب خداوندی بھی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے پڑھا بھی ہے اس لئے یہ کلام خداوندی بھی ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کی عظمت سے تمام ملائکہ بے ہوش ہو جاتے تھے اور جب ہوش میں آتے تو پوچھتے مَاذَا قَالَ رَبُّنَا قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْر ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام فرماتے کہ حق فرمایا ہے۔ اور وہ علی کبیر ہے۔ تو حق تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو پورا قرآن سنایا ہے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پورا قرآن لا کر جناب نبی کریم ﷺ کو سنایا۔

صرف قرآن ہی کلام خداوندی ہے

تو قرآن کریم کتاب خداوندی بھی ہے کہ سب سے پہلے اس کو لوحِ محفوظ میں لکھا گیا اور اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا کہ وہ حروف ذرا خفی تھے اور لوحِ محفوظ کے حروف جلی تھے بعض احادیث میں ہے کہ ایک ایک حرف کوہ قاف کے برابر تھا جیسا لکھنے والا ویسا اس کا قلم ویسے اس کے حروف ویسے ہی اس کی لوح۔ لکھنے والا لا محدود عظمت والا ہے اس کے کلامِ کی کتابت بھی ایسی ہوگی اور حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر چھوٹے حروف میں لکھا گیا۔ یہاں سے حمائل کا ماخذ نکل آیا مسلمان بڑی تختی میں بھی قرآن کریم لکھتے اور چھوٹی حمائل شریف بھی گلے میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے حمائل بھی لکھ دی اور لوحِ محفوظ پر جلی حروف میں بھی لکھا۔ بہر حال یہ کتابِ خداوندی بھی ہے جس کو قرآن کہتے ہیں اور کلامِ خداوندی ہے جس کا باری تعالیٰ

نے اولاً تکلم کیا پھر حضرت جبرائیل علیہ السلانے حضور علیہ الصلوۃ السلام کے ساتھ دور کرتے تھے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام پڑھتے۔ وفات کا جو سال ہے جو آپ کا آخری رمضان تھا اس میں دو مرتبہ دور فرمایا تو تکلم واقع ہوا۔ نبی کی زبان سے بھی یہ کلام ادا ہوا اور فرشتے کی زبان سے بھی یہ تکلم ہوا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی تکلم ہوا۔ تو کلامِ حقیقی صرف کلامِ خداوندی یہی قرآن ہے؛ دوسری چیزوں کا کلام مجازاً کہہ دیں گے حقیقتاً وہ یا کتابِ خداوندی ہے یا مضمونِ خداوندی ہے لیکن کلام اسی کو کہیں گے جس کے ساتھ تکلم واقع ہوا۔

قرآن وحدیث میں مابہ الامتیاز تو یوں کہنا چاہئے کہ حدیث مضمونِ خداوندی لیکن الفاظ حضور علیہ السلام کے ہیں اور قرآن کلام خداوندی ہے کہ لفظ بھی اللہ کا اس لئے اس کو وحی متلو کہتے ہیں کہ وہ تلاوت میں آتی ہیں اور اس (حدیث) کو وحی غیر متلو کہتے ہیں کہ یہ ان معنوں میں تلاوت میں نہیں آتی۔ لیکن محبّت اور استفادے کا تقاضا ہے کہ اس کی بھی تلاوت کی جائے۔

چنانچہ بعض علماء کا معمول رہا ہے کہ جہاں وہ دو چار پارے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھ تو وہاں وہ بخاری کا پارہ ـــ یا نصف یا ربع یا ثلث مقرر کر لیتے تھے اور اس کی بھی تلاوت کرتے تھے اب بھی بعض علماء ایسے ہیں کہ وہ بخاری کی تلاوت کرتے ہیں دو تین سال میں ختم کر دیتے ہیں تو تلاوت کرنے میں ایک برکت حاصل ہو گئی دوسرا نبی کریم ﷺ سے نسبت پیدا ہوتی ہے جتنا کسی کے کلام کو پڑھا جائے اس سے نسبت پیدا ہو جائے گی یعنی دل اٹک جاتا ہے اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر آدمی با معنی پڑھے تو حقائق تک پہنچتا ہے اور اگر مُراقبے کے ساتھ پڑھے تو کیفیات بھی طاری ہونے لگتی ہیں۔

شاہ رفیع الدینؒ لکھتے ہیں کہ جب تلاوت کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ دراصل تلاوت کنندہ حق تعالیٰ کی ذات ہے، میں تلاوت نہیں کر رہا۔ حق تعالیٰ تلاوت کر رہے ہیں زبان میری ہل رہی ہے، زبان میری ہے کلام ان کا ہے تکلم ہو رہا ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحَىٰ

ہمارا نبی جو کلام کرتا ہے کلام ہمارا ہے زبان ان کی ہے زبان مظہر بنی ہوئی ہے ـــ تو شاہ رفیع الدینؒ لکھتے ہیں کہ تلاوت کرنے بیٹھو تو اس لحاظ سے کرو کہ کلام حق تعالیٰ کا ہے۔ وہ پڑھ رہے

ہیں زبان میری حرکت کر رہی ہے۔ اس پر عبور ہو رہا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ جب یہ مراقبہ مضبوط ہو جائے گا تو صراحۃً غیب وکشف کے اندر سے آواز آنا بھی شروع ہو جائے گی کہ حقیقتاً تم تلاوت نہیں کر رہے ہو۔ حق تعالیٰ ہی تلاوت کر رہے ہیں اور جب وہ تلاوت کریں گے تو پورے عالم کا ذرہ ذرہ ناطق ہوگا۔ اس کلام کے ساتھ ہر درخت کے پتہ سے آواز آئے گی کہ تلاوت ہو رہی ہے۔

بہر حال یہ کلام خداوندی کی خصوصیت ہے کہ اس کی۔ تلاوت کثرت سے کرو تو حق تعالیٰ سے نسبت پیدا ہوگی اور اس کو مراقبہ سے کرو تو وہ کیفیات جو ان آیات میں بھری ہوئی ہیں وہ قلب پر طاری ہو جائیں گی اور قلب وروح محسوس کریں گے اور قیامت میں جاکر آنکھوں کو محسوس ہوگا۔

عظمتِ قرآن اور پیغمبر کی جلالتِ شان

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ لوحِ محفوظ کو (قیامت میں) خطاب کریں گے کہ قرآن لاؤ۔ وہ عرض کرے گی کہ قرآن تو جبرائیل امین لے گئے تھے جبرائیل علیہ السلام کو بلایا جائے گا تو وہ اس طرح آئیں گے کہ ان کے ہاتھ پیر کانپتے ہوں گے۔ اتنا مشکل ہوگا لرزتے ہوئے ہوں گے کہ معلوم نہیں کیا ہوگا؟ میں نے محمد ﷺ کے قلب مبارک پر اتار تو جناب نبی کریم ﷺ کی طلبی ہوگی۔ حق تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو فرمائیں گے کہ ہمارا قرآن آپ تک جبرائیل نے پہنچایا۔ آپ فرمائیں گے بلاشک پہنچایا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے آپ نے کیا کیا؟ میں نے اپنی امت کے سامنے تلاوت کیا اور اس کو پڑھا اور تعلیم بھی دی اس کی کیفیات بھی میں نے بتائیں يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا اب ہمارے سامنے اور ان امتوں کے سامنے بھی تلاوت کرو۔ حدیث میں ہے کہ آپ کا منبر اس مقام پر بچھا دیا جائے گا۔ جہاں آج آپ کا منبر بچھ ہوا ہے یعنی مسجد نبوی (ﷺ) میں۔ اس پر بیٹھ کر آپ تلاوت فرمائیں گے پوری ترتیب کیساتھ اول سے لے کر آخر تک پور قرآن پڑھیں گے اور دنیا کی ساری امتیں سنیں گی۔ تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے اب تک سنا ہی نہیں جو آج سن رہے ہیں اس لئے کہ وہ کیفیات جن کا ادراک روح کرتی تھی آج آنکھوں سے نظر آئیں گی اور قرآن ایک باغ وبہار کے رنگ میں ہوگا جس میں عجیب وغریب پھول کھلے ہوئے ہوں گے عجیب عجیب خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں تو پورے قرآن کو مجسم کر دیا جائے گا۔ اور وہ کیفیات جو روحیں محسوس کرتی تھیں قیامت کو

آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔

ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ سامنے ہوں تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کا مجمع ہو اور سید اولین والآخرین پڑھ رہے ہوں تو ان کیفیات کا کیا ٹھکانہ ہوگا جو قلوب پر طاری ہونگی اور وہاں سے بڑھ کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گی۔

تو در حقیقت قرآن کریم میں پہلی چیز لفظ اور دوسری چیز معنی ہیں اور تیسری چیز اس کے حقائق ہیں اور چوتھی حقائق کے نیچے اس کی کیفیات ہیں جو اروح پر طاری ہوتی ہے کبھی خوف کا غلبہ کبھی خشیت کا غلبہ کبھی رجاء کا غلبہ کبھی امید کا غلبہ کبھی رحمت کا غلبہ کبھی قہر سامنے یہاں روح محسوس کرتی ہے وہاں آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔

اس لئے میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں تو کیفیات الوہیت جمع ہیں اور کلام رسول میں کیفیات نبوت جمع ہیں۔ اگر آیت قرآن کو تلاوت کیا تو کیفیات الٰہیہ آپ کے باطن پر طاری ہونگی اور اگر نبوت کو تلاوت کیا تو کوائف نبوت آپ کے قلب کے اوپر طاری ہوں گی اور پھر آپ محسوس کریں گے کہ یہ کیسا عجیب وغریب کلام ہے کہ کتنے سمندر اس میں چھپے ہوئے ہیں۔ تو بہرحال یہ داستان تو بڑی طویل ہے میرا مقصد تھا عرض کرنے کا کہ پہلی بات کی صنعت تھی اور دوسری چیز حدیث کی خصوصیات تھیں۔

احوال واقعی

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعوم دیوبند نے دارالعلوم دیوبند نے دارالعلوم حقانیہ میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر طلباء و اساتذۂ دارالعلوم کی خواہش پر بروز اتوار ۲۰ رجب ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء دارالحدیث ہال میں بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پر نہایت حکیمانہ اور عالمانہ درس دیا۔ دارالحدیث میں اس کے باہر برآمدے ---- اہل علم وفضل سے کھچاکھچ بھرے ہوئے تھے ہال پر ایک عجیب نورانی فضاء چھائی ہوئی تھی۔ علوم ومعارف قاسمیہ کا یہ فیضان نماز عصر تک جاری رہا۔ یہ تقریب ایک گونہ دارالعلوم کے مدرسہ مولانا شیر علی نے عربی زبان میں ایک فصیح وبلیغ سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام مظہر اور قاسمیہ مدظلہ کی تقریر کے تمہیدی کلمات اپنے اندر کابرین دیوبند کی تواضع عجز انکساری اور بے نفسی کا پہلو لئے ہوئے ہیں ---- حضرت مدظلہ کا درس اس وقت ٹیپ ریکارڈ سے محفوظ کرلیا گیا۔ اور اب اسے من عن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ ''الحق'' دارالعلوم اکوڑہ خٹک

احوال واقعی

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم مہتمم سابق دار العلوم دیو بند نے دار العلوم حقانیہ میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر طلباء واساتذہ دار العلوم کی خواہش پر بروز اتوار ۲۰ رجب ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء دار الحدیث ہال میں بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پر نہایت حکیمانہ اور عالمانہ درس دیا۔ دار الحدیث اور اس کے باہر برآمدے۔۔۔ اہل علم و فضل سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے ہال پر ایک عجیب نورانی فضاء چھائی ہوئی تھی۔ علوم و معارف قاسمہ کا یہ فیضان نماز عصر تک جاری رہا۔ یہ تقریب ایک گونہ دار العلوم کی طرف سے استقبالیہ تقریب بھی تھی۔ اس لئے حضرت شیخ الحدیث مرحوم کی طرف سے دار العلوم کے مدرس مولانا شیر علی شاہ نے عربی زبان میں ایک فصیح وبلیغ سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام مظہر انورِ قاسمہ مرحوم کی تقریر کے تمہیدی کلمات اپنے اندر اکابرین دیو بند کی تواضع عجز' انکساری اور بے نفسی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔۔۔ حضرت مدظلہ کا درس اس وقت ٹیپ ریکارڈ سے محفوظ کر لیا گیا۔ اور اب اسے من عن قارئیں کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ "الحق" دار العلوم اکوڑہ خٹک

افادات بخاری نمبر ۲

”امام بخاریؒ کی صنع بھی حد کمال تک ہیں‘ لیکن یہ اول و آخر کی صنعت اس میں بھی حد کمال ہے کہ ابتداء میں بندے کو بندگی سمجھائی اور اخیر میں الوہیت کے مقامات کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اور بیچ میں تمام ابواب آ گئے۔ اس میں عبادات بھی ہیں‘ معاملات بھی ہیں‘ معاشرت بھی ہے‘ سیاسیات بھی ہے تو دین کے سارے ابواب درمیان میں آجاتے ہیں اور اول آخر کو نیت اور میزان عمل سے گھیر دیا‘ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دو کنارے صحیح رہیں تو عبادت بھی قبول‘ معاشرت بھی قبول‘ سب رضائے خداوندی کا ذریعہ بن جائیں گے“۔
از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِینُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّنَذِیْراً وَّدَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً..................اَمَّابَعْدُ..................

حَدَّثَنَا الْحُمَیْدِیُّ (اِلٰی قَوْلِہٖ سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ عَلَی الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِیءٍ مَّانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ....... اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوْاِلٰی امْرَاَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَاِلَیْہِ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ.

بجواب سپاس نامہ

بزرگان محترم!
یہ مجلس کسی وعظ و تلقین کی یا کوئی اجتماع عام نہیں ہے۔ بلکہ مجلس درس ہے اس لئے میں نے صحیح بخاری کی دو حدیثیں تلاوت کی ہیں۔ ایک بالکل ابتدائی اور ایک بالکل انتہائی۔ ابتداء اور انتہاء

کے بیچ میں ''وسط'' کا حصہ ہوتا ہے۔ تو اس اعتبار سے تقریباً پوری بخاری ''معنیً وحکماً'' آپ کے سامنے تلاوت کر دی۔

سپاسنامہ میرے لئے دنیا و آخرت کی نجات کی دستاویز ہے۔ اس لئے کہ پیش کرنے والے جن کا نام مبارک لیا گیا' حضرت مولانا عبدالحق صاحب مرحوم ہیں میں انہیں اپنے اساتذہ کے طبقے میں سمجھتا ہوں۔ اس لئے ان کا سپاس نامہ در حقیقت شفقت نامہ ہے' سپاسنامہ تو کسی چھوٹے کی طرف سے ہوتا ہے بڑوں کی طرف سے محض شفقت' حوصلہ افزائی اور اظہار برکت کے لئے ہوتا ہے۔
حدیث میں فرمایا گیا کہ :

انتم شهداء الله فی الارض

تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ اگر سرکاری گواہ کسی کی نسبت شہادت دے دے کہ وہ اچھا ہے تو وہ عند اللہ اچھا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضرات کی شہادت اگرچہ کریم النفسی یا حوصلہ افزائی ہے لیکن میں اسے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اہل اللہ کی زبان ہے اور اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ من اللہ ہے۔۔۔ اور میں کتنا بھی نالائق سہی لیکن جب ایسے پاکیزہ لوگ گواہی دیں گے تو اللہ کے ہاں کیا بڑی بات ہے کہ اللہ کسی نالائق کو لائق بنا دے' کسی برے کو اچھا بنا دے۔۔۔ سپاسنامہ درس کے مناسب حال نہیں تھا۔۔۔ اس کے علاوہ میں یہاں دار العلوم حقانیہ حاضر ہوا' تو میں اسے اپنا گھر سمجھتا ہوں کہ دار لعلوم دیو بند میں بیٹھا ہوا ہوں میں تو خود آپ کے گھر کا ایک جز ہوں۔ تو اپنے گھر میں کسی کو سپاس نامہ تھوڑا ہی دیا جاتا ہے۔ یہ تو غیر کو دیا جاتا ہے۔

برادری مختلف جگہوں پر منتشر ہے لیکن افراد کے انتشار سے خاندان منتشر نہیں ہوتا۔ ہمارا علمی خاندان ایک ہی ہے اس کے اجزاء منتشر ہیں کچھ دیو بند میں' کچھ پاکستان میں' کچھ برما میں' کچھ افریقہ میں۔ یہ سارے افراد کنبہ ہیں جو مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اصل ہم سب کی ایک ہے جس کو دار العلوم دیو بند کہا جاتا ہے۔ اس واسطے جیسے آپ اس کی شاخیں ہیں' میں بھی ایک شاخ ہوں تو میں اپنی برداری میں آیا بھائیوں میں آیا۔ تو بھائیوں میں سپاس نامہ عزت افزائی تو ہے مگر ایک رسمی سی چیز ہے۔۔۔ لیکن چونکہ اہل حق پیش کر رہے ہیں میں اس لئے اسے رسم بھی نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ حقیقت ہے۔ جو کچھ ارشاد فرمایا گیا یہ اعمال قلب سے ارشاد فرمایا گیا یہ زبان اور قلم نے حرکت نہیں کی۔ بلکہ دل کی حرکت ہے اور دل سے جب ایک چھوٹے اور نالائق کو اچھا کہا گیا' تو انشاء اللہ وہ عند اللہ اچھا بن جائے گا۔

تو میں نے اس وقت بجائے کسی تقریر کے جو جلسے کا موضوع ہوتا ہے صحیح بخاری کی دو حدیثیں تلاوت کی ہیں اور اسی سلسلے میں چند کلمات طالب علموں کے سامنے گزارش کروں گا۔ میرے مخاطب حضرات اساتذہ نہیں ہیں۔ یہ تو خود میرے استادوں کے طبقے میں ہیں۔ یہ میری بات چیت طلبہ سے ہے جو برادری کے بھائی ہیں۔

علم میں بے شک آپ مجھ سے افضل ہیں' آپ کا علم تازہ ہے۔ اور مجھے تو پڑھے ہوئے چالیس برس گزر گئے' بھول بھال بھی گیا کہ پڑھا تھا۔ انتظامی سلسلے کے جھگڑوں میں پھنس کر وہ نوعیت بھی

نہیں رہی اس واسطے ایک بھائی تو ہوں مگر ایک جاہل قسم کا بھائی ہوں آپ بحمد اللہ علماء ہیں علم تازہ ہے تاہم آپ نے چونکہ اس جگہ بٹھلا دیا۔ اس واسطے اسی کے مناسب حال یہ روایتیں میں نے تلاوت کیں۔

امام بخاریؒ اور ان کی کتاب کی عظمت

امام بخاریؒ کی جلالتِ شان اور جلالتِ قدر سے کون مسلمان ناواقف ہے اہل علم میں کون ہے جو ناواقف ہے۔ ان کی تصنیف یا تالیف صحیح بخاری کی عظمت و جلالت پوری امت پر واضح ہے۔ امت نے اجماعی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہونے کی شہادت دی ہے اس لئے مولف بھی جلیل القدر، کتاب بھی جلیل القدر اور کتاب کا موضوع ہے حدیث نبی کریم ﷺ وافعالہ و اقوالہ و تقریرات۔

اس لئے موضوع بھی مبارک، مصنف بھی مبارک، تصنیف بھی مبارک، حق تعالیٰ ہم سب کو بھی مبارک بنادے کہ اس کے سلسلے میں ہم سامنے آرہے ہیں۔

امام بخاریؒ کی یہ صفت تمام محدثین کرام میں امتیازی طور پر معروف ہے نسائیؒ کو کہتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاریؒ کا کچھ نقش قدم اختیار کیا ہے مگر بہر حال اصل اصل اور فرع فرع ہے صنع بخاری یہ بہت اونچی چیز ہے اور تراجم بخاری یہ تو فی الحقیقت فقہ کا ایک مستقل باب ہیں۔۔۔ فقہ البخاری فی تراجمہ تو امام بخاریؒ محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں۔ نیز اجتہاد کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں اس لئے میں نے تبرکاً پہلی حدیث بھی تلاوت کی آخری کی بھی تلاوت کی۔

علمی دنیا کی دو چیزیں

دونوں روایتوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں نہ وقت ہے نہ اب اتنی طاقت ہے۔ لیکن اتنی بات بالاجمال عرض کئے دیتا ہوں کہ آدمی کے لئے علمی دنیا میں دو چیزیں ہیں' ایک مصدر علم وہ چیز ہے جس سے عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور مظہر عمل، عمل کی وہ ہیئت کذائی ہے جس میں رہ کر ہم اور آپ عمل انجام دیتے ہیں تو مصدر عمل درحقیقت اسی نیت پر موقوف اور عمل کی قبولیت، نامقبولیت اسی نیت پر موقوف ہے' اچھا سے اچھے عمل ہو نیت کی صحت سے انجام پائے تو آدمی کبھی مورد ملامت نہیں ہوتا۔ وہ عمل بھی مقبول ہو جاتا ہے' اس لئے سب سے بڑی چیز نیت ہے کہ جس سے عمل کا صدور ہو اور ایسے پاک عمل کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو میزان عمل ہے وہ بھاری پڑ جائے گا۔ نیک اعمال ہی سے میزان میں وزن پیدا ہوگا۔ برے اعمال کا وزن نہیں ہے۔ بلکہ بروں کو تو تولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب اچھے اور برے جمع ہوں گے جبھی تو تولنے کی ضرورت پڑے گی۔ تاکہ توازن قائم ہو جائے۔

اس عملی دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک مصدر عمل اور ایک ثمرہ عمل۔ تو امام بخاری نے ابتداء میں انما الاعمال بالنیات حدیث نقل کی ہے گویا نیت بنیاد ہے عمل کا ظہور درحقیقت اسی نیت سے ہوتا ہے قبولیت بھی اسی نیت پر موقوف ہے یہ الگ چیز ہے کہ بعض اعمال بلانیت نے صحیح ہو جائیں اور شریعت ان کو معتبر مان لے لیکن آخرت کا اجر و ثواب بغیر نیت کے مرتب نہیں ہوگا۔ وضو

اگر آپ بلانیت بھی کریں تو مفتاح صلوۃ تو بن جائے گا۔ لیکن جب تک نیت نہ ہو اجر مرتب نہیں ہوگا۔ تو عند اللہ قبولیت کا معیار در حقیقت نیت پر ہے۔ صحت کا معیار فتویٰ ہے۔ اس لئے کہ بعض بغیر نیت کے صحیح بھی نہیں ہوتے بعض صحیح تو ہو جاتے ہیں گو ان پر اجر مرتب نہیں ہوتا۔

نیت عمل کی بنیاد ہے بہر حال قدر مشترک کے طور پر نیت بنیادی چیز ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ:

نية المرء خير من عمله

آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ یوم محشر میں بعض لوگ حاضر ہوں گے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ لکھ دو انہوں نے عمر بھر تہجد پڑھ لی ہے۔ ملائکہ عرض کریں گے انہوں نے ایک دن بھی تہجد نہیں پڑھی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے روزانہ سوتے وقت نیت کرتے تھے کہ آج ہم تہجد پڑھیں گے مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی لہذا لکھ دو کہ انہوں نے ساری عمر تہجد پڑھی تو انسان کی نیت عمل کی بنیاد ہے۔

ربط بین الابواب

دوسرے لفظوں میں اس کو یوں تعبیر کرنا چاہئے کہ آدمی پہلے دل سے عمل کرتا ہے پھر ہاتھ پاؤں سے۔۔۔ وہی دل کا عمل بنیاد ہے جس سے ہاتھ پیر کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔ تو قلب سے عمل کرنے کی صورت نیت ہے اور قالب سے عمل کرنے کی ہیئت کذائیہ ہے جو شریعت نے ارشاد فرمائی۔ تو پہلے ہر عمل قلب سے ہوتا ہے پھر قلب سے انجام پاتا ہے اور وہ قالبی عمل پر منطبق ہوتا ہے۔ تو رخ دو ہیں اور عمل در حقیقت ایک ہے باطنی رخ اس کا نیت ہے اور ظاہری رخ اس کی وہ ہیئت عمل ہے۔۔۔ تو امام ہمامؒ نے سب سے پہلے ایسی بنیادی حدیث نقل کی کہ کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس میں نیت کا دخل نہ ہو۔ اور اس کے اجر و ثواب کا تعلق نیت سے نہ ہو۔ ترتیب یوں ہوگی کہ پہلے نیت درست کرا دی۔ اس کے بعد ابواب ایمان ابواب علم پھر ابواب زکوٰۃ اور دیگر ابواب بیان کئے ان سب کا مصدر "نیت" ہی بتلا دیا۔ تو حکماً وہ سارے اس کے نیچے آ گئے۔

اعمال پر اجر کا ترتب

اخیر میں جو چیز تھی وہ عند اللہ قبولیت اور اجر کا ترتب ہے۔ تو آخر میں یہ حدیث نقل کی:

كلمتان جبيبتان الى الرحمن خفيفتان على اللسان ثقيلتان فى الميزان سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم.

دو کلمے ہیں جو زبان پر نہایت ہلکے ان کے ادا کرنے میں نہ وقت لگتا ہے نہ دشواری ہے ایک کلمہ سبحان اللہ وبحمدہ اور دوسرا کلمہ سبحان اللہ العظیم ہے۔ یہ ہلکے پھلکے دو کلمے جو ادائیگی میں نہایت ہلکے زبان پر نہایت لطیف، لیکن بلحاظ اجر کے ثقیل ہیں۔ میزان عمل کے اندر جو ان کا وزن ہوگا۔ وہ دوسرے اعمال کا نہیں ہوگا۔ کیوں ہیں یہ وزنی۔۔۔؟

وزنِ کلمات کی وجہ ان کے ثقیل ہونے کی بنا در حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں مقامات الوہیّت کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اتنے عظیم ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز اس کے لگ بھگ نہیں ہو سکتی۔ تو انتہائی بات یہ ہے کہ مقام الوہیّت کو ان دو کلموں کے ذریعے بیان فرمایا گیا گویا یوں کہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اجزاء سے پاک ہیں۔ وہ نہ بسیط ہے نہ مرکب، ہر چیز سے وراء الوراء ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کی الوہیّت کے مقامات، ظاہر بات ہے کہ وہ لامحدود ہیں حد کمال انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مقام تنزیہہ حق تعالیٰ کے مقامات میں سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے، یعنی وہ ہر عیب سے بری۔ ہر نقص سے بالا اور تمام عیوب سے پاک تو حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی بیان کرنا ظاہر بات ہے کہ یہ مقامات الوہیّت میں ایک مقام ہے۔ خدا کہتے ہیں اس ذات کو جو ہر برائی سے پاک ہو الخیر کله منك والیك والشر لیس الیك ہر خیر کا سر چشمہ وہ ہے، اسی سے خیر چلتی ہے، ہر شر سے بری و بالا ہے ذات بھی شر سے پاک ہے اور باہر کی شر بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ تو وہ ہر حیثیت سے وراء الوراء ہے۔ تو الوہیّت کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ خدا ذات برتر ہر عیب سے پاک ہے، تو پہلی چیز مقامات الوہیّت میں تنزیہہ ہے اور سبحان اللہ کہنا یہ گویا اشارہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی پاک بیان کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک ذات بابرکات وہ ہو جو ہر عیب سے پاک اور بری ہے (تو الوہیّت اسی کے شایان شان ہو سکتی ہے۔ تو ایک مقام الوہیّت کا یہ ہوا)۔

اب آگے خوبیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ تو جہاں بھی جو خوبی ہے وہ اسی ذات کی ہے اگر آپ علم دیکھیں گے تو اصل علم حق تعالیٰ کا ہے اس کا پرتو پڑتا ہے تو دوسرے عالم کہلانے لگتے ہیں۔ قدرت در حقیقت اس کی ہے اس کا پرتو پڑا۔ تو ملائکہ قادر کہلانے لگے۔ کہ پل بھر میں آسمان سے زمین اور زمین سے آسمان پر۔ ان کا علم حقیقی اور ذاتی ہے اس کا پرتو پڑا تو ہم آپ بھی عالم کہلانے لگے اور اور انسان کو مظہر علم بنادیا۔ رفیع المرتبہ اور رفعت و عظمت ان کی شان ہے۔ اس کا پرتو آسمانوں پر پڑا تو وہ رفعت والے ہو گئے۔ وہ بھی اونچے بن گئے اور ان کی برتری ثابت ہو گئی۔۔۔ تو سر چشمہ کمالات کا اللہ کی ذاتِ بابرکات ہے اور ظاہر بات ہے کہ حمد و ثناء کمال پر ہی کی جاتی ہے۔ نقص اور عیب پر کوئی کسی کی حمد و ثناء نہیں کرتا تو حمد و ثناء کے معنی یہ ہیں کہ جمیل اختیاری پر حمد کی جائے۔

مقامِ تحمید ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ تمام کمالات کا سر چشمہ اور ساری برکتوں کا مصدر ہیں اس لئے تمام تعریفیں بھی انھی کے لئے ہونگی۔ حمد و ثناء بھی انھی کے لئے ہوگی۔ جس کی بھی ثناث کی جائے گی وہ در حقیقت انجام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ثناء ہوگی۔ کیونکہ اسی کا کمال تھا جو کسی دوسرے میں ظاہر ہوا۔ تو حمد و ثناء کے اظہار کا طریقہ در حقیقت تحمید ہے اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا تو سبحان اللہ کا کلمہ تنزیہہ بیان کرنے کے لئے ہے۔

دوسرا مقام تنویہ اور عظمت بیان کرنے کا ہے اس لئے تحمید رکھی گئی اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف عنوانوں سے ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ. وغير ذالك.

تو تسبیح و تحمید اور حمد و تسبیح کرنا جگہ جگہ ذکر کیا گیا۔ تو سبحان کا کلمہ مقام تنزیہہ کو ظاہر کرتا ہے اور الحمد للہ کا کلمہ مقام تنویہ کو ظاہر کرتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے جو ذات اقدس ہر عیب سے بری اور ہر کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی بھی اسی کے لئے ہوگی۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ عظمتوں کا سرچشمہ تو وہ ہو اور بڑائی کسی اور کی ہو جائے۔ عظمت اور کبریائی کسی اور کے لئے ہو جائے۔ جو در حقیقت کمال کا مصدر ہے وہی حمد و عظمت کا مستحق ہے کہ اسی کی کبریائی اور عظمت بیان کی جائے اسی لئے اسلام نے تکبیر کا عنوان رکھا اور اس کے لئے اللہ اکبر کا صیغہ رکھا۔ تاکہ اللہ کی عظمت بیان کی جائے کہ اکبر من کل شی ہر چیز سے وہ بڑا ہے۔

اور نہ صرف اضافۃً بڑا ہے بلکہ حقیقتاً بڑا ہے کہ بڑائی ہے ہی اس کیلئے جس میں کوئی بڑائی آتی ہے اسی کے نام کے ساتھ ملنے سے آتی ہے اس کے نام سے جو کٹ گیا اس میں بڑائی ختم ہو گئی۔ تو بڑائی، عظمت و کبریائی در حقیقت اسی کے لئے ہیں جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

الكبرياء ردائى والعظمة ازارى فمن نزعنى فيهما قصمته.

تکبر میری چادر ہے، بزرگی میری لنگی ہے جو بھی اس میں کھینچاتانی کرے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کو نیچا دکھلاؤں گا۔ تو یہ برداشت نہیں کہ کبریاء و عظمت میں کوئی شریک ہو۔ وہ وحدہ لاشریک لہ کے لئے ہے۔ تو لہ الکبریاء فی السموات والارض اس کے لئے بڑائی و عظمت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ذرا سا ایک طالب علمانہ شبہ پیدا ہوگا۔ یا ہوا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں حکم ہے تخلقوا باخلاق اللہ اللہ کے اخلاق سے متخلق بنو۔ وہ کریم ہے تو تم بھی کریم بنو۔ وہ رحیم ہے تو تم بھی رحیم القلب بنو وہ حفیظ ہے تو تم بھی اپنوں کی نگہداشت کرو وہ مغنی حقیقی ہے تو تم بھی فقیروں کے ہاتھ پر رکھو اور اعطاء کی صفت اختیار کرو۔ تو اللہ تعالیٰ کے کمالات سے متکمل بھی بنو۔ اور اس کے اخلاق سے متخلق بھی بنو۔ تو شبہ یہ ہوتا ہے کہ متکبر بھی تو اس کی شان ہے اس میں بھی تخلق ہونا چاہئے ہر شخص متکبر بنے ورنہ کریم النفس بننے سے روکا جائے۔ اس میں بھی شرک ہوگا تو پھر اگر ہم تکبر کریں تو ملامت کیوں کی جاتی ہیں تخلقوا باخلاق اللہ (بموجب حدیث) اللہ کے اخلاق سے متخلق بنا تو عین کمال ہے۔۔۔؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبات حکیم الاسلام

جلد ششم

افادات

از

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ

سابق مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر نعمان پبلشنگ کمپنی

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون: 7241703 فیکس:

نام کتاب — خطبات حکیم الاسلام جلد ششم

از افادات — قاری محمد طیب صاحب قاسمی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کمپوزنگ — دارالنشر یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون: 7356963

کمپوزر — دلدار حسین ۔ طاہر انور

ڈیزائننگ — حافظ محمد احمد چوہدری

ترتیب جدید — نعمان پبلشنگ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون نمبر 7241703 فیکس نمبر

قیمت

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ حنفیہ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:7241703

☆ مکتبہ حنفیہ عقب قائد گیڈ اردو بازار گوجرانوالہ فون پی پی :215507

☆ مکتبہ صدیقیہ نور محل روڈ بہاولپور فون :0621-875998

☆ مکتبہ مدنیہ اردو بازار لاہور فون :

☆ مکتبہ امدادیہ متصل جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد فون پی پی :717811

☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

☆ مکتبہ سید 22 علامہ اقبال روڈ لاہور فون :6374594

☆ مکی دارالکتب یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ رحیمیہ چونگی نمبر 2 ڈھوبزار کوہاٹ صوبہ سرحد

☆ عزیز کتب گھر بیراج روڈ سکھر

☆ کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱

سٹاکسٹ ایجنسی شمالی علاقہ جات

☆ مکتبہ المیزان القرآن روز مارکیٹ ڈیرہ اسماعیل خان صوبہ سرحد

فہرست مضامین خطبات حکیم الاسلام جلد ششم

علمی معجزہ

انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دیئے گئے تھے۔۔۔۔اور حضور ﷺ کو عملی معجزات کے ساتھ ساتھ علمی معجزہ بھی دیا گیا۔ عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔۔۔۔لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے مگر اس کا علم باقی رہتا ہے تو نبی ﷺ کے عملی معجزات آپ کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے لیکن ''علمی معجزہ'' قرآن کریم ہے' جو آج تک باقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے۔ وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے۔۔۔اس لئے حضور ﷺ کی نبوت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کر دیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

الحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلَى كَآفَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اَمَّابَعْدُ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ۝

معجزہ دلیل نبوت ہے

بزرگانِ محترم!

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے مختلف معجزات دیئے ہیں معجزہ چونکہ دلیل ہوتا ہے۔ تو وہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے غیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا۔۔۔۔اور گویا یہ فعل خداوندی ہے کہ اس کی مثل لانے سے مخلوق عاجز ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ معجزہ دیا کہ وہ اللہ کے حکم

سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ تو احیائے موتی ان کا معجزہ تھا۔ اسی طرح اندھے مادر زاد کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ ان میں بینائی آجاتی تھی۔ جذامیوں اور کوڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے' ان کا بدن صاف ستھرا بن جاتا تھا۔ بلکہ اس دور کے ڈاکٹر اور حکماء عاجز آگئے تھے اور ان بیماریوں کو لاعلاج سمجھا گیا تھا۔۔۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ معجزہ ظاہر کیا تو دنیا سمجھ گئی کہ یہ اسباب کے درجے کی چیز نہیں ہے ضرور مسبب الاسباب کی طرف سے یہ کوئی کرشمہ اور خرق عادت ہے۔ یہ ان کی نبوت کی دلیل تھی۔

موسیٰ علیہ السلام کو عصاء موسیٰ دیا گیا۔ جس کی خاصیت یہ تھی کہ اسے زمین پر ڈالتے تھے وہ اژدھا بن جاتا تھا' ہاتھ میں تھام لیتے تھے تو لکڑی بن جاتی تھی۔

اسی طرح ید بیضاء ان کو عطا کیا گیا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالتے تھے تو سورج کی طرح ان کا ہاتھ چمکتا تھا۔ ہر سو روشنی پھیل جاتی تھی۔ دنیا نے سمجھ لیا کہ یہ چیزیں دوسرا کوئی دکھلانے والا نہیں۔ یقیناً یہ خدا کی طرف سے اس شخص کی نبوت اور رسالت پر دلیل ہے۔ جو سفیر خداوندی ہے اور اس کی سفارت لے کر آیا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر کی کہ ان کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا اور آگ بردو سلام بن گئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ چیز دکھلانے والا رب ابراہیم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ پر ایک ایسا عجیب معجزہ ظاہر ہوا جو ان کے مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ تو نار خلیل ان کو دی گئی۔

دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی معجزات دیئے گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ظلہ شعیب دیا گیا قوم نے جب نہ مانا تو ابر آیا اور ابر میں سے انگارے برسے۔ قوم عذاب میں مبتلا ہوئی۔۔۔ حضرت ہود علیہ السلام آئے تو ہوا کا معجزہ دیا گیا قوم نے نافرمانی کی تیز آندھی چلی اور سات دن تک چلتی رہی یہ چھوٹی موٹی آندھی نہیں تھی اتنی عظیم آندھی تھی کہ اس نے بستیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ قوم عاد کے جانوروں کی آوازیں فضا میں سنی جاتی تھیں مکانات اوپر جاتے تھے پھر پٹخے جاتے تھے۔ یہ معجزہ تھا جس سے سمجھ لیا گیا کہ یہ شخص بے شک مبعوث من اللہ ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کو ناقۂ صالح دی گئی۔ قوم نے مطالبہ کیا کہ کوئی دلیل لاؤ' سند کہ ہم تمہیں نبی سمجھیں۔۔۔ فرمایا۔۔۔ جو تم مانگو۔۔۔ انہوں نے کہا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکالو۔۔۔ ظاہر ہے کہ بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال دے۔ یہ تو اسی ذات کا کام ہے جس کی شان یہ ہے کہ :-

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ زندہ میں سے مردہ نکال دے اور مردہ میں سے زندہ پیدا کر دے۔ تو پتھر جیسی ظاہری طور پر ایک بے جان چیز میں سے جاندار کو نکالنا یہ معجزہ تھا آپ یہ معجزہ رات دن دیکھتے رہتے ہیں مگر چونکہ رات دن کا قصہ ہے اس لئے وہ عجیب معلوم نہیں ہوتا انسان کی پیدائش کیا معجزہ نہیں ہے؟" ایک جماد' بے عقل' ایک بے حقیقت قطرہ' اس پانی پر نقاشی کرنا' نقش کھینچنا اور گندے قطرے میں سے ایک پاکباز انسان نکال کر تیار کرنا' بے عقل چیز میں

سے عاقل انسان پیدا کر دینا۔ بے جان چیز میں سے جان دار چیز کو نکالنا' بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر کے اندر سے اونٹنی نکال دی گئی۔ مگر چونکہ رات دن یہ قصہ ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے مشکل اور عجیب نہیں معلوم ہوتا ورنہ معجزات رات دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔۔۔ تو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ ناقۂ صالح تھی۔

یوسف علیہ السلام کو قمیص یوسف دیا گیا۔ وہ یعقوب علیہ السلام کے چہرہ مبارک پر ڈالا گیا قمیص کا ڈالنا تھا کہ بارہ برس کی بینائی جو ضائع ہوئی تھی پانچ منٹ بعد لوٹ آئی اور آنکھیں روشن ہو گئیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

داؤد علیہ السلام کو الانہ حدید کا معجزہ دیا گیا۔ لوہے کو ہاتھوں میں پکڑتے تھے وہ موم کی طرح سے نرما جاتا تھا۔ جس طرح چاہتے اس سے سامان بنا لیتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح کا معجزہ دیا گیا۔ ہوائیں مسخر تھیں ان کے حکم سے ہوائیں تخت اڑاتی تھیں۔ سواریں لے جاتی تھیں۔ ہوا پر وہ کام ہوتا تھا جو زمین پر سواری کو چلانے کا ہوتا ہے۔۔۔ اسی کو فرمایا گیا۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ.

بہرحال تسخیر ریاح یہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ اسی طرح منطق الطیر کا معجزہ بھی دیا گیا۔ پرندوں کی بولیوں کا جاننا اور سمجھنا اور اس پر احکام مرتب کرنا یہ اعجاز سلیمانی تھا۔

تو داؤد علیہ السلام کو الانہ حدید یعنی لوہے کو نرما دینے کا معجزہ دیا گیا' سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح' موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا اور عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔ یہ تمام معجزے درحقیقت ان کی نبوت کے دلائل تھے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ مبعوث من اللہ ہیں۔ خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اس کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کا تفوق

جناب رسول ﷺ کو بھی اس قسم کے ہزاروں معجزات عطاء کئے گئے اگر عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا کہ ان کے ارشاد سے مردے زندہ ہوتے تھے تو نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر استوانہ حنانہ کو زندگی عطاء کی گئی۔

واقعہ آپ نے سنا ہوگا احادیث میں صراحۃً موجود ہے کہ منبر بننے سے قبل مسجد نبوی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ تو کھجور کا ایک سوکھا ہوا تنا کھڑا ہوا تھا' جس کو کاٹ دیا گیا تھا اس پر ٹیک لگا کر آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ایک مدت دراز تک آپؐ نے اس پر ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا' جب منبر تیار ہو گیا اس پر خطبہ پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے تو حدیث میں موجود ہے اس ستون میں سے آہ و بکاہ کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں اس طرح سے اس نے بلک بلک کر رونا شروع کیا جیسے فراق زدہ انسان روتا ہے۔ اور جب چیخ و پکار بڑھی تو حضور ﷺ ممبر سے اترے اس پر ہاتھ رکھا اور اس طرح دلاسہ دیا جس طرح سسکتے ہوئے بچے کو چپ کرایا جاتا ہے اور وہ

چپ ہوا۔

تو عیسیٰ علیہ السلام نے اگر مردے کو زندہ کیا تو آپ کے معجزے سے ایک سوکھا ہوا تنا زندہ بنا۔۔۔ یہ معجزہ اس سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔

اس لئے کہ انسانی لاش میں بہر حال پہلے جان موجود تھی۔ اگر دوبارہ لوٹ آئے تو اس روح کو اس بدن سے مناسبت تھی۔ اگر نکل سکتی تھی۔ تو واپس اپنے محل اور مکان میں پہنچ گئی۔ اپنے سانچے میں آکر ڈھل گئی۔

لیکن کھجور کا ایک تنا زندہ ہو اور زندہ ہو کر وہ آثار ظاہر ہوں جو جاندار مین سے ظاہر ہوئے ہیں اگر فقط اتنی زندگی ہوتی کہ اس پر ہرے پتے لگ جاتے تو کہا جاتا کہ اس کے اندر روح نباتی آئی۔ روح نباتی اگر اس کے خشک ہونے کی وجہ سے چلی گئی تھی وہ دوبارہ لوٹ آئی' اس کا محل تھا۔ جیسے مردے میں جان آجائے۔

لیکن جان آئی تو ایسی آئی جو جانداروں کی سی جان ہے۔ یعنی روح حیوانی داخل ہوئی نہ صرف روح حیوانی بلکہ انسانی افعال ظاہر ہوئے۔ تو روح انسانی داخل ہوئی اور انسانی افعال میں سے وہ افعال سرزد ہوئے جو عشاق خداوندی سے سرزد ہوتے ہیں عاشقان الٰہی کی طرح فراق نبوی میں رونا اور چلانا شروع کیا جو ایک عاشق خداوندی کا کام ہے۔ تو ایک کھجور کے خشک تنے میں جان بھی آئی تو انسانوں جیسی بلکہ کامل انسانوں جیسی تو اس سے بڑا معجزہ ہے کہ ایک لاش کے اندر انسانی جان آئے جو انسان ہی کی لاش تھی۔ لاش تو ہو درخت کی اور روح اس میں کامل انسان کی پڑے یہ کہیں زیادہ اونچی بات ہے بہ نسبت اس احیاء موتی کے تو حضور ﷺ کو بھی احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا عطاء کیا گیا کہ ہاتھ روشن ہوتا تھا تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابی جن کا نام تھا ابا حنیفہ ہے وہ جنگل میں جا رہے تھے۔ سخت اندھیرا تھا' راستہ ملتا نہیں تھا۔ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ راستے کی کوئی صورت ہو' کسی طرح سے مجھے راہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ان کی لاٹھی اس طرح روشن کردی گئی کہ پورے جنگل میں روشنی پھیلی اور راہ نظر آنے لگی۔۔۔ تو حضور ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرامؓ میں یہ کرامتیں پائی گئیں۔ یہ معجزہ ہی کا اثر تھا۔ یہ حضور ﷺ کا معجزہ کہا جائے گا جو آپ کے خادم کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے گئے وہ سب کے سب بلکہ بدرجہا زائد نبی کریم ﷺ کو بھی عطاء فرمائے گئے۔

سب سے بڑا معجزہ

لیکن آپ ﷺ کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ جو انبیائے سابقین کو نہیں دیا گیا وہ معجزہ فی الحقیقت علمی معجزہ ہے۔ جس کو قرآن حکیم کہا جاتا ہے کہ ایسی کتاب اور شریعت لاکر نا پیش کر جو جامع ہدایت ہے۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معجزہ ہے اس کی فصاحت و بلاغت وہ ہے کہ دنیا اس کے مقابلہ کرنے سے عاجز رہ گئی معنی

اور مضامین کا لحاظ سے انتہائی جامع ہے کہ اتنا جامع کلام پیش کرنے سے دنیا عاجز آ گئی۔

عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت میں مثل تھے۔ ان کو دعویٰ تھا کہ ہم عرب ہیں باقی ساری کی ساری دنیا عجم ہے۔ عجم کے معنی گونگے کے ہیں۔ وہ اپنے مقابلے میں پوری دنیا کو گونگا جانتے تھے کہ نہ انہیں بولنا آتا ہے نہ یہ شادی اور غم کی شرح کر سکتے ہیں نہ وہ اسالیب بیان ان کے ہاتھ میں ہیں جو عربوں کے ہاتھ میں ہیں قصائد لکھتے تھے اور دنیا کو چیلنج کرتے تھے کہ کوئی ہے جو ان کا مقابلہ کرے؟ ان جیسا قصیدہ لائے؟ بیت اللہ میں قصیدے ٹانکے جاتے تھے چیلنج دیا جاتا تھا کہ کوئی ان کا مثل بنا کر لائے۔ یہ گویا اس زمانہ میں عام دستور تھا۔ اور عربوں کی فصاحت و بلاغت اس حد پر پہنچ چکی تھی کہ ان کی پانچ چھ برس کی بچیاں ننانوے ننانوے اشعار کے نہایت فی البدیہہ قصائد برجستہ پڑھ جاتی تھیں۔۔۔ یہ سبعہ معلقہ جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے یہ وہی سات قصیدے ہیں جو بیت اللہ میں لٹکائے گئے تھے اور چیلنج کیا گیا تھا کہ ان کا مثل لائے۔۔۔ غرض اس زمانے میں عربوں کے اندر فصاحت و بلاغت کا زور تھا اس وقت کا معجزہ جو جناب نبی ﷺ نے لا کر پیش کیا وہ فصاحت و بلاغت ہی کا معجزہ تھا جس کو قرآن کریم کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اگر قصائد لٹکا کر چیلنج کیا اللہ نے قرآن اتار کر چیلنج کیا۔

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا.

”اگر جن و انسان سب مل کر مجتمع ہو جائیں اور اس قرآن کا مثل بنانا چاہیں تو ان کو قدرت نہیں ہے کہ وہ بنا سکیں“۔

اس لئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ خدا کا کلام ہے۔

حقیقت معجزہ جس سے سب عاجز آ جائیں یہ دلیل ہوتی ہے کہ یہ بشر کے قبضہ قدرت کی بات نہیں ہے۔ آج آپ پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورج اور چاند خدا کا فعل ہے اس لئے کہ سارے انسان مل کر چاہیں تو سورج کی ایک کرن نہیں بنا سکتے۔ آپ کہتے ہیں زمین خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ دلیل یہی دیتے ہیں کہ سارے انسان جمع ہو جائیں تو زمین کا ایک ذرہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اس کے ذروں کو جوڑ توڑ کر اس سے کام لے لینا تو اور چیز ہے۔ لیکن ایک ذرہ بنا دیں جس میں وہی انبات وغیرہ کی تمام صلاحیتیں ہوں جو زمین میں ہیں دنیا کے سارے فلاسفر جمع ہو کر نہیں بنا سکتے۔۔۔ چاند اور سورج تو علویات و فلکیات میں سے ہیں اور ارضیات میں زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا جز انسان نہیں بنا سکتا۔ درخت کی ایک پتی ایسی نہیں بنا سکتا جس میں وہی خاصیتیں ہوں جو اللہ نے اس پتے میں رکھی ہوں یہ الگ چیز ہے کہ آپ زمین کے اجزاء میں ترکیب اور تحلیل کر کے اس سے کوئی نئی چیز پیدا کر لیں۔ مگر پیدا کرنے میں آپ اسی زمین کے اور اس کے مادوں کے محتاج رہیں گے۔ خود مادے کو اپنے ہاتھ سے بنا لینا اور اس کو ایجاد کر دینا عدم سے وجود میں لے آنا یہ انسان اور بشر کی قدرت کی چیز نہیں ہے سارے انسان جمع ہو جائیں نہیں بنا سکتے۔ جس چیز سے سارے انسان عاجز

آجائیں اس کی نظیر نہ لاسکیں اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

کلامی معجزے کے سامنے اہل کلام کی بے بسی

اسی طرح کلام کے سلسلہ میں ساری دنیا کے فصحاء اور بلغاء عاجز آگئے اور وہ عرب عاجز آگئے جنہوں نے دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی فصاحت و بلاغت کا نمونہ لائے لیکن جب قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں تو ہار مان لی اور کہا کہ ۔

ان فیه لحلاوة وان فیه لتراوة اس کلام میں عجیب قسم کی حلاوۃ اور شیرینی ہے کہ ہم پیدا کرنا چاہیں تو اس کا عشر عشیر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ غرض اس زمانے کے فصحاء اور بلغاء اس چیز کو مان گئے کہ ہم اس کی نظیر لانے سے عاجز ہیں۔

ورنہ آپ خود اندازہ کیجئے کہ جب چیلنج کیا گیا تو جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ کو گھر سے بے گھر کیا، انتہائی ایذاء رسانی کی، لڑائیاں ٹھانیں، مقابلے کئے یہ ساری چیزیں تھیں۔ مگر ایک آیت کی نظیر لا کر پیش کر دی ہوتی کسی نے یہ نہیں کیا۔۔۔ پورا قرآن تو بجائے خود ہے کسی ایک آیت کی نظیر نہیں دے سکے۔۔۔ اسی لئے قرآن نے پہلے تو یہ چیلنج کیا کہ ۔

عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

”اس قرآن کا مثل لاؤ“۔

پھر تنزل کر کے کہا ۔

قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ.

”تم کہتے ہو کہ یہ اختراع کردہ کلام ہے تو اس قسم کی اختراع کردہ دس سورتیں تم بھی لاؤ“

پھر اور تنزل کیا اور کہا ۔

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ.

”ایک سورۃ اس جیسی بنا لاؤ“۔

سورۃ یہ بھی قید نہیں لگائی کہ سورۃ بقرہ جیسی سورۃ ہو جو اڑھائی پارے کی ہے۔ آل عمران جیسی سورۃ ہو یہ بھی قید نہیں، اِنَّاۤ اَعْطَیْنٰكَ کی طرح کی چھوٹی سی سورۃ بنا لاؤ۔۔۔ پھر اس سے تنزل کیا اور کہا کہ ۔

فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ.

”اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک بات ہی اس جیسی بنا لاؤ“.

سورت تو بجائے خود ہے۔۔۔

تو اندازہ کیجئے اس قوم کے سامنے جو چیلنج دینے کی عادی تھی اتنے بڑے چیلنج دیئے جائیں وہ دوسرے سارے مقابلے کرے، جتن کرے۔ لیکن کلام کی نظیر نہ پیش کرے تو وہ سمجھتی تھی کہ یہ بشر کی طاقت سے خارج ہے اس قدر فصاحت و بلاغت سے کلام کا بھرا ہوا ہونا یہ صرف اعجاز خداوندی ہے

انسانی صفات کی حد اعجاز

آپ اندازہ کیجئے کہ جتنی بھی انسانی صفات ہیں اور انسانی افعال ہیں ان میں ایک حد ایسی نکلتی ہے کہ وہاں پہنچ کر انسان عاجز ہو جاتا ہے۔ ایک حد تک قادر رہتا ہے پھر ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتا ہے اسی حد سے سمجھا جاتا ہے کہ آگے خدائی حدود ہیں۔۔۔ مثلاً آپ دیکھتے ہیں گویا آپ میں بصر کی طاقت ہے۔ آپ فرلانگ۔ دو فرلانگ یا میل بھر کی چیز دیکھ لیں گے۔ آسمان کے ستارے دیکھ لیں گے۔ لیکن اس کے بعد۔۔۔؟ اس کے بعد نگاہ عاجز ہو گی اور ایک حد نکلے گی جہاں آپ کی نگاہ عاجز ہو جائے گی آپ تحت الثریٰ کو نہیں دیکھ سکتے' صرف سطح کو دیکھ سکتے ہیں آپ کسی چیز کے اندرونی جگر کو اپنی بصر سے نہیں دیکھ سکتے۔ بصر عاجز ہے۔۔۔ بہرحال آپ کی بصر دیکھے گی اسے دیکھنے کی قدرت ہے مگر ایک حد ایسی نکلے گی جہاں آکر عجز کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔۔۔ اس سے آگے خدائی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کو دیکھنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی کی بصر ہے جو دیکھتی ہے۔

آپ میل دو میل یا پچاس میل کی بات سنیں گے۔ آلات کے ذریعے سے آپ مشرق و مغرب کی خبریں سن لیں گے لیکن آسمان کے اندر کی خبریں اور آوازیں بھی آپ سننے لگیں؟ آپ کی سماعت یہاں آکر عاجز ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی سمع و بصر اور تکلم بھی محدود۔ ہر چیز محدود ہے ایک حد کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس حد کے اوپر آپ پہنچ کر آپ اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں اس حد سے باہر خدائی قوتیں ہوتی ہیں۔

یہی صورت کلام کی بھی ہے کہ آپ کرنے کے سلسلہ میں فصیح و بلیغ اور بہترین کلام ریں گے۔ آپ بہترین شاعر بن جائیں گے۔ آپ سے بڑھ کر کوئی اور پیدا ہو گا' وہ آپ سے اچھا کلام کرے گا۔ پھر اس سے اور بڑھ کر پیدا ہو گا جو اور اچھا کلام کرے گا۔ مگر ایک حد ایسی نکلے گی بشر وہاں عجز کا اقرار کرے گا کہ اتنے دقیق معانی کو میں چار الفاظ میں ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

نبی کریم ﷺ افصح العرب والعجم ہیں۔ احادیث میں دقیق سے دقیق مضامین سہل سے سہل تعبیر سے ادا فرمائے گئے ہیں' دوزخ و نار کی کیفیات' جنت کی کیفیات' حشر کی کیفیات اور قبر کے احوال وغیرہ جو خالص کیفیاتی چیزیں ہیں ان کو اگر ادا کیا ہے تو جناب رسول اللہ ﷺ نے سہل الفاظ میں ادا کیا ہے' تعبیر اور عنوان نہایت سہل اور مضامین نہایت دقیق ایک عامی آدمی سمجھے گا تو اپنی بساط کے مطابق سمجھے گا۔ اسی کلام کو ایک حکیم پڑھے تو اس میں سے حکمت کی باتیں نکالے گا' اسی کلام کو ایک عارف باللہ پڑھے تو معرفت کی باتیں نکالے گا۔ تو کلام چھوٹا سا ہے مگر مضامین اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ احادیث کا ذخیرہ آپ کے سامنے ہے ان کی شرح میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ نہیں۔ حدیث ایک ہے۔ ہر عالم نئے سے نئی اس کی شرح کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے ایک عالم ایک پہلو لیتا ہے تو اس پہلو سے بے انتہاء علوم نکلتے چلے آتے ہیں' دوسرا عالم دوسرے پہلو پر غور کرتا ہے تو اس سے بے انتہاء علم نکلتا چلا آتا ہے۔ حدیث ایک ہوتی ہے اس کے اندر سے ہزاروں دقائق اور معانی نکلتے آتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ افصح العرب والعجم ہیں لیکن آپ خود فرماتے ہیں کہ

قرآن کریم کے بارے میں میں بھی عاجز ہوں کہ میں ایسا کلام نہیں لاسکتا۔ کہ خدا ہی کا کلام ہے۔ تو ایک حد ایسی پیدا ہوئی کہ خالق ہی اس تعبیر کے اوپر قادر ہے۔ مخلوق کو قدرت نہیں دی گئی۔ تو تمام صفات میں، سمع، بصر، قدرت اور حیات ہو ان میں جیسے ایک حد اعجاز نکلتی ہے تو کلام میں بھی ایک حد اعجاز ہے اور وہی حد اعجاز معجزہ کہلاتی ہے۔۔۔ تو حضور ﷺ کو قران کریم کا معجزہ دیا گیا ہے۔

اعجاز کلام

قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے ثبوت میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بڑے بڑے دلائل پیش کئے ہیں ہ۔۔۔ موٹی سی ایک بات یہ ہے جو سمجھنے کی ہے۔ ہر شخص اپنے سمجھے گا کہ ہر انسان پر مختلف کیفیات آتی ہیں جس کی کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے اس حالت میں جو وہ کلام کرتا ہے وہی کیفیت اس کے کلام میں ہوتی ہے۔ اگر وہ یوں چاہے کہ اس وقت میرے کلام میں دوسری کیفیت آجائے اسے قدرت نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک شخص غمگین بیٹھا ہوا ہے خدانخواستہ کوئی میت ہو گئی، اس کا قلب غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس وقت وہ جو بھی کلام کرے گا اس میں غم کے اثرات نمایاں ہوں گے اگر وہ یہ چاہے کہ میں اس وقت خوشی کا کلام کروں اسے قدرت نہیں ہوگی۔ اگر وہ تصنع اور بناوٹ کر کے چاہے بھی کہ میں خوشی کا بھرا ہوا کلام کروں ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس پر اس وقت غم کی کیفیت غالب ہے۔ جس چیز کا غلبہ ہوگا، وہی چیز اس کے کلام میں آئے گی۔

اگر ایک شخص پر خوشی ہے اس کے ہاں شادی ہو رہی ہے جب بھی بولے گا۔ اس کے ہر لفظ سے بے ساختہ خوشی ٹپکے گی۔ اگر وہ یوں چاہے کہ میں ایسا کلام کروں جس سے بے انتہا غم ٹپکتا ہو۔ اس کی قدرت میں نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت خوشی سے مغلوب ہے۔ تو ہر کیفیت انسان پر جب آکر غالب ہوتی ہے اس کیفیت کے تحت جب بھی کلام کرے گا تو کلام میں اسی کیفیت کا غلبہ ہوگا۔ ایک کیفیت سامنے آئے گی۔ دوسری مغلوب ہوگی۔

لیکن قرآن کریم کو دیکھا جاتا ہے ایک وقت میں ایک آیت نازل ہوئی اس کی ابتدا میں بے انتہاء جلال خداوندی کا اظہار معلوم ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے جملہ میں بے انتہاء جمال معلوم ہوتا ہے کہ بے انتہاء بشارتیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر جنت کا ذکر ہے تو اسی کے ساتھ دوزخ کا ذکر ہے اور جس وقت ہم پڑھتے ہیں تو یہ کیفیات ہمارے قلوب کے اوپر طاری ہوتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متضاد کیفیات برابر چل رہی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان تو ابن الحال ہے، ہر حال اس پر غالب آتا ہے جیسا حال ہوگا ویسا کلام کرے گا۔۔۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ، پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ۔

نہ خوشی غالب آسکتی ہے نہ غمی خوشی اور غمی اس کی پیدا کردہ ہے۔۔۔ اس لئے جب وہ کلام کریں گے تو اگر چاہیں کہ اس میں خوشی کی کیفیات بھری ہوئی ہوں اس میں پیدا کر دیں گے۔ اگر چاہیں کہ غمی کی کیفیات ہوں تو وہ پیدا کر دیں گے کیونکہ وہ ہر چیز پر ہر وقت قادر ہیں۔۔۔ تو قرآن

کریم کی ایک ایک آیت کے اندر جو لمبی آیت ہو کئی متضاد کیفیات پوری قوت کے ساتھ برابری سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کلام بشر کی حاقت سے خارج ہے بشری کلام نہیں بلکہ اس ذات کا کلام ہے جو ہر چیز کے اوپر غالب ہے اس کی صفات اور اس کی شانیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں جب آدمی پڑھے اور سمجھ بصیرت کے ساتھ پڑھے تو کچھ کیفیات قلب پر مترشح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

معرفت اوصاف متکلم

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کلام میں متکلم کے اثرات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلام کو پڑھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ کسی عالم کا کلام ہے یا جاہل کا؟ شاعر کا ہے یا غیر شاعر کا؟۔۔۔ اس کے کلام کے طرز بیان اور مضامین کو دیکھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا کلام ہے یا ایسے شخص کا جس میں فلاں صفت غالب ہے۔۔۔۔ غرض کلام میں خود متکلم چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اگر متکلم کو دیکھنا ہو اس کا کلام پڑھ لو تو اس کی کیفیت عیاں ہو جائے گی۔

اورنگ زیب کی بیٹی "زیب النساء" یہ بڑی شاعرہ تھی۔ اس کا کلام بہترین ہوتا تھا۔ مشاعرے جب ہوتے تھے تو اس کا کلام بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو ماقل خان جو اورنگ زیب کے زمانے کا بڑا عہدہ دار بھی تھا اور بڑا شاعر بھی تھا۔ اس کی زبان سے کہیں یہ جملہ نکلا کہ کاش میں اس شاعرہ کو کہیں دیکھتا جس کا اتنا اونچا کلام ہے 'اتنی اس میں بلاغت ہے۔

یہ جملہ زیب النساء کو پہنچا۔۔۔ زیب النساء نے اس کا جواب ایک شعر میں دیا۔ اگر تو جھے دیکھنا چاہتا ہے تو دیکھ سکتا ہے۔ میں اس کی تدبیر بتلائے دیتی ہوں۔ اس نے یہ شعر لکھ کر بھیجا کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

میں اپنے کلام میں اس طرح سے چھپی ہوئی ہوں جس طرح سے گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

جو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے 'میں نمایاں ہو جاؤں گی۔۔۔۔ غرض ہر کلام میں متکلم کے اوصاف چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعراء کے کلام کی فصاحت وبلاغت کے درجات آپ اسی طرح سے قائم کرتے ہیں کہ اگر بہت اونچا شعر ہے آپ کہتے ہیں کہ کسی بڑے اونچے شاعر کا ہے۔ اگر معمولی کلام ہے آپ کہتے ہیں کہ ہاں تک بندی ہے۔

ایک بات مجھے یاد آئی کہ ہماری اردو زبان میں ایک محاورہ ہے "آنکھیں چار ہونا" اور یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب محبت کا اشارہ کنایہ کرنا ہوتا۔۔۔ اس محاورے کو استاذ ذوق نے نظم کیا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا

ایک دوسرا شاعر بندواس نے بھی یہی مضمون بیان کیا۔ مگر اس مضمون کو اونچا کر دیا۔

وہ کہتا ہے ۔

دل کی نہیں تقصیر منکڈ آنکھیں ہیں ظالم
یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

یہ ایک ہی بات دو شعروں میں ادا کی گئی مگر جاننے والوں نے جان لیا کہ اس مضمون کو دوسرے شعر میں جس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے وہ بہ نسبت پہلے پیرائے کے بلند پیرایہ ہے۔ تو کلام کے اندر فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے مراتب اور تفاوت فصحاء و بلغاء سمجھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ بہترین کلام ہے اس سے زیادہ بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جب انسانوں کے کلام میں ایسے درجات نکلتے ہیں کہ کہ بعض موقعوں پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سہل ممتنع ہے اس سے آگے اب بہتر نہیں ہو سکتا

متکلم حقیقی

تو اللہ کے کلام میں یہ چیز بدرجہ اولیٰ پائی جانی چاہئے۔ جب وہ کلام کرے تو اس درجے کا بدیع ہو کہ اس سے بہتر نا ممکن ہو۔ انسانی کلام کتنا ہی بدیع ہو مگر اس سے بہتر ممکن تو ہوگا اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بہتر فصیح و بلیغ انسان پیدا ہو جائے۔ لیکن اللہ جو کلام کرے گا یا کلام فرمائے گا اس سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کا نظیر ہے نہ اس کے کلام کا نظیر ہو سکتا ہے نہ اس کے لئے کوئی مثل ہے نہ اس کے کلام کا کوئی مثل ہو سکتا ہے۔ اس لئے فرمادیا گیا کہ ۔

لَا يَاْتُونَ بِمِثْلِه.

اس کے کلام کے مثل کوئی نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ اس کی ذات و صفات کا مثل کوئی موجود نہیں۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ.

”اس کی ذات کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ہے، وہ سمیع اور بصیر ہے“۔

جب ذات بے چوں اور بے چگون ہے اور صفات کی کوئی نظیر نہیں ہے تو پھر افعال کی کوئی نظیر کیسے ہوگی؟ تو صفات میں سے کلام بھی ہے۔ کلام کرنے کا حق تو اللہ ہی کا ہے۔ ہم اور آپ متکلم تو اس کے پرتو سے بن گئے ہیں اگر کلام کا پرتو نہ پڑے تو ہمیں متکلم ہونا نصیب نہیں ہو سکتا۔ سمیع اور بصر اس کی صفت ہے۔ اس کا پرتو پڑا تو ہم بھی سمیع اور بصیر کہلائے۔ موجود حقیقی وہ ہے۔ اس کے وجود کا پرتو پڑ گیا تو ہم موجود کہلانے لگے۔ ورنہ ہم میں کوئی اپنا ذاتی اور اصلی وجود نہیں ہے۔ تو جب ہماری ہر چیز حق تعالیٰ کے پرتو سے ہے، اصل صفات اس کی، ظلی صفات ہماری ہیں، اصل وجود اس کا ظلی وجود ہمارا اصل کلام اس کا ظلی کا ہمارا تو اصل فصاحت و بلاغت اس کی ہوگی ہماری فصاحت و بلاغت ظلی ہوگی۔

غرض جب اصل فصاحت و بلاغت ہمارے اندر ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ ایک کا ظل دوسرے ظل کے مشابہ ہو سکتا ہے۔ اصل کے مشابہ تو جب ہو جب کوئی دوسرا اصل پیدا ہو اور اصل ایک ہے تو اصل کلام ایک ہی رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہ، نے حقیقت میں جیسے افعال نے معجزے ظاہر فرمائے زمین ایک معجزہ ہے، آسمان ایک معجزہ ہے، چاند اور سورج ایک معجزہ کہ جن کی نظیر لانے کی کسی کو قدرت نہیں، تو کلام کا

معجزہ بھی ظاہر فرمایا اور وہ قرآن کریم ہے جس کا مثل ناممکن تھا۔ نہیں لایا گیا اور آج تک نہیں لایا گیا۔

دنیا کی اقوام نے دن رات مقابلے کئے مگر اس جیسا کلام لا کر پیش کر دیں جس میں ویسی ہی معنویت ہو اتنے ہی پہلو بھرے ہو ہوں اتنی ہی جامعیت ہو اور اتنی ہی فصاحت وبلاغت ہو یہ کوئی نہ کر سکا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے یعنی خدا کا کلام ہے بشر کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کریم کی اعجاز نمائی

پھر یہ معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی قرآن کریم نے معجزات بنائے اس واسطے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے سے بڑے بڑے اکابر اولیاء پیدا ہوئے ان اولیاء کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہوئیں تو قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ہاتھ پر معجزہ نمایاں بھی کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ نبی کے ہاتھ پر جو خرق عادت ظاہر ہوتی ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ ولی کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر ہو اسے کرامت کہتے ہیں۔ ابو حنیفہؒ سفیان ثوریؒ وغیرہ یہ اکابر مجتہدین گزرے ہیں یہ انبیاء نہیں تھے مگر نبیوں جیسے کام کئے ایک ایک نے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو ایمان سے رنگا اور ایک ایک خطہ کو ایمان واسلام سے رنگیں بنا دیا۔

صوفیاء کے طبقے پر نگاہ ڈالو۔۔۔ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ کے بارے میں کسی مسلمان کی نہیں بلکہ ایک عیسائی کی شہادت ہے۔ جس کا نام مسٹر آرنلڈ ہے اس نے پریچنگ آف اسلام کتاب لکھی ہے کہ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ کے دست مبارک پر ننانوے لاکھ آدمیوں نے ہندوستان میں اسلام قبول کیا ہے۔ تو ایک فرد نے ننانوے لاکھ کو مسلم بنایا۔۔۔ خود حضرت شیخ کے خلفاء کے ہاتھ جو لوگ اسلام لائے ان کی تعداد الگ ہے۔۔۔ تو ایک شیخ معینؒ۔۔۔ نے وہ کام کیا جو انبیاء نبی اسرائیل کرتے تھے کہ جس خطے میں بیٹھ گئے لاکھوں اور کروڑوں کو باایمان بنایا۔ ایمان کی روشنی پیدا کر دی تو جناب رسول ﷺ کے اس معجزے اور اس پر عمل کی بدولت لوگ ایسے مقامات پر پہنچے ولایت کے ان مرتبوں پر پہنچ جن کے ہاتھوں پر خرق عادت اور کرامتیں ظاہر ہوئیں الہامات ظاہر ہوئے۔

شرائع ظلیہ

یہ جتنے آئمہ مجتہدین ہیں اگر انبیاء علیہم السلام پر اصلی شریعتیں ظاہر ہوئیں تو ان مجتہدین کے قلوب پر ظلی شریعتیں ظاہر ہوئیں۔ یعنی انہوں نے انہی ہی شریعتوں میں سے استنباط کر کے مستقل احکام دیئے۔ انہی شریعتوں میں اجتہاد کر کے احکام نکالے اور کتابوں کی کتابیں بھر دیں۔

یہ کتاب وسنت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ کتاب وسنت کی کلیات میں جو چیزیں چھپی پڑی تھیں۔ مجتہد کے فہم نے ان کو اندر سے نکال کر کے نمایاں کر دیا یہ الہامی چیزیں تھیں۔ حق تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ڈالیں انہوں نے ان کو واضح کر دیا۔

امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ

مجھے امام احمد بن حنبلؒ جو امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں کا واقعہ یاد آیا۔۔۔ استاذ بھی امام ہیں اور شاگرد بھی امام ہیں۔ اور دونوں صاحب مذہب اور صاحب فقہ ہیں۔۔۔ امام شافعیؒ کا فقہ حجاز میں پھیلا اس لئے کہ ان کی ابتداء حجاز میں ہوئی انتہا مصر میں جا کر ہوئی۔ مصر کی اکثریت شوافع کی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ مغربی ممالک کی طرف گئے۔ تو نجد اور یمن کے اندر حنبلیت پھیلی ہوئی ہے۔ لاکھوں انسان فقہ حنبلی پر چل رہے ہیں۔

چونکہ امام شافعیؒ کا آخیر زمانہ مصر میں گزرا ہے اور امام احمدؒ سے ملاقات کئے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ تو امام شافعیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے نام خط لکھا۔

"بہت عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے اور ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مصر آنے کی کوئی صورت بن پڑے تو کوشش کرو مصر آ جاؤ۔ جی چاہتا ہے کہ اخیر عمر میں تمہیں ایک دفعہ اور دیکھ لوں۔۔۔"۔

امام احمدؒ نے جواب لکھا کہ

"میں حاضر ہو رہا ہوں"۔

دن اور تاریخ متعین کر دی کہ میں فلاں تاریخ کو حاضر ہو رہا ہوں۔۔۔ چنانچہ مقررہ وقت پر امام احمد بن حنبلؒ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور اسی تاریخ کو مصر پہنچے جس کا وعدہ لکھا تھا۔ امام شافعیؒ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے۔

جب امام نکلے تو جتنے علماء تھے سب کے سب امام شافعیؒ کے ساتھ چلے۔ علماء جب چلے تو جتنے احکام اور زعماء تھے وہ بھی ساتھ ہوئے۔ حتیٰ کہ بادشاہ وقت بھی استقبال کے لئے آیا ایک بڑا عظیم جتھہ گویا ملک کے اجلہ اور اکابر استقبال کے لئے آئے اور پورے مصر میں خوشی تھی کہ آج امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہے ہیں۔

امام شافعیؒ کی بچیوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کودتی پھرتی ہیں کہ ہمارے ہاں امام وقت مہمان ہونے والا ہے۔۔۔ خدا خدا کر کے امام احمدؒ پہنچے امام احمد شافعی کے ہاں قیام کیا۔

امام شافعیؒ نے کھانا لا کے رکھا۔۔۔ امام شافعیؒ کی مہمان نوازی مشہور اور تاریخی چیز ہے۔ ان کی مہمان نوازی کے عجائبات تاریخ کا حصہ ہیں۔۔۔ غرض امام شافعیؒ نے بہت شغف اور توجہ کے ساتھ مہمان نوازی کی کھانا لا کر رکھا۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کھانا کھانا شروع کیا مگر اس طرح سے کھایا جس طرح کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے اور کافی مقدار میں خوب پیٹ بھر کے کھایا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ معلوم نہیں کتنے وقت کا کھانا نہیں ملا۔۔۔ وہ زمانہ تقویٰ اور طہارت کا ہے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے گھر میں امام شافعی پر اعتراض کیا کہ تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے یہ کیسا امام وقت ہے جو پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے یہ عوام الناس کا کام ہے کہ پیٹ بھر کے کھائیں۔ اتقیاء کا یہ کام نہیں ہے۔ وہ تو سنت کے تابع ہوتے ہیں۔

نبی ﷺ صحابہؓ اور تابعین کی سنت یہ ہے کہ بقدر ضرورت کھالیا۔ لیکن اس طرح سے کہ پیٹ

کے کھانا کہ بہت وقت کا بھوکا ہے یہ شان اتقیاء کی نہیں ہے۔ تو یہ کیسا امام وقت ہے؟

امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا۔۔۔ فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے۔ مگر میں بول یوں نہیں سکتا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میری زبان سے یہ نکلا کہ بھئی کم کھاؤ۔ تو یہ موضع تہمت ہوگا کہ میں شاید اپنی روٹی بچانا چاہتا ہوں۔۔۔ اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں مگر حیرت مجھے بھی ہے کہ احمد بن حنبلؒ میں یہ تغیر کیسے پیدا ہوا؟ کھانے کی طرف اس طرح سے متوجہ کیسے ہوئے؟

رعایت مقام اتقیاء کے کھانے کی شان یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب جہاد میں جاتے تھے تو یہ نہیں تھا کہ سامان رسد کے طور پر وہاں انڈے کیک اور پیسٹریاں پہنچتی تھیں۔ کچھ سوکھے ٹکڑے زنبیلوں میں بھرے ہوئے ہیں بہت بھوک لگی چبا کر کھا لئے۔ کسی کے پاس وہ بھی نہیں کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں وہ کھا لیں۔ یہ بھی نہ ہوا تو بعض کے پاس گٹھلیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں گٹھلیاں منہ میں ڈال لیں گویا نفس کو بہلا دیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں اور نفس سمجھ گیا کہ مجھے میری غذا مل گئی تو غذائیں یہ تھیں اور جو بیس گھنٹے جہاد میں مصروف تھے۔۔۔ یہ روحانی و معنوی قوت ہوتی تھی۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اندازہ کیجئے ایک بادام بھی کوئی غذا ہے۔ شراح لکھتے ہیں کہ وہ خود حضرت شیخ ہیں۔ اپنے کو چھپانے کے لئے ایسے لکھا کہ میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اور حالت یہ تھی کہ ان کے ایک تراجم میں موجود ہے رات کو جب ذکر اللہ کرتے تھے تو اتنی بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ سرائے میں ذکر کرتے تھے دو فرلانگ پر شہر ہے ہر گھر میں اس طرح پر آواز پہنچتی تھی جیسے ہمارے دروازے پر بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں یہ ان کی قوت کی حالت تھی۔ یہ روحانی و معنوی قوت تھی۔

اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں حدیث میں فرمایا کہ دو دو مہینے ایسے گزرتے تھے کہ بیت نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا اسودین پر گزر ہوتا تھا ایک کھجور کھالی ایک کٹورا پانی پی لیا یہ غذا ہوتی تھی اور جب صوم وصال رکھنے پر آئے تو یہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔

بہر حال انبیاء کی شان بھی کھانے پینے کے بارے میں انتہائی تقلیل کی ہے صحابہ اولیاء اور اتقیاء کی شان بھی انتہائی قلت کی ہے۔۔۔ اتقیاء کی یہ نظیریں سامنے تھیں ان کو سامنے رکھ کر ذکیوں نے اعتراض کیا کہ احمد بن حنبلؒ کیسا متقی شخص ہے؟ اور کیسا امام ہے یہ جس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔۔۔؟

امام شافعیؒ سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا اور فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے مگر میں میزبان ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ خیر وہ بات ختم ہو گئی۔

عشاء کا وقت آیا اور امام احمد بن حنبلؒ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لے گئے۔ تو امام

شافعیؒ کی بچیوں نے امام احمد کے لئے بستر لگایا اور لوٹا بھر کر پانی کا رکھا تاکہ رات کو تہجد کے لئے انہیں تو تکلیف نہ ہو۔ لوٹا بھرا بھرایا مل جائے۔ رات کا یہ سب سامان کر کے بچیاں چلی گئیں۔

امام احمدؒ تشریف لائے چارپائی پر لیٹ گئے۔ صبح کی نماز کو جب اٹھ کر گئے۔ بچیاں بستر تہہ کرنے آئیں تو معلوم ہوا لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔۔۔ اب تو ان کے غصہ کا پارہ انتہائی طور پر چڑھ گیا اور انہوں نے امام شافعیؒ کا دامن پکڑ کے کہا کہ یہ تمہارے شاگرد جن کو تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے اور اتقیاء امت میں سے ہیں کیسا متقی ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے؟ اور رات کے اوقات میں نوافل پڑھنے کی اسے توفیق نہ ہو؟ تہجد یہ نہ پڑھے؟ یہ کیسا نئی قسم کا امام ہے۔۔۔ اب امام شافعیؒ سے بھی ضبط نہ ہو سکا آخر احمد بن حنبلؒ کے استاد تھے۔ تو بٹھا کر کہا کہ :

اے احمد بن حنبل! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔ میں کل سے دیکھ رہا ہوں اور صبر کر رہا ہوں تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ میں اس لئے نہیں بولا! میں میزبان تھا۔ میرے اوپر تہمت آتی۔ بہرحال میں نے صبر کیا۔

لیکن اب جب دیکھا کہ رات کو تہجد تک کی توفیق نہیں ہوئی' تو میرے سے نہ رہا گیا۔ تو تمہارے حالات میں یہ تغیر کب سے پیدا ہوا۔۔۔؟ یہ تو افسوس ک حالات ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ ہنسے اور عرض کیا' حضرت! واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔

شان عمل اور شان اجتہاد

فرمایا کیا واقعہ ہے۔۔۔؟

کہا کہ واقعہ یہ ہے آپ کو میرے زیادہ کھانے کے اوپر اعتراض ہوا۔ حقیقۃً میں نے زیادہ کھایا ہے اور کافی کھایا۔ عمر میں کبھی اتنا نہیں کھایا تھا جتنا یہاں کھایا۔۔۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کا دستر خوان بچھا تو اتنی حلال کی کمائی تھی اس کے اوپر آسمان سے انوار و برکات کی بارش تھی' میں نے عالم میں اتنی پاک کمائی نہیں دیکھی۔ میں نے ارادہ کیا جتنا زیادہ سے زیادہ کھا سکوں کھاؤں ممکن ہے پھر ایسی پاک غذا مجھے نصیب نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے زیادہ کھایا چاہے مجھے سات دن روزے رکھنے پڑیں۔ مگر اتنا منور اور بابرکت لقمہ حلال میں نے آج تک عالم میں نہیں دیکھا۔

اور فرمایا اس کھانے کی دو برکتیں میرے اندر نمایاں ہوئیں ایک علمی اور ایک عملی۔۔۔ عملی برکت تو یہ نمایاں ہوئی کہ میں نے آج عشاء کے وضو سے تہجد پڑھی اور صبح کی نماز بھی پڑھی یہ وجہ ہوئی لوٹا استعمال نہ کرنے کی وہ بھرا ہوا رہ گیا۔ میں رات بھر عبادت میں رہا۔

اور علمی برکت یہ پیدا ہوئی کہ قرآن حکیم کی ایک آیت سے فقہ کے سو مسئلے نکالے اور علوم کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔ یہ لقمہ حلال کی غذا کی برکت تھی۔

شرط معرفت

حقیقت یہ ہے کہ نور معرفت غذا سے پیدا ہوتا ہے پہلی شرط یہ ہے کہ لقمہ حلال کا ہو ایمانی وروحانی قوتیں لقمہ حلال کے تابع ہیں۔

انسان کا پیٹ حوض بدن ہے۔ حوض میں جو بھرا جائے گا نلوں اور نالیوں میں بھی وہی آئے گا۔ اگر پیٹ میں پاک غذا ہے تو قلب میں پاک آثار آئیں گے اور دماغ میں بھی اقوال بھی پاک نکلیں گے اور اگر لقمہ حلال نہیں ہے پھر وہی ظلمت اور کدورت ملے ہوئے اقوال وافعال ہوں گے اور ایسی ہی حرکات بھی ہوں گی۔

اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ لقمہ حلال کا اہتمام کرتے تھے کہ ہماری کمائی پاک ہو۔ اس کمائی سے ہی قلب میں نور معرفت پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ قساوت پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے شاہ جی عبداللہ صاحب ان کا نام تھا۔

بے پڑھے لکھے امی محض تھے۔ مگر صاحب نسبت بزرگوں میں تھے انہوں نے اپنے گزر اوقات کا ذریعہ گھاس کھودنا وغیرہ مقرر کرلیا تھا۔ گھاس کھود کر گٹھڑی بیچتے تھے۔ اور گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر کی ہوئی تھی۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے نہ ایک پیسہ زیادہ لیتے تھے۔

اس چھ پیسے کی تقسیم ان کے ہاں کیا تھی۔۔۔؟

دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے۔ ان دو پیسوں میں اس زمانے میں کچھ پائیاں ملتی تھیں تو وہ ایک ایک دو دو بچوں کو، یتیموں کو، بیواؤں کو غریبوں کو وہیں کھڑے کھڑے تقسیم کر دیتے۔۔۔ اور دو پیسے روزانہ کے گھر کا خرچ تھا۔ کچھ تیل لے لیا، کچھ نمک، لکڑی وغیرہ سستا زمانہ تھا تو دو پیسے روز میں گھر والوں کا خرچ ہو تا تھا۔

اور دو پیسے جو بچتے تھے۔ انہیں جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب وہ سات روپے بن جاتے اس رقم سے ہمارے اکابر حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی دعوت کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں۔ یہ فقط عالم ہی نہیں عارف باللہ بلکہ صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ سال بھر ہمیں شاہ جیؒ کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ ان کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا جس دن کھانا کھاتے تھے۔ تو چالیس دن قلب میں نور رہتا تھا اور قلب میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بھی عبادت کرلیں، نوافل پڑھ لیں، تلاوت کرلیں۔ ہر وقت طاعت وعبادت کو جی چاہتا تھا۔ اس اکل حلال کی یہ برکت قلوب میں نمایاں ہوتی تھی۔

سلب توفیق

لقمہ حلال درحقیقت ایسی چیز ہے کہ اسی سے توفیق پیدا ہوتی ہے۔ آج کی بے عملی علمی کے سبب سے نہیں ہے۔ علم تو عام ہوگیا۔ ہر شخص جانتا بوجھتا ہے۔ پھر بھی بد عملی؟ توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے۔ اور توفیق لقمہ حرام یا مشتبہ لقمہ کی وجہ سے سلب ہوتی ہے اکل حلال پورا میسر نہیں ہے۔ بقول غالب کے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لئے کہ مشتبہ غذاؤں نے طبیعت پر بندش عائد کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔۔۔ غرض آج کے گناہوں کا سبب لاعلمی نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت کی قساوت یا ظلمت یا عدم توفیق یا سلب توفیق یہ چیزیں باعث بنتی ہیں۔ اس لئے کہ لقمہ صحیح نہیں رہا۔

میں دیکھا کرتا ہوں' یہاں تو نہیں مگر ادھر اپنے نواح میں دیکھا۔۔۔ یہ جو آج کل شوگر مل ہر جگہ ہیں۔ ہمارے ہاں دیوبند سے لے کر دہلی تک ہر اسٹیشن پر ایک شوگر مل ہے۔ اس کی وجہ سے گنے کی کاشت بڑھ گئی۔ تو گنے ریل گاڑی اور بیل گاڑیوں میں بھر بھر کے جاتے ہیں۔ بعض مل والوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریلیں چلا رکھی ہیں تو وہ کھیتوں میں گھومتی ہیں اور وہاں سے گنا مل میں پہنچاتے ہیں تو مال گاڑی کے ڈبے ہر وقت بھرے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔۔۔ تو میں نے دیکھا کہ مسافر جب اترتے ہیں دیکھتے ہیں کہ مال گاڑی گنوں سے بھری کھڑی ہے تو کوئی بیس گنے کھینچ لایا' کوئی چالیس کوئی پچاس اور کھا رہے ہیں۔ میں حیرت سے دیکھا کرتا ہوں کہ یہ لوگ گویا یوں سمجھ کے کھا رہے ہیں کہ ان کے باپ کا مال ہے۔ انہیں کوئی احساس نہیں کہ یہ غیر کا مال ہے۔ ہمارے لئے اس کا کھانا حلال ہے یا حرام ہے۔ کوئی حس باقی نہیں جیسے جانور' مثلاً بیل جس کھیت میں گھسا' منہ مارتا ہوا چلا گیا' اسے اس کی کیا تمیز کہ میرے مالک کا کھیت ہے یا غیر کا یہی حالت انسانوں کی ہو گئی کہ بس کھانے کی چیز سامنے آنی چاہئے۔ پھر حلال ہو یا حرام۔ بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ! ان کے قلوب کی کیا کیفیات ہوں گی؟ اس قسم کے مال سے سوائے قساوت' ظلمت اور تاریکی کے اور کیا پیدا ہو سکتا ہے۔ لقمہ حرام سے نیکی کا جذبہ نہیں ابھر سکتا۔ نیکی کا جذبہ ہمیشہ لقمہ حلال سے ابھرے گا۔

پچھلے زمانے میں اہل اللہ جب بیعت کرتے تھے' پہلی شرط یہ لگاتے تھے کہ لقمہ حلال بھی میسر ہے یا نہیں؟ اگر تمہاری غذا مشتبہ ہے تو سارا دن بھی ذکر اللہ کرو گے تو قلب کے اوپر آثار نمایاں نہیں ہوں گے۔ غرض لقمہ حلال کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پاک کمائی سے نور معرفت پیدا ہوتا ہے اور پاک کمائی کی طرف جذبہ۔۔۔؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اتباع انبیاء علیہم السلام سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

لقمہ حلال کی قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے فرمایا۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔

ایک دوسرے کا مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ حق کے ساتھ کھاؤ' جائز طریق پر کھاؤ' ناجائز طریق پر مت استعمال کرو۔

یہ چوری' ڈکیتی' رشوت' جو اسی لئے تو ممنوع ہوئیں کہ یہ کمائیں ناجائز ہیں۔ ان کے کھانے سے قلب پر برا اثر پڑے گا' مشتبہ کمائی سے برا اثر پڑے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ۔

میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ یعنی جن مواقع میں صرف ہوتا ہے۔ ان مواقع کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مال کیسے مواقع سے آیا ہوگا۔ اگر پاک جگہ پر خرچ ہو رہا ہے۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ پاک طریق پر کمایا گیا ہے۔۔۔ اگر ناپاک مواقع پر صرف ہو رہا ہے' میں سمجھ لیتا ہوں یقیناً ناجائز طریق پر کمایا گیا ہے' پاک مال کبھی بھی ناپاک جگہ پر خرچ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ناپاک مال پاک جگہ پر نہیں لگ سکتا۔

مشتبہ چندے سے احتراز

دار العلوم دیوبند میں بمبئی کے سیٹھ آئے تھے۔ لکھ پتی لوگوں میں سے تھے' دار العلوم کو دیکھا۔ بہت خوش ہوئے' پسند کیا اور اعلان کیا کہ پچیس ہزار روپیہ بھیجوں گا۔۔۔ تو ہمارے بزرگوں نے اس کے اوپر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا۔۔ جیسے مثلاً یہ ہوتا کہ انہوں نے اعلان کیا اس پر کوئی شکریہ ادا کیا جاتا یا کوئی دعائیہ کلمات کہے جاتے' جس سے ان کا دل بڑھتا۔۔۔ بس چپ ہو کر بیٹھ گئے۔۔۔ تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بے چارے نے تو کتنی جی داری کا ثبوت دیا۔

پچیس ہزار۔۔۔۔ یہ آج سے پینتالیس برس پہلے کی بات ہے پینتالیس برس پہلے پچیس ہزار کی قیمت ایسی ہی ہے جیسے آج اسی ہزار۔۔۔ پھر دینی مدارس میں پچیس ہزار کی رقم آئے تو ان کے مصرف تھوڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے بلحاظ مصارف وہ رقم بہت تھی۔۔۔ تو بجائے ان کا کوئی شکریہ یا دعا وغیرہ کے کلمات خوشی کا کچھ غیر معمولی اظہار ہوتا۔ سارے ہی چپ بیٹھ گئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔۔۔ خیر وہ سیٹھ صاحب اعلان کر کے چلے گئے۔۔۔ ایک مہینہ گزرا' دو مہینے گزرے میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے عرض کیا کہ آپ نے یاد دہانی نہیں فرمائی۔ دار العلوم کو اگر اتنی رقم مل جاتی تو دار العلوم کے بہت سے کام چلتے۔ ایک شخص نے وعدہ کیا اعلان کیا کم سے کم وعدہ کی یاد دہانی فرما دیں میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئے۔۔۔ پھر مجھے حیرت ہوئی کہ اس شخص کو نہ شکریہ نہ دعا دی اور اب بھی یاد دہانی کے لئے کہہ رہا ہوں تو چپ۔۔۔ پھر میں نے کسی دوسرے وقت یاد دہانی کرائی کہ کم سے کم ایک خط تو لکھ دیں کہ بھئی یہ رقم بھیج دیں۔۔۔ اس وقت کچھ منہ بنا کر فرمایا کہ۔

"یہ رقم دار العلوم میں آ نہیں سکتی"۔

میں نے کہا آخر کیوں؟۔۔۔ فرمایا۔

ان کا سارا کام سود سٹے پر چلتا ہے۔ آبکاری کے محکمے میں ان کی ملازمت ہے اور اسی قسم کی ان کی ساری کمائی ہے۔ وہ کمائی یہاں نہیں آئے گی نہ یہاں چلے گی اور نہ انہیں بھیجنے کی توفیق ہوگی۔ ہم کیوں یاد دہانی کرائیں۔۔۔۔ اس وقت میرے ذہن میں آیا کہ ان حضرات کو ہمیشہ ایسی کمائی کا چندہ قبول کرنے سے انکار رہتا تھا۔ جس کو یہ مشتبہ سمجھتے تھے۔۔۔ اور وہ اس بناء پر کہ اگر چندہ صرف کیا گیا تو طلباء پر بھی وہی اثر پڑے گا' ان کے علم میں برکت نہیں رہے گی۔ ان کی معرفت ختم ہو جائے گی۔ اس واسطے گریز کرتے تھے۔

بہرحال اہل اللہ کے ہاں یہ مسئلہ ہمیشہ بہت ہی زیادہ قابل توجہ رہا ہے کہ کمائی مشتبہ نہ ہونی

چاہئے۔ پاک ہونی چاہئے اس لئے کہ اس پر توفیق اور اعمال کا دارومدار ہے۔ تو تقلیل تو بجائے خود ہے کہ حلال میں سے بھی کم سے کم ہو۔ یہ تو خیر بڑوں کی شان ہے۔ لیکن ہم کم سے کم اتنا تو رکھیں کہ کمائی حرام اور مشتبہ نہ ہو۔

شانِ اتقیاء

تو میں نے عرض کیا کہ آج بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب ہیں ہمارے اندر احتیاط باقی نہیں ہے۔ تقویٰ اور طہارت چھوڑ فتویٰ بھی باقی نہیں کہ فتویٰ کے مطابق ہماری کمائیاں صحیح ہوں۔۔۔ سب کو میں نہیں کہتا الاماشاء اللہ ایسے آج بھی موجود ہیں جو برابر اپنی کمائی میں احتیاط کرتے ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ یہ امت خالی نہیں ہوگی۔۔۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ فرمایا کہ ؎

مثل امتی کمثل المطر لا یدری اوله خیر ام اخره۔

میری امت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بارش کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زمین کے لئے بارش کا پہلا قطرہ زیادہ نافع ہوا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ یعنی میری امت میں خیر مشترک ہے۔ کمی اور زیادتی کا فرق رہے گا۔ لیکن خیر سے امت کبھی خالی نہیں ہوگی۔ اس لئے متقیوں سے یہ امت کبھی خالی نہیں ہو سکتی۔۔۔ نبی کریم ﷺ نے وعدہ دیا ہے فرمایا ؎

لاتزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خالفھم ولامن خذلھم حتی یاتی امر اللہ.

میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہے گا جو منصور من اللہ ہوگا' موید من اللہ ہوگا' حق کہتا اور سنتا رہے گا' حق ہی پر عمل کرتا رہے گا۔ اس کے خلاف کرنے والے اس کو گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہاں لفظ طائفة فرمایا یعنی چھوٹی جماعت یہ تو ہوگا کہ وہ کم ہو جائیں گے۔ مگر موجود رہیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ امت میں باقی نہ رہیں گے اسی طرح فرمایا ؎

لاتجتمع امتی علی الضلالة۔

فرمایا میری امت ساری کی ساری مل کر گمراہی پر جمع نہیں ہوگی اہل حق اس میں ضرور باقی رہیں گے اور اس مت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ خدانخواستہ سارے کے سارے (ایسے مشتبہ حرام کمائی والے) ہی ہیں مگر ہاں اکثریت ایسوں کی ہوگئی ہے۔ قلیل طبقہ ہے جو احتیاط برتتا ہے اور تقوی وطہارت کو پیش نظر رکھتا ہے۔۔۔ تو بات اس پر یاد آئی تھی کہ لقمہ حلال سے ہی انسان میں توفیق ہوتی ہے نہ صرف عمل کی بلکہ اس سے علم اور معرفت بھی پیدا ہوتی ہے۔

کمالِ دانشمندی

تو امام شافعیؒ اس وقت خوش ہوئے اور لڑکیوں سے کہا کہ دیکھا تم نے کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے؟ یہ امام کی شان ہے کہ وہ قلیل کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔ کثیر کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔ تو دیندار حقیقی معنی میں وہی ہے کہ اس کو دنیا جہاں بھی ملے وہ اس میں سے اپنے لئے دین پیدا کر لے۔ یہ بدعقلی ہے

کہ آدمی دین کو بھی دنیا بنالے اور دانش مندی یہ ہے کہ دنیا میں سے اپنے حق میں دین اور خیر نکال لے۔

غرض امام شافعیؒ اس پر بہت خوش ہوئے اور پھر فرمایا کہ دیکھو امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے۔ بات اس پر یاد آئی تھی کہ اکل حلال اور قلیل کھانے میں بہر حال ایک نور اور ایک معرفت ہے اور اس سے آدمی چلتا ہے۔

عمل بالقرآن سے انبیاء بنی اسرائیل سے مماثلت

تو قرآن کریم ایک معجزہ ہے' اس پر چل کر لوگ ولی بنے' کامل بنے اور امت اولیاء سے بھر گئی اور ایسے ایسے اولیاء کاملین پیدا ہوئے جو۔

کانبیاء بنی اسرائیل۔

تھے' وہ نبی نہیں تھے' مگر انہوں نے کام ایسے کئے جیسے نبیوں کے ہوتے ہیں۔ نبیوں پر اگر وحی آتی تھی تو ان پر الہام ہوا۔ نبیوں کے ہاتھوں پر اگر معجزے ظاہر ہوئے تو ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔۔۔۔ نبیوں نے اگر اصل شرائع پیش کیں تو انہوں نے شرائع وضعیہ پیش کیں جنہیں اجتہادی شرائع کہتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام سے مماثلت پیدا ہوگئی۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

کانبیاء بنی اسرائیل۔

یہ حدیث گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ مگر اس کے ہم معنی اور بھی حدیثیں ہیں۔ مضمون قدر مشترک کے طور پر ثابت ہے کہ اس امت کے اولیاء' اتقیاء اور علماء کارناموں اور کارگزاری کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کے مثل ہوئے ہیں۔ یہ ان کی ساری چیزیں عمل بالقرآن سے پیدا ہوئی ہیں۔

تو بات اس پر چلی تھی کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزے بناتا بھی ہے۔ یعنی معجزے کی شبیہ چیزیں اولیاء کے ہاتھ پر نمایاں ہوتی ہیں جب وہ عمل با قرآن کرتے ہیں۔ تو قرآن کریم معجزہ ہے جو نبوت کی دلیل ہے۔

علمی معجزے کا امتیاز

اس سے ایک اور بات واضح ہوئی۔۔۔ وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دے دیئے گئے تھے۔ اور حضور ﷺ کی علمی معجزات کے ساتھ ساتھ یہ عملی معجزہ بھی دیا گیا' عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ مگر اس کا علم باقی رہتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ کے عملی معجزات آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ ختم ہوگئے۔ لیکن علمی معجزہ قرآن کریم ہے جو آج تک باقی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے۔ وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے۔ اس لئے

حضور ﷺ کی نبوت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کر دیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

دوامِ کتاب دوامِ نبوت کو مستلزم ہے

موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ آج ان کی نبوت پر ایمان لے آؤ اور دلیل مانگی جائے تو نہ عصاءِ موسیٰ ہے نہ ید بیضاء ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں آج نہ احیاءِ موتی ہے نہ ابرءِ اکمہ وابرص ہے، جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ شعیب علیہ السلام کی نبوت کو پیش کیا جائے تو ان کی نبوت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔۔۔ لیکن اگر نبی کریم ﷺ کی نبوت کو پیش کیا جائے اور دلیل کا مطالبہ ہو تو یہ دلیل موجود ہے، یہ معجزہ کلامی اور علمی ہے۔ جو عالم کے دنیا سے اٹھنے کے بعد ختم نہیں ہوگا بلکہ آج بھی بدستور موجود ہے اس لئے حضور ﷺ کی شریعت بھی ابدی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کہ اس کی دلیل قائم ہے۔۔۔ غرض اور انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں حق ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں سچی ہیں مگر آج ان کے دلائل عالم میں موجود نہیں ہیں لیکن حضور ﷺ کی نبوت کی دلیل آج دنیا میں موجود ہے اس لئے نبوت قائم ہے اور اس کے بارے میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ جائے گا کہ قرآن کی وجہ سے یہ نبوت دائمی اور ابدی ہے اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے تو خاتم الانبیاء ﷺ کی نبوت چونکہ قیامت تک باقی رکھنی تھی اس لئے دلیل نبوت وہ دی گئی جو باقی رہ سکے ختم نہ ہونے پائے۔۔۔ اور وہ ”علمی معجزہ“ ہے۔

معارضۂ قرآن کا عذاب

معجزے کی شان یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی معجزے کے مقابل آئی ہے، جبھی فنا ہو گئی۔۔۔ صالح علیہ السلام سے معجزہ مانگا گیا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال کر دو۔ انہوں نے باذن اللہ اونٹنی نکال کر دکھائی۔ قوم نے اونٹنی کا مقابلہ کیا اور اس کو ختم کیا۔ تو قوم کے اوپر عذاب آیا اور اس کا صفایا کر دیا گیا۔۔۔ غرض جب بھی دنیا میں معجزے کے مقابل کوئی قوم آئی گر گئی۔۔۔ قرآن کریم ایک معجزہ ہے۔۔۔ یہ الگ چیز ہے کہ ہم اپنی سستی یا غفلت سے عمل میں کوتاہی کریں۔۔۔ لیکن خدانخواستہ اگر کوئی قوم مدمقابل آئے گی اور قرآن کے معارض پڑے گی۔ تو یقیناً خسارے میں پڑے گی، یقیناً کسی نہ کسی عذاب میں پڑے گی۔۔۔ وہ عذاب چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو اس امت پر وہ عذاب تو نہیں آئیں گے جو پچھلی امتوں پر آئے ہیں۔۔۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ

> لیس عذاب امتی الخسف والمسخ والرجف ان عذابها القتل والفتن والزلازل۔
>
> ”میری امت کا عذاب یہ نہیں ہے کہ صورتیں مسخ کر دی جائیں۔ جیسے پچھلی امتوں کی گئیں یا پوری امت زمین میں دھنسا دی جائے یہ نہیں ہوگا یا پتھر برسا کر ختم کر دی جائے یہ نہیں ہوگا یہ عذاب ختم کر دیئے گئے“۔

میری امت کا عذاب کیا ہے۔۔۔۔؟

فتنے پھیلیں گے، ایک دوسرے کو مزہ چکھائیں گے، ایک دوسرے کے مدمقابل آئیں گے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ.

فرماتے ہیں! اللہ اس پر قادر ہے کہ اس امت پر اوپر سے عذاب برسادے، نیچے سے عذاب ابھار دے۔۔۔یا ان کے اندر عذاب ڈال دے۔۔۔وہ کیا ہے؟ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا۔۔۔ان میں وہ گروہ بندی پیدا کر دے۔ ایک پارٹی دوسرے کو مزہ چکھاتی رہے، چین سے نہ بیٹھے۔۔۔یہ جبھی ہوگا جب لوگ قرآن "جو معجزہ ہے" کے معارضے پر آئیں گے۔۔ قرآن کریم کو ماننے پر آئیں، اختلافات ختم ہو جاتے ہیں، معارضہ کرنے پر آئیں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ نزاعات کا برا اثر پھر امت ہی کے اوپر پڑتا ہے۔

افتراق امت کے عذاب سے بچنے کا راستہ

اگر اس کو امام مان کر سارے طبقات اس پر جمع ہو جائیں اور اس کی شرح حدیث ہے اس پر جمع ہو جائیں اور آئمہ وعلماء راسخین نے جو جو مسائل اس سے استنباط کئے ہیں اس پر جمع ہو جائیں تو فی الحقیقت قوم کو کوئی گمراہ کرنے والا اور مٹانے والا نہیں ہے۔ اس کی قوت بنی بنائی ہے۔

نبی کریم علیہ السلام فرماتے ہیں ۔

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا بعدی ابدا ان تمسکتم بهما

فرماتے ہیں کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا، اگر تم ان دونوں چیزوں سے تمسک کرتے رہو گے۔ تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے، کبھی مغلوب نہیں ہوگے۔

کتاب اللّٰہ و سنتی۔

اللہ کی کتاب اور میری سنت۔۔۔ یعنی اسوہ اور میرا طریق عمل جب ان دو کو اختیار کر لو گے۔۔۔ تو ان دو کو ثقلین فرمایا گیا۔۔۔ یہ وزنی چیزیں ہیں یہ بہنے والی نہیں ہیں۔ مٹنے والی نہیں ہیں۔

جب طوفان آتا ہے۔۔ اگر آدمی تنکے کا سہارا پکڑے تو تنکا بھی بہہ جائے گا اور آدمی بھی بہہ جائے گا، کوئی درخت بہتا ہوا آ رہا ہے گو بڑا نظر آئے، مگر وہ بھی بہتا ہے، اسے پکڑے گا تو یہ بھی بہہ جائے گا۔۔۔ لیکن اگر آدمی کسی عظیم الشان چٹان کی پناہ لے۔ تو چٹان کو طوفان نہیں ہلا سکتا۔ تو اس شخص کو بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس لئے کہ وہ ثقیل اور وزنی چیز ہے کتاب وسنت کو ثقلین کہا گیا۔ یعنی یہ دو اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹلنے اور ہلنے والی نہیں ہیں۔ انکو کوئی دوسرا نہیں ہلا سکتا۔۔۔ اگر ان دو چیزوں کو ہم مضبوط تھام لیں۔ تو یہ ایسی ثقیل اور وزنی چیزیں ہیں کہ پھر طوفان ہمیں بہا نہیں سکتا۔ یقیناً ہم اپنی جگہ اٹل ہو جائیں گے۔ ایک قوی حجت ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔

اگر ہم عقلی حجت پیش کریں تو جس سے بھی ہم کوئی معقول بات کہیں گے وہ کہے گا میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں میں بھی ایک معقول بات پیش کرتا ہوں۔ ہم طبعی بات پیش کریں گے وہ کہے گا

میرے اندر بھی طبیعت ہے' ہم اپنے مزاج کی بات منوانا چاہیں گے' وہ کہے گا میرے اندر بھی مزاج موجود ہے میری بات آپ کیوں نہ مانیں۔۔۔ لیکن جب آپ ایسی چیز پیش کریں گے جو سب مزاجوں سے بالاتر اور سب طبیعتوں سے اونچی ہو گی اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہیں۔ یہ دو ایسی وزنی اور اٹل چیزیں ہوں گی کہ ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔ تو ایک قوی حجت اللہ نے ہمارے ہاتھ میں عطاء کی ہے۔

اور وہ قرآن وسنت ہے کہ یہ اٹل چیز ہے اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں ہے۔۔۔ بہر حال قرآن کریم معجزہ بھی ہے معجزہ نما بھی ہے' اس پر چل کر آدمی خود معجزہ نما بھی بن سکتا ہے۔ ہزاروں اولیاء بنے' ہزاروں کا ملین تیار ہوئے۔ اسی کتاب وسنت کے عمل نے تیار کئے کہ یہ خود مستقل حجت ہے۔

تو قرآن کریم کو علم کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین علم اس میں ہے' عمل کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین عمل کی کتاب ہے اس کا وظیفہ پڑھو تو وظیفے کی بہترین کتاب ہے اس میں سے حکمت نکالو تو بہترین حکمت کی کتاب ہے آج اس کے علم وحکمت سے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں۔

علوم القرآن

امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے دنیا کی کسی امت نے تصانیف کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہیں کیا جتنا اس امت نے کیا ہے۔ تاتار کی جنگ کے موقع پر تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا ہے تو بغداد میں کتنے کتب خانے تھے یہ تو آپ تاریخ میں دیکھیں' تو تعداد آپ کو معلوم ہو گی۔ صرف ایک کتب خانے کا مورخین حال لکھتے ہیں کہ بغداد کے کنارے پر جو دجلہ دریا بہتا ہے اس کا پل توڑ دیا گیا تھا تاکہ دشمن اندر نہ آسکے۔۔۔ لیکن بہر حال دشمن اندر پہنچ گئے اور بغداد کو فتح کر لیا۔۔۔ پل ٹوٹا ہوا تھا۔۔۔ تاتاریوں کو آنے جانے کی ضرورت تھی دریا گہرا تھا تو مسلمانوں کے ایک کتب خانے کو لے کر اس کی کتابوں سے دریا کو بھرنا شروع کیا پاٹتے پاٹتے اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر برابر آجاسکتی تھیں۔ صرف ایک کتب خانے کی کتابوں کا یہ عالم تھا۔

نیز مورخین لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کی روشنائی سے دھل دھل کر پانی جو بہا ہے تو ایک مہینے تک علماء کو روشنائی لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دریا کا پانی اتنا سیاہ ہو گیا تھا کہ اس سے بے تکلف لکھا جاسکتا تھا۔ تو اندازہ کیجئے جس شہر کے ایک کتب خانہ کا یہ حال ہو اس شہر کے دوسرے کتب خانے کتنے ہوں گے۔ اس ملک میں کتنے ہوں گے۔

اندلس "اسپین" کی حکومت جب تباہ ہوئی ہے تو ایک عیسائی عورت نے اس کی تاریخ لکھی ہے جس کا نام حاضر الاندلس و غاربھا ہے تو اس میں تعصب دکھلایا ہے کہ عیسائیوں نے تعصب میں آکر ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر تباہ کیا جائے۔ اگر یہ کتابیں باقی رہ گئیں۔ تو ان کا عروج پھر ممکن ہے۔ اس لئے ایک مستقل مہم قائم کی گئی کہ ان کتب خانوں کو ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے افراد چنے گئے۔ ایک محکمہ قائم کیا گیا کہ کتب خانوں کو جلا دیا جائے یا دریا برد کیا جائے اور ضائع کیا جائے۔ اس کے لئے ایک مستقل انچارج آفیسر مقرر ہوا۔۔۔ تو وہ لکھتی ہے کہ کتب خانوں کی کتابیں لائی جاتی

تھیں اور جلائی جاتی تھیں۔ پچاس برس میں جا کر پورے ملک کے کتب خانے ختم ہوئے ہیں' تو اندازہ کیجئے کتنے کتب خانے ہوں گے' ہندوستان کے کتب خانے' آپ کے پاکستان کے کتب خانے' بہت سے قدیم کتب خانے ہیں' جن کو کیڑے چاٹ رہے ہیں' پڑھنے والا کوئی نہیں' ہزاروں کتب خانے اب بھی موجود ہیں جو کیڑوں کی نذر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح حجاز کے کتب خانے' نیز مصر کے کتب خانے' مصری حکومت چھاپتے چھاپتے تنگ آگئی ہے۔ مگر سلف کی کتابیں عشر عشیر بھی نہیں چھپی ہیں' ہزاروں' لاکھوں کی تعداد میں اب بھی باقی ہیں جو چھپ سکتی ہیں۔ یہ اتنا ذخیرہ اس قرآن و سنت ہی کی بدولت تو قائم ہوا۔ یہ علماء نے جو تصانیف کی ہیں یہ قرآن ہی کی تو شرح ہو رہی ہیں۔

کتاب مبین کا خاصہ

تو قرآن و حدیث کا اندازہ کیجئے کہ یہ اسلوب بیان کتنا جامع اور بلیغ ہے کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے ہزاروں کتب خانے جمع ہو گئے۔ اب بھی عشر عشیر ہوا ہے۔ ہزاروں' لاکھوں کتابیں اب بھی باقی ہیں جو شرح طلب ہیں' تو اس سے قرآن کے علم کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علم معجزے کا علم ہے کسی انسان کے علم کی تعبیر میں علم کا اتنا ذخیرہ نہیں ہوتا کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے صدیاں گزر جائیں اور اس کی شرح ختم نہ ہو۔ یہ کتاب مبین ہی کا خاصہ ہے۔ خدائی کتاب ہے اور اسی کے علم ہی کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ علماء' حکماء' عرفاء' اور صوفیاء ہزاروں طبقات کھڑے ہوئے اور اس کی شرح کی اور شرح ہوتی جا رہی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ ؂

لاتنقضي عجائبه۔

قیامت آجائے گی مگر قرآن کریم کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے' برابر چھتے ہی رہے گے اور نکلتے ہی رہیں گے اور آج بھی علماء ہزاروں تصانیف کرتے جا رہے ہیں اور استدلال آیات سے یا احادیث ہی سے ہوتا ہے۔۔۔ تو اندازہ کیجئے ایک ایک آیت مستقل ایک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف تصانیف کی ہیں بلکہ فنون کی بنیاد ڈالی۔ بیسیوں فنون اور علوم ایجاد کئے ہر ہر فن کے اندر پھر لاکھوں کتابیں ہوئیں۔ تو یہ معجزہ نہیں تو کیا ہے؟۔۔۔ کہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے کہ اس کتاب کے اندر سے اتنا علم نکلتا چلا آ رہا ہے کہ لاکھوں کتب خانے بھر گئے' لاکھوں کتابیں بن گئیں اور آج بھی بنتی جا رہی ہیں اور جو نیا مسئلہ یا حادثہ سامنے آتا ہے اس میں سے اس سے اس کا حکم نکلتا چلا آتا ہے یہ سوائے اعجاز کی قوت کے اور کون سی قوت ہے؟

اصلاحی نصاب بہر حال قرآن کریم معجزہ ہے اور مسلمان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ معجزہ انہیں عطاء فرمایا اور اللہ کا ایک تبرک جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے وہ ان کے اندر موجود ہے۔ وہ آج بھی اس کی طرف توجہ کریں تو ان کا علم عمل اور تقویٰ پھر اونچے درجے تک پہنچ سکتا ہے اور اس کے آثار پھر ویسے ہی نمایاں ہو سکتے ہیں جیسا کہ کسی زمانے میں نمایاں ہوئے تھے۔

امام مالکؒ نے فرمایا ؂

لایصلح اخر هذه الامة الابما صلح به اولها۔

اس امت کے اخیر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس چیز سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی ہے۔ تو امت کا اولین طبقہ صحابہ کرامؓ کا ہے۔ ان کی اصلاح کا ضامن یہی قرآن ہوا ہے۔ ان کے کتب خانے میں قرآن کے سوا اور کوئی کتاب نہیں تھی یا قرآن تھا یا اللہ کے رسول کا کلام تھا جو ان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اسی نے ان کی اصلاح کی۔ زمانہ جاہلیت کو تبدیل کیا اس میں انقلاب پیدا کیا۔ انقلاب پیدا کرنے والی یہی کتاب مبین تھی۔۔۔ جو قوم کہ دنیا کی تمام اقوام میں ذلیل سمجھی جاتی تھی حقارت کی نگاہوں سے عربوں کو دیکھا جاتا تھا۔ وہ پچاس برس کے اندر اندر اتنی اونچی بن گئی کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے حکومتوں میں انقلاب پیدا کر دیئے' دنیا میں جہالت کی بجائے علم کو فروغ دیا اور پھیلا دیا۔ یہ انقلاب ان کے اندر اس کتاب مبین ہی نے پیدا کیا۔ اس کے سوا کوئی اور کتاب نہیں تھی اسی کا علم اور اسی کا عمل تھا۔ جس نے انہیں اتنا آگے بڑھایا تو جو چیز ان کی اصلاح کا ذریعہ بنی وہی آج ہماری بھی اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔

مرکز علوم

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ دوسرے علوم اور فنون کی تعلیم چھوڑ دیں۔ تمام علوم و فنون آپ حاصل کریں۔ آپ سائنس' فلسفہ' ہندسہ' ریاضی اور علوم طبعیہ و عقلیہ بھی حاصل کریں۔۔۔ لیکن ہر علم کا کوئی معیار اور مرکز بھی تو ہونا چاہئے جس کے ارد گرد وہ گھومیں۔ سارے علوم کا اگر مرکز آپ دین کو بنالیں گے کہ ہم اس کی ترویج و تبلیغ اور فروغ کے لئے یہ تمام چیزیں حاصل کر رہے ہیں یہ سب چیزیں آپ کے حق میں دین بنتی چلی جائیں گی' دنیا ہی کار آمد نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا اجر و ثواب بھی مرتب ہونا شروع ہو جائے گا۔ اگر دین و کتاب و سنت کو مرکز بنایا جائے اور تمام علوم و فنون اس کے ارد گرد گھمائے جائیں' جن کا مقصد یہ ہو کہ اس علم کو آگے بڑھانا ہے اس کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کرنی ہے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کو صالح بنانا ہے تو ہر علم و فن کام دے گا اور ہر علم و فن باعث اجر اور باعث اصلاح و تقویٰ بنے گا۔

تبریک

بہر حال اس وقت یہ چند کلمات میں نے قرآن کریم کے متعلق اس لئے عرض کئے کہ دار القرآن میں یہ جلسہ ہو رہا ہے تو وہ لوگ مبارک ہیں جنہوں نے دار القرآن قائم کر کے قرآن کے فروغ کا راستہ ڈالا۔ قرآن کے الفاظ کا اور اس کے لب ولہجے کے پہنچانے کا۔۔۔ اور یہی پھر آگے قرآنی علوم کو پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو وہ افراد یقیناً قابل مبارکباد ہیں جنہوں قرآن کی تبلیغ اور ترویج کے لئے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی اور قائم کئے۔ اسی میں ہمارے لئے صلاح اور فلاح ہے۔

اس وقت یہ چند جملے اس ذیل میں ذہن میں آ گئے تھے جو میں نے عرض کئے حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو قرآن کریم پر چلنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

اللّٰھم ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم' اللّٰھم اعذنا من الفتن ما ظهر منها وما بطن.

اللّٰھم اجعل القران اماما لنا و اجعله حجة لنا وارزقنا عمله بفضلك العظيم يارب العالمين

اللّٰھم توفنا مسلمين والحقنا بالصالحين غير خزايا ولا مفتونين وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد واله وصحبه اجمعين برحمتك يا ارحم الراحمين.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خلافت تجوید

یہ الفاظ اور لب ولہجے کی خلافت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے۔ قراء اور مجودین نے اسی لب ولہجے کی حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق آئے۔ مگر لے وہی اختیار کرتے ہیں جو اوپر سے چلی آرہی ہے۔
از حضرت حکیم الاسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً وَّدَاعِياً اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً............... اَمَّابَعْدُ.........

فَقَد قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبَرَّكْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ كَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ)اَوكَمَا قَالَ النَّبِيُّ صلي اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ(.

جوہر دنیا

بزرگان محترم!

یہ دنیا دو چیزوں سے آباد ہے وہی دو چیزیں اس دنیا کا جوہر اور روح ہیں۔ ایک اللہ کا کام اور اللہ کا کلام ایک طرف آپ کے سامنے یہ دنیا کھڑی ہوئی ہے' زمین کا فرش بچھا ہوا ہے' آسمان کا خیمہ اوپر تنا ہوا ہے' آسمان میں سورج اور چاند کے انڈے روشن ہیں۔ جن سے اس دنیا میں روشنی اور جگمگاہٹ ہے۔۔۔ مختلف قسم کی جاندار اور بے جان مخلوق اس میں آباد ہے اور بس رہی ہے۔۔۔ یہ سب چیزیں اللہ کا کام ہیں۔ یہ اس کی صنعت وصنائی اور کاریگری ہے جو آپ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔۔۔ یہ سب چیزیں فی الحقیقت اللہ کے انعامات اور اس کے تبرکات ہیں۔ سورج اور چاند بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے' زمین اور آسمان بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے۔۔۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئی۔ اللہ کے پیدا کئے ہوئے سے پیدا ہوئی ہے' لیکن خدا کے اندر سے نکل کر نہیں آئی اس نے ایک معدوم شے کی وجود دیا' تخلیق کی' پیدا کیا اور نمایاں فرمادیا تو اس کی ایجاد

سے ہی یہ ساری چیزیں آپکے سامنے موجود ہیں۔

امتیازی عطیہ لیکن وہ تبرک اور عطیہ جو اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے اس کے باطن سے نکل کر ظاہر ہوا اور آپ کے سامنے آیا وہ اللہ کا کلام ہے۔۔۔ تو یہ ساری چیزیں مخلوق کہلائیں گی۔ لیکن کلام مخلوق نہیں ہو سکتا۔۔۔ جب آپ کوئی چیز بناتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ چیز بنائی‘ میں نے عمارت بنائی‘ چارپائی‘ بنائی‘ برتن بنایا۔۔۔ لیکن جب کلام کرتے ہیں تو یوں نہیں کہا کرتے کہ میں نے اپنے کلام کو بنایا یا میں نے اپنے کلام کو پیدا کیا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کلام کیا۔ تو کلام متکلم کے اندر سے سرزد ہوتا ہے‘ صادر ہوتا ہے۔ بنایا نہیں جاتا۔ باہر کی چیز بنائی جاتی ہے۔ جس کو وجود دیا جاتا ہے تو یہ زمین اور آسمان اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے‘ اس کے پیدا کیے سے پیدا ہو گئے اور نمایاں ہو گئے۔۔۔ لیکن کلام خداوندی خود اس کی ذات میں سے نکلا ہے اور نکل کر ہمارے سامنے آیا تو سب سے بڑا تبرک اور عطیہ جو بلاواسطہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا‘ وہ آج مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔

امتیاز مسلم تو یہ ایک مسلمانوں کا امتیاز اور خوش قسمتی ہے کہ براہ راست عطیہ خداوندی اور تبرک الٰہی ان کے ہاتھ کے اندر موجود ہے۔ اللہ کے اندر سے نکلا اور ان کے اندر داخل ہو گیا۔۔۔ اسی واسطے حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تبرك بالقران فانه كلام الله و خرج منه.

”قرآن سے برکت حاصل کرو‘ اس لئے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے“۔

کلام خداوندی۔۔۔ یوں تورات بھی ہے‘ انجیل اور زبور بھی ہے۔۔۔ لیکن حقیقی معنی میں کلام وہ ہوتا ہے جس سے تکلم کیا جائے اور بولا جائے۔ تورات حق تعالیٰ بولے نہیں بلکہ الواح لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں۔۔۔ اسی طرح انجیل بھی کلام خداوندی ہے مگر اس کا تکلم واقع نہیں ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر اس کا الہام کر دیا گیا۔ الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں۔ مضمون حق تعالیٰ کا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مبارک الفاظ میں اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی طرح سے زبور کے ساتھ بھی تکلم واقع نہیں ہوا۔

امتیازی کتاب قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ نے اس کا تکلم کیا‘ اسے پڑھ کر سنایا۔۔۔ اس واسطے قرآن کریم میں قرات کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی‘ تلاوت کی نسبت بھی اپنی طرف کی اور تکلم کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ فرمایا گیا:

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ

''جب ہم قرآن کریم کی قرات کریں تو اے رسول ﷺ! سنتے رہو اور اس کی پیروی کرو''

کہیں فرمایا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ.

''اور ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے اور ہم ہی اس کے حافظ اور نگہبان ہیں''۔

تو حافظ بھی وہ ہیں، قاری بھی وہ ہیں اور تلاوت کرنے والے بھی وہ ہیں تو یہ خصوصیت قرآن کریم کی ہے کہ اس کی تلاوت بھی اللہ کی طرف سے واقع ہوئی اس کا تکلم بھی ان کی طرف سے واقع ہوا اس کی قرات بھی ان کی طرف سے واقع ہوئی۔

صورت سرمدی کلام کے لئے بہر حال کچھ آواز کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ۔

كيف ياتيك الوحي يا رسول الله؟

''یا رسول اللہ ﷺ! آپ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ کیا کیفیت ہوتی ہے؟''۔

تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ياتيني مثل صلصلة الجرس.

میرے اوپر وحی اس طرح سے آتی ہے جیسے گھنٹہ بجا کر جب چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس میں ایک قسم کی گونج ہوتی ہے کئی منٹ تک اس کی آواز آتی رہتی ہے، میں ایسی ایک گونج دار سنتا ہوں۔۔۔ کہیں یہ فرمایا۔۔۔ جیسے پتھر کے اوپر اگر ایک لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے کھینچا جائے تو ایک مسلسل جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے، میں اس قسم کی آواز سنتا ہوں جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں کسی قسم کی صوت اور آواز کا بھی دخل ہے اگرچہ اس کی کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ مگر بہر حال تکلم کے لئے صورت ہوتی ہے تو صوت سرمدی کے ساتھ قرآن کریم سنایا گیا۔

عظمت کلام جبرئیل علیہ السلام نے اس کلام کو سنا۔۔۔ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ وحی فرماتے تو اس کی ہیبت اور عظمت سے تمام ملائکہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے خود جبرئیل علیہ السلام پر بھی اس کی ہیبت و عظمت اور جلال سے غشی طاری ہوتی تھی۔۔۔ سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام افاقہ پاتے تھے اس کے بعد دوسرے ہوش میں آتے تھے تو ملائکہ پوچھتے تھے:

ماذا قال ربنا؟

"کیا فرمایا ہمارے پروردگار نے؟"

قال الحق وهو العلي الكبير۔

کہتے ہیں "حق فرمایا اور وہ علی وکبیر ہے"۔

خلافت تجوید و قرات

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو کلام جبریل علیہ السلام سنتے تھے اس سماع کی ہیبت سے ہی غشی طاری ہوتی تھی تو تکلم کے ساتھ صورت اور آواز واقع ہوتی ہے جب آواز عظیم اور ہیبت ناک ہوتی ہے تو اس کی ہیبت سے ضروری ہے کہ غشی طاری ہوتی ہے۔۔۔ اگر گرج زور سے ہو جائے تو یقیناً دل دہل جاتے ہیں اور بعض دفعہ آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے آدمی تو آدمی۔۔۔ آواز جب زوردار آتی ہے تو اس سے پہاڑ تک شق ہو جاتے ہیں عمارتیں گر جاتی ہیں مکانات گر پڑتے ہیں۔۔۔ تو قرآن کریم کی آواز جب سنائی دیتی تھی تو ملائکہ جیسی طاقت ور مخلوق بھی ہیبت زدہ ہو کر بے ہوش ہو جاتی تھی۔۔۔

بہرحال قرآن کریم کی تلاوت واقع ہوئی اور تکلم واقع ہوا اور کوئی خاص قسم کی آواز بھی تھی جس سے تکلم ہوتا تھا۔ جس کو ملائکہ سنتے تھے اور بعض اوقات نبی کریم ﷺ نے بھی سنا۔۔۔ تو قرآن کریم میں ایک طرف الفاظ ہیں ایک طرف اس کے معنی ہیں اور ایک طرف اس کا تکلم اور لب ولہجہ ہے۔ الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے۔ بعینہٖ آج اس کا ایک ایک لفظ اس کا ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے اور لکھا پڑھا موجود ہے۔ بعض قرآن کریم چھاپے گئے ہیں جن میں رکوعات کی تعداد اور سورتوں کی تعداد حروف کی اور لفظوں کی تعداد اور زیروزبر کی تعداد تک لکھی گئی ہے۔ اس کو حفاظ نے محفوظ کیا۔۔۔ اس کے معانی کی علماء اور فقہاء نے حفاظت کی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قانونی حیثیت دی تھی اس کو علماء نے سمجھا اس کے لب ولہجہ اور طرز ادا کی قراء اور مجودین نے حفاظت کی۔

جناب رسول ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے سنا تو ایک خاص لب ولہجے سے پھر آپ نے تلاوت فرمایا اور اپنے صحابہ کو آپ نے سکھلایا۔ اس میں سے بہت سے قراء اور مجودین نے سنا اور سن کر دوسروں کو سنایا اور سکھلایا۔۔۔ تو قرآن کریم کی طرز ادا کی مجودین نے حفاظت کی۔۔۔ اگر الفاظ میں حفاظ خلفاء خداوندی ہیں اور معانی میں اگر خلفاء الٰہی علماء ہیں تو اصوات اور طرز قرات میں خلفاء ربانی قراء اور مجودین ہیں جنہوں نے طرز ادا کی حفاظت کی۔۔۔ اس کے رسم الخط کی حفاظت کی۔ وہ اسی انداز میں آج بھی لکھا جاتا ہے جس انداز میں قرن اول میں لکھا گیا۔۔۔ مثلاً آپ الرحمٰن لکھیں گے تو یہ لکھنا مکروہ اور ممنوع ہے کہ میم کے ساتھ الف ملا کر "الرحمان" لکھا جائے میم کے ساتھ نون ملا کر لکھیں گے اور میم پر کھڑا زبر دے دیں گے۔ یہ اصل رسم الخط ہے۔ تو اسی طرح پورے رسم الخط کی حفاظت

کی گئی۔ علماء رسم الخط نے اس کے قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک فن کی صورت دی۔ تو پورے ایک طبقے نے اس کی حفاظت کی۔

اس کی حکمتوں کی حفاظت حکماء اسلام نے کی۔۔۔ اسکے اندر تاریخ کے جتنے جملے موجود ہیں' ان کی تفصیلات مورخین نے بیان کیں۔۔۔ اس میں جتنے حقائق موجود ہیں' ان کو صوفیاء کرام نے منضبط کیا۔۔۔ تو قرآن کریم کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے مستقل ایک ایک طبقہ کھڑا ہو گیا۔ الفاظ کے لئے حفاظ' معانی کے لئے علماء' رسم الخط' آواز اور طرز ادا کے لئے قراء اور مجودین' حکم اور مصالح کے لئے حکماء حقائق کے لئے صوفیاء' اور علل واسرار کے لئے فقہاء۔۔۔ تو ایک ایک طبقے نے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی اسی طرح سے قرآن کریم محفوظ ہوا۔

انَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ.

''ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔

امتیازی حفاظت

تو حقیقی حفاظت تو حق تعالیٰ شانہ' کی ہے۔۔۔ لیکن اللہ کی جتنی صفات اور کمالات ہیں' وہ اس دنیا میں بذیل اسباب نمایاں ہوتے ہیں۔۔۔ خلاق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن تخلیق مرد و عورت کے ملنے سے واقع ہوتی ہے تو سبب تخلیق مرد و عورت ہیں اور خالق حق تعالیٰ ہیں۔ ماں باپ کو خالق نہیں کہا جائے گا' سبب تخلیق کہا جائے گا۔ رزاق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن رزق رسانی کا ذریعہ زمین کو بنایا' اس سے غلہ اگتا ہے۔ کاشتکار اس میں محنت کرتا ہے تو کاشتکار ظاہر میں محنت کرتا ہے۔ حقیقت میں کاشتکاری حق تعالیٰ فرماتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا۔

ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ' اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ

''تم زراعت کرتے ہو کہ ہم زراعت کرتے ہیں؟''۔

تم نے بیج ڈال دیا' اس بیج کی منوں مٹی کے نیچے حفاظت کرنا' اس میں سے کونپل نکالنا' کونپل میں مار دے اور جوہر رکھنا' پھر اس کونپل میں دانہ پیدا کرنا' یہ کاشتکار کا کام ہے یا ہمارا کام ہے؟ تو محض دلنہ ڈال دینا یہ کاشت نہیں ہے۔ اس میں سے بنانا' بنا کر درخت نکالنا' درخت میں سے پھل نکالنا' اصل کاشتکاری یہ ہے تو فرماتے ہیں'

ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ' اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ

''تم زارع اور کاشتکار ہو کہ ہم کاشتکار ہیں؟ ہم کھیتی کرتے ہیں کہ تم کرتے ہو؟''۔

اور فرمایا۔

ءَ اَنْتُمْ تخلُقُوْنَهٗ' اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ

تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ نر و مادہ مل گئے۔ رحم مادر میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح سے مخلوق بنائی جا رہی ہے؟ کس ترتیب سے اسے ابھارا جا رہا ہے؟ یہ تو کرنے والا جانتا ہے۔ وہی کرتا ہے' خود اس ماں کو خبر نہیں جس کے پیٹ میں یہ ساری مشینری چل رہی ہے اور کارخانہ چل رہا ہے۔۔۔ تو اس اندھیری کوٹھڑی میں پانی کے اوپر نقاشی کرنا یہ اسی صانع حکیم کا کام ہے جس کی قدرت لامحدود ہے۔۔ اسی طرح سے کلام کو تکلم کرنا' فرمایا تم تکلم کرتے ہو' ظاہر میں تم ہو مگر حقیقت میں کلام ہمارا ہوتا ہے۔ حفاظت بظاہر تم کر رہے ہو مگر حقیقت میں ہماری حفاظت ہے۔ ظاہر میں تم قاری ہو مگر حقیقت میں ہم قاری ہیں جو قرآن کریم کی قرات کر رہے ہیں۔ تو حفاظت خداوندی بذیل اسباب نمایاں ہو رہی ہے۔

آج کے دور میں جب کہ قرآن کریم کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہے یعنی سو میں سے ایک دو کی ہے۔ مجموعی طور پر قوم متوجہ نہیں ہے جیسا کہ توجہ کا حق ہے قرآن کی تعلیم پر کوئی مادی وعدہ نہیں ہے کہ آپ نے اگر قرآن پڑھ لیا تو آپ کو کوئی بڑا عہدہ مل جائے گا یا قرآن پڑھ لیا تو چند لاکھ روپے آپ کو مل جائیں گے یا کوئی جاگیر آپ کو مل جائے گی؟ کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں۔۔۔ اس کے باوجود یہ دار العلوم کس طرح سے قائم ہیں؟ یہ حافظ خانے کس طرح سے قائم ہیں؟ ہزاروں آدمی کیوں چلے آ رہے ہیں؟ یہ محض قرآن کا معجزہ ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور دلوں پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ آؤ پڑھو اور پڑھاؤ بظاہر اس میں کوئی دنیوی مفاد نہیں ہے پھر بھی آنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی حفاظت خداوندی ہے کہ دلوں میں ڈالا جا رہا ہے۔ وہ آ رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں اور قرآن کی حفاظت ہو رہی ہے۔

پھر حفاظت بھی چھوٹے بچوں سے کرائی جا رہی ہے۔ عموماً قرآن کریم پڑھنے والے چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں۔۔۔۔ بڑے آدمی اگر پڑھتے تو یہ تہمت آسکتی تھی کہ وہ حفاظت قرآن کی غرض سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی طرف حفاظت منسوب ہوتی کہ اگر یہ عقلاء اور بڑے بوڑھے متوجہ نہ ہوتے تو قرآن محفوظ نہ ہو سکتا۔ تو وہ اگر حفاظت کرتے تو ان کے ارادے کی طرف نسبت ہوتی کہ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت کی ہے۔۔۔ لیکن بچوں سے حفاظت کرائی جا رہی ہے۔ جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے؟ اور حفاظت ہو رہی ہے تاکہ اس کی حفاظت کی نسبت خالص اللہ کی طرف ہو کہ وہ حفاظت کرنے والے ہیں' بچے حفاظت کرنے والے نہیں ہیں۔ تو بڑوں کے ذریعے حفاظت ہوتی تو حفاظت کی نسبت ان کی طرف ہوتی جس سے تہمت آتی۔۔۔ اس لئے عادت اللہ یوں چلی کہ چھوٹے بچے پانچ پانچ' چھ چھ اور سات سات برس کے جن سینوں کے اندر قرآن کریم محفوظ ہے تاکہ یہ حفاظت براہ راست اللہ کی حفاظت سمجھی جائے' بہر حال فرمایا گیا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ.

''ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔

تو حقیقی حفاظت حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہو رہی ہے۔

حفاظت بطریق حفظ

اور اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے ایک ایک مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے حفاظت کی۔۔۔ تو یہ قراء اور مجودین بھی فی الحقیقت قرات کے اندر خلفاء نداوندی ہیں۔۔۔ ان کی سند بھی جا کر اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچتی ہے۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہر چیز استناد کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم ہے' حدیث ہے' فقہ ہے اصول فقہ ہے۔ سب چیزیں سند کے ساتھ ہیں۔ حدیث کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک ٹکڑے کی سند ہم سے لے کر نبی کریم ﷺ تک پہنچتی ہے۔ ایک ذرا سا جملہ آپ روایت کریں گے اس کی سند نبی کریم ﷺ تک پہنچ جائے گی۔ محدثین نے حدیث کے راویوں میں سے چار لاکھ راویوں کی تاریخ مدون کر دی۔ ان کا کیریکٹر ان کا کردار' ان کا حافظہ' ان کا ضبط ان کی عدالت اور ان کے نام و نسب محفوظ کر دیئے کہ یہ راویان حدیث ہیں۔

اسی طرح سے قرآن کریم کی حفاظت سند کے ساتھ کی گئی ہے۔۔۔ یہ جتنے قراء اور مجودین ہیں' ان کو سند دی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے خود مولانا قاری عبدالوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کریم پڑھا اور تجوید کے ساتھ پڑھا تو اس کی سند میرے پاس محفوظ ہے۔۔۔ تو مجھے قاری عبدالوحید صاحب نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبدالرحمٰن صاحب الٰہ آبادی نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبداللہ صاحب مکی نے پڑھایا' ان کو قاری ابراہیم رشید مصری نے پڑھایا اور پھر آگے ان کے استاد' یہاں نبی کریم ﷺ تک سند پہنچ گئی اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے اسکو بواسطہ جبرئیل حق تعالیٰ سے حاصل کیا اور جبرئیل کہتے ہیں کہ میں نے براہ راست حق تعالیٰ سے سنا۔ تو ایک قاری کی سند اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو جس طرح سے قرآن کریم کے الفاظ کی سند محفوظ ہے اسی طرح سے اس کے لب و لہجے کی سند بھی محفوظ ہے اس کے معانی اور علوم کی سند بھی محفوظ ہے اس کے کلام کے جتنے پہلو ہیں وہ سب سند کے ساتھ محفوظ ہیں' ایک ایک نقطہ تک اس کا حفاظت کیا گیا ہے۔ تو فرمایا۔

اناَّ نَحنُ نَزَّلنَا الذِکر و انِاَّ لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ.

''ہم نے اس کو نازل کیا' ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔

تو حفاظت کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ زبان سے پڑھا جائے یا لکھا جائے تو حق تعالیٰ کی طرف سے تکلم بھی واقع ہوا اور لکھا بھی گیا۔

حفاظت بطریق کتابت

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم سب سے پہلے لوح محفوظ کے اوپر لکھا گیا ہے۔ جیسا کاتب ہے ویسی ہی اس کی کتابت ہے۔ ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔۔۔ بعض سیر کی روایتوں میں ہے کہ لوح محفوظ میں قرآن کریم لکھا گیا اور اس کا ایک ایک حرف کوہ قاف کے برابر ہے۔ تو جیسا اس کا لکھنے والا ہے ویسے اس کے حروف ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے لوح محفوظ کو دیکھ کر قرآن حفظ کیا۔۔۔ پھر اسی قرآن کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا یہ گویا ان پر انعام کیا گیا۔ تو اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر اور لوح محفوظ میں بھی درج ہے اور جبریل علیہ السلام کے قلب میں درج کیا گیا۔۔۔ اس کے بعد میں پھر بیت العزت میں قرآن اتارا گیا۔ یہ آسمان اول کے اوپر یعنی آسمان دنیا میں ایک مقام ہے۔ پورا قرآن آسمان دنیا کے اوپر بیت العزت میں اتار دیا گیا۔ اور وہاں سے پھر تئیس برس میں رفتہ رفتہ نبی کریم ﷺ کے اوپر نازل ہوا۔ ایک ایک آیت' دو دو آیت حسب موقع حسب واقعہ اترتی گئی۔۔۔ تو گویا اللہ سے چل کر لوح محفوظ تک آیا پھر جبرئیل تک آیا' پھر بیت العزت میں آیا' پھر نبی کریم ﷺ تک پہنچا۔

حفاظت بطریق تواتر

اور نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پڑھایا' صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تابعین کو پڑھایا۔ تو قرآن کریم میں تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ ایک تو ضابطے کا تواتر ہوتا ہے حدیث متواتر اس کو کہتے ہیں جس میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے چلے آرہے اور اخیر تک تین کا عدد محفوظ رہے۔ بہر حال تین ہوں یا تین سے زیادہ۔ یہ اعلیٰ ترین تواتر سمجھا جاتا ہے۔۔۔ لیکن قرآن کریم میں تین تین کا نہیں بلکہ ہزاروں ہزار کا ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں حافظ رہے۔ ہر قرن کے اندر ایک طبقے نے دوسرے طبقے سے سنا' دوسرے نے تیسرے سے سنا۔ اس طرح سے سند چلی

صحیفہ بالدیانت کتاب

تو مروی عنہ جس سے روایت کی گئی وہ حق تعالیٰ شانہ' ہیں' راوی اول جو جبریل علیہ السلام ہیں۔ پھر حفاظت کے ساتھ جناب نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر اس کو اتارا گیا۔۔۔ جس کو ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا:۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ.

"یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اس کو لے کر روح الامین نازل ہوئے اور قلب محمد کے اوپر لے کر آئے"۔

حق تعالیٰ شانہ' کی صفت اس کے اسماء میں سے امین ہے کہ وہ امانت والا ہے۔ حضرت جبریل

کی صفت روح الامین' وہ خود امانت والے اور نبی کریم ﷺ کی صفت محمد الامین ہے کہ امانت والے ۔۔۔ اور یہ امانت کا لفظ وہ تھا جس کو اپنوں نے ہی نہیں بلکہ غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ نبوت سے پہلے تمام کفار مکہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ آتے تو کہتے ۔

جاء محمدن الامین

"امانت والا آ گیا"۔

تو کلام امین سے چلا' امین کے قلب پر اترا۔ تو امانت کے ساتھ اوپر سے نیچے تک پہنچ گیا۔ سند میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ راوی اور مروی عنہ پوری عدالت لئے ہوئے ہوں' پورا ضبط لئے ہوئے ہوں پوری امانت داری کے ساتھ پہنچائیں۔۔۔ تو اللہ سے بڑھ کر امانت والا کون ہو سکتا ہے اور جبرئیل علیہ السلام سے بڑھ کر امین کون ہو سکتا ہے؟ اور خاتم الانبیاء سے بڑھ کر انسانوں میں امانت والا کون ہو سکتا ہے؟ تو تین امینوں کے اندر یہ کلام یہ رہا پھر سند کا سلسلہ چل نکلا۔

سند قرآن پر از روئے قرآن بحث

اس واسطے ایک جگہ قرآن کریم میں اس کی سند بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ محدثین کوئی حدیث بیان کریں تو راویوں کے اوپر نقد تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کے راوی کیسے ہیں پہنچانے والے کیسے ہیں جس درجہ کا راوی ہوگا اسی درجے کی روایت ہوگی۔۔۔ تو ایک سورۃ میں مستقل طور پر قرآن کریم کی سند پر بحث کی گئی ہے۔ فرمایا گیا۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ

گویا راوی اول جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس لئے ان کا وصف بیان کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ

"یہ کہا ہوا ہے ایک رسول کا جو کریم ہے"۔۔۔ تو لفظ "رسول" سے تعبیر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول کس کے ہیں؟ اللہ ہی کے رسول ہیں اللہ تعبیر فرما رہے ہیں۔۔۔ ہر شخص اپنا رسول اور قاصد اسے بناتا ہے جس پر پورا اطمینان ہو۔ اگر ذرا بھی بے اعتمادی ہو اسے قاصد نہیں بنایا جا سکتا۔ غیر معمولی باتوں پر اسے قاصد بناتے ہیں جس پر پورا اطمینان ہو' وہ دوستوں میں شمار ہوتا ہو' دشمن اور بدخواہ نہ ہو۔ سچا ہو' امانت دار ہو۔ تو اول تو لفظ رسول سے حضرت جبریل کی تعریف کی گئی کہ وہ ہمارے رسول ہیں۔ رسالت خود ایک بزرگی اور برگزیدگی کی چیز ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ رسول بھی کیسے ہیں۔۔۔؟ کریم ہیں۔

جن کے اخلاق میں کرم داخل ہے۔ ان کی عادت میں کرم داخل ہے۔ تو رسول بھی ہیں اور کریم بھی ہیں۔ کریم النفس ان کا جوہر ہے تو دو لفظ فرمائے گئے ایک رسول اور ایک کریم جس سے گویا

جبریل علیہ السلام کی شان واضح کی گئی۔

لیکن یہ سوال ہو سکتا تھا ایک شخص رسول بھی ہے' کریم بھی ہے' نیک نفس ہے۔ بلکہ نیک نیت ہے۔۔۔ مگر اتنا کمزور ہے کہ اگر کلام لے کر آئے تو کسی نے دباؤ ڈالا' تو ممکن ہے کہ دباؤ میں بات بدل ڈالے' دباؤ میں آکر مرعوب ہو جائے۔ نیک نیت بھی ہے' امانت دار بھی ہے مگر دل کا کمزور ہے۔ سچی بات کہنے لگا تھا مگر دوسرے نے تلوار دکھلائی یہ کیا کہتا؟ دباؤ میں آکر اس نے کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ تو بعض دفعہ ایک شخص نیک نیت ہے' کریم النفس بھی ہے۔ مگر بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید دب کر کلام میں تبدیلی کر دے۔۔۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا'

ذِی قُوَّۃٍ ۔۔۔ رسول بھی ہے' کریم بھی ہے' طاقت ور ہے' کمزور اور ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال کر کچھ کا کچھ کہلوائے بہر حال تین باتیں ہوئیں کہ جبریل میں رسالت بھی ہے' کرامت بھی ہے اور قوت بھی ہے جبریل ایسے نہیں ہیں کہ کسی کے دباؤ میں آکر کچھ کہہ دیں۔ سنجیدگی سے کہیں گے' امانت سے کہیں گے اور جو پیغام دیا گیا ہے وہی پہنچائیں گے۔۔۔ لیکن پھر بھی ایک احتمال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص نیک نیت بھی ہے' کریم النفس بھی اور باقوت بھی ہے۔۔۔ لیکن اس دور سے کلام کو سنا اور کچھ کا کچھ سن لیا۔ جب روایت کی تو پوری طرح وہ روایت نہ کر سکا جو اصل متکلم کا کلام تھا۔۔۔ اس نے میل دو میل' فرلانگ دو فرلانگ سے سنا۔ آواز آرہی تھی مگر دور کی آواز تو دور کی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ غلط فہمی ہو جائے آواز پوری طرح کان میں نہ پڑے۔۔۔ یہ ایک احتمال ہو سکتا تھا اس واسطے ایک جملہ اور بڑھایا۔

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ

جبریل عرش والے کے پاس ہی رہتے ہیں کہیں دوری اور بعد نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دور بیٹھ کر کچھ کا کچھ سن لیں۔۔۔ تو قرب بھی انتہائی ہے کہ ان کا مکان اور جگہ اور رتبہ بھی عرش والے کے پاس ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ جبریل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے سدرۃ کے آگے پھر جنتوں کے علاقے شروع ہوتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر سمندر ہے جس کے اوپر عرش عظیم واقع ہے۔ بہر حال کائنات کا دائرہ جس کو مکلّف کہا جاتا ہے وہ آسمانوں کے نیچے نیچے ہے تو آسمان کے اوپر جا کر حضرت جبریل کا مقام ہے۔ اب پرواز اگر ہوتی ہوئی تو کہیں اوپر ہی ہو گی۔ نیچے بھی آتے ہیں اوپر بھی جاتے ہیں۔۔۔ اس لئے فرمایا گیا کہ:۔

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ

"عرش والے ہی کے پاس مقیم ہیں"۔

لہٰذا دوری اور بعد کا کوئی سوال نہیں۔ تو ایک راوی کی یہ شان نکلی کہ اس میں رسالت بھی ہے' کرامت بھی ہے' قوت بھی ہے اور قرب خداوندی بھی ہے۔ بُعد کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

مگر پھر بھی ایک احتمال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص رسول ہے' کریم ہے' طاقت ور ہے' اللہ کا مقرب بھی ہے۔۔۔ لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں۔۔۔ یعنی اس کا منصب کوئی نہیں۔۔۔ منصب والا جب بولتا ہے' اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ ایک بڑے سے بڑا آدمی ہو طاقت ور بھی ہو مگر اس کے پاس کوئی عہدہ نہ ہو' کوئی ضابطے کی بڑائی اس کے پاس نہ ہو' تو اس کے کلام کو توجہ سے نہیں سنا جائے گا۔ اگر میں ایک جملہ بولوں اس کی کوئی وقعت نہیں ہو گی۔۔۔ لیکن اگر کسی ملک کا سربراہ وہی جملہ بولے' تو سیاست کی بساط الٹتی چلی جاتی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ملکوں میں اس سے انقلابات واقع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک صاحب منصب نے کلام کیا۔ تو آدمی نیک بھی ہے' بزرگ بھی ہے' مقرب خداوندی بھی ہے' حقانی بھی ہے۔ مگر منصب دار اور عہدہ دار نہیں' کوئی منصبی رتبہ نہیں ہے' تو اس کا کلام زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتا۔۔۔ تو جبریل علیہ السلام کے متعلق ممکن تھا کہ یہ کہتا کہ بڑے درویش ہیں' بڑے اعلیٰ درجہ کے مقرب ہیں' عرش کے قریب رہتے ہیں' نیک بھی اور بزرگ بھی ہیں' کامل امانت دار ہیں مگر عہدہ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس لئے ان کی ذمہ دارانہ شان نہیں ہے کہ ان کے کلام کو توجہ سے سنا جائے اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا۔

"مُطَاعٍ" سارے ملائکہ کے سردار بھی ہیں اور واجب الاطاعت ہیں' سارے فرشتے ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں' آسمانوں میں ان کی حکومت ہے' سید الملائکہ ہیں تو ظاہر بات ہے جب متکلم' قاصد اور بولنے والا اپنی ذات سے بزرگ ہو' صاحب امانت ہو' باہر سے اس کو رسالت ملی ہوئی ہو اور اوپر سے اتنا بڑا عہدہ دار کہ ساتوں آسمانوں میں اس کی حکمرانی بھی ہو۔ اس کی ذمہ داری اور اس کا منصب بھی ہو' تو اتنی بڑی شخصیت جب پیام پہنچائے گی تو اس میں کوئی وغل وفصل کا خطرہ نہیں ہو سکتا۔ کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا' اس کے بعد پھر فرمایا۔

"ثَمَّ اَمِیْنٍ" ان سارے اوصاف کے اوپر یہ ہے کہ وہ امانت دار ہیں اور اس کی شہادت کون دے رہا ہے؟ اللہ میاں شہادت دے رہے ہیں۔ یہ جبریل کو کون کہہ رہا ہے کہ وہ بزرگ بھی ہیں' مطاع بھی ہیں۔ صاحب قرآن کہہ رہے ہیں۔۔۔ تو حق تعالیٰ ان کی صفت فرما رہے ہیں۔

عظیم شہادت

اگر کسی بڑے آدمی کی بڑائی کوئی چھوٹا آدمی بیان کرنے لگے تو وہ بڑائی نہیں سمجھی جاتی یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعریف خود کرنا چاہتا ہے۔

مادح خورشید مداح خود است

اگر سورج کی کوئی تعریف کرنے لگے تو یہ کہا جائے گا کہ اسے اپنی تعریف منظور ہے' سورج محتاج تعارف نہیں ہے۔ تو کسی بڑے آدمی کا تعارف اگر چھوٹا کرائے' وہ در حقیقت اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ بڑا تو خود ہی متعارف ہے۔ لیکن اگر بڑا تعارف کرائے یہ فی الحقیقت ایک عظیم شہادت ہے۔۔۔ تو

جبریل علیہ السلام کا مثلاً میں تعارف کرانے لگوں۔ تو یہ کہا جائے گا کہ میں اپنے تعارف اور اپنی عزت کا خواہاں ہوں کہ ایک بڑے آدمی کا نام لے رہا ہوں ایک بڑی شخصیت کا نام لے رہا ہوں۔ جبریل علیہ السلام کا تعارف وہ کرائے جو خود جبریل کا خالق ہے جو جبریل کا معبود ہے' وہ فرماتے ہیں کہ جبریل رسول بھی ہیں' کریم بھی ہیں۔ ذی قوت بھی ہیں' امانت دار بھی ہیں' مقرب بارگاہ بھی ہیں' عہدے دار بھی ہیں یعنی سید الملائکہ بھی ہیں۔ ان کو ہم نے قاصد اور پیغمبر بنا کر بھیجا۔۔۔ تو بھیجنے والے حق تعالیٰ جن کا علم لامحدود ہے۔ ان کے علم کی کوئی حد ونہایت نہیں۔ جن کو بھیجا گیا وہ صاحب امانت ہیں اور جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کریم ﷺ جن کو نبوت کا عہدہ دیا گیا کہ عالم بشریت میں اس سے بڑا کوئی با کمال نہیں۔

عظمت سند

اور نبی کریم ﷺ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ جو نبوت کے درجات کا منتہی ہو۔ یعنی نبوت کے سارے مراتب ان کے اوپر آکر ختم ہو جائیں۔ کوئی ایسا درجہ باقی نہ رہے کہ کسی اور شخصیت کی ضرورت پڑے کہ وہ اس درجے کو لے کر سامنے آئے۔ تو خاتم الانبیاء کا یہ مطلب ہے کہ نبوت کے کمالات کے جتنے درجات اور جتنے مراتب ہیں وہ اس ذات میں ہیں وہ اس ذات اقدس پر ختم ہو گئے۔

نبوت کی بنیاد دو ہی چیزوں کے اوپر ہے۔ ایک کمالات علمی اور ایک کمالات اخلاق' جن سے عمل کا سلسلہ چلتا ہے۔ تو علم کے بارے میں تو فرمایا گیا۔

اوتیت علم الاولین والاخرین

''اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم آپ کو عطاء کیے گئے''۔

اور اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

''تو اخلاق بھی خلق عظیم''۔

اور آپ کا علم اتنا جامع کہ اولین و آخرین کا تمام علم آپ کو دے دیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جو ذات بابرکات علم میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو' اخلاق میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو۔ تو اس کی نبوت بھی انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ مکمل ہو گی۔ اس لئے آپ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں۔ یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوت کے مراتب ختم کر دیئے گئے۔۔۔

تو ایسی ذات کے اوپر قرآن نازل ہو جو کمالات بشریہ میں سب سے زیادہ اکمل ہو۔ اور ایسی ذات قرآن کو لے کر آئے جس کی حق تعالیٰ تعریف فرمائیں کہ ایک راوی میں جتنے اوصاف ہو سکتے

ہیں وہ سب ان میں موجود ہوں اور قرآن کریم کو بھیجنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہو جو سارے کمالات کا مصدر اور سر چشمہ ہے۔۔۔ تو اوپر سے لے کر حضور علیہ السلام تک قرآن کریم کی سند اتنی مکمل ہے کہ اس میں کسی نقد و تبصرہ کی گنجائش نہیں۔

تواتر طبقہ

اس کے بعد جناب رسول اللہ علیہ السلام نے اپنے صحابہؓ کو قرآن پڑھایا تو صحابہؓ نے طبقے کے طور پر اس کو لیا۔ یعنی اکے دکے نے حفظ نہیں کیا۔ بلکہ جماعتوں کی جماعتیں اور طبقات کے طبقات حافظ قرآن ہوئے۔ انہوں نے پھر بعد والے طبقات کو حافظ بنایا اور طبقہ در طبقہ حافظ بنتے چلے گئے۔ اسی طرح آج تک تواتر طبقہ کے ساتھ یہ قرآن کریم چلا آرہا ہے کہ ایک ایک اور دو دو یا بیس بیس اور چالیس چالیس نہیں سو سو اور پچاس پچاس نہیں بلکہ ہزاروں ہزار حفاظ ہر قرن میں موجود رہے۔ اوپر کے قرن سے لیتے رہے اور نیچے کے قرن کو دیتے رہے۔ تو جو کلام خداوند اس حفاظت کے ساتھ آئے اور قیامت تک چلتا رہے اس میں کسی دغل و فصل یا تحریف کی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی تحریف کرنے والا تحریف کرے گا۔ چونکہ حفاظت کے سامان کافی ہیں اس لئے اس کی تحریف کھل جائے گی چنانچہ بہت سے محرفین پیدا ہوئے جنہوں نے معنی کے لحاظ سے بھی تحریف کرنا چاہی لیکن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا گیا۔

ہمہ گیر ابدی حفاظت

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر صدی پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ان اللّٰہ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا

ہر صدی کے اوپر اللہ مجدد بھیجے گا۔۔۔ مجدد کے لئے کوئی شخص واحد ہونا ضروری نہیں۔ جماعتیں بھی مجدد بن کر آئی ہیں افراد بھی مجدد بن کر آئے ہیں۔ دین کے جس گوشے میں لوگوں نے خلط واقع کیا اور تنقیص واقع کیا۔ انہوں نے آکر اسی کو کھول دیا۔ تو ہر صدی پر مجددوں کا وعدہ دیا کے خود حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کیف تہلک امتہ انا اولھا والمسیح اخرھا والمہدی وسطھا.

وہ امت کیسے ہلاک ہو جائے گی جس کی ابتداء میں میں ہوں اور اخیر میں مسیح ہیں اور بیچ میں مہدی ہیں۔ تو اول و آخر کی بھی حفاظت بتلائی گئی' ہر صدی کی حفاظت بتلائی گئی۔ پھر ہر صدی کے اندر اندر وعدہ دیا گیا۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین و تاویل الجاھلین.

ہر قرن اور زمانے کے اندر اس علم کو اٹھاتے رہیں گے' اسلاف میں سے اخلاف رشید' نیک خلف' نیک سلف سے لیتے رہیں گے۔ اس علم کو امانت داری کے ساتھ سلف سے خلف قبول کرتے رہیں گے غلو کرنے والے کے غلو کو توڑ دیں گے۔ غلو کرنے والے جو تحریفیں کریں گے اور معانی کے اندر جو تحریف واقع کر دیں گے اس کو مٹائیں گے اور دوروغ بافیوں اور جاہلانہ تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔۔۔ بہر حال اس امت میں وعدہ دیا گیا کہ قیامت تک ایک طبقہ حقانی ضرور باقی رہے گا جو بجنسہٖ قرآن کو مع اس کے لفظ و بیان اور مع اس کی شرح کے دیتا رہے گا تو سلف سے خلف تک پہنچتا رہے گا۔

جہاں یہ کہا گیا کہ امت میں فرقے ہوں گے اور اختلافات رونما ہوں گے وہاں یہ بھی وعدہ دے دیا گیا کہ قیامت تک ایک فرقہ ضرور حق کے اوپر رہے گا اور اپنے ذوق' وجدان اور دلائل سے لوگ سمجھتے رہیں گے کہ یہ فرقہ حقانی ہے۔ اس کے افعال و اعمال اور اس کی علامات بتلاتی رہیں گی کہ یہ حقانی ہے اور لوگ اس کی طرف رجوع کرتے رہیں گے۔ غرض ایک طبقہ ہمیشہ باقی رہے گا جو صحیح مزاج کے ساتھ دین کو باقی رکھے گا اور صحیح ذوق کے ساتھ اس کو قائم رکھے گا۔

لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتی امر اللّٰہ۔

نہ ان کو رسوا کرنے والا رسوا کر سکے گا نہ ذلیل کرنے والا ذلیل کر سکے گا۔ وہ ایک ہی چیز کہتے رہیں گے کہ ۔

ما انا علیہ الیوم واصحابی

جن کے اوپر آج کے دن میں (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابہ ہیں۔۔۔ اسی کے مطابق لفظ اور معنی اور حقائق و کیفیات دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔۔۔ بہر حال یہ وعدہ دیا گیا اور جہاں اختلافات کی خبر دی گئی وہیں ساتھ اس فرقہ حقانی کی بھی خبر دی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ دین خاتم الانبیاء کا دین ہے۔ قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ درجات نبوت آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ اب کوئی درجہ باقی نہیں رہا کہ کسی شخصیت کو لا کر اسے پورا کیا جائے۔

بہر حال قرآن کریم کی حفاظت خداوندی کے سلسلہ میں مجودین کے وعدے الگ ہیں۔ ائمہ ہدایت کے وعدے الگ ہیں' خلفاء کے وعدے الگ ہیں اور خلف عدول کے وعدے الگ ہیں' صلحاء کے وعدے الگ ہیں کہ برابر بھیجے جاتے رہیں گے اور دین کو حقانیت قائم رہے گی۔ تو یہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ.

میں بتلایا گیا کہ جہاں قرآن کریم کے الفاظ محفوظ کئے گئے اور جہاں اس کا رسم الخط محفوظ کیا گیا وہیں اس کے علوم اور معانی بھی محفوظ کئے گئے' وہیں اس کے احکام بھی محفوظ کئے گئے۔۔۔ تو اول سے لے کر آخیر تک اور ظاہر سے لے کر باطن تک قرآن کریم کا ایک ایک پہلو محفوظ ہے اور محفوظ چلا

جائے گا۔

بہر حال یہ بات میں نے اس پر عرض کی کہ دار القرآن قائم کیا گیا' بہر حال یہ بھی ایک خلافت خداوندی ہے۔ یہ الفاظ اور لب ولہجے کی خلافت ہے جو نبی ﷺ سے چلی ہے۔ قرآء اور مجودین نے اسی لب ولہجے کے حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق واقع ہوتا ہے۔

تغنی بالقرآن

اس واسطے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا کہ ؂

من لم یتغن بالقران فلیس منا.

"جو قرآن کریم کے ساتھ تغنی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

مگر تغنی کے معنی یہاں موسیقی کے نہیں ہیں۔ گانے بجانے کے طرز پر پڑھنے کے متعلق دھمکی دی گئی ہے۔ اگر کوئی قرآن کو مزامیر کی صورت سے پڑھے تو اسے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے تو قرآن کا غنا الگ ہے گانے بجانے کا غنا الگ ہے۔ قرآن کریم کی تغنی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ اتنے درد آمیز لہجے کے ساتھ پڑھے کہ قرآن کی کیفیات ایک قلب سے دوسرے قلب میں پہنچنے لگیں۔۔۔ تو وہ ایک خاص درد' ایک خاص لب ولہجہ ہے' قراء اور مجودین وہی اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی سینکڑوں قسم کی موسیقیاں ہیں۔ ہر ملک کی موسیقی الگ ہے لیکن قرآن کا غناوہ ہے کہ کسی موسیقی پہ منطبق نہیں اور کسی موسیقی میں وہ تاثیر نہیں جو اس میں تاثیر ہے اگر صحیح معنی میں کوئی پڑھنے والا موجود ہو اس سے دل کھنچتے ہیں۔ تو فرمایا گیا ؂ من لم یتغن بالقران فلیس منا.

کہیں فرمایا گیا ؂

زینوا القران باصواتکم فان الصوت الحسن یزید القران حسنا.

قرآن کریم کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھو۔ اس سے قرآن کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ تو خوش آوازی میں اوپر والوں کی تقلید کرنی پڑے گی کہ جس انداز کی خوش آوازی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چلی آرہی ہے اور تابعین سے چلی آرہی ہے اور سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہے۔ اسی کے ساتھ تغنی کرو۔ اسی کے ساتھ حسن صورت اختیار کرو۔ تو قرآن کریم کی آواز اور لب ولہجہ اور طرز ادا تک محفوظ کیا گیا۔

تبریک

اور وہ قراء و مجودین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے یہ خلافت خداوندی سنبھالی۔۔۔ تو ایک خلافت علمی ہے' ایک خلافت اخلاقی ہے' ایک خلافت عملی ہے اور یہ خلافت صوتی ہے کہ آواز کے لحاظ سے بھی دنیا میں اللہ کے خلیفہ موجود ہیں کہ اس کے کلام کو اسی کے انداز سے پڑھنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ اسی واسطے مبارک باد کے مستحق ہیں اور دار القرآن بھی مبارکباد کا مستحق ہے جس نے قرآء اور مجودین بنانے کا ایک راستہ پیدا کیا۔ اس فن شریف کو پھیلانے کا ارادہ کیا۔۔۔ بہر حال یہ اس کی برکات میں سے ایک برکت ہے کہ آپ حضرات یہاں جمع ہیں اور قرآن سننے کے لئے جمع ہوئے۔ قرآء اور مجودین کی محفل منعقد ہوئی۔ کلام خداوندی پڑھا گیا۔ تو حقیقت میں یہ کلام اللہ کا ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں جب کفار کے اوپر کنکریاں پھینکی تھیں تو آپ کے بارے میں فرمایا گیا تھا۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔

اے نبی! جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے وہ آپ نہیں پھینک رہے تھے۔ وہ تو ہم پھینک رہے تھے۔ یعنی اعضاء آپ کے تھے ہمارے کمالات کا ظہور ہو رہا تھا اور مظہر آپ بنے ہوئے تھے۔ تو زبانیں ہماری ہیں کلام خدا کا ہے اور انسان مظہر بنا ہوا ہے۔۔۔ اس واسطے یہ ادارہ مستحق مبارکباد ہے جس نے قرآء اور مجودین جمع بھی کئے اور آئندہ پیدا کرنے کا سلسلہ بھی ڈالا۔ حق تعالیٰ شانہ کامیاب فرمائے اور اس ادارے سے بہت سے مجودین پیدا ہوں اور قرآن کریم کے پڑھنے کی اور اس فن تجوید کی اشاعت ہو اور لوگوں کے دلوں میں یہ گھر کرے اور پھر لوگ مائل ہوں اور اس کے علم وعمل کی طرف متوجہ ہوں۔

واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العلمین.

اللّٰھم ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

اللّٰھم اغفرلنا وارحمنا وعافنا واعف عنا واھدنا سبل

السلام واخرجنا من الظلمت الى النور وجنبنا الفواحش ما ظهر

منها ومابطن اللّٰھم وتوفنا مسلمين والحقنا بالصّٰلحين غير خزايا ولا

مفتونين وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وعلى اله

وصحبهٖ اجمعين.

برحمتك يا ارحم الراحمين

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نجوم ہدایت

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم در حقیقت نبوت کا ظل کامل تھے۔ جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالات نبوت پہچانے جاتے تھے۔ اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت اللہ و رسول کے یہاں مرضی و پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طبقہ ہے۔ جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنْ لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآ فَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّنَذِیْراً وَّدَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً.................اَمَّابَعْدُ.........

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ (اَوْکَمَاقَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ)

مقام صحابیت

آفتاب نبوت کی تاثیر و تربیت اور تعلیم و تمرین سے امت کے استفادہ اور منور ہونے کے متفاوت درجات و مراتب کھل جاتے ہیں جن کا معیار آفتاب سے قرب اور بعد ہے یعنی جو اس سے قریب تر ہے وہ اتنا ہی نورانی تر اور متاثر ہے اور جتنا آفتاب سے دور ہے اتنا ہی اس کے فیض سے کم مستفید ہے۔

مثلاً طلوع آفتاب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ اور سب سے پہلے آفتاب کے آثار سے متاثر ہوتی ہے وہ فضا ہے۔ وہ چونکہ خلقتاً اپنی ذات سے شفاف ہے اور ادھر آفتاب کے سامنے بلا واسطہ حاضر

ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ وہ اس کے نور وحرات کا اثر لیتی ہے۔ وہ اس درجہ منور ہوتی ہے کہ باوجود اس کے چمک اٹھنے کے خود اس کی چمک آنکھوں کو نظر نہیں آتی بلکہ آفتاب ہی کی دھوپ اور شعاعیں نظر پڑتی ہیں۔ اگر فضا میں نگاہ اٹھائی جائے تو فضا کا جو حصہ بھی سامنے آئے گا اس میں آفتاب ہی دکھائی دے گا۔ خود فضا کی ہستی نظر نہ پڑے گی۔ تو یا وہ اس کے نور میں اس درجہ مستغرق اور فنا ہو جاتی ہے کہ اس کا اپنا نور کسی کی آنکھ میں نہیں آتا بلکہ آفتاب اس میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا بلا واسطہ دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ فضا اپنی بے حد وسعت کے ساتھ بیچ میں حائل ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب سے استفادہ کی بھی ہے کہ اس کے عالمگیر آثار سے متاثر تو سب ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ متاثر وہ طبقہ ہوتا ہے جو بلا واسطہ اس سے قریب ہو کر نور لیتا ہے اور وہ طبقہ صحاب کرامؓ کا طبقہ ہے جو فضا کی مانند ہے کہ زمین سے بالاتر ہے اور فلک شمس یعنی آسمان نبوت سے فروتر ہے وہ فضا کی طرح خلقی طور پر خود شفاف ہے جو محض اس کے نور ہی کو دکھادینے کی نہیں بلکہ عین آفتاب کو دکھلانے کی کامل استعداد رکھتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آپ نے فرمایا کہ سارے نبیوں کے صحابہ میں میرے صحابہ منتخب کر لئے گئے۔ یا جیسے عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ان کے دل شفاف تھے' ان کا علم گہرا تھا' ان میں تکلفات نہ تھے' انہیں اقامت دین کے لئے پوری امت میں سے چن لیا تھا۔ ان کا نقش قدم واجب الاتباع ہے وغیرہ۔ جس سے حضرات صحابہ کرامؓ کی کمال قابلیت کھلتی ہے جو انہیں انوار نبوت کو جذب کرنے کیلئے عطاء ہوئی تھی۔ پس وہ فطری شفاف اور کمال قرب کے لحاظ سے بمنزلہ فضا کے ہوئے جو شفاف ہے اور ساری دنیا کی نسبت سے آفتاب سے قریب تر بھی ہے کہ بلا واسطہ نور آفتاب جذب کرتی ہے۔ پس انہوں نے ان شفاف سینوں سے اس درجہ آفتاب نبوت کا نور واثر قبول کیا کہ فضا کی طرح سر تاپا نور بن گئے اور جیسا کہ فضا آفتاب سے متصل اور ملحق ہو کر اس درجہ منور ہو جاتی ہے کہ وہ خود نظر نہیں آتی۔ یعنی وہ خود اپنے کو نہیں دکھلاتی بلکہ صرف آفتاب اور اس کی شعاعوں اور چمک دمک ہی کو نمایاں کرتی ہے۔ ایسے ہی صحابہؓ کرام اپنی فطری قابلیتوں کی بناء پر اس درجہ پاک قلوب' عمیق العلم' قلیل التکلف اور بے غل وغش بنا دیئے گئے تھے گویا ان میں خود ان کی کوئی ذاتی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف سنن نبوی ﷺ کے مجسم نمونے بن گئے تھے۔

سنن صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہم

اس لئے حضور ﷺ نے ان کے عقیدہ وعمل کو اپنے عقیدہ وعمل کے ساتھ ختم کر کے انہیں معیار حق فرمایا اور اعلان فرمایا کہ سنن نبوت اور سنن صحابہؓ ایک ہی ہیں جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ صحابہ اکرامؓ کی دینی خصوصیات' خصوصیات نبیؐ تھیں۔ چنانچہ امت کے بہتر (۷۲) فرقوں کے بارے

میں حضور علیہ ﷺ سے یہ سوال کیا گیا کہ ان بہتر (۷۲) میں وہ ناجی فرقہ کونسا ہے؟ تو فرمایا'

مااناعلیہ واصحابی

''جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہؓ ہیں''

گویا اپنے عقیدہ و عمل کے ساتھ انکے عقیدہ و عمل کو اس طرح ملا کر بتایا کہ ان کے عقیدہ و عمل اور حضور علیہ ﷺ کے عقیدہ و عمل کی نوعیت ایک ثابت ہوگئی اور فرقوں کے حق و باطل ہونے کے معیار آپؐ نے خود اپنی بابرکات اور حضرت صحابہؓ کو ٹھہرایا۔

سب وشتم کا انجام

پھر جیسے فضا تک کوئی گندگی نہیں پہنچتی اور پہنچائی بھی جائے تو وہ لوٹ کر پہنچانے والے ہی پر گرتی ہے۔ فضا اس سے گندی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی حضرات صحابہ کرامؓ کا طبقہ جو روحانی فضا کی مانند ہے۔ امت کی تنقیدوں سے بالاتر ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی طبقہ سب وشتم یا گستاخی یا سوء ادب یا جسارت و بے باکی یا ان پر اپنی تنقیدی تحقیر کی گندگی اچھالے گا تو اس کی یہ ناپاکی اسی کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس فضاء شفاف پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ بہرحال حضرات صحابہؓ فضاء قریب کی مانند ہیں کہ انہیں شفافی میں بھی آفتاب سے مناسبت ہے وہ آفتاب نبوت سے نزدیک تر بھی ہیں۔ بلاواسطہ اس سے ملتی بھی ہیں۔ وہ زمین کی کدورتوں سے بالاتر بھی ہیں اور وہ آفتاب کے نور میں فانی بھی ہیں کہ اس نور کی نمائش گاہ بن کر رہ گئے ہیں جن میں اپنی خصوصیت بجز انفعال اور قبول حق کے دوسری نہیں رہ گئی تھی۔

جامع اضداد زندگی

پس صحابہ کرامؓ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور تیز بھی ہے اور پیغمبر علیہ ﷺ سے اقرب تر اور اشبہ تر بھی ہے کہ اس نے نبوت کی زندگی سے متصل رہ کر اس کی شعاعوں کا نور قبول کیا ہے اس لئے یہ زندگی نہ صرف عزیمتوں کی زندگی اور اولعزمانہ زندگی ہے کہ جائزات کی آڑ لئے بغیر عمل کے اعلیٰ ترین حصہ ہی کو اپنالیا جائے اور نفس کی راحت طلبیوں کو خیرباد کہہ کہ عملی مجاہدہ و ریاضت ہی کو زندگی بنالیا جائے بلکہ یہ زندگی جامع اضداد بھی ہے جو کمال اعتدال لئے ہوئے ہے کہ ایک طرف نفس کشی بھی انتہائی اور ساتھ ہی ادب شریعت اور اتباع سنن نبویؐ بھی انتہائی اور ایک طرف طبعی جذبات بھی قائم اور دوسری طرف عقلی دواعی اور ملکیت بھی غالب اس کمال اعتدال و جامعیت کے ساتھ یہ زندگی صحابہ کرامؓ کے سوا امت کے کسی طبقہ کو طبقاتی حیثیت سے نصیب نہیں۔ آحاد و افراد اس زندگی کے حامل نظر پڑیں گے۔ جس میں شرف صحابیت کے سوا سب کچھ ہوگا' لیکن طبقہ کا طبقہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور ہمہ وقت اخلاص و معرفت کی حد کمال کو طے کئے ہوئے ہو۔ طبقہ صحابہؓ کے سوا دوسرا نہیں۔ جنہوں نے گھر بار چھوڑ کر

اس نفس کی خواہشات سے منہ موڑ کر صرف اور صرف فضائے حق کو اپنی زندگی بنایا۔ مرغوبات کو شرعی مطلوبات پر قربان کر دیا۔ موطن طبیعت سے ہجرت کر کے موطن شریعت میں آکر بس گئے اور شرعی مرادوں کی خاطر نفس کی حیلہ جوئیوں اور راحت طلبیوں سے کنارہ کش ہو کر عزم صادق کے ساتھ ہمہ تن مرضیات الٰہی اور سنن نبوی کی پیروی میں مستغرق ہو گئے اور اسی کو اپنی زندگی بنالیا۔ اس جامع اور جامع اضداد زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ یہ کلیۃ تارک دنیا بھی تھے اور رہبانیت سے الگ بھی' دنیا اور دنیا کے جاہ و جلال' دھن دولت' حکومت و سیاست' گھر بار' زمین' جائیداد کے ہجوم میں بھی تھے اور پھر ادائے حقوق میں بے لاگ بھی یہ زن' زر' زمین ان کے تصرف میں بھی تھی اور پھر غالباً ان سب چیزوں سے بے تعلق اور کنارہ کش بھی' درویش کامل بھی ہیں اور قبا شاہی بھی زیب تن ہے۔ حکمران بھی ہیں اور کاسئہ گدائی بھی کندھوں پر ہے۔ ممالک بھی فتح کر رہے ہیں اور فقیری کی خو بھی بدستور قائم ہے۔

یوں بہم کس نے کئے ساغر و سندال دونوں

کامل انسانیت کا طبقہ

انبیاءؑ کی یہی زندگی ہے کہ بشر بھی ہیں اور ملک بھی۔ نہ طبائع کو ترک کرتے ہیں نہ عقل و فراست کے تقاضوں سے ایک انچ ادھر ادھر ہوتے ہیں۔ خالص طبعی جذبات کی پیروی حیوان کا کام ہے اور طبعیات سے کلیۃ باہر رہ کر محض عقل کلی کی پیروی فرشتوں کا کام ہے' لیکن طبعیات کو بحالہ قائم رکھ کر انہیں عقلی شعور کے ساتھ عقل کی ماتحتی میں انجام دینا اور حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ انسان کا کام ہے۔ مگر انسان کامل فرما کر اس کے تقدس و برگزیدگی کو نمایاں کیا گیا۔ اس لئے جس طبقہ کے افعال قویٰ' عقائد' احوال' اقوال سب میں یہ کامل عتدا در رہا ہوا ہو۔ وہی طبقہ کامل انسانیت کا طبقہ کہلائے گا۔ سو طبقاتی حیثیت سے یہ کمال بالذات تو انبیاءؑ میں ہوتا ہے اور بالغرض بحثیت طبقہ ان کے صحابہؓ میں' ان کے بعد طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ صرف انفرادی حیثیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی اس مقام کی نہیں جس پر یہ طبقہ فائز ہوتا ہے۔

ظلّ نبوّت

پس صحابہ کرامؓ در حقیقت نبوت کا ظلّ کامل تھے جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالات نبوت پہچانے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت طبقہ اللہ و رسولؐ کے یہاں مرضی' پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کرامؓ کا طبقہ جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی اور "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہ دستاویز رضا ان کے لئے آسمانی کتاب میں تا قیام قیامت ثبت کر دی گئی۔ کہیں

أُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقوے کے لئے خالص کر دیا ہے ان لوگوں کے

لئے مغفرت واجر عظیم ہے۔

کے ذریعہ ان کے قلوب کی پاکیزگی کی شہادت دی گئی اور کہیں۔

أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللهِ وَنِعْمَةً

اور کہیں۔

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً

فرما کر ان کے اخلاق کی برتری ثابت کی گئی اور کہیں۔

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم

فرما کر ان کے ہر ہر فرد کو پوری امت کا مقتدا بتلایا گیا جس کی پیروی اور پیروی سے حصول ہدایت میں کوئی ادنیٰ کھٹکا نہ ہو۔

مکمل میزان اور متوازن ترازو

کچھ عرصہ ہوا بعض منتسبین دارالعلوم کا ایک خط دربارہ طلب سرٹیفکیٹ احقر کے نام دفتر دارالعلوم میں موصول ہوا۔ جس میں ضمناً مودودی مکتب فکر اور خود اپنے مودودی ہونے کی نوعیت کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا تھا۔ یہ اصلاح طلب نوعیت دیکھ کر حضرت شیخ مولانا مدنیؒ نے بنظر اصلاح انہیں ایک شفقت نامہ تحریر فرمایا جس میں مودودی مکتب خیال کی بعض بنیادی دفعات پر کلام فرماتے ہوئے ان کے اصلاح خیال کی توجہ فرمائی ہے۔ حضرت شیخ مدنیؒ کا یہ ارشاد نامہ سلسلہ عقائد وافکار کے لئے ایک مکمل میزان اور متوازن ترازو کی حیثیت رکھتا ہے جس سے موجودہ زمانے کے حدود سے گزرے ہوئے افکار و خیالات کو عموماً اور مودودی نقطہ نظر کے مزعومات ومعتقدات کو خصوصاً تول کر اس کے حق وباطل کا فیصلہ باآسانی کیا جاسکتا ہے کیونکہ حضرت ممدوحؒ کے اس والا نامہ کا موضوع مودودی لٹریچر کا کوئی فروعی یا جزوی مسئلہ نہیں ہے جسے مودودی صاحب کی شخصی رائے یا ان کے اجتہاد وقیاس کا ثمرہ کہہ کر جماعت کے سر سے بوجھ ہلکا کر لیا جائے۔ جیسا کہ اس قسم کے موقع پر عموماً ایسا ہی کیا جاتا ہے بلکہ ایک اصولی مسئلہ ہے اور وہ بھی دستور جماعت کا بنیادی اصول موضوعہ جو جماعت اور امیر سب کے لئے یکساں حجت اور معیار عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس اگر پوری جماعت دستور کو جو بنام دستور جماعت اسلامی شائع شدہ ہے، تسلیم کرتی ہے۔ (اور ضرور تسلیم کرتی ہے جب کہ جماعت کا وجود اور اس کی تشکیل ہی اس دستور سے ہوئی ہے) تو بلاشبہ دستور کی یہ دفعہ۔

"رسول خدا ﷺ کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی "ذہنی غلامی" میں مبتلا نہ ہو"۔

ساری جماعت کا ایک مسلمہ عقیدہ اور بنیادی اصول ثابت ہوئی۔ اس لئے حضرت شیخؒ کے

مکتوب گرامی میں اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کے اس پر جو شرعی گرفتیں کی گئی ہیں وہ یقیناً پوری جماعت کے ایک ایک فرد پر حجت ہیں اور اس لئے بحیثیت مجموعی جماعت کو گروہی تعصب سے بالاتر ہو کر ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عقائد کا معاملہ دینوی نہیں اخروی ہے جو زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔

دفعہ مذکورہ پر حضرت شیخؒ نے کتاب وسنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے سامنے آنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اس دفعہ کے آنے سے پہلے تنقیح کردوں تاکہ ان حقائق کا جو اس مکتوب کا موضوع ہے سمجھنا آسان ہو جائے۔ اس دفعہ میں مودودی صاحب نے غیر رسول کو معیار حق بنانے اور تنقید سے بالاتر سمجھنے سے روکا ہے۔ مگر یہ ممانعت جب ہی درست ہو سکتی ہے کہ شرعاً کوئی غیر رسول معیار حق وباطل نہ بن سکے اور تنقید سے بالاتر نہ ہو۔ اگر شرعی طور پر کوئی اور بن سکتا ہو تو اسے معیار حق مان لینا اور تنقید سے بالاتر سمجھنا جرم نہیں ہو سکتا۔

کوئی تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ پھر بھی اگر کسی نے از خود کسی کو معیار حق بنالیا اور تنقید سے بالاتر سمجھا تو وہ شرعی مجرم اور ایک شرعی گناہ کا مرتکب ہوگا۔

اس لئے ہمارا کلام مودودی صاحب کے اس نظریہ پر ہوگا کہ غیر رسول معیار حق نہیں بن سکتا اور تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔

اگر اس دفعہ نمبر ۶ کو اس کے ہمہ گیر عموم کے ساتھ اس کے عام الفاظ میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ۔

”رسول خدا ﷺ کے سوا کوئی معیار حق نہیں کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں اور کوئی بھی اس کا مستحق نہیں کہ اس کی ذہنی غلامی کی جائے“۔

تو سوال یہ ہے کہ خود رسول خدا ﷺ ہی کسی کو معیار حق بنادیں یا اس کے معیار حق ہونے کی شہادت دیں یا معیار حق ہونے کا ضابطہ بتادیں کہ اس کی رو سے معیار حق ہونے کی تعیین کر لی جائے تو کیا وہ پھر بھی معیار حق نہ بن سکے گا؟ اگر بن سکے گا تو یہ اصول غلط نکلا کہ ”رسول خدا ﷺ“ کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں ہو سکتا۔ اگر رسول خدا ﷺ کے ارشاد کے باوجود بھی ان کے سوا کوئی معیار حق نہ ہوا تو خود رسول خدا ﷺ کا معیار حق ہونا معاذ اللہ باطل ٹھہر جاتا ہے جب کہ رسول خدا ﷺ کا قول خلاف ہو گیا۔ العیاذ باللہ۔ دونوں صورتوں میں دستور جماعت کی دفعہ نمبر ۶ باطل ہو جاتی ہے۔ ایک صورت میں اس کا منفی پہلو باطل ٹھہرتا ہے کہ رسول خدا ﷺ کے سوا کوئی معیار حق نہیں اور دوسری صورت میں اس کا مثبت پہلو باطل ہو جاتا ہے کہ صرف رسول خدا ﷺ ہی معیار حق ہیں۔ اس ضابطہ سے نکلنے کی آسان صورت اس کے سوا دوسری نہیں کہ ہم رسول خدا ﷺ کے سوا کسی کو بھی ارشاد رسول ﷺ کے مطابق معیار حق اور ناقابل تنقید تسلیم کر لیں۔ کیونکہ رسول خدا

ﷺ بذاتہ معیار حق ہیں اور غیر رسول بادشاد رسول خدا ﷺ معیار حق ہیں۔

صحابہؓ کا معیار حق ہونا منصوص ہے

سوال رہ جاتا ہے تو صرف یہ کہ آیا رسول خدا ﷺ نے کسی کو معیار حق بنایا بھی ہے یا نہیں؟ اور آیا کسی کو تنقید سے بالاتر اور مستحق ذہنی غلامی فرمایا بھی ہے یا نہیں؟

سو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے جن کا نام لے کر معیار حق و باطل قرار دیا' ان پر جرح و تنقید سے روکا اور ذہنوں کو ان کی غلامی کے لئے مستعد فرمایا وہ صحابہ کرام رضوان اللہ کی مقدس جماعت ہے۔ ان کے معیار حق بتلانے ہی کے لئے آپ نے نہایت صاف و صریح اور غیر مبہم ہدایت جاری فرمائی۔ یعنی صحابہؓ کا معیار حق ہونا قیاسی یا استنباطی نہیں بلکہ منصوص ہے۔ جس کے لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مستقل حدیث ارشاد فرمائی۔

عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنھما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تفترق امتی علی ثلث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الا واحدۃ قیل من ھم یا رسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی۔　　(مشکوٰۃ)

"حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ میری امت تہتر (۷۳) ملتوں پر تقسیم ہو جائے گی سوائے ایک کے سب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ پوچھا گیا کہ وہ (مستثنیٰ) کون ہیں یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ جو لوگ میرے اور میرے اصحاب کے طریق پر ہیں"۔

فرق اسلامیہ کے حق و باطل ہونے کا معیار

اب اس حدیث میں فرق اسلامیہ کی نجات و ہلاکت اور بالفاظ دیگر ان کے حق و باطل ہونے کا معیار نبی کریم ﷺ نے بتلایا ہے کہ وہ میرا اور میرے صحابہؓ کا طریقہ ہے۔ لیکن اس طریقہ کو شخصیتوں سے الگ کر کے تنہا کو معیار نہیں بتلایا۔ بلکہ اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہؓ کی ذات قدسیہ کی طرف منسوب کر کے معیار بتلایا کہ وہ ان شخصیتوں کے ضمن میں پایا جائے۔ ورنہ بیان معیار میں اس نسبت اور نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ من ھم کے جواب میں ما انا علیہ کی سیدھی تعبیر یہ تھی کہ ماجئت بہ فرمادیا جاتا۔ یعنی معیار حق وہی ہے جسے میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی شریعت' لیکن شریعت کو شخصیتوں سے الگ کر کے ذکر کرنے کی بجائے شخصیتوں کے انتساب سے ذکر فرمانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ محض کاغذ کے کالے نقوش معیار نہیں بلکہ وہ

ذوات معیار حق ہیں جن میں یہ نقوش و حروف اعمال و احوال بن کر رچ گئے ہیں اور اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب کوئی بھی ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ محض لٹریچر معیار حق نہیں بلکہ وہ ذوات معیار حق ہیں جو اس لٹریچر کے حقیقی ظرف بن چکے ہیں۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ.

”بلکہ یہ تو قرآن کی آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں“۔

پھر اس طریقہ کو شخصیت کی طرف منسوب کرنے کے سلسلہ میں اننا برَما کے بعد آنا کافی تھا اور یہ فرما دینا بس کرتا تھا کہ نجات و ہلاکت سے پہچاننے کا طریقہ میری ذات ہے تاکہ معیار حق صرف رسول خدا ﷺ کی ذات ہوتی لیکن آپؐ نے اپنے ساتھ اپنے صحابہؓ کو بھی شامل فرمایا جس سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ فرقوں اور مختلف مکاتب خیال کے حق و باطل کے پرکھنے کا معیار جیسے رسول کی ذات ہے ویسے ہی صحابہ رسول ﷺ کی ذوات بھی ہیں اور اس لئے رسول خدا ﷺ کی موجودگی یا عدم موجودگی میں کسی فرقہ اور کسی مکتب خیال کے افراد کو پرکھنے کے لئے یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی راہ پر چل رہے ہیں یا مخالف سمت میں ہیں' ان کی اطاعت کر رہے ہیں یا ان سے گریز پر ہیں' ان کے ساتھ حسن ظن کا برتاؤ کر رہے ہیں یا سوء ظن اور بے اعتمادی کا کہ یہی شان کسی کے معیار ہونے کی ہوتی ہے۔ جس سے صاف طور پر رسول خدا ﷺ کے ساتھ صحابہ رسول کا معیار حق ہونا واضح ہو جاتا ہے اور یہ حدیث اس بارے میں نص صریح ثابت ہوتی ہے جس کا مقصد ہی یہ مدعا ثابت کرنا ہے۔

اطاعت صحابہؓ اطاعت رسولؐ ہے

اس کی وجہ یہ ہے جو خود اس حدیث ہی سے نمایاں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں اپنے طریق کو بعینہ اپنے صحابہؓ کا طریق بتایا ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ان کی راہ چلنا میری راہ چلنا ہے اور ان کی پیروی میری پیروی ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے حق تعالیٰ شانہ اپنے رسول پاک ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی“۔

اس سے ایک کی اطاعت کو بعینہ دوسرے کی اطاعت بتلانا مقصود ہے جس کے صاف معنی

یہی ہوتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول کا طریق الگ الگ نہیں۔ جو اللہ کا راستہ ہے وہی رسول کا راستہ ہے۔ پس اللہ کی اطاعت معلوم کرنے کا معیار یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر وہ ہے تو بلاشبہ خدا کی اطاعت بھی ہے ورنہ نہیں۔

وہی صورت یہاں بھی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی پیروی واطاعت کو بعینہ اپنی پیروی وطاعت قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول خدا ﷺ کی اطاعت دیکھنی ہو تو صحابہ کرامؓ کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر صحابہ کرامؓ کی متابعت کی جاری ہے تو رسول خدا ﷺ کی اطاعت قائم ہے ورنہ نہیں۔ اس کا حاصل وہی نکلتا ہے کہ رسول اور صحابہ رسول کے طریقے الگ الگ نہیں بلکہ جو رسول خدا ﷺ کا طریقہ ہے وہی بعینہ صحابہؓ رسول کا طریقہ ہے۔ اس لئے جیسے رسولؑ فرقوں کے حق وباطل کا معیار ہیں۔ ایسے ہی صحابہؓ رسول بھی معیار حق وباطل ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر سب کے حق وباطل کو بآسانی پرکھا سکتا ہے۔ بہر حال اس حدیث سے حضرات صحابہؓ کی صرف منقبت اور فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی۔ نیز ان کی معیاریت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں بلکہ امت کے حق وباطل کے لئے ان کی معیار شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی حق پر نہیں ہیں بلکہ حق وباطل کے لئے امت کی کسوٹی بھی بن چکے ہیں۔ جن سے دوسروں کا حق وباطل بھی کھل جاتا ہے پھر یہ بھی کہ ان میں یہ معیار ہونے کی شان محض ان کی غیر معمولی فضیلت سے بطور رائے وقیاس نہیں مان لی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے اپنی ذات کے دوش بدوش ان کے معیار حق وباطل ہونے کی شہادت دی ہے۔ اس لئے ان کا معیار حق وباطل ہونا قیاسی نہیں بلکہ منصوص ثابت ہوا۔

معیار... قابل تنقید نہیں ہوتا

اور جب رسول خدا ﷺ کے ساتھ صحابہؓ رسول پوری امت کے حق وباطل کے پرکھنے کا معیار ثابت ہوں تو کیا امت کو یہ حق پہنچے گا کہ وہ ان پر تنقید کرے اور گرفتیں کر کر کے ان کی خطائیں پکڑنے لگے؟ یا یہ حق خود ان کا ہوگا کہ امت کے خطاء وثواب کا فیصلہ کریں؟ کون نہیں جانتا کہ تنقید کا حق معیار کو ہوتا ہے جو پرکھنے والا ہے نہ کہ محتاج معیار کو جو جانچنے اور اپنا فیصلہ کرانے چلے ہوں اور وہ چلتے چلتے راستہ میں خود ہی معیار بن جائیں اور اپنے اوپر حکم لگوانے کی بجائے معیار پر ہی حکم لگانے کھڑے ہو جائیں؟ اس سے واضح ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ معیار حق وباطل کی وجہ سے تنقید سے بالاتر ہیں۔ ایسے ہی آپ کے صحابہؓ بھی' جب کہ آپؐ نے ان کو بھی حکم میں ساتھ ملا کر معیار حق وباطل قرار دیا ہے' تنقید سے بالاتر ہیں۔ ورنہ کسی کو معیار حق مان کر اس پر نکتہ چینی کرنا یعنی خلاف حق ہونے کا اس کی طرف ابہام کرنا یا اسے خلاف حق ہونے کا طعنہ دینا اس معیار کو مان کر بھی معیار نہ ماننا ہے جو صریح اجتماع ضدین ہے اس لئے حضرات صحابہؓ اگر امت کے فرقوں کے حق وباطل کے فیصلے

کا معیار ہیں اور حسب بالا ضرور ہیں تو وہ یقیناً ان فرقوں کی تنقید سے بالاتر بھی ضرور ہیں ورنہ ان میں معیار ہونے کی شان قائم نہیں رہے گی، جس کا قائم رہنا بنص حدیث ضروری ہے۔

حق دستیاب بھی صحابہ کرامؓ سے ہوگا

صحابہؓ کا معیار حق اور بالاتر از تنقید ثابت ہوجانے کے بعد یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ صحابہؓ کے معیار حق و باطل کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ جیسے کسوٹی کا پتھر سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو تو نمایاں کر دیتا ہے۔ مگر خود نہ کھرا ہوتا ہے نہ کھوٹا۔ ایسے ہی حضرات صحابہؓ بھی بایں معنی معیار حق ہوں کہ دوسروں کا حق و باطل تو ان سے کھل جائے مگر وہ خود معاذ اللہ نہ حق ہوں نہ باطل۔ کیونکہ انہیں نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ ملا کر امت کے لئے معیار حق بتلایا ہے اور ظاہر ہے کہ خود اللہ کے رسول ﷺ کے معیار حق ہونے کے معنی یہ کہ وہ حق و صداقت کا مجسم نمونہ اور سر تاپا صدق و امانت ہیں۔ جن میں باطل کی آمیزش کا شائبہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے صحابہ کرامؓ کی جماعت کے معیار حق ہونے کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ وہ بھی خالص حق کے پیکر ہوں اور حق و صداقت کا مجسم نمونہ ہوں جس میں باطل کا گزر نہ ہو۔

اس صورت میں ظاہر ہے کہ رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے معیار حق ہونے کی شان یہ نکلتی ہے کہ ان کو سامنے رکھ لینے پر حق و باطل میں امتیاز کامل بھی پیدا ہو جائے اور حق دستیاب بھی ہو جائے۔ کیونکہ نمونہ جب وہ کامل مونہ حق ٹھہرے اور وہی اس امت کے اولین نمونہ حق بھی ہوئے تو حق پہچانا بھی انہی سے جائے گا اور دستیاب بھی انہی سے ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی پیروی کی جائے۔ اندریں صورت صحابہ کرامؓ کے معیار حق ہونے اور امت کے مختلف الخیال فرقوں کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی نکل آئے کہ جو فرقہ ان کی اطاعت کا التزام کرے گا وہی حق پر ہوگا اور اس کسوٹی پر پورا اترے گا اور جو ان سے منحرف ہو کر خلاف راہ چلے گا وہی باطل پر ہوگا۔

اور ظاہر ہے التزام اطاعت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ان پر جرح و تنقید کرنے کی بجائے ان کی تصویب کی جائے۔ ان کی خطائیں پکڑنے اور ان پر گرفتیں کرنے کی بجائے ان کی توصیف کی جائے۔ ان سے بدظنی کی بجائے حسن ظن رکھا جائے اور ان پر امور قبیحہ مثل جھوٹ وغیرہ کی تہمتیں دھرنے کی بجائے انہیں صادق و امین سمجھا جائے۔ اگر ان کے بعد امت کے طبقات کو پیروی کا یہ درجہ بھی حاصل نہ ہو اور اس انداز سے وہ صحابہ کرامؓ کے نمونوں کو سامنے نہ رکھیں تو یقیناً نہ انہیں حق حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ان کے دلوں میں حق و باطل کا امتیاز ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

ناقدین صحابہؓ کا دین سلامت نہیں رہ سکتا

کیونکہ صحابہ کرامؓ ہی رسول ﷺ کے بعد اس امت کے مومنین اولین اور امت کے حق میں دین کے مبلغین اولین ہیں۔ دین کا کوئی حصہ کسی سے پہنچا ہے کوئی کسی سے، قرآن کریم کا کوئی ٹکڑا کسی سے ملا ہے اور کوئی کسی سے۔ جن کو جامعین قرآن صحابہ کرامؓ نے جمع فرمایا ہے تو کسی ایک صحابیؓ کی پیروی سے انحراف یا کسی ایک صحابیؓ پر جرح اور نکتہ چینی درحقیقت دین کے اس ٹکڑے سے انحراف ہوگا جو اس سے روایت ہو کر امت تک پہنچا ہے اگر راوی مجروح اور ناقابل پیروی ہے تو اس کا روایت کردہ حصہ دین بھی مجروح اور ناقابل اعتبار ہے۔ اگر معاذ اللہ یہ نکتہ چینی اور جرح اور عدم پیروی ان حضرات کے حق میں یونہی جائز کر دی جائے اور وہ سب میں دائر و سائر اور جاری رہے۔ جس کا ہم سے مطالبہ کیا جا رہا کہ رسول ﷺ کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو اور نہ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو تو دین کا کوئی ایک حصہ بھی غیر مجروح اور معتبر باقی نہیں رہ سکتا اور امت کا کوئی ایک فرد بھی دین دار یا مدعی دین نہیں بن سکتا۔ اس لئے صحابہ کرامؓ پر تنقید کو جائز سمجھنے والے بلکہ اسے اپنے دین کا موضوع بنانے والے پہلے اپنے دین کی خبر لیں کہ وہ باقی رہا ہے کہ ختم ہو گیا۔ بہر حال التزام طاعت اور ''ذہنی غلامی'' کا ادنیٰ ترین مرتبہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ قلبی حسن ظن اور ان پر جرح و تنقید سے روک تھام ہے۔ انہیں خطاکار سمجھ کر اطاعت شعار بننا ممکن نہیں کیونکہ خطا کو خطا سمجھ کر اس کی اطاعت نہیں کی جاتی۔

فرقہ ناجیہ اہلسنت والجماعت

اس لئے امت میں صرف وہی ایک فرقہ اس حدیث کی رو سے حق پر ہو سکتا ہے جو ہر نہج سے صحابہ کرامؓ کی توثیق و تصدیق اور تصویب و تنزیہ کے جذبات اپنے اندر لئے ہوئے ہو اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ مطیع طبقہ، ''ذہنی غلامی'' کا پیکر طبقہ صرف اہلسنت والجماعت کا جن کا مذہب ہی یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب بلا استثناء مطلقاً عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے ہر فعل کا منشا پاک، نیتیں راست، ارادے سچے تھے۔ وہ جھگڑتے بھی تھے تو ان کے جھگڑے میں شر نہ ہوتا تھا، ان کا اختلاف بھی ہماری آشتی سے خوش آیند تر تھا، ان کے نفوس امارہ نہیں بلکہ مطمئنہ تھے، ان کے قلوب تقویٰ اور تقدس کا محور تھے۔ جن کا امتحان اللہ تعالیٰ نے کر لیا تھا، ان کا آدھ پاؤ صدقہ بھی ہمارے پہاڑ جیسے صدقہ سے افضل تھا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے بری تھے۔ ان کا علم گہرا اور نکھرا ہوا تھا۔ ان کے مقامات توحید و اخلاق سے پوری امت کے توحید و اخلاق کو کوئی نسبت نہیں اور بقول حسن بصری رحمہ اللہ علیہ امیر معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک کے اوپر کا غبار عمر بن عبدالعزیزؒ سے ہزار درجے افضل تھا۔ کیونکہ امیر معاویہؓ صحابی تھے اور عمر بن عبدالعزیزؒ تابعی (روح المعانی وغیرہ وغیرہ)۔

ذہنی غلامی کے بغیر چارۂ کار نہیں

ظاہر ہے کہ ان جذبات کو بطور عقیدہ ذہن میں رکھ لینے کے بعد صحابہ کرامؓ پر جرح و تنقید کا تو کوئی سوال ہی ذہنوں میں نہیں آسکتا۔ البتہ ''ذہنی غلامی'' کا سوال ضرور پیدا ہو سکتا ہے۔ سو اس منقول دین میں اولین طبقہ کا ہر آدمی کا کلیتہً محتاج ہوگا۔ روایت میں بھی اور درایت میں بھی' تاویلات میں بھی اور تعلیم و تزکیہ میں بھی اجمال میں بھی اور تفسیر میں بھی آخر اس کی ''ذہنی غلامی'' نہ کرے گا تو کیا کرے گا اور جب کہ رسول خدا ﷺ نے انہی کو امت کے مختلف فرقوں کے حق و باطل کا معیار بھی قرار دے دیا اور معیار ہونے کی شان یہ ہے کہ انہی سے حق و باطل ممتاز ہوتا ہے اور انہی سے ملتا بھی ہے اور اس صورت میں بجز ''ذہنی غلامی'' کے چارہ کار بھی کیا ہے ورنہ بحق ہونے کے بجائے آدمی مبطل ہونا گوارہ کرے۔

روافض' خوارج' معتزلہ اور دوسرے انہی کے ہم رنگ فرقے مبطل ہی اس لئے قرار پائے کہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا ان کی ''ذہنی غلامی'' پر راضی نہ ہوئے اور ان پر طعنہ زنی اور نکتہ چینی سے باز نہ آئے۔ جس سے صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے روکا تھا اور فرمایا تھا کہ میرے صحابہؓ پر سب و شتم نہ کرو' میرے صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جس میں نکتہ چینی اور گرفت اور نقد و تبصرہ سب ہی کچھ زیر ممانعت آجاتا ہے۔ وہ نجوم ہدایت ہیں تو ان سے راہ پائی جائے گی۔ انہیں راہ دکھائی نہیں جائے گی' ان کی اقتداء کی جائے گی' ان کی غلطیاں پکڑ پکڑ کر ان سے اقتداء کرائی نہیں جائے گی۔

اس سے واضح ہے کہ جو لوگ اپنے نقد و تبصرہ کا دائرہ ان آباء صالحین تک وسیع کر دینا چاہتے ہیں اور بقول شخصے ''بازی بازی بر ریش بابا ہم بازی'' کے ڈھنگ پر ان پر جرح و تنقید جائز سمجھتے ہیں۔ تو یہی ایک چیز ان کے مسلک کے باطل ہونے اور مخالف اہلسنت والجماعت ہونے پر ان سے اعتزال کر لینے کی کافی دلیل ہے۔ اب خواہ کوئی نیا فرقہ بن جائے یا پرانے مبطل فرقوں کی ''ذہنی غلامی'' میں مبتلا ہو کر انہی کا مقلد ہو۔ بہر حال وہ اہل حق میں سے نہ ہوگا۔

ناقدین صحابہؓ افتراق امت کا سبب ہیں

کیونکہ اس حدیث میں یہ بھی نمایاں ہے کہ جب صحابہ کرامؓ معیار حق و باطل ہیں تو ان کی مخالفت ہی سے نیا فرقہ بنے گا۔ موافقت سے کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آسکتا۔ بلکہ وہی قدیم ناجی فرقہ برقرار رہتا ہے جو صحابہ کرامؓ کی جماعت تھی جو برحق بھی تھی اور معیار حق بھی۔۔۔ بعد میں جتنے فرقے بنے وہ ان کی مخالف راہ چل کر ہی بنے۔

اور اس لئے وہ ناحق قرار پائے کہ معیار حق سے الگ ہوگئے۔ پس جو لوگ بلا استثناء سارے

صحابہؓ کی عظمت و عقیدت کے ساتھ پیروی کرتے ہیں اور ان پر زبان و تنقید کھولنا جائز نہیں سمجھتے وہ یقیناً فرقہ نہیں بلکہ اصل جماعت ہیں۔ جن کے عقیدہ و عمل کا سر اسند کے ساتھ قرن اول کی پاکباز جماعت سے ملا ہوا ہے اور وہی اس جماعت کی سنتوں پر عقیدت و عظمت سے جمے ہوئے ہونے کے سبب صحیح معنوں میں اہلسنت والجماعت کہلانے کے مستحق ہیں۔ البتہ صحابہ کرام کا خلاف کرنے والے اور ان پر جرح و تنقید سے نہ رکنے والے حتی کہ اسے اصول قرار دینے لینے والے در حقیقت بلا جرکی نئی نئی شاخیں دین میں نکال کر اور نئے نئے خوشنما روپ کے عنوانوں سے دین کی تعبیریں کر کے اسے صدر رخ بنا دینے والے امت میں افتراق و انتشار پھیلا رہے ہیں اور امت کو دین کے نام پر ضعیف ناتواں بناتے جارہے ہیں تو یہی لوگ فی الحقیقت فرق ہیں "جماعت نہیں" گو اپنے نام کے ساتھ جماعت کا لفظ پکار پکار کر شامل کرلیں فاولئك الذين سماهم الله بہر حال اس حدیث مذکورہ سے ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرامؓ کو معیار حق رسول ﷺ نے بنایا اور وہ آپ کے منشاء کے مطابق حق ثابت ہوئے۔ جن پر آج تک امت مرحومہ اپنے کھرے اور کھوٹے کو پہچانتی رہی ہے۔ رسول ﷺ نے اسی لئے ان پر کلی اعتماد فرما کر ان کے طریقے کو اپنا طریقہ اور اپنے طریقہ کو ان کا طریقہ فرمایا اور پوری امت کے لئے انہیں حجت قرار دیا جس سے قیامت تک امت کے حق و باطل کا فیصلہ انہی کے علم و عمل کے معیار سے ہوتا رہے گا۔

خود اپنے معیار ہونے کا ادعاء

اندریں صورت مودودی صاحب کا دستور جماعت کی بنیادی دفعہ میں عموم و اطلاق کے ساتھ یہ دعوی کرنا کہ رسول ﷺ کے سوا کوئی معیار حق اور تنقید سے بالاتر نہیں ہے جس میں صحابہ کرامؓ سب سے پہلے شامل ہوتے ہیں اور پھر ان پر جرح و تنقید کا عملی پرداز بھی ڈال دینا حدیث رسولؐ کا محض معارضہ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک خود اپنے معیار حق ہونا کا ادعاء ہے۔ جس پر صحابہ کرامؓ تک کو پرکھنے کی جرات کرلی گئی۔ گویا جس اصول کو شدومد سے تحریک کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اپنے ہی بارے میں اسے ہی سب سے پہلے توڑ دیا گیا اور سلف و خلف کے لئے رسول ﷺ کے سوا خود حق بن بیٹھنے کی کوشش کی جانے لگی۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ۔

صحابہؓ کی اجتماعی اطاعت

اور اخذ حبیبؐ سے یہ واضح ہو رہا ہے رسول خدا ﷺ کے سوا ایک دو صحابی ہی معیار حق نہیں بنادیئے گئے۔ بلکہ "اصحابی" جمع کا صیغہ لا کر اشارہ کیا گیا کہ رسول خدا ﷺ کے سوا تمام صحابہ کرامؓ معیار حق بن کر واجب اطاعت ہیں۔ جس کے لئے احادیث میں ایک ایک دو دو اور چار چار اس سے زیادہ اور پھر پوری

جماعت کی اقتداء کے اوامر وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ معیار ہو کر بھی واجب اطاعت نہ بنے تو معیار معیار نہیں رہتا اور جب کہ معیار حق ساری جماعت صحابہؓ کو فرمایا گیا تو سارے ہی صحابہؓ بلا استثناء واجب الاطاعت بھی قرار دیئے گئے۔ ممکن ہے کہ شکی کو شک وشبہ گزرے کہ جب صحابہ کرامؓ کے فروئی مذاہب مختلف رہے اور مسائل میں اختلاف اور قص تک نظر آتا ہے تو لامحالہ ایک کی اطاعت کر کے بقیہ کی اطاعت سے دست برداری ہی کرنی پڑے گی ورنہ ضدین کا اجتماع ہو جائے گا جو ناممکن العمل ہے تو پھر سب کی اطاعت و پیروی کہاں رہی اور ممکن ہی کب ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ اگر ایک کی پیروی دوسروں کی طعن وتنقید سے بچ کر اور سب کی عظمت رکھ کر ہو تو وہ سب ہی کی پیروی کہلائے گی۔ جیسا سلسلہ ختم نبوت میں عملاً پیروی ایک رسول کی ہوتی ہے مگر معیار حق سب کو سمجھا جاتا ہے۔ عظمت وتنزیہ اور تقدیس سب کی یکساں کی جاتی ہے۔ تنقید وتخطیہ سب کا معصیت سمجھا جاتا ہے۔ تو یہی سارے انبیاء کی پیروی سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ کسی ایک پر بھی زبان طعن یا لسانی نقد وتبصرہ کھول کر ہزار کی پیروی بھی نہیں ہے۔ بلکہ سب کی مخالفت اور بغاوت ہے کیونکہ خود حضرات صحابہؓ فردعات میں مختلف رہنے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کی عظمت و توقیر کو واجب سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام شرائع میں مختلف رہ کر ایک دوسرے کی تصدیق کو اصل ایمان قرار دیتے تھے۔ پس ایک طعنہ زن اور نکتہ چین جب کہ ان کے اس قدر مشترک کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ سب کی خلاف ورزی کا مرتکب اور سب کے حق میں باغی ہے۔ ذیل کے ارشاد نبویؐ میں اس حقیقت پر روشنی بھی ڈال دی گئی ہے کہ:

اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم

''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاجاؤ گے''۔

ایہم کے لفظ سے اقتدا تو مطلق رکھی گئی ہے کہ کسی کی بھی کی جائے ہدایت مل جائے گی۔ لیکن نجوم کے لفظ سے اقتداء کو سمجھنا اور ہادی ماننا سب کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ جس کی پیروی کرو نجم ہدایت اور نور بخش صرف اسی کو سمجھو پس پیروی کا عمل تو ایک دو تک محدود ہو سکتا ہے لیکن نور افشانی کا عقیدہ ایک دو تک تو محدود نہیں رہ سکتا وہ سب کے لئے ماننا لازمی ہوگا۔

بہرحال صحابہ کرامؓ کا طبقہ تو وہ ہے کہ اس کا نام لے کر حضور علیہ ﷺ نے اسے امت کے مختلف مکاتب خیال کے فرقوں کے حق وباطل کا معیار قرار دیا ہے۔ تنقید سے بالاتر بتلایا اور ان کی ''ذہنی غلامی'' یا اطاعت وپیروی ضروری قرار دی۔

تا قیامت معیار شخصیت رہے گا

باقی ان حضرات کے بعد کسی طبقہ کو طبقہ کی حیثیت سے نام لے کر معیار حق نہیں ہونے کا ایک کلی ضابطہ اور معیاری اوصاف کا تعین فرمادیا گیا ہے۔ جنہیں سامنے رکھ کر معیاری افراد کو ہر زمانے میں فی الجملہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ قرآن مشہودہ کے بعد بشری کمزوریوں کے امکانات بھی رہے اور ایسی کمزوریوں کا گاہے بگاہے عملاً ظہور بھی ہوا لیکن ایسی گاہے بگاہے کمزوریوں سے معیاری شخصیتوں کے معیار ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اول تو اتقیاء امت میں سے کسی کی زندگی کو پاکباز زندگی کہنے کیلئے یہ کافی ہے کہ غالب زندگی تقویٰ وطہارت کی ہو۔ بھول چوک نسیان وذہول اور گاہے بگاہے ارادی کمزوری انسانی خمیر میں ہے دوسرے بعد کے لوگ صرف بایں معنی معیار حق ہونے کو انکا ہر قول وفعل حجت شرعی ہو تو اس قسم کے مقدس افراد اور معیاری لوگ ہر دور میں ہوتے رہیں گے اور امت کے لئے مینارہ روشنی ثابت ہوتے رہیں گے چنانچہ حضرت شیخ نے معیاریت کے ایسے اوصاف پر بھی کتاب وسنت سے روشنی ڈالی اور اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ راہ رشد وہدایت میں محض لٹریچر سے رہنمائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ شخصیتوں کے کردار کے جامہ میں سامنے نہ آئے۔ ورنہ کتب ہدایہ کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمائے جانے کی ضرورت نہ ہوتی جب کہ خود کتب ہدیٰ کے معانی ومرادات کی تعیین کے لئے بھی معیار حق یہی مقدس ہستیاں ہوئی ہیں۔ وہ نہ ہوں تو کتب الٰہیہ کے معنی متعین کرنے میں ہر بوالہوس آزاد ہو جائے اور حق وباطل کا کوئی فیصلہ کبھی نہ ہو سکے۔ اس لئے قیامت تک رسول خدا ﷺ کے بعد ایسی معیاری شخصیتوں کا بنام مجدد محدث امام مجتہد راسخ فی العلم فقیہ وغیرہ کا آتے رہنا ضروری ہے جس کے معیار سے امت کے عوام وخواص اپنے دینی عقیدہ وکردار کو جانچتے رہیں اور فی الجملہ ان پر اپنے کو منطبق کر کے روحانی سکون وطمانیت حاصل کرتے رہیں ہیں۔

پس مودودی صاحب تو رسول خدا ﷺ کے بعد کسی بھی انسان کو معیار حق ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن کتاب وسنت کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ کے بعد قیامت تک معیاری شخصیتیں آتی رہیں گی جو درجہ بدرجہ حق وباطل کا معیار ثابت ہوتی رہیں گی اور جو بھی کتاب وسنت کے الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کرے تو ایسی شخصیتیں اپنے اپنے دور کے مناسب حال عنوانوں سے انکی تاویلات کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کا چہرہ دکھاتی رہیں گی۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين و تاويل الجاهلين. (مشکوٰۃ)

”اس علم (دین) کو (ہر دور میں) اعتدال پسند خلف (اپنے سلف سے) لیتے رہیں گے جو غلو پسندوں (اور حدود واعتدال سے گزر جانے والوں) کی تحریفوں‘ باطل پرستوں کی دروغ بیانیوں اور جہلاء کی (رکیک) تاویلوں کو رد کرتے رہیں گے“۔

اگر توفیق خداوندی شامل ہوئی تو ان معیاری شخصیتوں اور ان کے معیار ہونے کی شانوں کی تفصیل آئندہ کسی دوسرے مقالہ میں کی جاسکے گی۔

بہرحال حضرت شیخ رحمہ اللہ علیہ کے مکتوب گرامی میں اہم اور بنیادی نکتہ بحث بھی معیاریت غیر رسول کا مسئلہ ہے جس کو مودودی صاحب نے اصولی طور پر اپنے بنیادی دستور بھی رد کر دیا ہے اور شیخ نے اسے اہل حق کی بنیاد قرار دیا ہے۔ جس سے یہ اختلاف فروعی نہیں بلکہ اصول بن گیا۔ خدا کرے کہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کار اس خلیج کو پاٹ دینے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائیں۔ کسی تحریک کو چلانے کے لئے بنیادی اختلافات پیدا کر لینا خود تحریک کو اپنے ہاتھوں ختم کر دینا ہے۔ فروعی باتیں تو اتفاق واختلاف دونوں راستوں سے چلتی رہتی ہیں‘ لیکن اصولی اختلاف اور صرف نظر ایک طرف میں جمع نہیں ہو سکتے۔

وماعلینا الاالبلاغ

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ
(یوم الخمیس)

ضمیمہ

ذہنی غلامی اور تقلید

ذہنی غلامی کے لفظ سے غالباً مودودی صاحب نے ''تقلید'' کی ترجمانی فرمائی ہے لیکن اس معنی میں یہ اصطلاح غلط اور مغالطہ انگیز ہے۔ غلامی کا حاصل کسی کے آگے جھکنا ہے اور تقلید کے معنی کسی کی بات ماننا ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کے کمالات کے آگے نہیں جھکتا بلکہ اس کی ذات کے سامنے جھکتا ہے خواہ وہ کندہ ناتراش اور احمق ہی کیوں نہ ہو لیکن ایک مقلد اپنے امام مجتہد کے سامنے آتا ہے تو صرف اس کے منصب ومقام کی پیروی کرتا ہے جس کو وہ عقل ونقل کا پیکر کامل سمجھتا ہے۔ ذات کے آگے نہیں جھکتا۔ پس غلامی میں آقا کی ذات پیش نظر ہوتی ہے۔ اس کا کمال پیش نظر نہیں ہوتا اور تقلید میں مجتہد کا کمال سامنے ہوتا ہے' ذات سامنے نہیں ہوتی۔ غلامی میں جبر ہوتا ہے کہ نہ غلام اپنی صلاحیتوں کو آقا کے انتخاب میں صرف کر سکتا ہے ورنہ خود آقا ہی کی صلاحیتوں پر نظر رکھ سکتا ہے۔ ادھر بھی ذات اور ذاتی خوف وطمع' ادھر بھی ذات اور ذاتی جبر وقہر۔ نہ وہاں شعور واستدلال نہ یہاں۔ پس ''ذہنی غلامی' میں نہ اپنا شعور بیچ میں ہوتا ہے نہ آقا کا کمال اور تقلید میں تطوع ورغبت' عقلی شعور اور قلبی اعتقاد ہوتا ہے جس میں نہ جبر ودباؤ کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ امام مجتہد کے کمالات سے بے شعور' غرض غلامی بے عقلی سے پیدا ہوتی ہے اور تقلید اتباع عقل وشعور سے' کیونکہ تقلید کسی کے آگے سر جھکانے کا نام نہیں' اس کی بات ماننے کا نام ہے اور بات بھی وہ جسے جذبات سے نہیں' علمی کمالات کے ذریعوں سے نکلی ہوئی سمجھی گئی ہو اور پھر کمالاتی ہی نہ ہو بلکہ اوپر سے نسبت بھی ہو کہ وہ خود اس شخص کی بات نہیں بلکہ اوپر کی بات ہے جہاں جھک جانا ہی نفسانی شرف ہے۔ پس تقلید میں شعور ہوتا ہے۔ بے شعور نہیں' استدلال ہوتا ہے۔ (گو جزوی مسئلہ نہ ہو' اصولی اور کلی ہو۔ جس سے مجتہد مطاع کی شخصیت اتباع کے لئے متعین کی جاتی ہے) بے حجتی اور ذاتی دباؤ نہیں ہوتا' عبودیت نہیں ہوتی اطاعت ہوتی ہے۔ پس کہاں غلامی ور عبدیت اور کہاں اتباع وعقیدت' کہاں غرض مندی اور خوف وطمع اور کہاں محبت وعظمت' کہاں شعور واستدلال اور کہاں جمود وتعطل' کہاں حسن ظن اور قلبی شفقت اور کہاں بیزاری اور اندرونی انحراف' کہاں عقل وخرد بالائے طاق اور کہاں عقلی رہنمائی پیش پیش۔

چراغ مردہ کجا' نور آفتاب کجا۔ اس لئے ذہنی غلامی کا لفظ جس کا معنی ذہن کو شعور واستدلال سے معطل کر کے کسی کی ذات کے آگے جھکا دینے کے ہیں اس تقلید کا ترجمان نہیں بن سکتا جس میں ذہنی شعور کی بیداری کے ساتھ کسی کی علمی اور کمالاتی نسبتوں کو سامنے رکھ کر حسن ظن اور استدلال کلی سے اس کی تقلید کی ترجمانی کے لئے ''ذہنی غلامی'' کا تحقیر آمیز لفظ شاید اشتعال انگیزی اور نئی نسل کے دل ودماغ پر چوٹ لگا کر انہیں تقلید سے بیزار بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ فی زمنہ

غلامی کے لفظ سے زیادہ کریہہ کوئی لفظ نہیں آج افراد ہوں یا طبقات' اقوام ہوں یا اوطان۔ آزادی کے نام پر سب برسرپیکار ہیں۔

با اقتدار قوموں نے چونکہ کمزوروں کی غلامی سازی کو زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے جس سے بے دست وپا اقوام تنگ آچکی ہیں۔ اس لئے وہ آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہیں اور آج کی دنیا میں غلامی کے لفظ ہی کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اس لفظ کے سامنے آتے ہی لوگ چونک پڑتے ہیں اور نفرت کے ساتھ اس سے بدک جاتے ہیں۔ اس لئے تقلید سے نفرت دلانے کے لئے اس سے بہتر تدبیر نہیں سوچی جاسکتی تھی کہ اس کا ترجمہ ایک ایسے مکروہ لفظ سے کر دیا جائے تو جو خود ہی ذہنوں میں حقیر وذلیل ہو کہ اس راستہ سے تقلید کے مفہوم سے ہی لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی جائے' لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ذہنی غلامی اور تقلید کی حقیقتوں میں زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ اور ایک کے لئے دوسرا لفظ کسی طرح بھی ترجمان نہیں ہوسکتا بلکہ یہ لفظ ہی شرعی نہیں ہے جو کسی دینی اور شرعی اصطلاح کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ محض اشتعال انگیزی اور ہنگامی مقصد برآری کے لئے ایک حیلہ کیا گیا ہے۔

پس ہم تقلید کے ضرور قائل ہیں لیکن تقلید کے معنی ذہنی غلامی کے نہیں سمجھتے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ تقلید میں اتباع بھی ہوتا ہے اور شعور بھی۔ گو شعور اجمالی ہو تفصیلی نہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے۔

"عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَاوَمَنِ اتَّبَعَنِیْ" یہاں صحابہ کرامؓ کے لئے (جو متبعین اولین ہیں) اتباع بھی ثابت کیا گیا ہے اور بصیرت وشعور بھی جس میں سب سے پہلے اس کا شعور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام کس کا ہے جس کی پیروی کی جارہی ہے اور وہ شخصیت کون ہے جس کا اتباع کیا جارہا ہے۔ اور ذہنی غلامی کا حاصل کلیتہً ذہنی بے شعوری اور جمود کے ہیں جو کسی بھی مومن کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔ اس مضمون میں ہم نے جہاں بھی یہ لفظ لیا ہے وہ مودودی صاحب کے کلام سے بطور حکایت ونقل کے لیا ہے ورنہ ہمارے نزدیک اسلامی اصطلاح کے نقطۂ نظر سے یہ لفظ مہمل اور بے معنی ہے۔ نہ یہ کسی شرعی مفہوم کا ترجمان بن سکتا ہے نہ عقل کا۔ کفار کی آبائی تقلید پر بول دیا جائے تو ممکن ہے کہ کسی حد تک چسپاں ہو جائے۔

(محمد طیب غفرلہ)

آغاز بخاری

خود مصنفؒ فرماتے ہیں جعلته بيني وبين الله حجة "میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے"۔ حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے اور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ انشاء اللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں وہ بھی انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہیں۔ ان کے لئے یہ دستاویز ہے۔۔۔ یہ گویا کتاب کی شان ہے۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ ونَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.......................اَمَّابَعْدُ............

كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ذِكْرُهٗ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ. حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ..........

قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدِ نِ الْاَنْصَارِيُّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيُّ اَنَّهٗ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصِ نِ اللَّيْثِيَّ يَقُوْلُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّانَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. . .

کلمات تمہید

بزرگان محترم!

یہ ہم لوگوں کی سعادت ہے کہ بخاری شریف کے افتتاح میں شرکت کا موقع ملا۔۔۔ عموماً اصحاب درس کا طریق یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن کی اہم کتاب شروع کرنے کے وقت چار چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ سب سے پہلے مصنف کا اجمالی تعارف کراتے ہیں۔ دوسرے خود تصنیف کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ کتاب کی عظمت و جلالت کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے جس سے کتاب میں بحث کی گئی ہے اور چوتھے یہ کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ کیوں اس کتاب کو پڑھتے ہیں۔؟

اس کو اگر علمی اصطلاح میں لایا جائے تو وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ سب سے پہلے "علت فاعلی" کہ اس کا فاعل کون ہے جس کی طرف ہم توجہ کر رہے ہیں۔ دوسرے "علت مادی" کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن پر مصنف نے بحث کی ہے اور تیسرے "علت صوری" کہ اس کتاب کی اور موضوع کی تشکیل کس طرح سے ہوئی ہے؟ اور چوتھے "علت غائی" کہ اس کے پڑھنے سے کیا غرض و غایت؟۔۔۔ تو عام طور پر اصحاب درس علت فاعلی، علت مادی، علت صوری اور علت غائی انہیں چار چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

جلالت امامؒ جہاں تک مصنفؒ کی ذات کا تعلق ہے وہ مسلمانوں کے قلوب میں آفتاب سے زیادہ مرکوز اور روشن ہے۔ کوئی زیادہ تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے اوائل میں سے ہیں، متقدمین میں سے ہیں، امام ہیں، حافظ ہیں اور مصنف ہیں۔ تمام اوصاف کمال جو اہل علم میں ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان میں جمع فرمائی ہیں۔

تقریباً ۱۹۲ھ یا ۱۹۴ھ میں پیدائش ہوئی ہے۔ باسٹھ (۶۲) سال کی عمر ہوئی ہے اور قریب قریب ۲۵۳ھ یا ۲۵۶ھ میں وفات ہوئی ہے۔۔۔ نے یہ تین چیزیں جمع کی ہیں اور تاریخ بتلائی کہ کونسا سن ولادت کا ہے اور کون سا سن وفات کے ہے اور عمر کتنی ہے؟ تو ان تینوں کو ایک شعر میں جمع کر دیا ہے ؎

کان	البخاری	حافظا	ومحدثا
جمع	الصحیح	مکمل	التحریر
میلادُہٗ	صدق	ومدۃ	عمرہ
فیھا	حمید	وانقضی	فی نور

گویا سن ولادت تو صدق کے لفظ سے نکلتا ہے اور مدت عمر حمید کے لفظ سے ہے اور سن وفات نور کے لفظ میں ہے۔

جہاں تک امام کی عظمت اور جلالت کا تعلق ہے۔ حافظ، عدل واتقان، زہد و تقویٰ اور دیانت

وہ اس سے زیادہ مشہور ہے جتنا کہ آفتاب کو ہم دیکھتے ہیں۔ پوری امت نے امام کی تلقی بالقبول کی ہے۔

حافظہ حق تعالیٰ نے محیر العقول عطاء فرمایا۔ اس زمانے میں حفظ ہی پر مدار تھا اور بڑے بڑے محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوئے کہ جن کے حفظ کو بس کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ طبعی طور پر یہ حافظے عام نہیں ہوتے۔ حق تعالیٰ شانہ' کو اپنے رسول ﷺ کے کلام کو زیادہ پھیلانا تھا تو حیرت ناک حافظے عطاء فرمائے جس کو ہم کرامت ہی کہہ سکتے ہیں۔

کرامت حفظ

امام ترمذیؒ مکہ مکرمہ کا سفر کر رہے تھے اور شیخ بھی ساتھ ہیں، جن کے امام ترمذی شاگرد ہیں۔ متعدد تلامیذ ساتھ ہیں۔۔۔ تمام تلامیذ نے درخواست کی کہ جمعہ میں ایک لمبا وقت گزرے گا تو حدیث کا املاء کرا دیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ شرط یہ ہے کہ کاغذ دوات ہو اور ۔ اکر بیٹھو۔ جو حدیث میں لکھواؤں لکھتے جاؤ۔۔۔ یہ شرط مان لی گئی۔

ترمذیؒ کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم اور شوق یہ تھا کہ میں بھی درس میں حاضر ہوں۔ مگر شیخ نے شرط لگا دی تھی۔

تو یہ کیا کہ پیچھے بیٹھے تھے اور ایک گھٹنا کھڑا کر کے بایاں ہاتھ اس پر رکھتے اور دائیں ہاتھ کو اس طرح حرکت دیتے تھے گویا لکھ رہے ہیں۔ تاکہ شیخ یہ سمجھیں کہ کاغذ بھی ہے اور لکھائی بھی ہو رہی ہے۔ چند ایام گزر گئے ایک دن شیخ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ نہ کاغذ ہے قلم ہے فرمایا۔۔۔۔ میں نے شرط لگائی تھی، تم بلا کاغذ اور قلم کے کیسے آئے؟

انہوں نے کہا کہ حضرت! مقصود تو یہ تھا کہ چیز محفوظ ہو جائے تو اس ایک ہفتے میں حضرت نے جتنی حدیثیں ارشاد کیں وہ سب محفوظ ہیں اور پہلے دن اتنی حدیثیں ان اسانید کے ساتھ سنائیں۔ دوسرے دن یہ حدیثیں فلاں فلاں سند کے ساتھ سنائیں ہفتے کی کل حدیثیں مع اسانید کے حافظے سے بتلائیں۔۔۔ شیخ بڑے خوش ہوئے۔ گلے لگایا۔ فرمایا تمہیں بیٹھنے کی اجازت ہے۔

اب یہ حافظہ کہ دس دن بعد فرمائیں کہ فلاں دن یہ حدیثیں تھیں اور یہ یہ سند تھی' فلاں دن یہ حدیثیں تھیں یہ یہ سند تھی۔ اس کو سوائے کرامت کے اور کیا کہا جائے۔ عام حافظے میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

امتحان حفظ

یہ امام بخاریؒ جب بغداد تشریف لائے۔ تو محدثین میں چرچا تھا کہ ایک نوجوان ہے جو حافظ حدیث ہے اور حفظ کا جو شہرہ تھا یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا غیر معمولی حفظ ہو تو ارادہ کیا گیا کہ امام بخاریؒ کے حافظے کا امتحان لیا جائے۔ دس محدث جمع ہوئے اور دس دس حدیثیں چھانٹ لیں۔ سو احادیث میں امتحان کرنا تھا۔ بہت ضخیم مجمع ہوا۔

پہلے محدث نے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ کسی متن کی سند کسی کے ساتھ تھوپ دی کسی کی سند کسی کے ساتھ تو دس حدیثیں الٹ پلٹ کر کے بیان کیں۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں

لا اعرفه' لا اعرفه۔

اس کے بعد دوسرے محدث نے اسی طرح الٹ پلٹ کر کے کسی کی سند اور کسی کا متن خلط ملط کر کے بیان کیا۔۔۔ ہر حدیث پر فرماتے رہے

لا اعرفه' لا اعرفه

میں نہیں پہچانتا سو کی سو حدیثیں اس طرح سے روایت کی گئیں ہر حدیث پر امام نے کہا لا اعرفه' لا اعرفه میں نہیں پہچانتا۔۔۔ لوگوں نے کہا کہ خوہ مخواہ شہرت ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان نہ حفظ رکھتا ہے' نہ اتقان رکھتا ہے ہر چیز میں "لا اعرفه' لا اعرفه" میں نہیں پہچانتا کہتا جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو امام بخاریؒ بولے سب سے پہلے محدثؒ نے اس ترتیب سے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ پہلی حدیث کی یہ سند ہے' دوسری کی یہ سند ہے' تیسری کی یہ ہے۔ دس کی دس صحیح سندیں بیان کیں۔ اس کے بعد کہا کہ دوسرے محدثؒ نے یہ دس حدیثیں بیان کیں ان مین یہ خرابی تھی۔۔۔ یہ خرابی تھی۔ اس کی اصل سند یہ ہے' یہ ہے۔ سو کی سو روایتوں کی صحیح سندیں بیان کر دیں۔ تمام محدثین کی گردنیں جھک گئیں اور کہا جو سنا تھا وہ حقیقتہً سچ تھا اور یہ شخص امامت کے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ وہاں سے پھر امام بخاریؒ کا شہرہ ہوا۔

بہر حال امام بخاریؒ کا حافظہ' ان کا اتقان اور ان کا زہد و تقویٰ یہ گویا اظہر من الشمس ہے۔ ساری دنیا اس کو جانتی ہے۔

جلالت کتاب

ظاہر بات ہے قدر الشهادة قدر الشهود جیسے شہود ہوتا ہے ویسی ہی شہادت ہوتی ہے۔ جب امام اس درجہ کا تو اس کی تصنیف بھی اس درجہ کی ہو گی۔۔۔ تو بخاری کی جلالت شان یہ ہے کہ پوری امت نے اجمالی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانا گیا ہے۔

بعض حضرات محدثین کہتے ہیں کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ' امام مالکؒ کی موطا ہے اور وہ حدیث میں اولین تصنیف بھی ہے۔۔۔ لیکن موطا کے اندر احادیث بھی ہیں' آثار صحابہ بھی ہیں اور فتاویٰ بھی ہیں۔ تو مخلوط ہے۔

امام بخاریؒ نے تنقیح کی بلکہ ہر چیز کو الگ کر دیا ہے۔ ابواب اور فصول مرتب کئے اور ایسی کڑی شرائط لگائیں کہ دوسری عبارات اور اسانید میں وہ شرائط نہیں پائی جاتیں بالآخر امت کا اجماع ہو گیا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری ہے۔ اولین درجہ سند میں قرآن کریم کا ہے تو وہاں تواتر طبقہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ تواتر روایت ہو یا تواتر سند ہو۔ بلکہ طبقاتی تواتر ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں حافظ قرآن مجید موجود ہیں۔ اس واسطے وہ تواتر طبقہ ہے کہ جس میں کذب کا شائبہ یا خلط ملط کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ اس کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔

اسماء الرجال

احادیث میں محدثینؒ نے "حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے" اور بڑے بڑے مقامات دے' امت کے لئے آسان کر دیا۔ روایات حدیث کے سلسلے میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ جمع کر دی جو روایان حدیث ہیں۔ ان کے خاندان کیا ہیں' ان کا کیریکٹر کیا ہے' ان کا کردار کیا ہے' حافظے کیسے تھے' عدالت کیسی تھی یہ سب جمع کر دیا ہے۔ تو پچاس ہزار انسانوں کی تاریخ ان کے خاندانوں اور احوال سمیت مرتب کر دی کہ یہ روایان حدیث ہیں۔

میزان حدیث

پھر مصطلحات الحدیث مستقل فن ایجاد کر دیا۔ حدیث کے درجات قائم کر دیئے کہ اگر حدیث مرفوع متصل ہے اور طبقہ میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے آرہے ہیں اس کو متواتر کہا۔ جو مورث یقین ہوتی ہے اس کے منکر کو جاحد کہ کہ وہ کفر میں مبتلا ہے اس سے دوسرا درجہ خبر مشہور کا ہے کہ کم سے کم دو دو آدمی صحابی سے لے کر اب تک روایت کرتے آرہے ہوں۔ کہیں زیادہ ہو جائیں تو مضائقہ نہیں مگر دو سے کم نہ ہوں وہ حدیث مشہور کہلاتی ہے۔ یہ مورث ظن غالب ہے جو قریب قریب یقین کے ہوتا ہے۔ تیسرا درجہ خبر واحد کا رکھا کہ ایک ایک آدمی روایت کرتا آرہا ہو۔ درمیان میں بڑھ جائے تو مضائقہ نہیں مگر ایک سے کم نہ ہو یہ خبر واحد یا خبر وحید کہلاتی ہے۔ یہ مورث مطلق ظن ہوتی ہے۔ اس کا منکر کافر تو نہیں ہوتا مگر فسق میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے' تو خبر مرفوع متصل' متواتر' مشہور' خبر واحد۔۔۔ پھر اس کے بعد اگر بیچ میں انقطاع آئے تو منقطع۔ اگر صحابیؓ کی جگہ پر انقطاع آئے تو مرسل بیچ میں انقطاع' مسلسل دو راویوں کا آئے تو معضل غرض اقسام حدیث بیان کی گئی ہیں کہ حدیث مشہور ہے' متواتر ہے' معضل ہے' مشکل ہے' مجمل ہے' مجہول ہے۔ ہر ایک کا الگ الگ درجہ بتلایا کہ کس درجے میں اس کی حجیت ہے۔ بہر حال محدثین نے ایسے کانٹے اور میزانیں بنا کر دیں کہ کوئی بوالہوس خلط ملط نہیں کر سکتا اس کانٹے پر تپ کر پانی الگ اور دودھ الگ کر دیا جاتا ہے نکھر دیا جاتا ہے۔

انتخاب احادیث

امام بخاریؒ اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور کتاب میں سات لاکھ احادیث میں سے سات ہزار حدیثیں منتخب کیں ہیں۔ اگر مکررات کو ملا دیا جائے تو سات ہزار بیٹھتی ہیں' مکررات کو حذف کر دیا جائے تو [illegible] ہزار سے اوپر بیٹھتی ہیں جو روایتیں اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں۔۔۔ بہر حال مصنف بھی جلیل القدر اور کتاب بھی جلیل القدر۔

شان قبولیت

خود مصنف فرماتے ہیں۔ جعلته بيني وبين الله حجة میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے۔

حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے اور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ انشاء اللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں وہ بھی انشاء اللہ عنداللہ مقبول ہیں۔ ان کے لئے یہ دستاویز ہے۔ یہ دستاویز کتاب

کی شان ہے۔

موضوع کتاب اس کا موضوع اقوال' افعال نبی کریم ﷺ ہیں۔ آپ نے جو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا یا عمل کر کے دکھلایا یا کسی کے عمل پر سکوت فرمایا۔ یہ سکوت رضا ہے یہ سب احادیث میں داخل ہیں۔

عصمت انبیاء علیہم السلام اس لئے کہ نبی کا قول اور فعل ہی شریعت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دین کے بارے میں معصوم پیدا فرمائے گئے ہیں اور اہلسنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ قبل از نبوت بھی معصوم ہیں معصومیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ گناہ نہ کریں۔ قوتیں ساری موجود ہیں۔ مگر مخالفت نفس کی اتنی قوت ہے کہ کوئی ایک درجہ بھی حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ قوئ نفس اور مقاومت نفس اتنی ہے کہ شوائب نفس باقی نہیں رہے مغلوب ہو گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا مطمئن ہوتا ہے کہ جو خواہش آتی ہے وہ بھی پاک ہی آتی ہے۔ غیر پاک یا ناپاک آتی ہی نہیں۔ اتنے پاک اور صاف انبیاء علیہم السلام کے قلوب پیدا کئے گئے ہیں جس کو صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ :-

یا رسول اللہ ﷺ! آپ کی عجیب شان ہے

ان ربك يسارعك في هوائك

آپ کی ہر خواہش کے پورا کرنے میں حق تعالیٰ اتنی جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر دل میں خواہش آئی اور ادھر پوری ہوئی۔۔۔ وہ یہ ہے کہ نبی کے قلب میں خواہش ہی پاک آتی ہے۔ جب نبی کو تخلی بالطبع چھوڑ دیں گے تو خیر ہی کی طرف طبیعت جائے گی' شر کی طرف نہیں جائے گی۔ تو خیر غالب ہوتی ہے اور ہوائے نفس اس کے تحت ہوتی ہے ہر خواہش نفس میں انبیاء علیہم السلام کو رضائے حق کا دھیان ہر وقت رہتا ہے۔ کسی وقت بری خواہش ان کے قلب میں آتی ہی نہیں۔

ان ربك يسارعك في هوائك

حفاظت اولیاء اور انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے اور ان کی جوتیوں کی برکت سے انبیاء علیہم السلام کے خدام میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے نفوس بھی مطمئن ہیں اور ان کی ہر خواہش پاک ہوتی ہے۔ جیسے حدیث میں ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ :-

الحق ينطق على لسان عمر

"عمر کی زبان پر حق بولتا ہے"۔

دار الحق معه' حيث دار

"جدھر عمر جاتے ہیں' حق بھی ادھر جاتا ہے"۔

تو بظاہر تو یہ ہوتا کہ جدھر حق جاتا ہے ادھر عمر جاتے ہیں اور فرمایا جا رہا ہے کہ جدھر عمر

جاتے ہیں، حق ادھر جاتا ہے --- یہ انتہائی مقام ہے --- اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر ہی مبتدی بھی چلے۔ لیکن جب اس مشق کے بعد منتہی ہوتا ہے پھر وہ جدھر جاتا ہے حق ادھر ہی جاتا ہے اس لئے قلب پاک اور مطمئن بن جاتا اس میں وہ چیز ہی آتی ہے جو حق ہوتی ہے ناحق چیز نہیں آتی۔

انبیاء علیہم السلام کے خدام میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ جدھر جھک جائیں حق بھی ادھر جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان تو بہت بلند و بالا ہے۔

بہر حال نبی کریم ﷺ کا قول و فعل اور سکوت سب شریعت ہے اس لئے کہ وہ پاک ہی پاک ہے، خیر ہی خیر ہے --- تو اس فن کا موضوع، اقوال نبیؐ، افعال نبیؐ اور رضائے نبویؐ ہے۔

غرض کتاب

اس کے پڑھنے کی غرض وغایت کیا ہے؟

رضائے خداوندی حاصل کرنا، آخرت کی کامیابی اور دنیا کی فلاح ہے۔ دارین کی فلاح اگر حاصل کرنی ہو تو فن حدیث کی طرف آدمی متوجہ ہو۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہے جیسے ہم اور آپ اور دنیا کا کوئی بھی انسان بغیر نبی کے توسل کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

وساطت حدیث

اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ بیچ میں نہ ہو تو کوئی بھی خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام ہی کا صدقہ ہے کہ بیچ میں آکر بندے کو خدا سے جوڑ دیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ادھر بھی واسطہ، ادھر بھی واسطہ۔ ادھر مخلوق میں شامل، ادھر اللہ سے واصل۔ تو بیچ میں جو بھی آجائے گا اسے اللہ سے واصل کر دیں گے۔ بغیر نبی کے واسطے کے کوئی بھی انسان خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی طرح سے لوگوں کا عمل کا علم قرآن سے نہیں جڑ سکتا۔ جب تک بیچ میں کلام رسول ﷺ کا واسطہ نہ ہو۔ تو حدیث نبوی قرآن سے لیتی ہے، فقہاء کو دیتی ہے۔ اگر فقیہہ کے کلام اور قرآن کریم کے بیچ میں حدیث نہ ہو تو فقہاء کا کلام قرآن کریم سے نہیں جڑ سکتا جیسے افراد اللہ سے بغیر نبی کے واسطے نہیں جڑ سکتے ایسے ہی کلام الناس بھی بغیر کلام رسول کے واسطے کے کلام خداوندی سے نہیں جڑ سکتا --- تو حدیث بیچ میں واسطہ ہے۔ قرآن سے لیتی ہے اور فقہاء کو دیتی ہے۔

بیان القرآن

اسی واسطے حدیث کو بیان قرآن کہا گیا ہے --- ایک قرآن ہے اور ایک بیان قرآن ہے۔ قرآن کریم تو وہ کلمات اور الفاظ ہیں جو منزل من اللہ ہیں ان کے معنی بھی نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر خود ہی اللہ تعالیٰ نے اتارے۔ تو قرآن لفظوں اور معنی کا مجموعہ ہے۔ لفظ بھی منزل من اللہ ہیں اور معنی بھی منزل من اللہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی فکر اور سوچ سے قرآن کے معانی متعین کئے ہوں کہ جو مطلب یہ سمجھے --- اس مطلب کو بھی اللہ ہی نے واضح کیا ہے۔ تو لفظ بھی اللہ کے ہیں معنی بھی اللہ کے ہیں۔

چنانچہ ابتداء میں یہ تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو جلدی جلدی رٹنا شروع کر دیتے کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ؎

لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ

''آپ جلدی نہ کریں۔ آپ کو یہی تو ڈر ہے کہ آپ بھول نہ جائیں''۔

فرمایا ؎

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ

ہمارے ذمہ ہے کہ ہم آپ کے سینے میں جمع بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ اس کی فکر نہ کریں ؎

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ

جب ہم قرات کریں ۔۔۔ از خود یا بواسطہ ملک کے ۔۔۔ آپ سنتے رہیں۔ ہمہ تن گوش ہو کر اسے جذب کر لیں ۔۔۔ دھیان نہ کریں' نہ عقل لڑائیں نہ حواس کو دخل دیں۔ صرف جذب کریں۔ آگے اس کا جمع کرنا' پڑھوانا اور جمع کر دینا یہ ہمارے ذمہ ہے ۔۔۔ تو الفاظ سے جمع کرنے کی اور زبان سے پڑھوا دینے کی گارنٹی حق تعالیٰ نے دی۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ

اس کے بعد پھر فرماتے ہیں ؎

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا بھی کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی مراد کیا ہے ۔۔۔ تو نبی کریم ﷺ الفاظ میں بھی امین ہیں اور معنی میں بھی امین ہیں۔ پوری امانت کے ساتھ آپؐ نے اللہ کے کلمات بھی پہنچا دیئے اور حق تعالیٰ کے کلام سے جو مرادات ہیں' وہ بھی بندوں تک پہنچا دیں۔ تو آپؐ امین ہی امین ہیں۔

اہمیت فن حدیث

بہر حال قرآن کریم اور کلام فقہاء کے درمیان اگر اتصال کا واسطہ ہے تو وہ حدیث ہے۔ اگر حدیث بیچ میں نہ ہو تو کلام فقہاء کا حدیث سے کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا۔ جیسا کہ بندوں اور خدا کے درمیان اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ نہ ہو تو کوئی بندہ اپنے خدا سے مربوط نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے اسلام میں فن حدیث کی اہمیت ہے۔ اور یہ دنیا میں اعلیٰ ترین اور اشرف ترین فن شمار کیا گیا ہے ۔۔۔ تو اس فن میں اعلیٰ ترین کتاب یہ ہے' جس کا نام بخاری ہے۔ جسے اللہ اور بندے کے درمیان امام بخاریؒ نے حجت قرار دیا ہے ۔۔۔ وہ آج شروع ہو رہی ہے۔ شروع میں اس میں چند مباحث ہیں۔ جو اکثر حضرات اساتذہ بیان کرتے ہیں۔

حمد و نعت سے ابتداء نہ کرنے کی وجہ

پہلی بات تو یہ کہ عام کتابوں کا طریقہ یہ ہے کہ کتابیں حمد و نعت سے شروع کی جاتی ہیں۔ خطبہ

ماثورہ ہوتا ہے۔ الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ الخ اس میں حمد ہوتی ہے نعت بھی ہوتی ہے۔ جناب نبی کریم علیہ پر صلوۃ وسلام ہوتا ہے۔امام بخاریؒ نے یہ نہیں کیا بس بسم اللہ سے کتاب شروع کردی۔۔۔ تو ایک عام شبہ اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے عام مروجہ طریق کے خلاف کیوں کیا۔۔۔؟ لیکن حقیقت میں یہ کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ اس لئے کہ سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ اس اعتراض کا منشاء کیا ہے۔امام بخاریؒ نے کس حدیث یا نص کی خلاف ورزی کی ہے بظاہر ایک رواج کی خلاف ورزی کردی' تو رواج کوئی حجت قاطعہ تو نہیں تھا کہ امام خواہ مخواہ اس کی پابندی کرتے؟ تو اصل منشاء کیا ہے؟

تو منشاء یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ

کل امر ذی بال لم یبداء ببِسْمِ اللّٰہ تعالیٰ فھو اقطع

جو مہتم بالشان کام خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ مقطوع البرکۃ ہوتا ہے۔ یہ حجت تھی۔۔۔ لیکن چھ طریقوں سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے اس کے کلمات مختلف ہیں ایک صیغہ کل امر ذی بال لم یبدا بسم اللّٰہ فھو اقطع. دوسرا صیغہ یہ ہے کل امر ذی بال لم یبدا بسم اللہ الرحمن الرحیم فھو اقطع۔۔۔ تیسرا صیغہ یہ ہے کل امر ذی بال لم یبدا بذکر اللّٰہ تعالیٰ فھو اقطع اسی طرح سے اور بھی ہیں جو تقریباً چھ صیغے ہیں۔ تو سب میں قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ "ذکر اللہ" سے آغاز کیا جائے۔ اس میں بسم اللہ بھی آ گئی اسم اللہ بھی آ گیا ذکر اللہ بھی آ گیا۔ ان کا قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے آغاز ہو۔۔۔ تو مصنف نے بسم اللہ سے آغاز کر دیا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ بسم اللہ بھی تو ذکر ہے اور اعلیٰ ترین ذکر ہے۔ پھر انہوں نے شبہ کیا کہ اگر لکھ دیتے تو کیا حرج تھا؟۔۔۔ تو سوال یہ ہے کہ نہ لکھتے تو کیا حرج تھا۔۔۔۔؟

حدیث میں یہ ہے کہ کل امر ذی بال لم یبدا لاخ کوئی مہتم بالشان کام جس کو ذکر اللہ سے شروع نہ کیا جائے مقطوع البرکت ہے۔ تو اس حدیث میں لم یبداء کا لفظ ہے لم یکتب کا لفظ تو نہیں ہے کہ کوئی امر ذی بال کے شروع میں اگر بسم اللہ نہ لکھی جائے وہ مقطوع البرکت ہوتا ہے لم یبدا شروع نہ کیا جائے۔۔۔ اب خواہ زبان سے شروع کردے' لکھ کر شروع کردے' دل سے شروع کر دے۔۔۔ حدیث پر عمل ہو جائیگا۔ تو مصنف نے اگر نہیں لکھا تو حمد وثنا زبان سے کہہ دی ہوگی۔

ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ

اور میں تو یہ کہتا ہوں۔۔۔ کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا مگر۔۔۔ بہر حال قواعد فن کے بھی خلاف نہیں۔۔۔ کہ امام بخاریؒ کا طریق یہ ہے جو راویوں نے نقل کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے مکہ مکرمہ (زادہا اللہ شرفاً وکرامتاً) میں سولہ برس گزارے ہیں اور وہیں بخاریؒ کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس دوران میں اور بھی سفر ہوئے مگر مستقر مکہ مکرمہ رہا یہاں بیٹھ کر بخاری کی تکمیل کی ہے اور تکمیل بھی اس طرح سے کی ہے۔۔۔ کہ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے۔ پھر دو رکعت نفل پڑھتے۔ جب انشراح ہو جاتا تب حدیث نقل کرتے تو ہر حدیث کو نماز اور غسل سے شروع کیا ہے۔ اور نماز اذکار عشرہ کا

مجموعہ ہے۔ نماز کے اندر بسم اللہ بھی ہے' اعوذ باللہ بھی ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھی ہے' تکبیر بھی ہے' تحمید بھی ہے' تسبیح بھی ہے' تہلیل بھی ہے جو اذکار عشرہ کہلاتے ہیں اور دین میں معروف ہیں۔ وہ سارے اذکار جمع کئے طاعت وعبادت کی ساری ہیئتیں جمع کیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ آپ۔۔۔ یہ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے ابتداء نہیں کی۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری نے ایک ایک حدیث میں نماز اور اذکار عشرہ سے ابتداء کی ہے۔ اس سے زیادہ اور آپ امام بخاریؒ سے کیا چاہتے ہیں؟۔۔۔ اگر کتاب میں اذکار عشرہ نہیں لکھے۔ تو ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ کئے ہیں۔ اس کے بغیر حدیث نہیں لکھی۔ لم یکتب کا لفظ تو ہے نہیں لم یبد اکا لفظ ہے اور بدایت اس طرح سے کی کہ ایک ایک حدیث کے لکھنے سے پہلے نماز پڑھ لی۔ ہر نماز میں سارے اذکار ادا کئے تو آپ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے شروع نہیں کیا میں کہتا ہوں کہ ہر ہر حدیث کو اذکار عشرہ سے شروع کیا ہے۔ اس کی کوئی نظیر بتلائے۔ یہ کیا اعتراض کی بات ہوئی۔۔۔؟ غرض اس میں مصنفؒ پر کوئی شبہ نہیں پڑتا۔

ابتداء کتاب میں اتباع سنت کا اہتمام

اب آگے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اذکار میں بسم اللہ بھی داخل ہے' الحمد للہ بھی داخل ہے تو بسم اللہ ہی کی کیوں تخصیص کی؟ الحمدلله نحمده کیوں نہ لکھ دیا۔۔۔؟ اس قسم کے سوالات حالانکہ ہوتے ہیں کہ لکھا کیوں نہیں؟ فقط بسم اللہ ہی کیوں لکھی؟۔

تو میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی امام بخاریؒ نے اتباع سنت کیا ہے۔۔۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ منبر پر وعظ اور خطاب فرماتے تو پورا خطبہ ماثورہ پڑھتے الحمدلله نحمده و نستعينه ونستغفره الخ اور جب سلاطین کو دعوت اسلام کا فرمان بھیجتے تو اس میں فقط بسم اللہ ہوتی تھی اس کے بعد من محمد بن عبدالله ورسوله الى فلان' الى فلان۔۔۔ تو عادت کریمہ یہ تھی کہ خطبات اور مواعظ کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورا خطبہ ماثورہ پڑھتے اور فرامین لکھتے تو فقط بسم الله پر اکتفاء فرماتے۔۔۔ تو امامؒ نے دیکھا کہ حدیثیں فی الحقیقت فرامین ہیں جو امت کے نام بھیجے گئے ہیں۔ تو بسم اله الرحمٰن الرحيم سے ابتداء کی۔

ترجمۃ الباب اور حدیث میں مناسبت

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔۔۔ وہ یہ کہ باب رکھا كيف كان بدء الوحى وحی کا آغاز کیسے ہوا۔۔۔؟ اور حدیث لائے انما الاعمال بالنيات۔۔۔ دوسری حدیث میں جس میں وحی کی کیفیت ذکر کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وحی اس طرح سے میرے اوپر آتی ہے یاتینی مثل صلصلة الجرس جیسے گھنٹہ بجانے کے بعد جو گونج پیدا ہوتی ہے بس اس قسم کی آواز سنتا ہوں اس میں سے پھر حروف متمیز ہوتے ہیں۔ تو اگر بداء الوحى کا باب رکھا تھا تو اگلی حدیث لانی چاہئے تھی یہ بیچ میں انما الاعمال بالنيات کا کیا ذکر۔۔۔ تو ترجمۃ الباب میں اور حدیث میں کوئی مناسبت قائم نہیں ہوتی یہ ایک سوال کیا جاتا ہے۔۔۔ حالانکہ مصنفؒ کا طریق یہ ہے کہ ترجمۃ الباب وہ رکھتے ہیں جو بعد میں

حدیث لاتے ہیں۔ تو حدیث میں اور ترجمۃ الباب میں کامل مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ کہاں بَدْأ الوحی اور کہاں انما الاعمال بالنیات کہ عمل نیت سے ہوتا ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو کامل مناسبت ہے۔ اس واسطے کہ نبی ﷺ کے قلب مبارک پر جب وحی آتی ہے۔ تو نبی کے قلب میں پہلا جذبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اسے امت تک پہنچاؤں۔۔۔ یہی تو نیت تھی۔۔۔ نبی ﷺ کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس وحی کا تحمل بھی کروں اور امت کیلئے اس وحی کی ادائیگی بھی کروں۔ نزول وحی کے وقت انبیا علیہم السلام کی یہی دو نیتیں ہوتی ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت سب سے پہلی چیز جو قلب نبوت میں آتی ہے وہ نیت ہے یہ وحی کا انجذاب ہے۔ تو بداء الوحی کو انما الاعمال بالنیات سے کامل مناسبت ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں وحی کے اترنے کے قت یہ نیت تھی کہ میں اسے جذب کرو۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ رٹنے لگتے تھے جس سے حق تعالیٰ نے روک دیا کہ ۔

لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ

"آپ ﷺ جلدی نہ کریں۔ ہم آپ کے قلب مبارک میں جمع کر دیں گے۔"۔

تو قلب مبارک میں نیت تو یہ آئی کہ میں اس وحی کو اپنے اندر جذب کرلوں اور ایسا یادر کھوں کہ بھول نہ سکوں۔۔۔ تو سب سے پہلی نیت نبی کے قلب میں یہ آتی ہے کہ اس کا تحمل کرلوں اور اسے جذب کرلوں' اسے جزء نفس کرلوں۔۔۔ اس کے بعد دوسری نیت یہ ہوتی ہے کہ اسے مخلوق کی طرف پہنچاؤں اور اس امانت کو ادا کر دوں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ وحی کو نیت سے کامل مناسبت ہے۔ اس واسطے اگر بدء الوحی کے نیچے انما الاعمال بالنیات لائے تو کامل مناسبت پیدا ہوگئی کہ یہی حدیث لانی چاہئے۔ تو پوری مناسبت ہے۔ یہ کوئی شبہ و اعتراض کی بات نہیں۔

كيف كان بداء الوحى۔

"وحی کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟"

کس طرح سے وحی آتی؟ یہ تو اللہ کا فعل ہے کہ کس طرح سے وحی بھیجی؟ نبی کا فعل یہ ہے کہ جب وحی آئی تو نبی نے کیا نیت کی۔۔۔؟ یہ کہ اس کا تحمل بھی کروں اور ادائیگی بھی کردوں۔ تو نیت اور وحی میں کامل مناسبت ہے۔

مثلاً آپ کے سامنے اگر وحی قرآنی پیش کی جائے یا وحی حدیث ہی پیش کی جائے تو سب سے پہلے آپ کے دل میں نیت ہی تو آتی ہے کہ اسے مان لوں۔ ماننے کے بعد یہ نیت آتی ہے کہ اس پر عمل بھی کروں' اس کے برکات اور فوائد بھی حاصل کروں۔ تو وحی کو نیت سے اتنی مناسبت ہے کہ درجہ اول میں وحی ہے اور درجہ دوم میں نیت ہے۔ بالکل مطابقت ہے۔

امام کا تفقہ

تو امام بخاری نے كيف كان بداء الوحى کا باب رکھ کر پھر حدیث انما الاعمال بالنیات کا ذکر کیا اس سے کمال مناسبت ظاہر ہوتی ہے کہ وحی نمبر اول

ہے اور نیت نمبر دوم ہے تو ان میں کامل تطبیق ہے۔ اس واسطے بداء الوحی کے تحت میں حدیث مذکور کا آنا بر محل اور بہت موزوں ثابت ہوا۔

اس سے گویا امام بخاریؒ کے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو امام بخاریؒ فقط محدث ہی نہیں تھے بلکہ فقیہ بھی تھے۔ فقط روایت ہی سامنے نہیں آتی تھی بلکہ درایت بھی سامنے تھی۔ حدیث کے الفاظ ہی سامنے نہیں تھے بلکہ حدیث کے معانی اور حدیث کے حقائق اور معارف بھی ان کے قلب میں موجود تھے۔ تو امام بخاریؒ روایت اور درایت دونوں کے جامع ہیں۔۔۔ اس واسطے علماء لکھتے ہیں کہ فقه البخاری فی تراجمه۔۔۔ امام بخاریؒ کا فقہ اگر دیکھنا ہو تو ان تراجم کو دیکھو جو باب رکھتے ہیں 'مثلاً یہی بب کیف کان بداء الوحی' باب الایمان' باب الصلٰوۃ وغیرہ۔۔۔ اور ان کے نیچے روایتیں لاتے ہیں۔۔۔ تو امام بخاریؒ کا اگر فقہ دیکھنا ہو تو ابواب و تراجم کو دیکھ لو۔ اس سے تفقہ معلوم ہوگا۔

درجۂ اجتہاد

یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ویسے معروف تو یہ ہے کہ وہ شافعی ہیں اور اکثر اعمال میں ہیں بھی شافعی۔۔۔ لیکن احادیث میں جب غور کیا جاتا ہے اور ان کی رائے معلوم ہوتی ہے تو بعض راؤں میں فقہ حنفی کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض میں امام شافعیؒ کی فقہ کو اور بعض میں امام مالکؒ کی فقہ کو۔۔۔ مختلف مذاہب کی ترجیحات ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحب اجتہاد ہیں۔ خود مستقل ان کی ایک رائے ہے۔ تو محض مقلد ہی نہیں بلکہ مجتہد بھی ہیں۔ جس درجہ کا بھی اجتہاد ہو مگر اجتہاد ہے۔۔۔ تو ان کا تفقہ تراجم وابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ باب کیف کان بداء الوحی یہ ترجمہ ہے اور اس کے نیچے انما الاعمال بالنیات کی حدیث لائے اس سے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وحی اور نیت کی کیسی تطبیق ان کے قلب مبارک میں آئی کہ وہی حدیث ذکر کی جو بداء الوحی کے ساتھ زیادہ مناسب تھی۔ بہر حال امام بخاریؒ نے اگر بسم اللہ سے آغاز کیا تو اتباع سنت کیا۔ ابتداء میں میں بداء الوحی کا ذکر لائے تو مادۂ شریعت کا ذکر کیا جس کا مقام اولیت کا ہے پھر بداء الوحی کے ساتھ انما الاعمال بالنیات کو لائے اس سے تفقہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کتنی کامل مناسبت ہے۔

تشریح حدیث

اس کے بعد حدیث نقل کی۔

انما الا عمال بالنیات و انما لامرء مانوی فمن کانت هجرته الی الله و رسوله فهجرته الی الله ورسوله وفمن کانتْ هجرته الی دنیا یصیبها اوامراة یتزوجها فهجرته الی ماهاجر الیه.

اصل کلی

اس حدیث کے تین جز ہیں۔ سب سے پہلا جز انما الاعمال بالنیات ہے۔ یہ ایک اصل کلی ہے جس میں کسی عمل کی طرف اشارہ نہیں۔ حاصل اس کا یہ کہ

عمل نیت سے ہے۔ نیت اچھی عمل اچھا۔ نیت بری عمل برا۔ عمل نیت کے تابع ہے۔۔۔ بعض نے کہا ہے کہ

انما ثواب الاعمال بالنیات

عمل پر جو ثواب ملتا ہے وہ نیت ہی سے ملتا ہے اور بعض نے کہا

انما صحة الاعمال بالنیات

جب تک نیت نہ ہو عمل صحیح نہیں ہوتا۔

ہر ایک پر اعتراض پڑتا ہے اس واسطے کہ شریعت کے بعضے اعمال ایسے ہیں کہ نیت نہ ہو تب بھی شریعت معتبر مان لیتی ہے ایک شخص جنبی ہے بانیت کے دریا میں کود گیا۔ شریعت نے اس عمل کو معقول سمجھا۔ وہ پاک ہو گیا۔ نماز ادا کر سکے گا یا ایک شخص نے وضو کیا نیت کچھ نہیں کی۔ لیکن اس کا وضو مفتاح صلوٰۃ بن جائے گا۔ شریعت اس کو معتبر مانے گی۔ تو یہ کہنا کہ **انما صحة الاعمال بالنیات** عمل نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتا یہ چلنے والا اصول نہیں ہے بہت سے اعمال ایسے ہیں جو صحیح ہو جاتے ہیں اور شریعت میں معتبر ہو جاتے ہیں حالانکہ نیت نہیں ہوتی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عمل کا ثواب اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نیت نہ ہو۔ اگر بلا نیت کے وضو ہوا تو مفتاح صلوۃ بن جائے گا۔ مگر اجر نہیں ملے گا جب تک تقرب نہ ہو۔ نماز اس درجہ میں صحیح ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عام یہ ہے کہ جیسی نیت ویسا عمل' نیت اچھی تو عمل اچھا' نیت بری تو عمل برا۔۔۔ توجود **الاعمال یا صحته الاعمال** تو صحیح نہیں ہوگا۔۔۔ البتہ ثواب الاعمال اس درجہ میں صحیح ہوگا یا پھر اعتبار کا لفظ (مقدر مانا جائے) کہ **انما تعتبر الاعمال بالنیات**۔۔۔ عمل کا اعتبار نیت سے ہے جیسی نیت ویسا عمل۔۔۔ بہر حال سب معنی محدثین نے ذکر کئے ہیں۔ تو پہلا جملہ **انما لاعمال بالنیات** یہ ایک اصل کلی ہے۔ اس میں کسی عمل کا ذکر نہیں۔ جو بھی عمل ہو وہ **انما الاعمال بالنیات** کے نیچے آجائے گا' تو ایک اصل کلی ذکر فرمایا۔

انتفاع نیت

اس کے بعد دوسرا جملہ وانما امرء مانوی ہے جیسی نیت کرے گا' وہی صلہ ملے گا۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ کیونکہ جب آپ نے نیت کی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اس نیت پر کوئی فائدہ بھی مرتب ہوگا یا خالی نیت ہی کرانی ہے۔ کوئی ثمرہ مرتب ہوگا یا نہیں؟ یا قلب کا ایک تخیل ہے کہ ہم نے نیت کرلی۔

تو دوسرے جملے میں اس کا جواب دیا کہ نہیں' اس کا انتفاع بھی ہوگا۔ اگر نیت اچھی ہے تو عند اللہ عمل معتبر ہے۔ اس پر اجر و ثواب مرتب ہوگا اور جیسی نیت کی وہی اس کو ملے گا۔ اگر اللہ و رسول کی قربت کی نیت کی ہے تو تقرب مل جائے گا۔ اگر دنیوی مصالح کی نیت کی ہے تو وہ مصلحت مرتب ہو جائے گی۔ مگر نیت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ضرور اس پر ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔

ابتداء و ظہور عمل

اسی واسطے شرعی طور پر فرمایا گیا کہ:

نیتہ المرء خیر من عملہ

''آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے''۔

یعنی عمل کا آغاز نیت سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل عمل کرتا ہے جو نیت ہے۔ اس کے بعد ہاتھ پیر عمل کرتے ہیں۔ وہ ہیئت عمل ہے۔ تو سب سے اول عمل کی ابتداء قلب سے ہوتی ہے اور وہ نیت کی صورت میں ہے۔ تو جس نے عمل کی نیت کرلی گویا اس نے اپنے دل سے عمل کرلیا۔ عمل کا ظہور نہیں ہوا وہ ہاتھ پیر ہوگا۔ مگر اس پر بھی نفع مرتب ہوتا ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ایک شخص نے نیت کی کہ فلاں نیک کام کروں۔ ابھی کیا نہیں تو فرشتہ لکھ دیتا ہے کہ ایک نیکی کرلی۔ اس پر آخرت میں ثواب مرتب ہوگا۔ تو مطلق نیت پر بھی ثواب مرتب ہوتا ہے۔ اگر بدی کی نیت کی تو قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک بدی لکھ دیتے مگر نہیں لکھی جاتی۔ اگر نیت بدل گئی کہ اس بدی کو نہیں کروں گا تو اس رک جانے پر ایک نیکی لکھ دیتے ہیں کہ یہ بھی ایک حسنہ اور نیکی ہے۔ یہ قلب ہی قلب سے معاملہ چل رہا ہے۔ اور نیت پر ثمرات مرتب ہو رہے ہیں۔ تو پہلا جملہ ثواب و عذاب سے قطع نظر محض ایک اصول تھا کہ جیسی نیت ویسا عمل دوسرے جملے میں انتفاع کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رائیگاں نہیں بلکہ جیسی نیت ہوگی ویسے ثمرات مرتب ہوں گے وانما لامرء مانوی جیسی نیت کرے گا وہ آگے آجائے گی۔ دنیا کی نیت کرے گا دنیا آجائے گی۔ آخرت کی نیت کرے گا آخرت آجائے گی۔

ثمرات نیت

جن کے واقعہ میں یہ حدیث ارشاد فرمائی گئی ۔۔۔ یعنی حدیث کا شانِ نزول وہ صحابی ہیں جنہوں نے اس نیت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ فلاں عورت مالدار ہے 'ام قیس اس کا نام ہے' اس سے نکاح بھی کریں گے دولت مند ہے کوئی مال بھی حاصل ہوگا ۔۔۔ یہ نیت کی اور ہجرت کی ۔۔۔ اس پر ارشاد فرمایا گیا:

انما الاعمال بالنیات وانما لامرء مانوی

''جو نیت کی ہے وہ ملے گا۔ اگر عورت کی نیت کی ہے وہ مل جائے گی''۔

مگر خدا نہیں ملے گا۔ اگر خدا کی نیت کی ہے تو خدا ملے گا۔ جیسی نیت ویسا ثمرہ ۔۔۔ تو دوسرے جملہ میں ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ یہ نیت رائیگاں نہیں جاتی بلکہ اس سے انتفاع ہوتا ہے دنیا اور آخرت کا اس سے آدمی نفع اٹھاتا ہے۔

واقعہ جزئی

چنانچہ اس صحابی کا لقب ہی ''مہاجر ام قیس'' مشہور ہو گیا کہ یہ ام قیس کے مہاجر تھے جو مدینے گئے اور عورت کی نیت کی۔ بعد میں نیت درست کی ہوگی توبہ کی ہوگی۔

غرض پہلا جملہ اصل کلی ہے دوسرا جملہ اس اصل سے انتفاع کا بیان ہے کہ آدمی نیت سے

منتج ہوگا۔ جیسی نیت کی ہوگی ویسے ثمرات سامنے آئیں گے۔

اور تیسرا جملہ ایک جزوی مثال کا ہے۔

فمن کانت هجرته الی اللّٰه ورسوله فهجرته الی اللّٰه و رسوله ومن کانت هجرته الی دنیا یصیبها اوالی امراة یتزوجها فهجرته الی ماهاجر الیه.

تو پہلے جملے میں اصول بیان کیا گیا دوسرے جملہ میں انتفاع بیان کیا گیا اور تیسرے جملے میں جزوی مثال بیان کی گئی۔

جامعیت حدیث

اور ظاہر بات ہے کہ یہی تین درجے ہیں کہ جن سے ایک دعویٰ منضبط اور مرتب ہوتا ہے کہ پہلے دعویٰ کرو، پھر اس کی غرض وغایت بیان کرو۔ پھر اس کی ایک حسی مثال بیان کرو۔ تو دعویٰ منقح اور ثابت ہو جاتا ہے۔۔۔ تو یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ جس کا حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چھ چیزیں مجھے عطاء کی ہیں جو پچھلے انبیاء کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے **اوتیت جوامع الکلم** مجھے جامع جملے دیئے گئے ہی کہ چھوٹا جملہ بولتا ہوں اور علوم کے دریا اس کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ہزارہا ہزار مسائل اس سے نکل آتے ہیں۔ تو یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کہ تین جملے ہیں اور تینوں میں تین علوم ہیں اور الگ الگ تین فوائد ہیں۔ ایک اصل کلی، ایک انتفاعی کلیہ اور ایک مثال جزوی۔۔۔ غرض یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے جس کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا تھا۔

غور کیا جائے تو اس ایک حدیث پر عمل ہو تو آدمی کامیاب ہے۔ ہر چیز میں نیت کر لیا کریں۔ تو دنیا بھی دین بنتی چلی جائے گی۔ لباس پہنتے ہوئے اگر یہ نیت کر لیں کہ حکم خداوندی کی تعمیل کر رہا ہوں ' بدن چھپانا واجب ہے ' اب یہ عبادت بن گیا۔ اس پر اجر و ثواب مرتب ہوگا۔۔۔ کھانا کھاتے ہوئے نیت کر لے کہ تقویٰ علی العبادت کے لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو اللہ کو یاد کروں ' پھر یہ سارا کھانا عبادت میں داخل ہو جائے گا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ نیت کرے کہ اتباع سنت یہ ہے کہ گھر میں سلام اور اللہ کے نام سے داخل ہو تو میں اتباع سنت کر رہا ہوں یہ گھر میں داخل ہونا عبادت بن جائے گا۔ تو پوری دنیا کو دین بنا لینا یہ نیت سے ممکن ہے۔۔۔ بری نیت ہو تو عبادت بھی بری کی اور اعلیٰ نیت ہو تو عادت بھی عبادت بن جاتی ہے۔

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے بھی ہے۔ اور دین کا نچوڑ ' اس میں گویا بیان کر دیا ہے کہ دین کا آغاز نیت ہی سے ہوتا ہے۔۔

آدمی جب اسلام قبول کرتا ہے تو اس کی نیت یہی تو ہوتی ہے کہ خدا کے دین میں داخل ہو جاؤں۔ تو نیت سے دین کا آغاز ہوا۔ آگے عمل کا درجہ اب باقی ہے۔۔۔ یہ جوامع الکلم میں سے بھی ہے اور یہ حدیث دین کا اصل الاصول بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کو امام بخاریؒ ابتداء لائے۔

ضروری تنبیہ

دوسرے یہ بھی ایک فائدہ ہے کہ امامؒ طلباء کے لئے گویا اشارہ کر رہے ہیں کہ جو بخاری پڑھنے کے لئے بیٹھے ہیں' وہ سب ابھی سے اپنی نیت درست کر لیں کہ بخاری کیوں پڑھ رہے ہیں کہ میں محدث کہلاؤں تو شہرت طلبی مقصود ہوئی' خدا طلبی مقصود نہ ہوئی۔ اگر کوئی اس لئے پڑھ رہا ہے کہ اس کے ذریعے سے دنیا کماؤں تو دنیا حاصل ہو گی آخرت نہیں ملے گی۔۔۔۔ اس واسطے امامؒ نے گویا ابتداء اس کو روایت کر کے طالبان علم کے لئے تنبیہ کی ہے کہ سب سے پہلے اپنی نیت درست کر لو کہ کیوں بخاری پڑھ رہے ہو؟ تمہاری غرض وغایت کیا ہے؟ جیسی اخیر تک نیت کرو گے' وہی ثمرات مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔۔۔۔ تو جوامع الکلم میں سے بھی ہے' دین کی اساس بھی ہے اور ایک مختصر نصیحت جو پورے انسانوں کے دین کے لئے ہے اور جامع بھی ہے۔۔۔ اس واسطے امام بخاریؒ کا تقویٰ اور زہد اور اس کے ساتھ ذکاوت اور فطانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ کیسے عجیب طریق پر مصنفؒ نے اپنی کتاب کا آغاز کیا۔ تو یہ چند جملے میں نے عرض کر دیئے۔ طالب علموں کے سامنے تو یہ جملے دس منٹ میں ادا ہو سکتے تھے۔ مگر چونکہ دوسرا مجمع بھی تھا اس واسطے قدرے تفصیل بھی کی۔ ورنہ درس کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ درس میں تو مختصر اور مجمل الفاظ ادا کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ دس منٹ کے بات تھی۔۔۔۔ مگر جیسے مخاطب ہوں گے تو تھوڑی تفصیل کرنی پڑے گی۔

بہر حال اس تفصیل میں بھی کچھ فنی چیزیں آگئیں' کچھ احادیث آگئیں۔ کچھ امامؒ کی عظمت و جلالت شان آئی' کچھ کتاب کی عظمت و جلالت شان آئی اور کچھ آغاز کتاب کی برکت کا بھی ذکر آ گیا۔ تو یہ سب چیزیں جمع ہو گئیں۔

دعا

اب آیئے سب حضرات مل کر دعا کریں اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو تادیر قائم رکھے۔ جس کے ذریعے سے دین پھیل رہا ہے۔ اور حجاز مقدس میں علم کا چرچا ہے اور جو بھی طلباء داخل ہوں وہ اپنے علوم سے متمتع ہوں۔ حق تعالیٰ انہیں باکمال بنا کر وہاں تک پہنچائے۔ جیسا کہ اب تک اس دارالعلوم "مدرسہ صولتیہ" سے بہت سے علماء اور فضلاء نکل چکے ہیں اور انہوں نے دین کے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔

اللھم ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

اللھم انا نسئلك علما نافعا و عملا صالحا ورزقا واسعا و شفاء من كل داء

اللھم ربنا اتنا من لدنك رحمة وهيئى لنا من امرنا رشدا

ربنا اتنا فى الدنيا حسنة وفى الاخرة حسنة وقنا عذاب النار وادخلنا الجنة

مع لابرار يا عزيز يا غفار.

برحمتك يا ارحم الراحمين.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تعلیم و تدریس

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو پڑھایا۔ صحابہؓ نے تابعینؒ کو پڑھایا اور تابعین نے تبع تابعین کو پڑھایا، یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا۔ یہ تعلیم ہی سے پہنچا ہے۔ محض علم سے نہیں پہنچا۔ علم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، وہ آپ کی ذات بابرکات کے ساتھ خاص ہے۔ اگر آپ تعلیم نہ دیتے تو ہم کیسے عالم بنتے؟ ہم تک علم کیسے پہنچتا؟ تو تعلیم و تعلم میں منحصر ہے۔ یہی افضلیت کی وجہ ہے جس نے انسان کو کائنات پر بڑھادیا۔ ورنہ متعلم تو حیوانات میں بھی ہے۔ تھوڑے بہت کا فرق ہے۔ آپ میں زیادہ ہے ان میں کچھ کم ہے لیکن ہے مگر معلم کوئی نہیں۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

الحمدُ للّٰہ نحمدُہٗ و نستعینُہٗ ونستغفرُہٗ ونؤمنُ بہٖ ونتوکّلُ علیہِ. ونعوذُ باللّٰہ مِنْ شُرُورِ انفُسنا وَمنْ سیّاٰتِ اعمالِنا من یّھدِہِ اللّٰہُ فلامُضلّ لہٗ ومنْ یُّضْلِلْہُ فلاھادی لہٗ ونشْھدُانْ لّآ الٰہ الاّ اللّٰہُ وحْدَہٗ لاشریْکَ لہٗ ونشْھدُانّ سیدنا وَسندنا ومولٰنا مُحمّدا عبدُہٗ ورسُوْلُہٗ ارسلہُ اللّٰہُ الی کآ فّۃ لّلنّاس بشیْراً ونذیْرا وّداعیاً الیْہِ باِذْنِہٖ وسرَاجاً مُّنِیْراً.............. امّابعْدُ..............

فاعُوْذُباللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیْم، بسْم اللّٰہِ الرّحْمٰن الرّحیْم. مَاکَان لبشرٍانْ یُّؤْ تِیَہُ اللّٰہُ الکتٰب والحکْم والنُّبُوّۃ ثُمّ یقُوْلَ للنّاس کُوْنُوْا عبادالّی منْ دُوْن اللّٰہ ولٰکنْ کُوْنُوْاربّٰنیّٖن بما کُنْتُمْ تُعلّمُوْن الکتٰب وبما کُنْتُمْ تدْرُسُوْن ہ صدقَ اللّٰہُ العلیُّ العظیْمُ۔

احوال واقعی

بزرگانِ محترم!

جس مبارک جامعہ کا افتتاح آج کیا جا رہا ہے اور یہ ایک برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے کیا جا رہا ہے۔ یعنی حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے اسم گرامی کی طرف منسوب کر کے یہ جامعہ قائم کی جا رہی ہے۔ یہ ہم سب کے لئے

خوش قسمتی ہے کہ تعلیم گاہ قائم ہو اور کسی برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے قائم ہو' یہ خود ایک عظیم ترین نعمت ہے۔۔۔اسی سلسلہ میں یہ آیت میں نے تلاوت کی ہے اور اس سلسلے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں اور وہ مختصر وقت میں ہی انشاء اللہ پوری ہو جائیں گی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ تو وقت دیا گیا ہے۔ شاید یہ بھی پورا نہ ہو سکے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ ان چند باتوں کو محدود وقت کے اندر اندر عرض کر دوں۔

شرف انسانی کے بارے میں دعویٰ شریعت

ایک بڑا مسئلہ علماء میں یہ زیر بحث رہا ہے کہ انسان جو ساری کائنات میں افضل ترین نوع ہے اور اس کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ شریعت نے بھی اس کا دعویٰ کیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ عقل بھی اس کی شاہد ہے اور مشاہدات بھی اس کے شاہد ہیں۔ شرع' عقل اور حس تینوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان افضل الکائنات ہے' اشرف المخلوقات ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ ۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا.

"ہم نے انسان کو مکرم اور معظم بنایا اور بر و بحر میں اس کو اٹھایا' بلند کیا اور اونچا لیا اور بہترین پاکیزہ رزق اس کے کھانے کے لئے دیا اور اسے بہت بڑی فضیلت دی۔۔۔ جتنی بھی چیزیں ہم نے پیدا کیں ان میں اسے فضیلت دی"۔

تو انسان کی افضلیت اور اشرف المخلوقات ہونا اس آیت سے پوری طرح ثابت ہے اور یہ دعویٰ قرآن کریم کا ہے۔

شرف انسانی کے بارے میں دعویٰ عقل

عقل بھی اس کی شاہد ہے کہ انسان ساری کائنات پر بلند اور برتر ہے۔ اس لئے کہ ساری کائنات میں یہی تصرف کرتا ہے۔ کائنات اس کے اندر تصرف نہیں کرتی ہے۔ زمین' آسمان' سورج' چاند ساری چیزیں اس کے استعمال میں ہیں۔ ہر چیز میں اس کے تصرفات ہیں۔

زمین کو نہ صرف کھود سکتا اور اس کے مکانات بنا سکتا ہے بلکہ اس کی خصوصیت پر بھی قبضہ ہے۔ اس کے خواص و آثار سے طرح طرح کی چیزیں ایجاد کر رہا ہے۔ سورج کی روشنی اور گرمی سے صرف فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کی شعاعوں اور حرارت سے مشینوں سے طرح طرح کی چیزیں بنا کر استعمال کر رہا ہے۔ نہ صرف سیارات کی روشنی اور گرمی سے فائدہ اٹھا رہا ہے بلکہ ان سے [illegible]

تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے اور آلات تیار کر رہا ہے۔ گویا سیاروں کی ذوات میں بھی تصرف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جو اور فضاء میں بھی اس کے تصرفات ہیں، زمین پر بھی تصرفات ہیں، سمندروں میں بھی تصرفات ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَلَكُمْ مَافِى السَّمٰوٰتِ وَمَافِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَةً ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً

فرماتے ہیں کہ

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمینوں اور آسمانوں کو کام میں لگا دیا ہے۔ جو کچھ زمین میں اور آسمانوں میں خزانے ہیں سب انسان کے کام میں آتے ہیں اور اللہ نے اپنی نعمتیں انسان کے لئے کامل اور مکمل کر دیں۔

کسی نوع کے لئے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا جو انسان کے لئے کیا گیا۔ تو افضل بھی کہا گیا، متصرف بھی کہا گیا، موجد بھی کہا گیا۔۔۔ تو یہ ایک دعویٰ ہے۔

حکماء کی نظر میں وجہ اشرفیت

سوال یہ ہوتا ہے کہ انسان کیوں افضل ہے؟ اس کی فضیلت کی خصوصیت اور بنا کیا ہے؟ بہر حال کوئی تخصیص ہوگی جو اوروں میں نہیں پائی جاتی ہوگی جس کی وجہ سے یہ سب سے بلند و بالا بن گیا۔

حکماء اور فلاسفہ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ انسان میں ایک جوہر ہے جو دوسری چیزوں میں نہیں ہے اور وہ عقل ہے۔ اسی لئے منطقی اس کی ''حیوان ناطق'' سے تعریف کرتے ہیں۔ یعنی ایسا جاندار جو معقولات کا پابند اور پانے والا ہے۔ یعنی عقل سے امور دریافت کرتا ہے جو اور چیزوں میں نہیں ہے۔ اس واسطے انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا تو بناء اشرفیت عقل ہے جو اس کے اندر ہے۔ یہ عام طور سے فلاسفہ اور حکماء کا دعویٰ ہے۔

حکماء کے نظریئے کی غلطی

لیکن میں سمجھتا ہوں یہ دعویٰ کچھ نامکمل ہے۔ فی الجملہ صحیح بھی ہے لیکن محض عقل پر بنیاد رکھ دینا، یہ انسان کی فضیلت کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل تھوڑی بہت جانوروں میں بھی موجود ہے۔ عقل سے انسان قیاس ہی تو کرتا ہے کہ ایک معلوم چیز پر قیاس کر کے نامعلوم کا حکم معلوم کرے۔۔۔ تو عقل کا سب سے بڑا کام قیاس اور استنباط ہے کہ انہونی چیز کو ایک موجود شے میں سے نکالے۔ عقل یہ کام کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جانور بھی یہ کام کر سکتے ہیں کہ ایک شے کا جو حکم ان کے ذہن میں ہے قیاس

کر کے دوسری شے پر لگا دیں گے۔ ایک کتا ایک جگہ موجود ہو آپ اسے لاٹھی مار دیں۔ دوسرے دن اس جگہ نہیں آئے گا۔ اس نے قیاس کیا کہ کل گیا تھا تو یہ حرکت ہوئی تھی آج جاؤں گا تو آج بھی وہی ہو گی۔ یہ عقل نہیں ہے تو اور کیا ہے ؟ اگلے دن کی مار پٹائی کو اس نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ وہ تو پہلے ہی دن پٹ چکا تھا۔۔۔ دوسرے دن کی مار پٹائی سے جو بچ رہا ہے یہ محض فہم اور عقل کی وجہ سے ہے۔ سمجھتا ہے کہ جو واقعہ کل ہوا تھا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ آج بھی وہی ہو گا۔ تو انسان قیاس کرتا ہے تو کتا بھی قیاس کرتا ہے۔ اس میں بھی عقل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان میں زیادہ عقل ہے اس میں کم ہے تو زیادتی اور کمی کی بات تو یہ ہے کہ خود انسانوں کی عقلیں برابر تھوڑا ہی ہیں۔ بعضے حکیم گزرے ہیں' بعضے نہایت غبی' بعضے بلید انسان ہیں' بعضے تیز فہم ہیں۔ بعضوں کی عقل بہت اعلیٰ' بعضوں کی بہت ادنیٰ جب خود آپ کی نوع میں عقلوں کا تفاوت اور کمی وبیشی کا فرق مراتب ہے اور کم عقل والے کو بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی عقل مند ہے تو اس سے کم تھوڑی سی کتے میں ہو گی تو اسے کیوں نہیں کہتے کہ یہ بھی عقل مند ہے۔ تھوڑی سی عقل ہے گو آپ کے برابر نہ سہی۔ تو انسان محض یہ دعویٰ کر کے بیٹھ جائے کہ میں ہی عقل مند ہوں' دوسرے میں عقل نہیں ہے یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور لومڑی کی چالاکی وہوشیاری تو مشہور ہے اور بندر کی عیاری سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ایسی چالاکیاں کرتا ہے کہ بعض دفعہ انسان بھی زچ ہو جاتے ہیں۔۔۔ بہر حال مطلقاً عقل وشعور ہر جاندار کو دیا گیا ہے۔ کمی وبیشی کا فرق ہے جیسے خود ہی نوع انسان میں ہے جانوروں میں بھی کمی وبیشی کا فرق ہے' اس لئے افضلیت کی بناء محض عقل پر رکھنا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جب کہ یہ جوہر دوسروں میں بھی موجود ہے چاہے کم ہی درجہ کا ہو۔

علم محض بھی وجہ شرافت نہیں

اس لئے بعض حکماء نے دعویٰ کیا کہ عقل بناء افضلیت نہیں۔ بناء افضلیت علم ہے۔ جانوروں کو علم نہیں دیا گیا' انسانوں کو علم عطاء کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی بناء صحیح نہیں ہے فی الجملہ صحیح ہے مگر اس پر ہم دار ومدار نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے کہ خود قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ جانوروں کو دیا گیا ہے۔

انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کو بھی علم حاصل ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

کُلٌّ " قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ

"ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی اور تسبیح کو جان لیا ہے"۔

تو نہ صرف آپ نماز پڑھتے ہیں بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ نماز پڑھتا ہے اور جانور بھی اپنی نماز کو

جاہلانہ طریق پر نہیں پڑھتے۔ قد علم میں قد کلمہ تحقیق کا ہے اور ماضی پر داخل ہو رہا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ یقیناً ہر شے نے جان لیا ہے۔

اور لفظ کل کے اندر جمادات بھی آتے ہیں نباتات بھی آتے ہیں حیوانات بھی آتے ہیں۔ تو شریعت سب کے لئے علم ثابت کر رہی ہے اور علم بھی شریعت کا۔ یعنی سب اپنی اپنی تسبیح اور نماز جانتے ہیں۔

شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ نمازی ہے نماز پڑھتا ہے مگر ہر ایک کی نماز اس کے مناسب حال ہے لکھتے ہیں کہ:۔

درختوں کی نماز میں قیام ہے رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ وہ ایک پیر پر کھڑے ہوئے اللہ کی یاد میں مصروف ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ جس طرح آپ نے ہمیں بنایا۔ ہماری اطاعت کا تقاضا ہے کہ ہم یوں ہی بنے رہیں۔ نہ ادھر جھکیں نہ ادھر جھکیں نہ رکوع کریں نہ سجدہ کریں ایک پیر پر کھڑے ہوئے قیام کی حالت میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ اطاعت و فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ یعنی سب کے سب مسلم ہیں۔

"ولہٗ اسلم من فی السمٰوات والارض"۔

یعنی ہر چیز مسلم ہے اور عبادت گذار ہے۔۔۔ تو درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ یعنی ہیئت ایسی بنائی ہے گویا وہ قیام کئے ہوئے ہیں۔

اور لکھتے ہیں کہ چوپایوں کی نماز میں رکوع ہے۔ سجدہ اور قیام نہیں ہے جو چار پیروں سے چلنے والے جانور ہیں۔ ان کی ہیئت بنائی کہ وہ ہمہ وقت رکوع کے ساتھ عبادت میں مشغول ہیں۔ ان کی نماز میں رکوع ہے۔

جتنے حشرات الارض ہیں سانپ بچھو کیڑے مکوڑے ان کی نماز میں سجدہ ہے۔ رکوع اور قیام نہیں ہے۔ وہ اوندھے پڑے ہوئے ہیں گویا ہر وقت اللہ کے سجدہ گزار ہیں۔ اسی میں نماز ادا کر رہے ہیں۔

پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے یعنی گھٹنے ٹیکے ہوئے زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں جیسے نمازی آدمی التحیات میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھتا ہے۔ ان کی نماز میں تشہد ہے۔ تشہد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

جنت اور دوزخ کی نماز میں فقط دعا ہے۔ سوال کرنا اور مانگنا یہ جنت اور دوزخ کی نماز ہے۔۔۔ جنت بھی سوال کر رہی ہے کہ اے اللہ! مجھے بھر دیجئے۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ قیامت کے دن تمہارا پیٹ بھر دیں گے۔

جہنمی جب سارے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے اور جہنم پھر بھی خالی رہ جائے گی تو کہے گی:۔

ھل من مزید ھل من مزید

اور لائیے اور لائیے۔ بھرنے کا وعدہ ہے۔ میں نے عمر بھر پیٹ بھرنے کی دعائیں مانگی ہیں۔ آج میرا پیٹ بھریئے۔۔۔ پہاڑ جھونک دیئے جائیں گے۔ زمین جھونک دی جائے گی۔ پھر بھی کہے گی ھل من مزید۔۔۔ تو حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنی ایڑی اس کے منہ پر رکھ دیں گے تو کہے گی قط قط۔۔۔ بس میں بھر گئی۔ اب مجھ تاب نہیں ہے تو سوال پورا ہو جائے گا۔ جنت کا بھی یہی سوال ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ تمام اہل جنت' جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ہزاروں محلات اور اس کے شہر خالی ہوں گے' وہ کہے گی کہ آپ کا وعدہ ہے مجھے بھر دیجئے' تو حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا فرمائیں گے جس سے جنت کی آباد کاری ہوگی' اس کا سوال پورا کیا جائے گا۔۔۔ تو جنت و دوزخ کی نماز دعا مانگنا اور سوال کرنا ہے۔

فرشتوں کی نماز صف بندی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں رکوع میں ہیں' کروڑوں سجدے میں ہیں۔ کروڑوں حالت قیام میں ہیں' کروڑوں بیت المعمور کے طواف میں مشغول ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔

تو فرشتوں کی نماز صف بندی ہے کہ ترتیب دار کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت ادا کر رہے ہیں۔ رکوع سے ہو یا سجدے اور قیام سے ہو۔

جتنے سیارے ہیں جو چکر کھا رہے ہیں' جیسے فلاسفہ قدیم کے کہنے کے مطابق سورج گردش میں ہے اور فلاسفہ حال کے دعویٰ کے مطابق زمین گردش میں ہے۔۔۔ بہر حال زمین کو بھی وہ ایک سیارہ مانتے ہیں اور چاند و سورج کو بھی سیارہ مانتے ہیں اور ممکن ہے کہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں گردش میں ہوں۔۔۔ ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ جہاں سے چلے پھر پھرا کر وہیں پھر لوٹ آئے۔ پھر وہاں سے چلے پھر وہاں لوٹ آئے۔ یہ گردش اور چکر یہی ان کی نماز ہے۔

تو کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنی ہیئت اور خلقت کے مطابق نماز اور تسبیح و تہلیل میں مشغول ہے۔ احادیث میں وہ تسبیحات بتلائی گئی ہیں جو مختلف جانوروں کی ہیں کہ تیتر بولتا ہے تو اس کی یہ تسبیح ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ کما تدین تدان۔۔۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ بعض جانور کہتے ہیں۔ سبحان الملک القدوس جانوروں کی مختلف تسبیحات آتی ہیں کہ مور یہ کہتا ہے' تیتر یہ کہتا ہے' طوطا یہ کہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سیٹیاں بج رہی ہیں۔ حقیقتاً یہ تسبیح و تہلیل ہے مگر ان کی زبان میں ہے۔

اسی کو فرماتے ہیں:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلاَّ یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لاَّ تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ

کوئی شے کائنات کی ایسی نہیں ہے جو تسبیح میں مشغول نہ ہو تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی

زبان میں کہہ رہے ہیں۔۔۔ اور آپ اپنے ہی بھائیوں کی زبان کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی انگریزی میں تسبیح پڑھے تو آپ کیا سمجھیں گے؟ پشتو زبان میں کوئی تسبیح پڑھے آپ اسے کیا سمجھیں گے؟۔۔۔ جن لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے انسان آتے ہیں۔ پشتون آدمی اپنی پشتو میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ بنگالی آدمی اپنی بنگلہ زبان میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ پنجابی' پنجابی زبان میں دعائیں مانگ رہا ہے۔ دوسرا اس سے نابلد ہے وہ سمجھ رہا ہے کہ خدا جانے کیا گڑبڑ ہو رہی ہے۔ لیکن اس گڑبڑ میں بہت سے علوم ہیں' بہت سے اذکار ہیں' بہت سی تسبیحات ہیں جو پوری

جیسے تار برقی والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب تار دینے جاتے ہیں اسے مضمون بتادیا آپ کے سامنے سوائے اس کے کہ وہ پیتل کی ایک کلی کے اوپر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے کچھ نہیں اور آپ کہیں گے کہ عجیب احمق آدمی ہے۔ میں آیا تھا کہ اس مضمون کو یہ بذریعہ تار پہنچا دے اور یہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں کہ اس کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں علم پہنچ رہا ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف معلومات منتقل ہو رہی ہیں۔ اگر آپ ان اصطلاحات سے واقف ہو جائیں جن اصطلاحات کو تار برقی والے جانتے ہیں' سارے علوم آپ کے سامنے آجائیں کہ اس کھٹا کھٹ میں کیا پوشیدہ ہے۔۔۔ اسی طرح اگر پرندوں کی بولیوں سے آپ واقف ہو جائیں تو سمجھیں گے کہ کس طرح عظیم الشان تسبیح و تہلیل اور ذکر اللہ ہے جو ان کی زبان پر جاری ہے۔

جن کو حق تعالیٰ نے معجزانہ طریق پر سمجھا دیا وہ جانتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ

اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلا دی گئی ہیں۔ وہ بتلا دیتے تھے کہ یہ کوا یہ کہہ رہا ہے۔ یہ کبوتر یہ بول رہا ہے۔۔۔ اللہ نے ہمیں جانوروں کی بولیاں سکھلا دی ہیں۔ لیکن کسی کالج اور اسکول کے ذریعہ سے نہیں۔ اعجاز کے طور پر ان کی زبانوں کا دل میں الہام کر دیا تو

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کا ایک لغت ہے۔ انسانوں کا بھی ایک لغت ہے۔ ہندی کا اور لغت' سندھی کا اور لغت پنجابی کا اور لغت۔ اسی طرح تیتر اور طوطے کا الگ الگ لغت ہے۔ یہ سارے اپنی اپنی لغات میں تسبیح و تہلیل کرتے ہیں۔۔۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ محض علم کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہو تو علم تو پرندوں کو بھی ہے جانوروں کو بھی ہے اور علم بھی تسبیح و تہلیل اور شریعت و نماز تک کا علم ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آپ کی نماز کو اللہ نے مکمل کر دیا تو آپ کی نماز میں درختوں کا سا قیام

بھی ہے‘ چوپایوں جیسار کوع بھی ہے۔ حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت و دوزخ کی سی دعا مانگنا بھی ہے۔ فرشتوں کی سی صف بندی بھی ہے اور سیاروں کی سی گردش بھی ہے اس لئے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں ہے۔ دو رکعت کے معنی یہ ہیں کہ جو کام پہلی رکعت میں کریں گے لوٹ کر پھر دوسری رکعت میں وہی کریں گے۔ تو آپ کی نماز کے اندر گردش بھی ہے۔ اگر آپ کے لئے گردش نماز ہے تو آفتاب کے لئے گردش نماز کیوں نہیں ہو سکتی؟ اگر آپ کا ایک رکعت سے دوسری رکعت کی طرف جانا اور چکر کھانا عبادت ہے تو زمین اگر چکر کھانے لگے تو وہ کیوں عبادت نہیں ہو گی؟ بہر حال عبادت کے طریقے مختلف اور اس کا علم بھی مختلف ہے۔ تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بناء نہیں ہو سکتی کہ آپ کو علم ہے۔

علم و عقل میں اگر انسان اور دیگر مخلوقات میں کچھ فرق ہے تو خود انسانوں میں بھی باہم فرق ہے

اور علم محسوسات تو بہت معمولی چیز ہے ایک گدھے میں بھی ہوتا ہے آپ سورج کو دیکھتے ہیں‘ گدھا بھی سورج کو دیکھتا ہے۔ آپ کو بھی حس ہے اسے بھی حس ہے۔ آپ زمین دیکھ رہے ہیں وہ بھی دیکھ رہا ہے تو احساسات میں جانور اور انسان برابر ہے۔ اس میں سے چیزیں نکلنا نتیجے پیدا کرنا یہ عقل سے تعلق رکھتا ہے تو تھوڑی بہت عقل جانوروں کو بھی ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر اس علم کا مرتبہ ہے کہ آپ احکام خداوندی کو جان گئے۔ یہ مرتبہ جانوروں کو بھی نصیب ہے۔ بہت سے بہت آپ اس مرتبے میں کامل سہی۔ وہ ناقص عالم الکل ہوتے تو اس جامعہ قاسمیہ ہی کے قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس مدرسہ کے قیام کی کیا ضرورت تھی سارے ماں کے پیٹ سے عالم ہی پیدا ہوتے۔ تو سارے ایک درجے کے نہیں۔ تو علم اگر آپ میں ہے تو تھوڑا بہت جانوروں میں بھی ہے۔ عقل اگر آپ میں ہے تو تھوڑی بہت جانوروں میں بھی ہے۔ فہم اگر آپ میں ہے تو ان میں بھی ہے۔ پھر کیا چیز ہے کہ آپ اشرف المخلوقات ہیں؟ آخر آپ کو کیوں دعویٰ ہے کہ ہم ہی سب سے افضل ہیں؟

آپ کہیں گے کہ ہم مکان بناتے ہیں تو کوا کہے گا کہ میں بھی گھونسلہ بناتا ہوں۔ آپ کہیں گے کہ میں کئی منزلہ مکان بناتا ہوں تو بھیا ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے وہ کہے گا میں مکان بناتا ہوں جس میں ایسی ایسی بلڈنگ ہوتی ہے۔ اس میں باتھ روم الگ ہے‘ سونے کا کمرہ الگ ہے اور بچوں کا کمرہ الگ اور جھولا الگ اور کیسا پر تکلف اور مضبوط مکان؟ یعنی دو تین گھاس کے تار ہوتے ہیں جس سے وہ اپنے گھر کو کیکر میں تانتا ہے۔ آندھیاں چلیں بارشیں آئیں‘ طوفان آئے کیکر اکھڑ کر گر جائے گا مگر کیا مجال ہے کہ گھونسلہ ٹوٹ جائے۔ اتنی پکی بلڈنگ بنتی ہے اور اس میں کمرے اور خانے ہیں۔ تو آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہو گیا کہ ہم بڑے انجینئر ہیں وہ کہے گا کہ میں بھی انجینئر ہوں۔ میں بھی کئی منزلہ

مکان بناتا ہوں۔

شہد کی مکھی کہے گی کہ میں تم سے زیادہ کاریگر ہوں۔ اس لئے کہ وہ شہد کے چھتے میں ہشت پہلو سوراخ بناتی ہے۔ آپ پرکار سے بھی ایسے برابر برابر سوراخ مشکل سے بنائیں گے وہ بلا پرکار کے اپنے منہ سے اپنے صحیح انداز سے بناتی ہے۔۔۔ پھر اس میں تقسیم عمل ہے کہ ایک حصہ میں شہد بھرا ہوا ہے۔ جو قوم کی خوراک ہے۔ ایک حصہ میں بچے ہیں اور ایک میں ماں باپ ہیں۔ یہ ساری کارروائیاں جو آپ کرتے ہیں وہ بھی کرتی ہے۔ اگر آپ کے ہاں وزیر خوراک ہے' تو ان کے ہاں بھی وزیر خوراک ہے۔

آپ کہیں گے کہ صاحب ہم تنظیم ملت جانتے ہیں۔ ہمارا ایک صدر اور پریزیڈنٹ ہے۔ وزیر اعظم ہے۔ جانوروں کو کہاں نصیب؟ شہد کی مکھی کہے گی کہ میرے ہاں بھی سب کچھ موجود ہے۔ امارت بھی ہے۔ عربی زبان میں جو سب سے بڑی مکھی ہوتی ہے ایسے یعسوب کہتے ہیں۔ اس کے اشاروں پر پوری مکھیاں حرکت کرتی ہیں۔ وہ جہاں جا کے بیٹھے گی ہزاروں مکھیاں وہیں بیٹھیں گی۔ وہیں شہد کا چھتہ بنے گا۔ مجال نہیں کہ یعسوب چلی جائے اور قوم نہ جائے۔ پھر تنظیم ملت کا یہ عالم ہے کہ مجرموں کو سزا دینا اور مطیعوں کو سرفراز کرنا' یہ بھی مکھیوں میں موجود ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں شہد کا چھتہ ہوتا ہے اس کے نیچے کچھ مکھیاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہوتی ہیں۔۔۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے درخت پر بیٹھ کر آئی اور زہریلا عرق چوس کر آئی ہے وہ امیر یعسوب فوراً پہچان لیتا ہے یہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اگر یہ یہاں بیٹھ گئی اور اس نے شہد میں ملادیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی تو اس کی گردن توڑ کر اسے نیچے پھینک دیتا ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ امیر نے قتل کر دیا۔ لیکن قوم میں ایجی ٹیشن نہیں ہوتا کہ امیر کو برطرف کرنے کے لئے نعرے لگا کر کھڑی ہو جائے۔ ساری کہتی ہیں کہ ہماری خیر خواہی کے لئے کیا ہے۔ ہمارے اندر اتنا علم نہیں ہے جتنا اس کے اندر ہے۔ یہ قوم کے بھلے برے کو جانتا ہے۔ لہٰذا اس کے قتل پر راضی ہیں۔ یہی قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الْأَلْبَابِ

ایک کو قتل کرتے ہیں تاکہ قوم زندہ ہو جائے۔۔۔ یعسوب بھی یہی کہے گا کہ ایک قتل کرتا ہوں تاکہ پوری قوم میں زندگی باقی رہے۔ اگر میں نے اسے باقی چھوڑ دیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔

تو علم سیاست اور علم تنظیم ملت بھی ان میں ہے۔ انجینئری اور مکان سازی بھی ہے۔ آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا کہ انجینئر تو ہم ہیں۔ سیاسی ہیں تو ہم ہیں۔ تنظیم ملت کرتے ہیں تو ہم کرتے ہیں یہ تو سارے جانور کرتے ہیں۔

بطخیں جب آتی ہیں تو ہمیشہ مثلث ہو کر آتی ہیں دو قطاریں اور آگے آگے ان کا امیر ہوتا

ہے۔ جیسے پریڈ کے میدان میں فوجیں قطار باندھ کر جاتی ہیں اور لیفٹیننٹ کی آواز پر چلتی ہیں۔ وہی شان بطخوں کے اندر ہے۔۔۔ جب جھیل پر بیٹھتی ہیں۔ تو ان کا امیر جو بطخا ہوتا ہے۔ وہ پوری رات ایک پیر پر کھڑا ہو کر گزارتا ہے تاکہ میری پوری قوم آرام سے سوئے تکلیف میں اٹھاؤں۔ اس لئے کہ عیش کرنے کا نام امارت نہیں ہے۔ امارت قوم کے لئے تکلیف اٹھانے کا نام ہے۔ میری قوم کو راحت پہنچے۔ اس لئے پوری رات امیر تکلیف اٹھاتا ہے۔۔۔ ذرا خطرہ دیکھا تو وہ ایک آواز لگاتا ہے اس پر ساری بطخیں چوکنا شروع ہو جاتی ہیں' دوبارہ آواز لگاتا ہے تو پر تولنے لگتی ہیں اور تیسری دفعہ جو اس نے آواز لگائی تو ایک دم راستہ چلنا شروع کر دیتی ہیں۔۔۔ جیسے فوجی کمانڈر گویا بگل بجا دیتا ہے اور اس میں اصطلاحات ہیں کہ پہلے بگل پر تیار ہو جائیں' دوسرے پر وردیاں پہن لیں' تیسرے پر ہتھیار آراستہ کریں اور چوتھے پر مارچ کرنا شروع کر دیں۔ وہی ان کے اندر قاعدہ ہے تو آپ کو خواہ مخواہ یہ دعویٰ ہو گیا کہ ہم ہی جنگی لوگ ہیں ہم ہی امیر الحرب ہیں ہم ہی حربی علوم سے واقف ہیں۔ وہ عربی عوم سے بھی واقف ہیں۔ حربی علوم سے بھی واقف ہیں۔ ان میں بھی دونوں قسم کے علوم ہیں تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بناء نہیں ہو سکتی۔

آپ کہیں گے صاحب! ہم تو بڑے عمدہ کپڑے بناتے ہیں۔ کھانے بڑے عمدہ کھاتے ہیں۔ بھلا گدھا پلاؤ زردہ کہاں کھاتا ہے۔ ہم کھاتے ہیں لہذا ہم اشرف المخلوقات ہیں۔۔۔ میں کہتا ہوں یہ تو آپ جب کہیں جب گدھے کو آپ کے زردہ پلاؤ پر لالچ آیا ہو۔ جس طرح آپ اس کی گھاس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ آپ کے پلاؤ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ اپنی نوع کے مطابق غذا کھاتے ہیں وہ اپنی نوع کے مطابق' تو نوعیت میں فرق ہوا۔ کھانے اور بھوک میں تو فرق نہیں آیا' آپ کا بھی جذبہ ہے۔ اس کا بھی جذبہ ہے۔ بہر حال نہ کھانا شرافت کی وجہ ہو سکتی ہے۔ نہ مکان بنانا اور نہ انجینئری وجہ شرافت ہے۔ نہ علوم سیاسیہ آپ کی افضلیت کی دلیل ہو سکتی ہے۔ ان میں بھی سیاست موجود ہیں۔۔۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم بڑے بڑے طبیب ہیں علاج کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں بھی بڑے بڑے اطباء موجود ہیں۔ مجھے راجپوتانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے خسر مولوی محمود صاحب مرحوم ریاست اندر گڑھ میں وزیر تھے۔ وہاں چونکہ ہندو راج تھا تو بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی اور یہ بندر بڑا نقصان کرتے۔ ذرا کمرہ کھلا رہ گیا تو کوئی برتن لے گیا کوئی کپڑے لے گیا۔ روز یہ قصہ ہوتا۔ اور یہ ایسا موذی جانور ہے کہ یہ نہیں کہ کپڑا لے گیا بلکہ منڈیر پر بیٹھ کر دکھا دکھا کے اسے پھاڑتے۔ جیسے چڑا رہا ہو۔ خواہ مخواہ بھی غصہ آتا مگر اب بس کی بات بھی نہیں تھی مار بھی نہیں سکتے تھے۔ چھپ چھپا کر دو چار بندر مارے اور راتوں کو باہر پھینکوا دیئے۔ مگر اس سے بندروں میں کمی تھوڑا ہی آتی تھی۔ اگلے دن پھر موجود اور پھر وہی قصہ۔

ہم نے یہ ارادہ کیا کہ سو پچاس ایک دم مر جائیں۔ کچھ تو کمی ہو گی اور ہمارا دل بھی ٹھنڈا

ہوگا۔ تو ہم نے چار روپے کا سنکھیا خریدا اور کئی سیر آٹے میں ملا کر اس کی روٹیاں پکوائیں اور انہیں چھت پر پھیلا دیا اور ہم دیکھنے بیٹھ گئے اور تصور یہ تھا کہ بندر آتے جائیں گے' کھاتے جائیں گے' مرتے جائیں گے اور ہم خوش ہوتے جائیں گے۔

مگر دو تین بندر آئے۔۔۔ بندر تو تو بڑا سیانا جانور ہے۔ اس نے دیکھا کہ روٹیاں پھیلی پڑی ہیں۔ روٹیوں کی یہ حالت ہوتی نہیں کہ وہ پھیلی پڑی ہوں کوئی بات اس کے اندر ہے۔۔۔ اب وہ کم بخت بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہے۔ روٹی اٹھانے کے لئے آگے نہیں بڑھتا۔ دو تین آئے تھے' وہ چلے گئے۔ ہم یہ سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی۔ یہ کم بخت کچھ سمجھ گئے۔۔۔ انہوں نے اپنے شہر یا بستی میں جا کر اطلاع کی ہوگی تو وہاں سے چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر اور آئے اور انہوں نے آکر یہ دیکھنا شروع کیا۔۔۔ گویا ان کے اندر کوئی بات ہے اور اور ان کی سمجھ میں آ نہیں رہی۔ وہ بھی آخر چلے گئے۔ اس کے دس پندرہ منٹ کے بعد پچاس ساٹھ بندروں کی قطار بڑے بڑے موٹے چوہدری قسم کے لوگ آئے اور وہ روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گویا گول میز کانفرنس منعقد کی کہ اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ روٹیاں کیوں پھیلی پڑی ہیں۔ اس میں کیا بھید ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے ڈر کے مارے آگے کوئی نہیں بڑھتا۔۔۔ خیر ایک بڑا بوڑھا بندر آگے بڑھا۔ اس نے روٹی کو توڑ کر سونگھا دوسرے نے توڑا۔ اس نے بھی سونگھا۔ تیسرے نے توڑا اس نے بھی سونگھا' اب گویا یہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور پچاس کے پچاس بھاگ گئے۔ ہم نے سمجھا کہ تدبیر فیل ہوگئی مگر وہ ہم سے زیادہ چالاک تھے۔ کوئی دس بیس منٹ گذرے ہوں گے تو کوئی سو دو سو بندروں کی ایک قطار اور ہر ایک یک ہاتھ میں ایک ایک ہری ٹہنی جس میں پتے بھی تھے۔ وہ لئے چلے آرہے ہیں۔ ایک لشکر چلا آرہا ہے اور ٹہنیاں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ کمبخت آئے۔ آکر انہوں نے روٹیوں کے ٹکڑے کئے۔ اس لئے کہ بندروں کی تعداد زیادہ تھی اور روٹیوں کی تعداد کم تھی۔

نیم نانے برخورد مرد خدا
بذل درویشاں کند نیمے دگر

درویش لوگ تھے۔ انہوں نے کہا خود غرضی ٹھیک نہیں۔ بانٹ کر کھاؤ' سب کو مل جائے تو مناسب ہے تو تعداد کے مطابق ٹکڑے کئے اور اس کے بعد ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھایا اور اوپر سے پتے چبائے اور دندناتے ہوئے چلے گئے۔ ان میں سے بے ہوش بھی کوئی نہیں ہوا' مرنا تو بعد میں ہے۔ تو وہ اچھے خاصے عقل مند ہوئے اور بے وقوف ہم ثابت ہوئے کہ چار روپے بھی گئے سنکھیے کی خریداری ہوئی۔ آٹا بھی خراب ہوا اور وقت بھی گیا اور بات وہیں کی وہیں رہی وہ اطمینان سے چلے گئے۔۔۔ انہیں گویا ایک ایسی جڑی بوٹی معلوم تھی جس میں تریاقیت موجود تھی۔ جو زہر کو مارنے والی تھی۔ انہوں نے وہ زہر کا لقمہ کھایا۔ اور اوپر سے وہ تریاقی پتے کھالئے۔ کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ آپ کو

خواہ مخواہ دعویٰ ہے کہ طبیب ہم ہیں۔ ان میں بھی اطباء ہیں۔ وہ بھی جڑی بوٹیوں کی خاصیت جانتے ہیں۔ آپ سو کی جانتے ہیں وہ دو چار کی جانتے ہوں گے۔ اتنا فرق ہے مگر جاننے والے وہ بھی ہیں۔

بہر حال علوم طبیہ لیجئے علوم شرعیہ یا علوم حسیہ لیجئے۔ سب میں جانوروں کا حصہ ہے۔ تو آپ خواہ مخواہ مدعی بن بیٹھے کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں اس لئے کہ ہم عالم ہیں۔۔۔ ان میں بھی سارے نمونے موجود ہیں تو یہ سوال بدستور باقی ہے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ عقل محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم کی نوعیتیں کافی نہیں کہ علم کی انواع مختلفہ ان میں بھی موجود ہیں۔ پھر آخر کیا بناء ہے؟

تمام مخلوقات میں علم وفہم کے درجات

اگر غور کیا جائے اور انصاف سے دیکھا جائے تو ایک خصوصیت ہے جو انسان میں ہے۔ غیر انسان میں نہیں ہے۔ حتی کہ ملائکہ میں بھی نہیں۔ یعنی عالم تو ملائکہ بھی ہیں۔۔۔ جب حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں ملائکہ کو رکھا اور آدم علیہ السلام سے کہا کہ:۔

اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ

ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ آدم علیہ السلام نے تمام چیزوں کے نام اور خاصیتیں بتادیں اور ملائکہ نے کہا تھا

سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا

بے شک آپ پاک ہیں، ہمیں علم نہیں۔ جتنی آپ نے تعلیم دے دی اتنا ہے۔۔۔ معلوم ہوا کہ ملائکہ کو علم سکھلایا گیا ہے۔ ان کے پاس بھی علم تھا۔ اتنا نہ سہی جتنا آدم علیہ السلام کو دیا گیا۔۔۔ نیز جب جانوروں تک کو علم ہے تو ملائکہ کو تو اور زیادہ ہونا چاہئے۔۔۔ خلاصہ یہ کہ عقل اور علم وفہم ملائکہ میں بھی ہے۔ ان سے کم درجہ کا جنات میں ہے۔ ان سے کم درجے کا حیوانات میں ہے۔ ان سے کم درجے کا نباتات اور جمادات کا ہے۔۔۔ تو انسان کو دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں کہ چونکہ میں عقل رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں، میں علم رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں۔ علم بھی سب میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہے۔

انتقال علوم انسانی خصوصیت ہے

البتہ ایک چیز ہے جو انسان کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ وہ علم نہیں بلکہ تعلیم ہے۔ یعنی دوسروں کو سکھلانا، دوسروں کو بنانا، دوسروں کی تربیت کرنا۔۔۔ یہ نہ ملائکہ میں ہے نہ جنات میں ہے نہ حیوانات میں ہے۔ حیوانوں میں جتنا علم ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا۔ کسی مکتب میں جا کے وہ تعلیم نہیں پاتے۔

آج یہاں جامعہ قاسمیہ قائم ہو رہا ہے۔ آپ نے کبھی سنا کہ آسمان اول پر کوئی جامعہ قائم ہوا اور فرشتے مدرس بن کے بیٹھے یا کسی اور آسمان میں کوئی مدرسہ ہو۔ یا جنات نے کسی ویرانے میں کوئی مدرسہ اور مکتب کھولا ہو؟ یہ صرف انسان کا کام ہے کہ ایک سے دوسرے تک تعلیم کے ذریعے علم منتقل ہوتا ہے۔۔۔ ملائکہ کا علم جو ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے جتنا ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ بس یہ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہے۔ جانوروں میں جتنا علم ہے وہ ان کے اندر سیکھنے سے نہیں آتا من جانب اللہ تکوینی طور پر ان کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ عالم بن جاتے ہیں۔۔۔ لیکن انسان تکوینی علم کے ساتھ ساتھ کسبی علم بھی رکھتا ہے کہ سیکھتا بھی ہے سکھاتا بھی ہے۔ جو اس کے ذہن میں ہے اسے دوسرے کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس علم پر تربیت دیتا ہے۔ ٹرینڈ کرتا ہے' مشاق بناتا ہے۔ یہ معلّمی کی خصوصیات وہ ہے کہ عالم میں انسان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے نہ فرشتوں میں تعلیم وتربیت ہے نہ جنات میں تعلیم وتربیت ہے نہ حیوانات میں ہے۔ گویا انسان میں علم متعدی ہے۔ طوطے کو اگر معلوم ہے تو اس کے اندر ہے۔ دوسرے کو وہ نہیں سکھلا سکتا۔ دوسرے طوطے کو جتنا آئے گا وہ پھر خدا کی طرف سے آئے گا وہ محدود ہے۔ وہ تیسرے طوطے کو نہیں سکھلا سکتا۔

فرشتے میں جو علم آئے گا وہ اس کی ذات کے لئے ہے وہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ انسان کو جو علم ہے وہ اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے وہ اگلوں کو پڑھاتے ہیں' تو ازل کا علم ابد تک چلتا رہتا ہے' یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔۔۔ تو معلّمی' تعلیم و تلقین اور تربیت یہ انسانی خاصہ ہے اور یہ وجہ اشرفیت اور بناء افضلیت ہے۔ انسان کہہ سکتا ہے کہ میں سب سے افضل ہوں کہ جو چیز میرے اندر ہے وہ کسی میں نہیں کہ میں اپنا علم ہزاروں تک منتقل کر سکتا ہوں۔ دوسرے اپنا علم منتقل نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان تک بھی علم منتقل ہو کر نہیں آیا۔ ان کی طبیعت میں مرکوز ہے۔ ان کو اس کا بھی شعور نہیں کہ ہم میں علم ہے مگر ان کے اندر علم ہے۔ اور انسان کو شعور ہے کہ مجھے سو مسئلے معلوم ہیں اور میں ان سو کو دوسرے تک پہنچا سکتا ہوں۔ تو سب سے بڑی انسان کی خصوصیت تعلیم اور تربیت ہے۔ یعنی اکتسابی علم' جدوجہد سے علم حاصل کرنا اور جدوجہد کے ذریعے دوسرے تک علم پہنچانا۔۔۔ تو ایک علم لازم ہے جو سب کے اندر ہے اور ایک علم متعدی ہے وہ صرف انسان میں ہے کہ دیئے سے دیا جلتا رہتا ہے۔ جو علوم آدم علیہ السلام کو عطاء کئے گئے۔ وہ آج تک محفوظ ہیں۔ ہزارہا برس گزرنے کے بعد فطری طور پر منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں نوح علیہ السلام نے جو اضافہ کیا وہ اضافہ بھی آج موجود ہے۔ جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اضافہ کیا وہ بھی محفوظ ہے۔ موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام نے جو علمی اضافے کئے وہ بھی موجود ہیں۔ پھر ان پر تکمیل کا لیبل نبی کریم ﷺ نے لگایا کہ ہر چیز اور علم کے ہر دائرے کو اتنا مکمل کر دیا کہ نوعی طور پر اس میں اب بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔۔۔

ایسے اصول وکلیات بتلائے کہ قیامت تک لاکھوں جزئیات ان کے نیچے سے نکلتی رہیں گی اور انسان ان علوم کے اندر تشنہ نہیں رہے گا۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام کے علوم و کمالات تعلیم ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں' تربیت ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں۔ تو تعلیم وتربیت برابر چلتی رہی ہے اور بڑھتی رہی ہے۔ یہ چیز انسان کے سوا کسی میں نہیں۔ اس لئے کہا جائے گا کہ یہی افضلیت کی بناء ہے کہ یہ معلم ہے۔

عظمت تعلیم نبوی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ۔

انما بعثت معلما

میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یعنی عالم تو آپ اتنے بڑے ہیں کہ کائنات میں کوئی اتنا بڑا علم نہیں' اللہ کے بعد اگر علم میں رتبہ ہے تو نبی کریم علیہ السلام کا ہے۔ تو ایک ہے آپ کا عالم ہونا اور ایک ہے کہ دوسروں کو یہ علم پہنچا کر عالم بنا دینا۔ یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ اپنی حیوۃ طیبہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار (یا کم وبیش) افراد کے مقدس نمونے تیار کر دیئے جو آپ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے آپ کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ آپ کے پسینے پر اپنے قطرات خون چھڑکنے والے تھے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے تیار کر دیئے۔۔۔ یہ تعلیم وتربیت ہی نے تیار کئے۔ تعلیم کے ذریعے مسائل سکھلائے۔ اور تربیت کے ذریعے قلوب کی راہ کو درست کیا' دلوں میں تصرف کیا۔ وہ باطنی تعلیم ہے کہ دل سے دل تک علوم اور کمالات کو پہنچایا۔

بتصرف تعلیم باطن

جیسے حدیث میں ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔۔۔ اور قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

انزل القران علی سبعة احرف

ابتداء میں سات لغات میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تو وہ نماز میں اپنی لغت کے مطابق قرآن پڑھ رہے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو لغت قریش میں قرآن یاد تھا۔ معنی میں تو فرق نہیں پڑتا مگر لغت بدلا ہوا ہے۔۔۔ عرب میں سات بڑے بڑے قبیلے تھے' جن کا لغت فصیح تھا۔ سب سے اعلیٰ ترین قبیلہ قریش کا تھا' پھر بنی تمیم' پھر بنی ہذیل وغیرہ' یہ سب قبائل تھے۔۔۔ اور یہ ایسا فرق تھا جیسا دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں ہے یا دہلی اور حیدر آباد کی زبان میں۔ اردو سب بولتے ہیں مگر لب ولہجے کا فرق' کچھ محاورات کا فرق اور کچھ اصطلاحات کا فرق ہے۔ تو معانی وہ بھی وہی سمجھاتے ہیں جو دہلی والے اور لکھنؤ والے۔ مگر انہی معنی کے سمجھانے کے لئے انکے ہاں اور لغت ہے

ان کے ہاں اور لغت ہے۔ مقصود دونوں کا ایک ہے۔۔ لب ولہجہ الگ ہے۔۔۔ بہر حال ابتداء اسلام میں سات لغت میں قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے اپنی لغت میں قرآن پڑھا۔۔۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے آ کے سننے لگے تو وہ دوسری لغت تھی۔ وہ تو اشدھم فی امر اللہ تھے۔ وہ تو ایک دم شدت تھی' انہوں نے اسی وقت حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی پگڑی اتار کر مشکیں کس دیں اور کہا

منافق! قرآن غلط پڑھتا ہے؟

میں ابھی تیری گردن اڑادوں گا۔ اور گھسیٹتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ اور عرض کیا

یارسول اللہ ﷺ! یہ قرآن غلط پڑھتا ہے۔

آپ نے فرمایا چھوڑ دو۔۔۔ اور حضرت خباب سے فرمایا پڑھو۔ انہوں نے اپنی لغت پر پڑھا۔ آپؐ نے فرمایا۔

ھکذا انزلت

"یوں ہی نازل ہوا"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تم پڑھو!۔۔۔ انہوں نے لغت قریش میں پڑھا۔۔۔ فرمایا

ھکذا انزلت

"یوں ہی نازل ہوا"۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوا کہ یہ کیسا قرآن ہے۔ جو جس طرح پڑھ دے تو فرمادیا جاتا ہے ھکذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔ ریب اور شک کی کیفیت وسوسہ کے درجے میں آئی۔۔۔ آپؐ نے فوراً سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔

یا ابن الخطاب!

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے تمام آسمان مجھ پر منکشف ہو گئے' شرح صدر ہو گیا حقیقت حال سمجھ میں آگئی۔ یہ بھی تعلیم تھی مگر یہ لسانی تعلیم نہیں تھی' باطن کے اندر تصرف تھا۔

دست مبارک کا سینے پر پھیر دینا' قلب پر ہاتھ کا مارنا یہ باطنی تعلیم تھی۔ قلب نبوت کا فیضان ہاتھ کی حرکت سے انکے قلب تک پہنچا' جیسے بجلی کا کرنٹ اس کے اندر سما جائے گا۔ تو قلب کا جو علمی کرنٹ تھا وہ آپؐ نے اپنے دست مبارک کے ذریعے سے پہنچایا یہ باطنی تصرف تھا۔ تو آپؐ نے زبان سے بھی تعلیم دی۔ قلب مبارک کی توجہ سے بھی تعلیم دی۔ دست مبارک کے تصرفات سے بھی تعلیم دی۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام معلمین اولین ہیں جنہوں نے دنیا کو تعلیم

وتربیت دینا سکھلایا۔ یہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جس کی بناء پر یہ افضل ہے۔

نبوت تعلیم ہی ہے

نبوت بھی تو تعلیم ہی کا نام ہے۔ نبی اس لئے آتے ہیں کہ انباء کریں۔ انباء خبر دینے اور علم پہنچانے کو کہتے ہیں۔۔۔ تو نبوت کا حاصل ہی تعلیم وتربیت ہے اور نبوت سے بڑا کوئی مقام نہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔ تو تعلیم وہ خصوصیت ہے جو انسان کے کسی کو نہیں دی گئی۔ جنات و ملائکہ میں کوئی پیغمبر نہیں۔ بلکہ ملائکہ اور جنات انبیاء بشری کے تابع بنائے گئے ہیں۔۔۔ جیسا کہ اس عالم میں یہودی بھی ہیں' نصرانی بھی ہیں' عیسائی بھی ہیں اور مسلم بھی ہیں۔ اسی طرح سے جنات کے اندر یہودی بھی ہیں' عیسائی بھی ہیں' نصرانی بھی ہیں' دہریئے بھی ہیں' ملحد بھی ہیں' بد دین بھی ہیں۔ سب طرح کے موجود ہیں۔۔۔ ان میں پیغمبری نہیں ہے۔ پیغمبر بشر کے اندر ہے اور جنات تابع بنائے گئے ہیں۔ پیغمبری کے معنی سوائے تعلیم وتربیت کے اور کیا ہیں؟ صرف یہ کہ علم پہنچا کر ان کو روشن بنایا جائے اور علم سے منور بنایا جائے۔ تو یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جس سے انسان اشرف الکائنات اور افضل المخلوقات بنا۔

بلا تعلیم انسانیت ختم ہو جاتی ہے

اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب یہ انسان کی خصوصیت ہے۔۔۔ تو خصوصیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب تک وہ خصوصیت رہتی ہے انسان انسان رہتا ہے۔ جب وہ خصوصیت ختم ہو جائے تو انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تعلیم انسان کی خصوصیت ہے تو جب تک تعلیم انسانوں میں موجود ہے۔ انسان انسان رہتا ہے۔ جب تعلیم نکل جائے گی ان کی انسانیت خطرے میں پڑ جائے گی۔۔۔ اور جب تعلیم نہیں رہے گی' علم نہیں رہے گا' تو اور علم جب نہ رہے تو آدمی جمادات و نباتات سے بھی بدتر ہو جائے گا۔۔۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی برتری تعلیم و تعلم سے اور تربیت سے ہی قائم ہے۔ یہ نہ رہے تو انسان انسان نہیں ہے۔

مدارس بقاء انسانیت کا ذریعہ ہیں

آج جو مدارس و مکاتب قائم کئے جا رہے ہیں' یہ دراصل انسانی خصوصیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ انسان کی افضلیت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔۔۔ اگر یہ مدارس قائم نہ کئے جائیں' یہ جوامع قائم نہ کی جائیں اور تعلیم نہ دی جائے اور فرض کیجئے کہ تعلیم مٹ گئی تو انسانیت مٹ گئی یہ تعلیم و تعلم کا سارا جھگڑا انسان کی بقاء کے لئے ہے۔ کیونکہ یہ خصوصیت ہے۔

اس لحاظ سے جامعہ قاسمیہ کا قائم ہونا' یہ ایک سعادت ہے اور مبارک علامت ہے۔ یہ انسانیت کے برقرار رکھنے کا ایک سلسلہ ہے۔ جتنا مضبوط ہوگا اتنی انسانیت مضبوط ہو گی۔ جتنی نیک نیتی اور اخلاص سے تعلیم دی جائے گی' اتنا ہی فی الحقیقت آدمیت کو اونچا بنایا جائے گا۔

علم مستند

اور کوئی علم اس وقت تک اونچا نہیں ہوتا جب تک اس کا انتساب صحیح نہ ہو علم تو ہزاروں ہیں لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ علم مجھے جناب رسول ﷺ سے پہنچا ہے تو وہ علم مستند ہو جائے گا جیسے مہر لگ گئی' پکا ہو گیا۔۔۔ اگر آپ یوں کہیں کہ میری رائے یوں ہے دنیا کہے گی آپ اپنی رائے اپنے پاس رکھیں' ہماری رائے یہ ہے ہر انسان کی الگ الگ رائے ہے۔۔۔ لیکن جب انسان یوں کہے گا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اللہ کے رسول کا کہا ہوا کہہ رہا ہوں جوں ہی گردن جھکا دی جائے تو وہ کہے گا بے شک گردن جھکی ہوئی ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟

برگزیدہ شخصیت کی طرف علم کی نسبت قائم ہو گئی۔ تو علم میں انتساب سے مقبولیت آتی ہے۔ اگر انتساب نہ ہو مقبولیت نہ ہو گی۔

اس کی وجہ فی الحقیقت یہ ہے کہ علم ایک وراثت ہے۔ جیسے حدیث میں آپؐ نے فرمایا:۔

ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن ورثوا العلم

انبیاء (علیہم السلام) اپنے ورثے میں درہم دینار نہیں چھوڑتے' روپیہ پیسہ نہیں چھوڑتے' محلات اور بلڈنگیں نہیں چھوڑتے' وہ اپنے ترکے میں علم و معرفت اور اخلاقی کمالات اور باطنی و ظاہری علوم چھوڑتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے۔

علمی وراثت کی شرط اور فرماتے ہیں:۔

العلماء ورثۃ الانبیاء

علماء اس ورثے کو پاتے ہیں۔۔۔ لیکن وراثت کب ملتی ہے؟

جب نسبت صحیح ہو۔ باپ کا وارث بیٹا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی اس باپ کا بیٹا ہے۔ اور اگر بیٹا ہی یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہی نہیں' پھر کہاں سے وراثت مل جائے گی یا سلسلے کے بیچ میں انقطاع پڑ جائے۔ دادا سے ایک جائداد چلتی آ رہی ہے اس کے باپ تک پہنچی۔ اس نے بیچ میں ایک واسطہ قطع کر دیا۔ تو میراث سلسلے سے آ رہی تھی' جب سلسلہ نہیں رہا' میراث رک جائے گی۔ تو میراث جب ملتی ہے جب مورث اعلیٰ تک سلسلہ یکسانی کے ساتھ قائم ہو' مثلاً علوم دین' علوم اسلام میں اور ان علوم میں جو اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ ہمارے مورث اعلیٰ جناب رسول ﷺ ہیں۔ آپ کی اولین روحانی اولاد صحابہ کرامؓ ہیں۔ صحابہؓ کے بعد دوسری پشت تابعین عظام ہیں۔ تابعین کے بعد

تبع تابعین ہیں۔ تبع تابعین کے بعد پھر آئمہ کرام، علمائے مجتہدین اور محدثین و فقہاء درجہ بدرجہ، طبقہ بطبقہ یہ سب وارث بنتے چلے آرہے ہیں اور ایک سلسلہ قائم ہے۔

تو آج آپ قرآن پڑھیں گے تو یوں کہیں گے کہ قرآن میرا اور میرے باپ کا بنایا ہوا نہیں یہ اللہ کے رسول کا لایا ہوا ہے اور یہ میرا سلسلہ ہے اور میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی، اس نے فلاں سے سنی اور اس نے فلاں سے سنی۔ سلسلہ نبی کریم ﷺ تک پہنچ جائے گا۔ ایک ایک حدیث کی سند محدثین کے یہاں موجود ہے۔

پھر احادیث کی قسمیں ہیں کہ سند اگر شبہ سے بالاتر ہو اور مورث یقین ہو تو وہ حدیث قرآن کے درجے میں آجائے گی جیسے اس کا منکر کافر ویسے اس کا منکر بھی کافر۔۔۔ اگر مورث یقین نہیں ہے مورث ظن ہے تو اس کا منکر کافر نہیں ہوگا مگر فاسق ہو جائے گا اور مبتدع کہلائے گا۔ اگر اس سے بھی کم درجہ ہے یعنی شبہات ہیں تو اس کا منکر نہ کافر ہوگا نہ فاسق، تو حدیث کے علم کا درجہ استناد پر موقوف ہے۔ اسی لئے محدثین نے چار لاکھ افراد کے قریب جو راویان حدیث ہیں۔ ان کی سوانح عمری مرتب کردی کہ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کا کیریکٹر کیسا تھا؟ کس طرح سے یہ حدیث منتقل ہو کر آئی تو ایک مسلمان کو بحمداللہ یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اپنے رسول کے ایک جملے کو سنے گا تو رسول تک سند پہنچا دے گا۔ گویا مطلب یہ ہے کہ اس سند کے ساتھ یہ علم کی وراثت مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ اس لئے میں صحیح معنی میں روحانی طور پر اولاد رسول ہوں اور میں صحیح وارث ہوں۔ تو وراثت تب ملتی ہے جب اوپر سے لے نیچے تک نسب ملا ہوا ہو۔ اگر بیچ میں انقطاع ہو جائے وراثت ختم ہو جاتی ہے۔

تو یہی روحانی وراثت میں بھی ہے کہ علم کی وراثت تب ملے گی کہ یہاں سے لے کر تلمذ اور شاگردی کا سلسلہ قائم ہونا چاہئے کہ یہ میرا استاذ اور یہ ان کے استاذ اور آگے تک سلسلہ پہنچ جائے۔۔ اور وہ بھی بصیرت کے ساتھ یعنی راویوں کے احوال اور کردار کے ساتھ۔

اگر بیچ میں سے آپ خدانخواستہ صحابہؓ کو نکال دیں پھر ہم تک علم پہنچتا ہی نہیں۔ تابعین کو نکال دیں، علم نہیں پہنچے گا۔ اس لئے کہ زنجیر ٹوٹ گئی یا آپ کسی کو استاذ نہ بنائیں اور یوں کہیں کہ میرے اوپر یہ علم آیا ہے پھر تو سرے سے نسب ہی قائم نہ ہوا تو وراثت وہ نہ رہی جو پیغمبر کی تھی۔ کچھ آپ کے وساوس اور کچھ اوہام ہوں گے۔ جن کو آپ نے علم سمجھ لیا۔ علم تو وہ ہے جو سند کے ساتھ منتقل ہو کر آپ تک پہنچے۔

علوم اسلامیہ کی خصوصیت

یہ اسلام کی خصوصیت ہے آج دنیا میں کس قوم کے پاس خدائی کتابوں کی سند موجود ہے؟ اور مسلمانوں میں پیغمبر کے نام تک کی سند موجود ہے۔ وہ روایت یہاں سے لے کر اوپر تک ملا سکتے ہیں۔

اہتمام استناد

اور قرآن و حدیث تو بجائے خود ہے فقہ کی جو کتابیں ہیں ان کی سند موجود ہے۔ اگر امام محمد نے مبسوط لکھا ہے تو مبسوط کی روایت موجود ہے کہ یہ ہمیں فلاں سے پہنچی' انہوں نے فلاں سے سنا اور انہوں نے فلاں سے۔ تصوف کی سند موجود ہے۔۔۔ رسالہ قشیریہ جو تصوف کی بنیادی کتاب ہے۔ جتنے تصوف کے مسائل اور اصطلاحات ہیں ان کی سند جنید و شبلی تک اس میں پہنچائی گئی ہے۔ اور جنید و شبلی سے آگے جناب رسول ﷺ تک۔۔۔ تو یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس امت نے ہر دینی فن کو سند کے ساتھ قبول کیا ہے۔ بلا سند اور بلا حجت کے کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ لفظوں کی بھی روایت کی ہے تو سند موجود ہے۔ مثلاً میں نے قرآن شریف حفظ کیا' اگر میں سند پڑھوں تو اللہ میاں تک سلسلہ پہنچا سکتا ہوں مجھے تجوید کے ساتھ میرے استاذ قاری عبدالوحید خان صاحب نے حفظ کرایا' انہیں تجوید کے ساتھ قاری عبدالرحمن صاحب رحمانی نے حفظ کرایا' انہیں قاری ابراہیم صاحب مکی نے تجوید کے ساتھ حفظ کرایا۔ اس طرح ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تک سند پہنچ جائے گی اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو جناب رسول ﷺ نے حفظ کرایا۔ تو جتنے مجودین اور قراء ہیں ان سب کی سند موجود ہے۔

تصوف کے سلسلہ میں یہ جو شجرے پڑھے جاتے ہیں یہ سند ہی تو ہے کہ میں نے فلاں شیخ سے بیعت کی۔ اس نے فلاں سے کی' اس نے فلاں سے کی اور سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچ دیتے ہیں اور پھر نبی کریم ﷺ تک۔ تو یہ جو شجرہ ہے یہ در حقیقت نسب نامہ ہے یہ رواۃ کا سلسلہ ہے۔ تو فقہاء کے ہاں الگ سند' محدثین کے ہاں الگ سند' قراء اور مجودین کے ہاں الگ سند' صوفیاء کے ہاں الگ سند ہے۔ ہر چیز سند سے ہے جو دوسروں کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

بقائے سلاسل تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے

تو مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ کو پڑھایا' سلسلہ ہم تک پہنچ گیا۔ یہ تعلیم ہی سے پہنچا ہے۔ محض علم سے نہیں پہنچا۔ علم جو حضور ﷺ کا ہے وہ آپ کی ذات بابرکات کے ساتھ خاص پہنچا ہے۔ اگر آپ تعلیم نہ دیتے تو ہم کیسے عالم بنتے؟ ہم تک علم کیسے پہنچتا۔۔۔؟ تو تعلیم کے ذریعے ہم تک علم پہنچا۔ تو در حقیقت انسانی خصوصیت اور بشری کمال تعلیم و تعلیم میں منحصر ہے۔ یہی افضلیت کی وجہ ہے جس نے انسان کو کائنات پر بڑھایا ہے۔ ورنہ مطلقاً علم تو حیوانات میں بھی ہے۔ تھوڑے بہت کا فرق ہے۔ آپ میں زیادہ ہے ان میں کچھ کم ہے۔ لیکن ہے۔ مگر کوئی معلم نہیں۔ انسانوں میں سب سے پہلے معلم انبیاء علیہم السلام ہیں پھر ان کے بعد ان کے اصحاب کرام ہیں۔ پھر ائمہ عظام' پھر علماء ربانیین۔

تردید باطل تعلیم پر موقوف ہے

یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین.

نبی کریم کریم علیہ ﷺ نے فرمایا'

ہر قرن اور ہر دور میں اس علم کو اٹھاتے رہیں گے سلف سے منتقل کر کے ہر زمانے میں خلف موجود ہوں گے جو علم کو لیتے رہیں گے اور صحیح مستند پیغمبر کا علم پہنچتا رہے گا۔۔۔ جو اخلاف رشید ہوں گے وہ اسلاف سے علم لیتے رہیں گے اور آگے چلتا کرتے رہیں گے۔

اس علم کی بدولت ہر قرن میں ایسے لوگ رہیں گے جو غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور مبطلین کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کو چاک کر کے رہیں گے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگوں کے ہونے کی خبر دی گئی۔

وہ ہوں گے تو تعلیم ہی کے ذریعے سے ہوں گے تو اصل بنیادی چیز تعلیم ہے۔ جس پر امت کا دارومدار ہے' افراد کا دارمدار ہے۔ اور اشخاص کا دارومدار ہے۔۔۔ اور تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مدارس فی الحقیقت انسانیت کی بقاء کے لئے قائم ہورہے ہیں۔ انسانیت اجاگر نہیں ہوسکتی اور خصوصیت انسانی باقی نہیں رہتی۔ اگر مدارس و مکاتب نہ ہوں اس لئے میں اپنے عزیز کو اور ان حضرات کو جو ان کے معاون ہیں۔ اس جامعہ قاسمیہ کے قیام پر مبارکباد دیتا ہوں۔

تعلیم و تعلم کے لحاظ سے برگزیدہ شخصیت

اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ اس جامعہ قاسمیہ میں جو تعلیم دی جائے گی اس کا ایک ہستی کی طرف استناد کیا گیا ہے جو فی الحقیقت علم میں بھی اونچی ہے اور معلمی میں بھی اونچی ہے۔۔۔ دار العلوم دیوبند کو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ نے قائم کیا اور دس بارہ شاگرد ایسے پیدا اور مہیا کئے کہ اس وقت ہندوستان میں علوم حدیث کا دارومدار انہی پر ہے۔ دار العلوم میں تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ علیہ نے چالیس برس تک حدیث کا درس دیا۔ ہزاروں طلبہ و فضلاء ان سے فیضیاب ہوئے۔ شیخ الہند کے فضلاء اور شاگرد کون ہیں؟

علامہ شبیر احمد عثمانی جو آپ کے پاکستان کے شیخ الاسلام ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی جو وہاں شیخ الاسلام کہلاتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی' مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب'' مولوی عبدالعلی صاحب مدرسہ عبدالرب کے محدث تھے۔ مولانا احمد حسین صاحب امروہی جو مدرسہ شاہی مراد آباد کے محدث تھے۔ تو جہاں جہاں یہ بڑے بڑے مدارس ہیں۔ حضرت کے تلامذہ نے وہاں حدیث پہنچائی اور فقہ پہنچایا۔

افادیت مدارس اور یہ خاص حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ کی شان تھی کہ دار العلوم دیوبند قائم کر کے جہاں جہاں گئے مدارس قائم کرتے چلے گئے۔

امروہہ میں مدرسہ قائم کیا' مراد آباد میں مدرسۃ الغرباء قائم کیا' انبیٹھ' شاہجہان پور اور بریلی میں مدارس قائم کئے۔ اسی طرح گلاؤٹھی میں قائم کیا اور اپنے شاگردوں اور مریدین کو تاکید کی کہ جہاں رہو مدرسے قائم کرو! آج ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں مدارس ہیں وہیں کچھ علم کی روشنی پائی جاتی ہے۔ جہاں مدارس نہیں جس کا جو جی چاہے کہتا ہے۔ ظلمت پھیلی ہوئی ہے مستند علم کا نشان نہیں ہے یا موضوع روایتیں ہیں جو لوگ پڑھ دیتے ہیں یا غیر مستند باتیں ہیں لیکن محدثانہ اور معلمانہ طرز پر بیٹھ کر سند صحیح کے ساتھ علم کو پہنچانا اور پرکھ کر دینا یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ جہاں مدارس ہیں پائی جاتی ہے۔

درجات تربیت اس آیت میں یہی فرمایا گیا کہ ۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ

کسی بشر کے لئے زیبا نہیں اور جائز نہیں ہے۔۔۔ کسی بشر کے لئے؟ جس کو اللہ تعالیٰ علم دے' نبوت دے' وہ لوگوں سے یوں کہے کہ لوگو! میرے بندے بن جاؤ اور میری عبادت کرو۔ یہ اس کے لئے جائز نہیں۔۔۔ وہ یوں کہے گا۔

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ

ربانی بنو' رب والے بنو' اللہ والے بنو' میرے بندے مت بنو اور ربانی کسے کہتے ہیں؟

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صحیح بخاری میں اس کی تفسیر فرمائی کہ ربانی کون ہے؟ فرماتے ہیں ۔

الذی یربی الناس یصغار العلوم ثم بکبارھا

ربانی وہ ہے کہ مخلوق خدا کو چھوٹے چھوٹے مسائل سے تربیت دے کر بڑے مسائل تک پہنچائے۔ محض بڑے ہمہ گیر اور کلیاتی مسائل کا پیش کرنا ربانی کی شان نہیں ہوتی۔ ربانی تو جزئیات پیش کرتا ہے۔ کہیں نماز کے مسائل' کہیں وضو کے مسائل' کہیں نکاح و طلاق کے مسائل' کہیں معاشرت کے۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات پر تربیت کرتا ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے علوم سامنے لاتا ہے۔ اس سے اپنی ہیچ مدانی محسوس نہیں ہوتی کہ میں اتنا بڑا عالم ہوں۔ میں نماز کا کیا مسئلہ بیان کروں؟ وضو کا مسئلہ کیا بیان کروں۔۔۔ یہی سب سے بڑی کائنات ہے کہ ابتداء مخلوق کو چھوٹے مسائل سے تربیت دے تاکہ علمی زندگی درست ہو۔ پھر اونچے اونچے مسائل بیان کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا ۔

علمنی یارسول اللّٰہ غرائب العلم

یارسول اللہ! علم کے کچھ عجائبات کچھ نکتے اور کچھ لطیفے ارشاد فرمائیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ۔

هل عرفت رأس العلم؟

یہ جو علم کے کچھ لطیفے اور نکتے سیکھنے آیا ہے کیا اصل علم بھی تیرے پاس ہے؟ بنیادی علم بھی تیرے پاس ہے جس کے اوپر نکتوں کی تعمیر کھڑی کی جائے؟

اس نے عرض کیا کہ ماشاء اللہ۔ جتنا اللہ نے چاہا فرمایا' هل عرفت الله؟ قال ماشاء الله جتنی میری استعداد تھی پہچان چکا ہوں۔

فرمایا هل عرفت الموت؟ تونے اپنی موت کو پہچان لیا؟ قال ماشاء الله

فرمایا! پہلے ان دو علموں کا حق ادا کر کے آ۔ پھر ہمارے پاس آنا۔ پھر ہم عجائبات بتلائیں گے۔ پہلے ان چیزوں پر تو عمل کر لے۔ تو ربانی وہ ہے کہ عمل کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتلائے اور رفتہ رفتہ بڑے علوم تک پہنچائے تو قرآن حکیم میں فرمایا کہ ہم جس کو علم و حکمت اور نبوت دیتے ہیں اس کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ لوگو! میرے بندے بن جاؤ' میری عبادت کرو۔ وہ یوں کہے گا'

بلا تعلیم ربانیت پیدا نہیں ہوتی

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ

تم ربانی بنو' رب والے بنو اور کس طرح سے؟ آگے صورت بتلائی۔

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

کتاب کی جو تعلیم دیتے ہو اور درس وتدریس کا جو مشغلہ اختیار کرتے ہو اس کے سبب سے تمہیں ربانی بننا پڑے گا۔

حاصل یہ نکلا کہ درس وتدریس کا مشغلہ نہ ہو تو ربانیت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ محض وعظ گوئی سے اور محض تقریروں سے ربانی نہیں بنایا جا سکتا' تقریریں تو مذاکرات ہیں جو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیتی ہیں۔ تقریر تربیت کی چیز تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو وقتی بات ہوتی ہے۔ تو تقریر یا خطابت یہ تربیت نہیں کر سکتیں یہ تو محض مذکر ہیں۔۔۔ اور یاد دہانی تو اس کی کی جائے گی جس سبق کو آدمی پہلے پڑھ چکا ہو اور جو پڑھائی نہ ہو تو یاد کا ہے کو دلایا جائے گا؟

تو حقیقت میں مربی جو شے ہے وہ تعلیم اور تدریس ہے اور تعلیم وتدریس بھی کتاب کے ساتھ۔

تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

یعنی کتاب اللہ سامنے ہو اور اس کا درس دو۔ اس کی تعلیم جو علوم کا سرچشمہ ہے۔ تو اس کا حاصل یہ نکل آیا کہ کہ ربانیت بغیر تعلیم وتربیت کے پیدا نہیں ہوتی اور تعلیم و تعلم ہی انسان کی خصوصیت ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ تو معلوم ہوا حقیقی معنی میں ربانی بنانا یہ انسان کا کام ہے دوسروں کا کام نہیں ہے حتی کہ ملائکہ بھی اگر جد وجہد کریں تو انسانوں کو ربانی نہیں بنا سکے وہ زیادہ سے زیادہ علم لا کر پہنچادیں گے۔ چاہے انہیں معنی معلوم نہ ہوں۔ جیسے کتاب علم پہنچادیتی ہے۔ لیکن

حقیقی معنی میں اس کو سمجھنے والا اور سمجھانے والا انسان ہوگا۔ اس واسطے علم ہو اور علم کے بعد تعیم ہو۔ تعلیم کے بعد استناد ہو اس کی سند اور نسبت صحیح ہو' یہ مقبول ہو جاتی ہے۔

عظمت استناد

الحمدللہ جامعہ قاسمیہ کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ علم بھی ہے' تعلیم بھی ہے اور تعلیم کے ساتھ ایک ذات کے ساتھ استناد بھی ہے اور وہ ذات مقبولان الٰہی میں سے ہے۔

میں تو کہتا ہوں ہمارا اصل وجود نسبت سے ہے۔ ہمارے وجود کے معنی یہ ہاتھ اور پیر یہ جگہ گھیرنا' یہ نہیں ہے۔ ہمارا وجود نسبت سے قائم ہے۔ ایک مومن کیوں مومن ہے؟ اس کا ایمانی وجود کیا ہے؟ اسے نبی کریم ﷺ سے نسبت ہے۔ وہ جب اپنا تعارف بحیثیت مومن کے کرائے گا تو وہ یہ کہے گا کہ نبی کریم ﷺ کا غلام ہوں۔ بس یہ مرا تعارف ہے۔ یہ نسبت ہی تو ہوئی کہ میں حضور ﷺ کا آدمی ہوں اور میں کسی کا نہیں ہوں میں تو ذات بابرکات نبوی کا غلام ہوں۔

جیسے دھوپ سے اگر پوچھے جائے کہ تو کون ہے؟ وہ اس کے سوا اور کیا تعارف کرائے گی کہ میں آفتاب کا ایک سایہ ہوں۔ تو آفتاب کی طرف نسبت دے دینا' یہی اس کا وجود ہے۔ اگر دھوپ آفتاب سے کٹ جائے' اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ تو حاصل یہ نکلا کہ وجود حقیقت میں نسبت و انتساب کا نام ہے۔ اگر ہمارا علم کسی مقدس ذات کی طرف منسوب ہو۔ وہ علم کار آمد اور معتبر ہے اگر کسی ذات کی طرف منسوب نہیں' محض اپنے ہی اندر سے اٹھا ہے اسے دماغی بخار کہا جائے گا۔ اس کا نام علم نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اوہام و وساوس کا مجموعہ کہا جائے گا۔ خواہ عقل بھی اس میں شامل ہو۔

نسبت علمی

کیونکہ عقل محض بھی علوم پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ عقل غلط بھی چلتی ہے' صحیح بھی چلتی ہے۔ اس کے غلط اور صحیح ہونے کا بھی تو معیار ہونا چاہئے جس پر پرکھ کر ہم کہیں یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ سورج گھومتا ہے' ایک کہتا ہے کہ زمین گھومتی ہے' ایک فلسفی عقلی دعوؤں سے کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ ایک کہتا ہے کہ بالکل موجود نہیں ہے۔ علت تامہ موجود ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ قیامت آئے گی' دوسرا کہتا ہے کہ ہرگز نہیں آئے گی' عالم قدیم ہے۔ یوں ہی آرہا ہے یوں ہی چلتا رہے گا۔ یہ سارے عقل مند ہی تو ہیں لیکن متضاد دعوے ہیں۔ ایک کا دعوی سچا ہوگا ایک کا دعوی جھوٹا ہوگا اور دونوں عقل سے کہہ رہے ہیں تو جب عقل غلطی بھی کر سکتی ہے اور صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ تو غلط اور صحیح ہونے کی کوئی کسوٹی تو ہوگی جس پر پرکھ کر ہم کہیں کہ یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط تو عقل کی کسوٹی نقل اور وحی خداوندی ہے۔ اس علم پر پرکھ کر ہم کہیں گے کہ یہ عقل صحیح کہہ رہی ہے اور یہ عقل غلط کہہ رہی ہے۔ اس عقل کے

دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل ہے۔ اس عقل کے دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل نہیں ہے۔ کس میں یہ قطعیت ہے اور کس میں محض وہمیت ہے تو عقل کی صحت و سقم کا مدار خود وحی کے اوپر ہے۔ اصل بنیاد وحی ہے اور وحی کا علم نسبت ہی تو لئے ہوئے ہے کہ اللہ کا علم' اللہ کے رسول کا علم' رسول کے صحابہؓ کا علم اور صحابہؓ کے تابعین کا علم۔۔۔ اس نسبت نے علم کو معتبر بنایا اگر یہ نسبت نہ ہو اور ایک شخص یوں کہے کہ میرا علم۔ تو اس کو دیوار پر مارا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ تیرا علم ہے تو ہمارا بھی علم ہے۔ ہم تیری بات کیوں مانیں؟ ہم بھی تو انسان ہیں۔ لیکن جب دونوں مل کر کہیں گے کہ نہ میرا علم نہ تیرا علم' خدا کا علم۔ دونوں گردن جھکا دیں گے کہ بے شک اب جھکنا پڑے گا۔ تو خدا کے علم کے معنی یہ ہیں کہ وہ علم جو خدا کی طرف سے آیا۔ جو اللہ کی طرف منسوب ہے۔

قبولیت نسبت

تو نسبت سے علم بڑا بنتا ہے اور قابل قبول بنتا ہے۔۔۔ تو جامعہ قاسمیہ کے لفظ میں جیسے تعلیم کی طرف اشارہ ہے ویسے ہی نسبت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ ایک ایسی ذات کی یادگار میں ہے جو معلم ہند ہو کر گزری ہے جس نے بڑے بڑے محدث پیدا کئے جس نے سینکڑوں ہزاروں مدارس قائم کئے۔

آج اگر آپ دیکھیں آپ کے پاکستان میں قصبے قصبے میں مدرسے موجود ہیں۔ میں افغانستان گیا تو گاؤں گاؤں میں فضلاء دیوبند موجود ہیں' برما میں گیا تو شہر شہر میں فضلائے دیوبند اور مدارس موجود' اخیاب میں پہنچا تو چار سو کے قریب علماء جمع ہوئے جو فضلاء دیوبند تھے' ملنے کے لئے آئے۔ افریقہ میں جاؤ تو ہزاروں کی تعداد میں فضلاء موجود۔۔۔ تو یہ جگہ جگہ مدارس' جگہ جگہ فضلاء اور جگہ جگہ معلم۔۔۔۔ یہ درحقیقت عالم اسباب میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ علیہ کا فیض ہے۔ جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھ کر گویا علم کی ایک فیکٹری قائم کر دی کہ وہاں سے علم کی مشینیں تیار ہوتی رہیں۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ نے سات برس کی عمر میں خواب دیکھا تھا کہ میں بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں اور میرے ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں سے دودھ کی نہریں جاری ہیں جو اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں۔

تو ان کے ماموں مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم نے تعبیر دی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ' تمہارے ذریعے سے علوم نبوت کا فیضان کریں گے۔

کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نانوتہ ایک کورسی بستی جو ضلع سہارن پور (انڈیا) میں ہے کوئی اس کی خصوصیت نہیں تھی کہ وہاں ایک ایسی شخصیت بھی پیدا ہوگی کہ مشرق و مغرب میں اس کے ذریعے علوم کے دریا بہیں۔۔۔ جب دارالعلوم قائم ہوا تو لوگوں نے کہا کہ یہ تعبیر ہے۔ آج

دار العلوم کے نقش قدم پر مدینہ منورہ میں اگر مدرسہ شرعیہ قائم ہے تو فضلاء دیوبند کا قائم کیا ہوا ہے۔ مکہ میں مدرستہ الفلاح کا قیام ہوا تو مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری کے ذریعہ جو دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ مکہ ہو‘ مدینہ ہو‘ بخارا ہو‘ بلخ ہو‘ افغانستان ہو‘ افریقہ ہو ہزاروں ہزار مدرسے قائم ہیں۔ تقریباً بیس ہزار کے قریب دار العلوم دیوبند نے ایسے علماء تیار کر دیئے۔ جن پر فتویٰ کا مدار اور حدیث سنانے کا مدار اور قرآن کریم کی تعلیم کا مدار ہے۔ مشائخ طریقت ان میں ہیں اور صوفیت کی تعلیم بھی ان میں ہے۔

عزت نسبت

تو ایک ایسی ذات جس کے فیضان سے ہزارہا علماء تیار ہوں‘ ہزارہا مدارس تیار ہو جائیں۔ اس کی طرف نسبت دینے سے یقیناً ہم لوگوں کی عزت ہے اور اس جامعہ کی بھی یقیناً عزت ہے کہ نسبت کی وجہ سے مقبولیت پیدا ہو جائے گی کہ قبولیت نسبت سے آتی ہے۔

آپ مکہ مکرمہ میں جاتے ہیں اور بیت اللہ کے در و دیوار کو عزت و عظمت سے چومتے ہیں۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ اس لئے کہ اس کی اللہ سے نسبت ہے۔ اس کا نام بیت اللہ ہے۔ یعنی اللہ کا گھر‘ حالانکہ اللہ میاں اس میں رہتے تھوڑا ہی ہیں وہ تو جسم سے پاک اور بری و بالا ہیں۔۔۔ مگر ایک نسبت ہے اور اس نسبت کی وجہ سے بیت اللہ مکرم و معظم ہے۔ اور تجلیات کا مورد بن گیا۔

تو بیت اللہ قابل تعظیم اور واجب التعظیم نسبت کی وجہ سے بنا۔۔۔ بیت اللہ کے اوپر غلاف ڈال دیا۔ حالانکہ آپ ہی نے تو اسے پاکستان سے سی کر بھیجا تھا۔ وہاں جب پڑ جائے گا تو آپ اسے چومیں گے۔۔۔ اگرچہ اس سے پہلے چومنا نہایت غلطی ہے۔ اس واسطے کہ ابھی اسے وہ نسبت حاصل نہیں ہوئی ابھی تو اسے آپ کی طرف نسبت ہے۔ جب اسے بیت اللہ سے نسبت ہو گی جب اسے چومنا۔۔۔ تو جب اسے بیت اللہ پر ٹانگ دیا جائے گا اور بیت اللہ سے مس کر دے گا تو اس میں برکات کے آثار آئیں گے۔ پھر بے شک آپ اسے چومیں تو آپ کے لئے عزت و عظمت اور مقبولیت ہے۔ تو پردوں میں مقبولیت آگئی اس لئے کہ دیوار کعبہ کو لگ گیا۔ دیوار کعبہ میں مقبولیت آئی کہ اللہ کا نام لگ گیا۔ بیت اللہ مسجد حرام میں ہے تو مسجد حرام ساری مسجدوں سے افضل بن گئی۔ مسجد حرام جس شہر میں ہے تو اس شہر نام بلد امین ہو گیا۔ کیونکہ وہ مسجد حرام کا شہر بن گیا۔ وہ مکہ شہر جس صوبے میں ہے وہ حجاز کا صوبہ مقدس بن گیا‘ اس لئے کہ اس میں مکہ واقع ہے۔ تو نسبت در نسبت سے فضیلت اور بڑائی آئی۔ اس طرح سے علم خود بڑی چیز ہے اور کسی بڑی شخصیت کی طرف انتساب ہو جائے تو اس کی اور بڑائی ہو کر نمایاں ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس جامعہ کا قیام اور اس کے قائم کرنے والے دونوں مستحق مبارکباد ہیں۔ یہ چند

جملے تھے جو مجھے اس آیت کے تحت اس جامعہ کے متعلق عرض کرنے تھے۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو مضبوط بنائے اور اس کو فیضان کا ذریعہ بنائے اور ایسے معاون اس کے لئے پیدا ہو جائیں تاکہ جو اسکے مقاصد ہیں وہ آگے بڑھیں اور علم پھیلے اور یہ علم کا منارہ بن جائے۔

اللهم ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم ربنا اغفرلنا ذنوبنا و اسرافنا
في امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا على القوم الكافرين.
اللهم استعملنا بالقران اجسادنا

تاثیر الاعمال

ایک زکوٰۃ کی خاصیت تھی کہ حسن معاشرت پیدا ہو۔۔۔ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں۔۔۔۔ایک زکوٰۃ کی خاصیت یہ تھی کہ نفس کے اندر سے بخل کا رذیلہ مٹ جائے۔اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدارِ خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے۔۔۔۔اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَ شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدِنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً وَّ دَاعِياً اِلَيْهِ. بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً اَمَّابَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم. حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ق وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ه صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم.

تمہید

بزرگانِ محترم!

حدیث قدسی میں حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ۔

انا عند ظن عبدی بی

میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں' جیسا گمان میرے ساتھ قائم کرے گا ویسا ہی میرا عمل اس کے ساتھ ہوگا۔اگر آپ نے ایک ناکارہ کے بارے میں اچھا گمان کر لیا ہے تو کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اس ناکارہ کو کارآمد بنادے۔۔۔۔بہر حال اس وقت میں کچھ زیادہ کہنے کی ہمت تو نہیں ہے' نہ کچھ قوت ہی ہے اور سفر بھی بہت لمبا رہا۔اس کی وجہ سے کچھ تھکاوٹ بھی ہے۔اس لئے زیادہ وقت تو میں نہیں لے سکوں گا۔البتہ جلسہ کے احترام کی وجہ سے چند جملے ضرور عرض کروں گا۔

خواص اعیان اتنی اصولی بات سمجھ لیجئے کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ نے ایک خاصیت رکھی ہے۔دوا ہو' غذا ہو ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور اس کے استعمال سے وہ خاصیت ظاہر ہوتی ہے۔۔۔مثلاً گل بنفشہ ہے۔زکام زائل کرتا ہے۔یہ اس کی خاصیت ہے۔جب آپ اسے استعمال کریں گے اور زکام

ہو گا تو وہ زائل ہو گا۔۔۔ ملیٹھی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کھانسی دفع کرتی ہے جب بھی آپ استعمال کریں گے، کھانسی ہو گی، اللہ تعالیٰ اسے زائل فرمادیں گے۔ تو ہر دوا کی ایک خاصیت ہے۔۔۔ اسی طرح ہر غذا کی ایک خاصیت ہے۔ گیہوں کھائیں گے تو اور خاصیت ہے، چنا کھائیں گے تو اور خاصیت ہے، چاول کھائیں گے تو اس کی اور خاصیت ہے۔ بہر حال ہر چیز کی ایک خاصیت ہے۔

خواص افعال اور میں کہتا ہوں کہ یہ چیزیں تو اعیان میں سے ہیں، ان کی خاصیتیں تو ہیں ہی، انسان کی ہر حرکت میں ایک خاصیت ہے۔ ہر وضع میں ہر انداز میں ایک اثر ہے۔ اگر آپ کسی کے سامنے یوں اشارہ کریں، ممنون کرم ہو جائے گا اور اگر یوں کریں تو لڑائی بن جائے گی۔ اگر کسی کو انگوٹھا دکھلا دیں تو چڑ پیدا ہو جائے گی اور کسی کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو محبت پیدا ہو جائے گی۔ رخ دے کر بات کریں اس کا اثر اور ہے اور منہ پھیر کر بات کریں اس کا اثر دوسرا ہے۔ ہر ہیئت کا اثر اور ہر شے کا ایک اثر ہے۔

اسی طرح سمجھئے شرعی اعمال کی بھی کچھ خاصیتیں ہیں۔ جتنے اعمال حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں، ہر عمل کی ایک خاصیت اور اس کی ایک خاص تاثیر ہے جب اسے استعمال کیا جائے گا، اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

روزے کی خصوصیت مثلاً روزہ ہے اس کی ایک خاصیت اور خاصیت ہے۔ اور وہ قہر نفس ہے۔ جب آپ نفس کا دانہ پانی بند کر دیں گے اور نفس کو مقہور و مجبور کر دیں گے تو نفس مقہور ہو کر کے گناہ کی طرف نہیں جائے گا۔ یہ تو خمار گندم ہے۔ جتنی زیادہ غذا کھائی جاتی ہے، طاقت بڑھتی ہے، گناہ کی سوجھتی ہے اور سات دن فاقہ کر لیں تو گناہ کی طرف طبیعت ہی مائل نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ نفس کے اندر ہی جان باقی نہیں ہو گی تو روزہ قہر نفس کے لئے رکھا گیا ہے کہ اس کو مقہور کر دے، قہر کے نیچے دبادے تاکہ وہ کھل کر کوئی عمل نہ کر سکے اور مجبور ہو جائے۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ روزہ رکھنے میں۔۔۔ نفس تو مقہور ہوتا ہی ہے اور نفس کے آثار و خواص تو مغلوب ہوتے ہی ہیں۔۔۔ نفس کے ساتھ شیطان کا ساز باز ہے۔۔۔ رمضان میں شیاطین بھی قید کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ جو کھل کر نفس پر اثر ڈالتے ہیں وہ گھٹ جاتا ہے۔ اس لیےکتنے بھی نیچے درجے کا مسلمان ہو، اس میں کچھ نہ کچھ رمضان کا احترام ضرور ہو گا۔ اگر روزہ بھی نہیں رکھے گا تو بھی دن میں کھاتے ہوئے شرمائے گا۔ بے روزہ رہنے کو اعلانیہ ظاہر کرنے سے شرمائے گا اور عار محسوس کرے گا۔۔۔ یہ خاصیت ہے۔

زکوٰۃ کی خصوصیت زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے۔۔۔ پہلی خاصیت یہ ہے کہ بخل کا ذریعہ انسان کے اندر سے زائل ہوتا ہے۔ بخیلی کا جو مادہ ہے وہ گھٹ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ غرباء کے لئے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے حسن معاشرت پیدا ہوتا ہے۔ جتنا آپ غرباء پر خرچ کریں گے۔ وہ آپ کے ممنون کرم ہوں گے اور جان نثار بن جائیں گے۔ آپ تو یوں خوش ہوئے کہ میں نے اللہ کا ایک فرض ادا کیا کہ زکوٰۃ دے دی۔ غریب یہ سمجھے گا کہ میرے اوپر کرم کیا اور احسان کیا۔ تو امیر اور غریب میں ایک ربط اور رشتہ قائم ہو جائے گا۔

اور وہی حسن معاشرت کی بنیاد ہے۔۔۔۔ تو زکوٰۃ کے اندر جہاں نفس کے اندر یہ اثر پڑتا ہے کہ بخل کا رذیلہ زائل ہو وہاں معاشرت کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تمدن کی خوبی بھی سامنے آتی ہے اور امیر و غریب میں باہمی میل جول پیدا ہو جاتا ہے۔ تو یہ زکوٰۃ کی خاصیت ہے۔

ظہور خواص کی شرط جب آپ اسے استعمال کریں گے یہ خاصیت ظاہر ہوگی' اب کوئی استعمال ہی نہ کرے تو وہ بات جداگانہ ہے۔ جیسے کوئی دوائی استعمال نہ کرے تو بیماری کیسے زائل ہوگی۔ محض طبیب کے نسخہ لکھ دینے سے تو بیماری زائل نہیں ہوگی۔ استعمال ہی کرنے سے زائل ہوگی۔ یہی صورت شرعی اعمال کی ہے کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہے۔ ظاہر جب ہی ہوگی جب اسے استعمال کیا جائے۔

ماہرین خواص کی اطاعت حق تعالیٰ نے جس طرح سے اطباء جسمانی پیدا فرمائے' ڈاکٹر ہیں' طبیب ہیں وہ ان خواص و آثار کو جانتے ہیں۔ مریض کی حالت دیکھ کر وہ نسخہ لکھتے ہیں مریض اگر طبیب کی اطاعت کرے گا' شفا پائے گا۔ اطاعت نہیں کرے گا بیمار پڑا رہے گا۔ بیماری بڑھ جائے گی' ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا۔۔۔۔ تو اطباء جانتے ہیں۔ ہر شخص دوا کی خاصیت کو نہیں جانتا۔ اسے طبیب کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی طبیب نسخہ لکھے۔ اور بیماریوں کہے کہ آپ نے اس نسخے میں گل بنفشہ کو چھ ماشے کیوں لکھا ہے۔ ایک تولہ کیوں نہ لکھ دیا۔ اور ملیٹھی آپ نے تین ماشے کیوں لکھی ہے چھ ماشے کیوں نہیں لکھی۔ تو طبیب کان پکڑ کر مطب سے نکال دے گا کہ تو مجھے تعلیم دینے کے لئے آیا ہے یا شفا پانے کے لئے نسخہ لینے آیا ہے؟۔۔۔ تو لامحالہ مریض کو اطاعت کرنی پڑے گی۔ جتنی مقدار وہ لکھ دے اور جو وقت وہ تجویز کرے۔ اسی وقت میں وہ دوا استعمال کی جائے گی۔ اتنی ہی مقدار میں استعمال کی جائے گی جتنی مقدار طبیب لکھ دے گا۔

پھر جو پرہیز بتلائے گا وہ بھی کرنا پڑے گا اگر آپ پرہیز نہ کریں تو دوا فائدہ نہیں دے گی ۔۔۔ زکام کو زائل کرنے کے لئے اس نے گل بنفشہ لکھا۔ وہ آپ نے پی لیا۔ مگر صبح سے شام تک سیر بھر دہی برف ملا کے پی لی۔ اس سے تو زکام اور ترقی پر آجائے گا۔ تو دوا موثر نہیں ہوتی۔ جب تک پرہیز نہ ہو۔۔۔۔ ہر علاج کے اندر دو جز ہوتے ہیں ایک دوا ایک پرہیز۔۔۔ بلکہ پرہیز زیادہ نافع ہوتا ہے۔ اگر جم کر پرہیز کرے تو بیماری آدھی ہو جاتی ہے۔ دوا سے پھر بقایا آدھی بیماری زائل ہو سکتی ہے۔ مگر ہر صورت طبیب کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ رائے زنی کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی کہ اس نسخے میں آپ نے پانچ دوائیں کیوں لکھی ہیں۔ چھ کیوں نہ لکھ دیں ۔۔۔ ؟ مریض کو اس کا حق نہیں ہوتا طبیب کہے گا کہ میں فن کی رو سے جانتا ہوں کہ کتنی مقدار ہونی چاہئے۔ تجھے اگر علاج کرانا ہے تو یہ نسخہ اسی مقدار میں استعمال کر۔

یہی صورت بعینہ طب روحانی یعنی شریعت کی ہے۔ جو اللہ نے نازل فرمائی۔ اس کے لئے اطبائے روحانی بھی نازل کئے وہ انبیاء ہیں۔ انبیاء کی تعلیم سے ان کے ورثاء پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو علمائے ربانی کہا جاتا ہے۔ وہ انبیاء سے وراثت پاتے ہیں اور وہ طب روحانی ان کے پاس آتی ہے۔۔۔

مریض سامنے آتے ہیں وہ بھی نسخے لکھتے ہیں۔ ہر مرض کے مناسب حال دوا تجویز کرتے ہیں۔۔۔ اگر مریض یہ کہنے لگے کہ آپ نے فلاں وقت میں مجھے دو ہی رکعات کیوں بتلائی ہیں' میں چار کیوں نہ پڑھ لوں؟ وہ کان پکڑ کے نکال دیں گے کہ تو علاج کے لئے آیا ہے یا تعلیم دینے کے لئے آیا ہے؟ تنی ہی مقدار لازمی ہے۔ شریعت نے ایک تسبیح کی مقدار بتلائی کہ سو مرتبہ پڑھا کرو۔ مریضوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں سو کے سوا سو کیوں نہ ہوئے؟ اور سو کے نوے کیوں نہ کر دیئے گئے۔ جتنی مقدار اللہ تعالیٰ نے تجویز کی ہے۔ وہی نافع ہو گی۔ جتنی مقدار تجویز نہیں کی وہ نافع نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ تو ہر عمل کی ایک خاصیت ہے روزے کی بھی ایک خاصیت ہے۔ زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے۔ حج کی بھی ایک خاصیت ہے اور نماز کی بھی ایک خاصیت ہے۔

نماز کی خصوصیت نماز کی خاصیت کیا ہے؟

نماز پڑھنے والے میں دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر نماز کا تارک ہے تو وہ جو میدان محشر میں دیدار خداوندی ہو گا' اس کی استعداد نہیں پیدا ہو گی وہ دیدار الٰہی سے محروم رہے گا۔ تو نماز کی خاصیت یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

دیدار خداوندی کے مراتب یہاں نماز پڑھنے میں آپ اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نماز اس طرح سے پڑھو کہ جیسے تم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔۔۔۔ اس عقیدہ سے نماز پڑھے گا تو گویا عقیدے کی آنکھ سے حق تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے گو اس آنکھ سے نہیں دیکھ رہا۔۔۔۔۔ کوئی بزرگ ہے۔ ولی کامل ہے۔ وہ کشف کی آنکھ سے تجلیات سے خداوندی کو دیکھتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو تجلیات الٰہیہ اس کے سامنے ہوتی ہیں۔۔۔ مگر قیامت کے بعد ایک وقت آئے گا کہ جس کے دیکھنے کی مشق آپ نے قلب سے' حواس سے اور باطنی آنکھ سے کی تھی وہ آج ظاہر آنکھ سے سامنے آجائے گی اور دیدار خداوندی عیاناً ہونا شروع ہو جائے گا۔ مختلف تجلیات نمایاں ہوں گی۔ جس میں بندے حق تعالیٰ شانہ کو دیکھیں گے۔۔۔۔ یہ دیکھنے کی استعداد نماز ہی پیدا کرتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد شریف میں تشریف رکھتے تھے اور چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ صحابہؓ چاند کو بھی اور چاندنی کو بھی دیکھ رہے تھے۔

ارشاد فرمایا کہ

تم جو چاند کو دیکھ رہے تو ایک کا دیکھنا' دوسرے کے دیکھنے میں حارج تو نہیں ہے؟ وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے' وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے دیکھنے میں رکاوٹ تو نہیں بنا ہوا' اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ نہیں بنا ہوا۔ دنیا کے کروڑوں اربوں انسان چاند کو ایک وقت میں دیکھتے ہیں مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج تو نہیں ہوتا۔۔۔۔ فرمایا۔۔۔۔ اسی طرح قیامت میں بندے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ اربوں کھربوں ہوں گے مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہو گا۔ جس طرح سے تم چاند کو دیکھ رہے ہو۔

فجر و عصر کی خصوصیت اور اس کے بعد فرمایا

اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو اور یہ کر سکو کہ صبح کی نماز اور شام کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو تو دیدار خداوندی کا یہی ذریعہ بنیں گی۔

گویا خاصیت تو ہر نماز میں ہے مگر خصوصیت سے یہ دو نمازیں' عصر کی اور صبح کی' یہ دو نمازیں وہ ہیں کہ یہ حق تعالیٰ کے دیدار استعداد پیدا کرتی ہیں۔

اور بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں نمازوں میں عالم غیب آدمی کے قریب ہو جاتا ہے ----- یہ جو اعمال لکھنے والے ملائکہ ہیں' یہ رات کے اور ہیں اور دن کے اور ہیں۔ دن کے لکھنے والے صبح کی نماز کے وقت آتے ہیں اور رات کے لکھنے والے انہیں چارج دے کر واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ دن بھر اعمال لکھتے ہیں' عصر کی نماز جب پڑھتے ہیں تو یہ رات والے ملائکہ کو چارج دے دیتے ہیں۔ رات کو وہ اعمال لکھتے ہیں۔ تو صبح کی نماز میں بھی کروڑوں' اربوں' کھربوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں اور اسی طرح عصر کی نماز کے وقت بھی جمع ہوتے ہیں۔ ہر بندے کے اوپر دو فرشتے ہیں جو اعمال لکھتے ہیں۔ تو اگر بندے ایک ارب ہیں تو وہ چار ارب ہوں گے۔ غرض اربوں کی تعداد میں یہ ملائکہ صبح اور شام کی نماز کے وقت آتے ہیں۔

فجر و عصر میں نزول ملائکہ کی حکمت اور عجیب حکمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ان دو نمازوں کے لئے ملائکہ کا تبادلہ رکھا کیوں؟

اس لئے کہ جب آدمؑ کو خلافت دی جارہی تھی اور حق تعالیٰ نے فرمایا تھا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً

میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں جو میری طرف سے دنیا میں میرا قانون چلائے گا۔ میری طرف سے نیابت کرے گا اور جو احکام میں نے بندوں کے لئے جاری کئے ہیں' انہیں پھیلائے گا۔ میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں تو ملائکہ کو خلجان گزرا جس کی وجوہ تھیں کہ۔

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ

آپ ایسی نوع کو خلیفہ بنارہے ہیں۔ جو دنیا میں خون ریزی الگ کرے گی' فساد الگ مچائے گی اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو ہر وقت آپ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں ----- گویا درپردہ اشارہ ادھر تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے یہ انسان تو نہایت ہی مفسد اور سفاک ہوگا۔

انسان کی تاریخ خون سے بھری پڑی ہے۔ آدمؑ کے وقت سے آدمی کا جو خون آدمی کے ذریعہ سے بہنا شروع ہوا ہے۔ وہ آج تک بند نہیں ہوا۔ بلکہ بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ تو انسان انسان کو پھاڑ کھارہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انسان کو درندہ کہنا یہ درندے کی توہین ہے۔ اس لئے کہ درندہ مثلاً شیر ہے اگر پھاڑتا ہے تو بکری کو پھاڑے گا۔ شیر شیر کو تو نہیں پھاڑتا۔ انسان ایسا درندہ ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں کو پھاڑ کھاتا ہے۔ جتنے مہلک ہتھیار ایجاد ہورہے ہیں اور انسان ایجاد کررہے ہیں وہ انسانوں ہی کی تباہی کے لئے ہورہے ہیں۔ سانپ بچھوؤں کو ہلاک کرنے کے لئے تو یہ توپیں اور بندوقیں نہیں ہیں۔ آدمی آدمی کو ہلاک کرنے کے لئے مہلک ہتھیار تیار کررہا ہے۔ تو انسانی تاریخ خون سے بھری

ہوئی ہے۔ انسان ہی انسان کا خون بہار ہا ہے۔ انسان ہی انسانوں کے حق میں فساد برپا کر رہا ہے۔ کچھ صلاح پہ آنا چاہتے ہیں۔ یہ فساد انگیزی کر کے اصلاح کے راستے اندر خون بھرا ہوا ہے اور فساد بھرا ہوا ہے یہ آپ کی نیابت کرے گا؟ یہ تو نیابت کو اور فاسد بنادے گا اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو رات دن تسبیح اور تقدیس میں مصروف ہیں۔ ہمیں خلیفہ بنایا جائے۔

خلافت آدم پر شبہ کا حاکمانہ جواب تو حق تعالیٰ نے اس کا ایک جواب تو حاکمانہ دیا کہ۔

اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ

تم نہیں جانتے ہم حقیقت حال کو جانتے ہیں۔۔۔ ملائکہ خاموش ہو گئے۔

لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ خاموش ہونے سے دل کا خلجان بھی نکل گیا ہو حاکم کے حکم سے آدمی دب کر ادباً چپکا تو ہو جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ دل کا خلجان بھی نکل جائے۔ اس لئے دوسرا جواب حکیمانہ دیا۔

خلافت آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب اور وہ یہ تھا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

آدمؑ کو تمام ناموں کی تعلیم دے دی۔ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان سب کے نام بتلائے۔ ان سب کی خاصیتیں بتائیں۔ اللہ کے جتنے نام ہیں وہ بتلائے' ان کے خواص و آثار بتلائے۔ تو اسماء الہیہ اور اسماء کونیہ سب آدمؑ کو بتلائے۔

اس کے بعد ملائکہ سے کہا۔

اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

اگر تم اپنے دعوے میں 'وہ۔۔۔ جو تمہارے دل میں دعویٰ ہے کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں' سچے ہو ذرا چیزوں کے نام تو بتلاؤ۔

اس واسطے کہ خلافت علم سے چلتی ہے اور علم کا ابتدائی مقام یہ ہے کہ کسی چیز کا نام معلوم ہو۔ اگر نام معلوم نہ ہو تو شے مجہول مطلق ہے۔ نام معلوم ہوگا تو شے کو تلاش کرے گا اور اگر نام ہی معلوم نہیں تو کسی سے کیا پوچھے گا؟ اور کیا کہہ کر پوچھے گا؟ تو علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسرا درجہ ان ناموں کی مسمیات کا ہے کہ وہ کیا کیا چیزیں ہیں جن کے یہ نام ہیں۔ پھر ان کے افعال کیا ہیں؟

پھر ان کے حقائق کیا ہیں؟ اور ان کے نفوس کے اندر جذبات کیا ہیں؟ یہ چوتھا درجہ ہے علم کے بعد' علم کے بعد' علم کے بعد علم۔۔۔ علم کے درجات نکلتے ہیں مگر ابتدائی درجہ علم کا ناموں کا معلوم کرنا ہے۔۔۔ تو آدمؑ کو جن پر حکمرانی کروانی تھی اور جن کا نظم بندھوانا تھا ان سب چیزوں کے نام بتلا دیئے۔

ملائکہ سے کہا کہ ان کے نام تو بتلاؤ؟

ملائکہ نہیں بتلا سکے۔۔۔ اس لئے کہ جن ملائکہ کو جس نوع پر متعین کیا ہے اس کے ناموں سے تو وہ واقف ہیں' دوسرے ناموں سے واقف نہیں ہے جو ملائکہ بارشیں لانے پر مقرر ہیں۔ وہ

بارش کے احوال کو تو جانتے ہیں لیکن بقیہ دوسرے احوال کا انہیں پتہ نہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں' اعمال کی حد تک علم رکھتے ہیں لیکن اعمال سے جو خارج چیزیں ہیں' ان کا انہیں پتہ نہیں ہے تو ملائکہ کو ہر نوع کی اتنی ہی چیزیں معلوم ہیں جن پر انہیں مقرر کیا گیا ہے' ساری دنیا کی ساری چیزوں کے نام انہیں نہیں بتلائے گئے۔ اس لئے کہ ساری دنیا سے ملائکہ کا کوئی تعلق نہیں۔

غرض ملائکہ جواب نہیں دے سکے۔

پھر حق تعالیٰ نے آدمؑ سے فرمایا۔

يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ

"اے آدمؑ! تم چیزوں کے نام بتلاؤ"۔

حضرت آدمؑ نے فرفر تقریر شروع کر دی۔۔۔ یہ آسمان ہے' یہ زمین ہے' یہ لوٹا ہے اور یہ روٹی ہے اور اس کے یہ آثار اور اس کی یہ خاصیات ہیں' تمام چیزوں کے نام اور آثار گنوانے شروع کئے۔ جو ملائکہ کے علم میں نہیں تھے۔

اب ملائکہ خاموش ہوئے۔۔۔۔ اور کہا۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ

بے شک آپ پاک ہیں۔ آپ نے جتنی چیزوں کے نام ہمارے حلقہ عمل کے بارے میں بتلا دیئے ہیں۔ ہمیں اتنا تو معلوم ہے' سب معلوم نہیں۔ آدم کو تو ساری چیزوں کے نام معلوم ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزیں' زمین کی پیداوار کی چیزیں اور آسمان کے رہنے والوں کے پتے اور ان کے آثار و خواص' سیارات کا پتہ' چاند سورج کا پتہ' پھر ان چاند سورج کے جو آثار ہیں ان کا پتہ' انسانی بدن کے اندر تمام اعضاء کا پتہ' معدہ کیا کام کرتا ہے۔ جگر کیا کام کرتا ہے' قلب کا کیا کام ہے' دماغ کا کیا کام ہے۔ ہر ہر چیز آدمؑ پر روشن کر دی گئی جو ملائکہ پر نہیں تھی۔۔۔ آخر ہار مانی اور خاموش ہوئے اور کہا کہ سُبْحٰنَكَ آپ پاک ہیں۔۔۔ وہ جو ہمارا خلجان تھا' اس سے آپ بری و بالا ہیں۔ بلاشبہ آپ کا انسان کو نائب بنانا برحق ہے اور آدم ہی اس کا مستحق تھا۔

لیکن ابھی ایک درجہ جواب کا اور باقی ہے۔۔۔ وہ یہ کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ یہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں ہوا تھا۔۔۔ یہ تو ہو گیا کہ آدم سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ جو تمہارے اندر نہیں۔۔۔ یہ بھی جواب ہو گیا کہ آدم کے حقائق کو ہم جانتے ہیں تم نہیں۔ لیکن وہ جو کہا تھا کہ فساد ہو گا خون پھیلے گا وہ چیز ابھی تک باقی تھی؟

حق تعالیٰ نے اس کا جواب حکیمانہ طریق پر یہ دیا کہ جہاں کوئی عمل خیر ہو اور انسان اس کے اندر جمع ہوں' ملائکہ کو حکم دیتے ہیں کہ اس مجلس کے اندر جاؤ۔ ایک جلسہ ہوا' اس میں بہت سے اللہ والے جمع ہیں' اللہ کے ناموں کا ذکر ہو رہا ہے' مسائل کا ذکر ہو رہا ہے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا۔

ان للہ ملائکۃ سیاحین

اللہ کے ہاں کروڑوں اربوں کی تعداد میں ملائکہ ہیں جن کا کام یہی ہے کہ دنیا میں گھومیں پھریں اور دیکھیں کہ انسان کیا کام کر رہا ہے۔ جب دیکھتے ہیں ایک مجلس خیر و برکت کی ہے۔ مسائل کا

ذکر ہے' وہ دوڑ پڑتے ہیں اور پچھلوں کو آواز دیتے ہیں۔

هلموا الی مقصد کم

دوڑو' تمہارا مقصد اس مجلس میں پورا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے پچھلوں کو بلاتے ہیں یہاں تک کہ اس مجلس اور جلسے میں چہار طرف آسمان تک اربوں کھربوں ملائکہ کا چھت لگ جاتا ہے۔

غشیتهم الرحمة وحفتهم الملائکه

ملائکہ اس مجلس کو ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت اس کو گھیر لیتی ہے --- اب یہ مجلس ختم ہونے کو ہے' ختم ہوئی ---- حق تعالیٰ ملائکہ سے ارشاد فرماتے ہیں' جب یہ ملائکہ مجلس میں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو کچھ مجلس میں ہو رہا ہے اب یہ آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں تو ان سے حق تعالیٰ سوال کرتے ہیں اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر حکمت کت تحت سوال ہوتا ہے کہ بندوں کو کس حالت میں پایا؟

عرض کرتے ہیں کہ آپ کے ذکر میں مصروف تھے۔

کیا ذکر کرتے تھے؟

آپ کی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے ڈرتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ جنت کو انہوں نے دیکھا ہے جو طلب کر رہے تھے یا جہنم کو دیکھ لیا ہے جو خوف کھا رہے تھے؟

عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں آپ کے انبیاء کی زبان سے سنا ہے اور ایماناً مانا ہے کہ جنت بھی حق ہے اور دوزخ بھی حق ہے۔

گویا پہلا الزام تو یہ ہوتا ہے کہ تم جنت و دوزخ کو آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔ اگر رات دن تسبیح میں مصروف رہو تو تمہارا کیا کمال ہے۔ کمال اس انسان کا ہے کہ دیکھی ایک چیز نہیں اور پھر تسبیح و تہلیل اور ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

اے ملائکہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ جتنے اس مجلس میں موجودت تھے' جو مانگتے تھے' وہ میں نے دیا --- یعنی جنت ---- اور جس سے ڈرتے تھے اس میں نے انہیں بچا لیا --- یعنی جہنم ---- اور میں نے ان کی مغفرت کر دی۔

تو ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ

یا اللہ! بہت سے تو وہ لوگ تھے جو گھروں سے قصد کر کے آئے تھے کہ اس مجلس میں شریک ہوں گے' اس جلسے میں بیٹھیں گے۔ مگر بعض تماشہ بین بھی کناروں پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا مقصد نہیں تھا کہ اس جلسے میں آئیں۔ جب قریب سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ بھئی! کیا ہو رہا ہے ہم بھی دیکھتے چلیں۔ وہ کھڑے ہو گئے تو کیا وہ بھی اس مغفرت میں شامل ہیں؟

جواب فرماتے ہیں۔

هم القوم لایشقٰی جلیسهم

اس جلسے میں بیٹھنے والی ایسی قوم ہے کہ ان کے آس پاس والا بھی محروم نہیں رہ سکتا' وہ بھی مغفرت میں شامل ہے۔

سب کی مغفرت ہو گئی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک بڑے جلسے کی مغفرت کرنی تھی۔ ہزاروں آدمی اس میں جمع تھے۔ تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ آسمانوں پر چڑھیں اور ان سے سوال کیا جائے کہ بندے کیا کر رہے ہیں' وہ جواب دیں۔ پھر انہیں گواہ بنایا جائے اور مغفرت کی جائے۔

اور پھر ان جلسوں کو دیکھا جائے تو ایک ہی جلسہ تو نہیں۔ ایک ہی وقت میں ہزاروں جلسے ہو رہے ہیں۔ اسی پاکستان میں آج ایک جلسہ یہاں ہے۔ ہر شہر میں معلوم نہیں کتنے جلسے ہو رہے ہوں گے۔

اور ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں اور پھر چڑھیں اور حق تعالیٰ سوال کریں در مغفرت کی جائے۔۔۔ پھر ایک پاکستان ہی نہیں' ہندوستان کے شہروں میں جلسے ہو رہے ہوں گے۔۔۔ ترکی کے لوگ ہیں وہاں بھی جلسے ہوں گے۔ عرب کے لوگ ہیں وہاں بھی ہوں گے۔۔۔ دنیا میں سارے جلسے کر لو' تو لاکھوں جلسے ہوں گے۔ تو ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں۔ پھر وہ اوپر چڑھیں اور ان سے سوال ہو۔۔۔ تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بخشنا تھا تو بخش دیتے۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ اس طرح سے آئیں اور ان سے سوال کیا جائے اور انہیں گواہ بنایا جائے کہ تم گواہ رہو کہ ہم نے بخشش کی۔

یہ درحقیقت ان کے خلجان کا جواب ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ انسان کی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے' یہ انسان ہی تو ہے جو ہر وقت ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔۔۔ تم نے بھی جا کے فائدہ اٹھایا۔۔۔ تو انسانی نوع میں یہ بھی داخل ہے کہ ذکر اللہ میں مصروف' مسائل سنن میں مصروف' کتاب و سنت کے احکام جاننے میں مصروف۔ تو تم نے سارے انسانوں پر کیسے حکم لگایا تھا کہ سارے ہی فسادی ہوں گے' سارے ہی مفسد ہوں گے' سارے ہی سفاک ہوں گے۔ ان میں یہ بھی تو ہیں۔۔۔ ایک لاکھ فسادی ایک طرف اور ایک صالح ایک طرف۔ اس کی وجہ سے ہزاروں کی نجات ہو سکتی ہے۔۔۔ تو انسانوں کے اندر یہ بھی تو ہیں۔۔۔ یہ جواب ہے اس کا کہ جو تمہارے دلوں کے اندر خلجان گزرا تھا۔

ملائکہ پر اتمام حجت حج جب ہوتا ہے' وہی صورت وہاں بھی ہوتی ہے۔ ملائکہ اربوں کھربوں جمع ہیں۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ۔

"یہ بندے ننگے سر' ننگے پیر' گرد آلود ریگستان میں پڑے ہوئے ہیں آخر یہ کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟۔۔۔ میری ہی محبت تو انہیں کھینچ کر لائی ہے۔ اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنے حج کرنے والے ہیں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔۔۔ اور آج یہ ویسے ہو گئے جیسے ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوئے ہیں"۔

ملائکہ پر یہ حجت تام کی جاتی ہے کہ یہی وہ انسان ہے جسے تم نے کہا تھا کہ بڑا مفسد ہو گا' بڑا

سفاک ہوگا۔ یہ سفاکی کررہے ہیں؟ یہ مفسدہ پر درازی کررہے ہیں؟ ہمارے ذکر میں مصروف' ہماری اطاعت میں مصروف۔

غرض ایسے تمام مواقع میں ملائکہ بھیجا جاتا ہے تاکہ عملی طور پر جواب ہوجائے کہ تم نے جو پوری نوع پر حکم لگایا تھا کہ یہ مفسد نوع ہے' خلافت کے لائق نہیں۔ سارے ایسے نہیں ہیں۔ بے شک زیادہ ایسے ہوں گے جو سفاک ہوں گے مگر ان کے اندر کم وبیش وہ بھی ہوں گے جو اللہ کا نام لینے والے ہوں گے خدا کی یاد کرنے والے ہوں گے اور انہیں پر دنیا قائم ہے۔ ایک بھی نہ رہے تو دنیا تھی نہیں رہ سکتی۔

ذکر انسانی پر نظام دنیا قائم ہے　　حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

لاتقوم الساعة حتی یقال فی الارض اللہ اللہ

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا دنیا میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا جب قیامت قائم ہوگی اور یہ سارا علم درہم برہم کردیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اللہ کے نام پر قائم ہے۔ جب نام نکل جائے گا۔ دنیا تباہ ہوجائے گی۔ اور ختم ہوجائے گی۔

تو دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا قائم ہے اللہ کے نام لینے والوں کے اوپر' جب تک اللہ کا نام لینے والے موجود ہیں' دنیا قائم ہے۔ جب وہ مٹ جائیں گے تو دنیا ختم کردی جائے۔۔۔۔ جس ملک کے اندر ابتدا اور ترقی کی طرف جائے گا۔ بہرحال اللہ کے نام میں ترقی ہے۔ تو جہاں کہیں بھی اللہ کے نام لینے والے جمع ہوتے ہیں تو فرشتوں کو بھیج کر انہیں جواب دیا جاتا ہے اور انہی کو گواہ بناتے ہیں کہ تم گواہ رہو میں نے ان کی مغفرت کی۔

انہی میں سے ایک شکل یہ بھی ہے اور عصر کی نماز کے وقت لاکھوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جب یہ دن والے چڑھتے ہیں اور رات والوں کو چارج دے دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ بندوں کو کس حالت میں چھوڑا؟

عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھ رہے تھے۔۔۔۔ اور یہ کہتے ہیں کہ۔

اتیناھم وھم یصلون وترکناھم وھم یصلون

جب ہم اعمال نامے لینے کے لئے گئے اور چارج لینے کے لئے گئے جب بھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور جب صبح کی نماز میں چھوڑ کر آئے' جب بھی یہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔ تو ترک بھی ہم نے انہیں نماز میں ہی کیا اور جب ہم پہنچے جب بھی نماز ہی پڑھ رہے تھے۔

گویا جواب دیا جاتا ہے کہ یہی ہے وہ انسان جس کے بارے میں تم نے خلجان ظاہر کیا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا' یہ مفسد کا کام ہے؟ کہ جب تم گئے جب بھی عبادت میں مصروف تھا' جب تم چھوڑ کر آئے جب بھی عبادت میں مصرف تھا۔ یہ ملائکہ پر اس خلجان کی وجہ سے حجت تمام کی جاتی ہے۔۔۔۔ بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہے۔ تو نماز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے دیدار خداوندی کی استعداد ار صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ تارک نماز کے اندر دیدار

خداوندی کی استعداد پیدا نہیں ہو گی۔

جلوۂ خداوندی روحِ عبادت ہے　اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نماز اکمل ترین عبادت ہے اور عبادت میں لطف جب ہی آتا ہے جب عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اگر معبود بالکل غائب ہو تو نماز کے اندر لطف نہیں آئے گا' نمازی اور عبادت گزار یہ کہے گا کہ ایک خیالی چیز کی عبادت کر رہا ہوں کوئی میرے سامنے تو ہے نہیں ـــــ یہ خطرہ گزر سکتا تھا ـــــ تو اصل میں نماز کا مقصد ہی یہ ہے کہ عابد اور معبود کا آمنا سامنا ہو ـــــ اسی لئے حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا جب حضرت جبریلؑ نے سوال کیا۔

ما الاحسان یا رسول اللہ؟

احسان کیا چیز ہے یا رسول اللہ ـــــ؟ ـــــ فرمایا۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم آنکھوں سے حق تعالیٰ شانہ کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی یہ تصور اور یہ دھیان باندھو کہ اللہ کے سامنے میں حاضر ہوں اور اگر تمہارے اندر اتنی قوت نہیں ہے تو کم سے کم یہ تصور رکھو کہ اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہوں سے تم اوجھل نہیں ہو۔ غرض دیکھنا اور آمنا سامنا ہونا یہ عبادت کی روح معلوم ہوتی ہے کہ محسن اور احسان والا عبادت میں جب ہی بنے گا جب معبود کا آمنا سامنا ہو۔ تو حق تعالیٰ شانہ کے بارے میں تصور کی آنکھ سے ہم دیکھتے ہیں کہ معبود ہمارا سامنے ہے اور ہم اس کی عبادت کر رہے ہیں۔

دنیا میں تجلیاتِ ربانی کا ظہور　زیادہ عبادت کی' قلب میں روشنی پیدا ہوئی۔ تو تجلیات اور انوارِ ربانی سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں تو جو آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ ذات کو تو نہیں دیکھ سکتا' ذات تو وراء الوریٰ ہے اور نفسِ ذات تو قیامت کے بعد بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اتنی لطیف' اتنی چمک اور اتنی نورانیت میں ہے کہ آنکھ کتنی لطیف بن جائے۔ مگر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ ذات بابرکات کو دیکھ سکے۔ تجلیاتِ ربانی کو دیکھے گی' عکوس کو دیکھے گی۔ یعنی عکسِ خداوندی مختلف صورتوں میں سامنے آئے گا' اسے دیکھ لے گی' ذات کا دیکھنا وہ کبھی نہیں ہو گا ـــــ مگر بہر حال تجلیات و انوار سامنے آتے ہیں جو اہل اللہ کے سامنے آنے لگتے ہیں۔

تجلی اخروی　البتہ قیامت کے دن اس تجلی کو دیکھیں گے جو اقرب الی الذات ہے یعنی جو ذات کے بالکل اقرب ہے۔ گویا اس کا دیکھنا ذات کا دیکھ لینا ہے۔ مگر تجلی کو دیکھیں گے۔ اس لئے کہ سب سے بڑا مقام دیدارِ خداوندی کا جنتیں ہوں گی۔

دربارِ خداوندی کا انعقاد　حدیث میں فرمایا گیا کہ ہر ہفتہ میں ـــــ وہاں ہفتے تو نہیں ہوں گے مگر ایک ہفتے کی جتنی مسافت اور مقدار ہوتی ہے ـــــ اس میں دربارِ خداوندی ہو گا۔ اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے ان سو کے اوپر پھر کرسی ہے۔ اس کے اوپر سمندر ہے۔ اس کے اوپر پھر عرشِ خداوندی ہے۔ تو کرسی گویا جنتوں کی چھت کے اوپر ہے۔ اس میں دربار ہو گا۔

آخرت میں رویت خداوندی کا مقام وہ دربار کہاں ہوگا؟

تو حدیث میں اس کی شرح یہ فرمائی گئی کہ حضرت جبریلؑ ایک دفعہ حاضر ہوئے تو ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ آئینے کے بیچ میں ایک نکتہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا یہ نکتہ کیسا ہے؟

عرض کیا کہ اس کا نام مزید ہے۔

فرمایا 'مزید' کیا چیز ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ! جنت میں ایک میدان ہے جس کا نام مزید ہے اور وہ اتنا بڑا ہے کہ لاکھوں برس سے اس میں گھوم رہا ہوں اور اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہیں ۔۔۔ اس کی ہر چیز سفید ہے' زمین سفید ہے' کنکریاں سفید ہیں' گھاس بھی سفید۔ غرض ہر چیز سفید ہے۔ تو جب جمعہ کا دن آئیگا اس وقت اس دربار کے لئے تیاری کی جائے گی۔ اس تمام میدان میں بیچوں بیچ تو اللہ تعالیٰ کی کرسی بچھائی جائے گی۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا

آسمانوں اور زمینوں سے کہیں زیادہ کرسی بڑی ہے' لیکن اس میدان میں جب کرسی بچھے گی تو وہ ایسی معلوم ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھوٹا سا چھلہ ڈال دیا جائے۔ وہ بیچوں بیچ بچھائی جائے گی ۔۔۔ اس کے اردگرد انبیاءؑ کے منبر ہوں گے۔ وہ نور کے منبر ہوں گے۔ ہر منبر کے پیچھے امتوں کی کرسیاں ہوں گی۔ ہر نبی کی امت اس کے پیچھے ہوگی اور کرسیاں جو ہوں گی وہ علیٰ قدر مراتب ہوں گی۔ جو عمل میں انبیاء سے زیادہ قریب ہیں' ان کی کرسیاں منبر کے قریب اور جو عمل میں بعید تھے کوتاہ عمل تھے ان سے ان کی بعید۔ درجہ بدرجہ۔

دربار خداوندی میں اہل جنت کی شرکت جب یہ دربار کا دن آئے گا تو تمام جنت دربار کی شرکت کے لئے چلیں گے ۔۔۔ اب یہ لاکھوں میل کا فاصلہ ہوگا مگر سواریوں پر جائیں گے' تخت ہوا ہوں گے۔ وہاں کوئی مشین نہیں ہے۔ جیٹ طیارے نہیں ہوں گے کہ ان کی مرمت کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ قوت متخیلہ کے تابع ہوں گے۔ تخت پر بیٹھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ چلے۔ اب وہ تخت چلنا شروع ہوا اور لاکھوں میل کا فاصلہ وہاں کی سواریاں پل بھر میں طے کریں گی۔ کوئی براق پر سوار ہے' کوئی تخت ہوا پر سوار ہے۔ درجہ بدرجہ مختلف سواریاں ہوں گی۔ اس میدان میں آکر بیٹھیں گے۔ جہاں کرسیاں ہوں گی۔

پھر کرسیوں میں یہ نہیں کہ وہاں نظم کرنے والے کھڑے ہوں کہ بھئی! یہ کرسی تمہاری ہے۔ یہ سیٹ تمہاری ہے۔ وہاں نہ بیٹھ جانا یہ نہیں ہوگا۔ ہر شخص اپنی قلبی شہادت سے اپنے مقام کو پہچانے گا۔ ٹھیک اسی کرسی پر جاکر بیٹھے گا جو اس کے نام زد ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ دوسری کرسی پر بیٹھ جائے تو تمام لوگ جمع ہو جائیں گے اور میدان بھر جائے گا۔ اس میں جو بالکل عوام ہوں گے' جن میں عملی کوتاہیاں زیادہ تھیں' تو کرسیوں کے پیچھے چبوترے ہوں گے۔ ان پر مشک وعنبر کے غالیچے ہوں گے وہ اس پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ اب یہ پورا دربار بھر گیا بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہے۔ اب کرسی کے اوپر تجلیات ربانی کا ورود شروع ہوگا ۔۔۔ جیسے احادیث میں فرمایا گیا ہے یہ محسوس ہوگا کہ جب اللہ

کی تجلیات اتریں گی تو کرسی اس طرح چرچرائے گی جیسے اب ٹوٹ کے دی'اب ٹوٹ کے دی۔ دباؤ بوجھ بدن کا نہیں ہوگا۔ حق تعالیٰ بدن سے پاک ہیں۔ وہ بدن کے خالق بھی ہیں اور روح کے خالق بھی ہیں۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا۔ ان کے کمالات کا بوجھ ہوگا جس کو ارواح محسوس کریں گے۔ وہ حسی اور جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔۔۔ تو کرسی گویا ایسے چرچرائے گی جیسے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب گویا تجلیات اتر چکی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ موجود ہیں اور انبیاء ؑ اردگرد نورانی منبروں پر ہیں اور ان کے پیچھے امتیں اربوں کھربوں اولین وآخرین جمع ہیں۔

دربار خداوندی میں شراب طہور کا دور　حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ علیہم السلام کو فرمائیں گے کہ وہ جو ہم نے قرآن کریم میں وعدہ کیا تھا

وَسَقٰهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا

ایک پاک قسم کا شربت ہم پلائیں گے وہ ان بندوں کو تقسیم کرو۔ ملائکہ تقسیم شروع کریں گے۔ گویا شاہی دربار کی طرف سے ایک ضیافت ہوگی۔ اس کو پئیں گے۔۔۔ اس سے ایسا سرور پیدا ہوگا اس کو نشہ تو نہیں کہہ سکتے۔ روحانی نشہ ضرور ہوگا۔۔۔ یعنی دنیا کی شراب میں تو یہ نشہ ہے کہ عقل جاتی رہتی ہے۔ آدمی مجنون ہو جاتا ہے خبطی بن جاتا ہے۔۔۔ اس شراب کے پینے سے عقل میں اور تیزی پیدا ہوگی اور معارف الٰہیہ اور علوم ربانیہ اور زیادہ کھلنے شروع ہو جائیں گے۔ انوار وبرکات بڑھ جائیں گے۔۔۔ تو یہ شراب طہور تقسیم ہوگی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوت مناجات　اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام جن کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا اتنی پاکیزہ پاک اور خوشنما آواز تھی کہ جب وہ حمد وثنا کی مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرندو پرند سب ان کے اردگرد جمع ہو کر سر دھنتے تھے اور مست ہو جاتے تھے۔۔۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ

اے داؤد! ان اہل دربار کو وہ مناجاتیں سناؤ جو تم دنیا میں پڑھتے تھے اور اسی اعجاز آواز سے سناؤ۔

داؤد علیہ السلام حمد وثنا کی وہ مناجاتیں پڑھنا شروع کریں گے۔ تو آواز تو معجزہ تھی ہی۔۔۔ اور وہاں میدان میں۔ سارے اللہ والے جمع ہیں سارے انبیاء علیہ السلام جمع ہیں۔ اربوں کھربوں ملائکہ جمع اور خود حق تعالیٰ شانہ موجود۔۔۔ تو اس کی تاثیر کی کیا انتہا ہوگی۔۔۔ جب وہ مناجاتیں پڑھی جائیں گی تو عجیب قسم کے اس کے آثار نمایاں ہوں گے سب بندے اس کے اندر محو ہو جائیں گے۔

جمال خداوندی کے دیدار کا سوال　اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے:

سلونی ماشئتم

بندے عرض کریں گے کون سی نعمت ہے جو آپ نے ہمیں عطاء نہیں کر دی۔ جنت ساری نعمتوں کا مجموعہ ہے۔ وہاں نقص کا نشان نہیں۔ ہر چیز میں کمال ہے جب آپ نے ہمیں سب کچھ دے دیا تو اب ہم کیا مانگیں۔۔۔؟ ہمارے تو خیال سے بھی زیادہ بلند چیزیں ہمیں مل چکی

ہیں۔اس کیا مانگیں ہم را تو تخیل بھی نہیں جاسکتا۔

ارشاد ہوگا۔۔۔ نہیں! مانگو!

جب کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب مل کر علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ تم فتویٰ دواور مشورہ دو کیا چیز مانگیں۔۔۔ ہمیں تو سب کچھ مل چکا ہے۔

تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ لوگ دنیا میں علماء سے کنارہ کشی چاہتے ہیں کہ چھوڑ دیں یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔وہاں بھی فتوے کی ضرورت پڑے گی۔وہاں بھی علماء کی حاجت پڑے گی۔۔۔ علم خداوندی کے بغیر نہ دنیا میں کام چل سکتا۔ ہے نہ آخرت میں کام چل سکتا ہے۔

علماء فتویٰ دیں گے کہ ایک چیز نہیں ملی وہ مانگو۔بے شک ساری نعمتیں مل گئیں۔ مگر ایک چیز ابھی تک نہیں ملی اور وہ یہ کہ جمال خداوندی کا دیدار ابھی تک نہیں ہوا۔وہ طلب کرو۔اس وقت بندے عرض کریں گے کہ :

"اے اللہ! اپنا جمال مبارک دکھلا دیجئے۔ آپ نے سب نعمتیں دے دیں۔ مگر یہ نعمت ابھی تک باقی ہے"۔

یہ درخواست منظور ہو جائے گی

نعمت مزید اور حق تعالیٰ فرمائیں گے :

ان کما انتم

ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھہری رہے۔۔۔ اگر یہ نہ فرمادیں تو :

لاحرق سحبات وجهه مابين يديه

اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیں۔۔۔ خود فرمادیں گے کہ ہر چیز تھمی رہے۔

اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔۔۔ اور سب حجابات اٹھ کر ایک حجاب کبریائی کا باقی رہ جائے گا۔

اس وقت بندوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ ایک تو شراب طہور۔۔۔ روحانی نشہ چڑھا تھا۔ داؤد علیہ السلام کے مضمونوں سے معرفت کا نشہ بڑھا۔ حق تعالیٰ کا جمال دیکھ کر اتنے اتنے محو ہوں گے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں رہے گی۔۔۔ اور یہ سمجھیں گے کہ کوئی نعمت ہی ہمیں اب تک جنت میں نہیں ملی تھی۔ آج ہمیں نعمت ملی ہے۔ اس نعمت کا نام شریعت کی اصطلاح میں "مزید" ہے۔۔۔ تو جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ وہ میدان مزید ہے۔اس میں نعمت ملے گی جو سب کے اوپر مزید ہے۔جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا :

ولدنیا مزید

ہم ضابطے کا اجر تو سب کو دیں گے۔ اور کچھ مزید بھی ہے جو ہم بعد میں عطاء کریں گے۔۔۔ وہ مزید یہ نعمت ہوگی۔

یوم المزید اور اس کے آداب اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یوم المزید" ہے

تو دنیا میں اس میدان مزید کی نقل جمعہ کا دن رکھی گئی ہے۔

جمعہ کا دن گویا دربار خداوندی کا دن ہے۔۔۔امام اور خطیب نائب خداوندی ہو کر بیٹھتا ہے۔

اسی واسطے فرمایا فرمایا گیا ہے کہ کوشش کرو کہ امام کے قریب بیٹھو۔ جو جمعہ کے اندر امام کے قریب بیٹھنے کی عادت ڈالے گا۔ اسی وہاں بھی اللہ کے قریب اور انبیاء علیہم السلام کے قریب جگہ ملے گی اور جو یہاں سستی کرے گا پیچھے رہے گا۔ وہاں بھی پیچھے رہ جائے گا۔

اسی واسطے فرمایا گیا:

اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام

جب خطبہ پڑھنے کے لئے خطیب نکل آئے نہ سلام وکلام کرنے کی اجازت ہے نہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے نہ تلاوت کرنے کی اجازت ہے۔۔۔اس وقت سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خطیب کو دیکھے۔۔۔اگر سامنے نہ ہو تو کم سے کم اس کی آواز سے کان لگائے۔ آواز سنائی نہ دے تو استماع کرے۔ کان لگائے۔ یعنی خطیب ہی کی طرف متوجہ رہے۔ اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے۔ یہ خطبہ عام وعظوں کی طرح نہیں ہے۔ اس میں تو بات بھی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی سکتے ہیں۔۔۔لیکن خطبہ کے آداب یہ ہیں نہ کنکر سے نہ تنکوں سے کھیلو نہ نماز پڑھو نہ ذکر کرو۔ بس امام کو دیکھو۔ اس وقت تمہاری سب سے بڑی یہی عبادت ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا:

من مس الحصا فقد لغا

جس نے کنکری چھوئی اس نے لغو حرکت کی۔ جس نے چٹائی کا کوئی تنکا چھوا اس نے لغو حرکت کی۔۔۔اس کا کام یہ نہیں تھا اس کے کا کام یہ تھا کہ امام کو دیکھے۔ سامنے نہ ہو تو کم سے کم یہ ہے کہ ادھر آنکھ لگائے۔ آواز نہ آئے تو ادھر کان لگائے۔ غرض ہمہ تن امام کی طرف متوجہ رہے۔۔۔جو جتنا یہاں اس کی توجہ کی مشق کرے گا۔ وہی میدان مزید میں اللہ کی طرف متوجہ ہو گا۔ جو جتنا یہاں قریب ہو گا وہاں قریب ہو گا۔ جو جتنا زیادہ جمعہ میں متوجہ ہو گا وہاں متوجہ ہو گا تو جمعہ در حقیقت اس دربار خداوندی کی ایک نقل ہے جو دنیا میں ہمیں دی گئی ہے۔ اس کا نام میدان مزید تھا اور دن کا نام بھی مزید وہی نام جمعہ کے دن کا ہے۔ اسے یوم المزید کہا گیا ہے کیونکہ اجر وثواب کے اندر زیارت پیدا کرتا ہے۔

تو حدیث مجھے اس پر یاد آگئی تھی کہ عبادت میں اصل تو یہ ہے کہ معبود سامنے ہو اسے دیکھ کر عبادت کرے۔۔۔لیکن دنیا میں یہ چیز ناممکن ہے بلکہ ذات کا دیکھنا آخرت میں بھی ناممکن ہے۔ تجلیات ہی کو دیکھے گا عکس ہی کو دیکھے گا روپوں کو دیکھے گا۔ ذات نگاہ کے احاطے میں نہیں آسکتی۔

لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

"ذات کے اوپر آپ کی نگاہ غالب نہیں آسکتی نہ فتح پا سکتی ہے"۔

رؤیت باری کے بارے میں معتزلہ کا مسلک　اسی واسطے مسلمانوں میں ایک معتزلہ کا فرقہ ہے اس نے دیدار خداوندی کا انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیدار وغیرہ کچھ نہیں ہو گا۔ یہ

ناممکن اور محال ہے اور اس کو عقلاً محال کہتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔
مسلک اہل حق لیکن انبیاء علیہم السلام اور اہل حق کا مسلک یہ ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔۔۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ

بہت سے تروتازہ چہرے ہوں گے جو پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے اور کفار کو دھمکی دی گئی ہے کو:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ

کفارہ کو دھمکی دی گئی ہے کہ قیامت کے دن تمہارے اور اللہ کے درمیان حجابات آجائیں گے تم اللہ کو نہیں دیکھ سکو گے۔۔۔ نہ دیکھنے کی دھمکی دینا جبھی ممکن ہے جب دیکھنا ممکن ہو۔۔۔ بہر حال قرآن کریم اور تمام آسمانی کتابوں کا مسلک اور تمام انبیاء السلام کا مسلک یہی ہے کہ آخرت میں دیدار خداوندی ہوگا۔۔۔ مگر معتزلہ ایک فرقہ ہے جو اسے نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً محال ہے۔

مناظرے میں معتزلہ کی شکست چنانچہ مامون کے زمانے میں یہ بڑا فتنہ پھیلا۔ معتزلہ غلبہ پا گئے اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ دیدار خداوندی محال ہے۔ عقلاً ممکن نہیں ہے، واقعتاً تو ہوگا ہی ن ہیں۔ عقل بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس کے انہوں نے دلائل بیان کئے۔ مسلمان فتنے میں گرفتار ہونا شروع ہوئے۔ علماء نے جوابات دینا شروع کئے مگر مشکل مسئلے کا اعتراض جلد سمجھ میں آجاتا ہے اور جواب دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔ دقیق مسئلہ تھا تو اعتراض تو سب کی سمجھ میں آ گیا۔ جواب سمجھ میں نہ آئے۔ فتنہ بڑھتا رہا۔ علماء عاجز آ گئے۔

آخر اس زمانے کے شیخ ہیں۔ حضرت شیخ شبلیؒ۔۔۔ ان کی خدمت میں علماء کا ایک وفد حاضر ہوا کہ حضرت! جتنا ہمارے امکان میں تھا ہم جوابات دے چکے۔ مگر وہ جوابات علمی ہیں او عوام علم کی باتیں سمجھتے نہیں۔ اس واسطے شبہات تو ان کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ جوابات نہیں بیٹھتے۔۔۔ مگر اب ہم کیا کریں۔ اب تو اہل اللہ کچھ قلبی تصرف و توجہ سے کام کریں تو یہ فتنہ رفع ہو۔ محض علم سے رفع نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ شبلیؒ نے فرمایا کہ اچھا!

اعلان کر دو کہ ہم معتزلہ سے مناظرہ کریں گے۔

اعلان ہو گیا۔

اور جامعہ بغداد میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔۔۔ اول تو اس لئے کہ شیخ شبلی اور عظ کہیں۔ کبھی نہیں فرماتے تھے۔ ایک نئی چیز معلوم ہوئی کہ شیخ کبھی مجمع میں وعظ کہنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ آج وعظ فرمائیں گے تو لاکھوں لوگ جمع ہوئے۔

دوسرے یہ کہ نام مناظرہ کا تھا اور مناظرہ درحقیقت جھگڑا ہے۔ چاہے وہ علمی ہی سہی۔ عوام کو جھگڑوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ کوئی سکون کی بات ہو کوئی نہیں جائے گا اور جھگڑا ہو تو ہزاروں

وہاں پہنچ جائیں گے۔ تو لوگوں نے کہا آج مناظرہ اور بحث ہوگی۔ بڑا تماشہ ہوگا۔۔۔ غرض ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔

منبر بچھایا گیا۔۔۔ حضرت شبلیؒ بیٹھ گئے۔

معتزلہ کے جتنے علماء تھے وہ قطار باندھ کر سامنے بیٹھے گئے۔

تو شیخؒ نے فرمایا تمہارا دعویٰ کیا ہے؟

معتزلہ نے کہا کہ:

" دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ اللہ کا دیکھنا ناممکن و محال ہے۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ عقل گوارا نہیں کرتی عقلاً محال ہے"۔

تو اہل اللہ پر حقائق روشن ہوتی ہیں۔ وہ لفظوں کی گرفت سے تھوڑا ہی گرفت کرتے ہیں۔ وہ لمبی تقریریں تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ وہ چٹکی میں ضمیر کو تھام لیتے ہیں۔ شیخ نے دو منٹ میں فیصلہ کر دیا۔ سارے مناظرے ختم ہو گئے۔

"معتزلہ سے پوچھا کہ تمہارے دلائل اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہم تمہارے دل سے بات پوچھنا چاہتے ہیں کہ تمہارا دل بھی چاہتا ہے اللہ کو دیکھنے کو؟"

سب نے کہا دل تو چاہتا ہے۔

فرمایا۔ یہ دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔۔۔ اس لئے محال کو دیکھنے کی تمنا کبھی قلب کے اندر نہیں آسکتی۔ اسی چیز کو دیکھنے کی تمنا آئے گی جس کو دیکھا جانا ممکن ہو۔ کبھی آدمی تمنا نہیں کرے گا کہ میں کان سے دیکھ لوں۔ اس لئے کہ کان کے اندر دیکھنے کی قدرت ہی نہیں۔ آنکھ سے ہی دیکھنے کی تمنا کرے گا۔۔۔ کبھی یہ تمنا نہیں کرے گا کہ میں زبان سے آواز سن لوں زبان چکھنے کے لئے ہیں۔ آواز سننے کے لئے نہیں۔ اس کے لئے کان ہیں۔ تو کان سے سننے کی اور آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھنے کی تمنا کرے گا۔ یہ نہیں کر سکتا کہ آنکھ کا کام زبان سے لینے لگے اور زبان کا کام آنکھ سے لینے لگے یہ دل میں آتا ہی نہیں۔

تو شیخؒ نے فرمایا کہ جب تمہارے دل میں تمنا ہے کہ ہم اللہ کو دیکھیں تو تمنا اور دل کے اندر ہونا اس کی دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ جس کا دیکھا جانا محال ہو کبھی اس کے دیکھنے کی تمنا دل میں نہیں آسکتی۔ تو امکان تمہارے ضمیر سے ثابت ہو گیا اور وقوع پیغمبر کی خبر سے ثابت ہے۔ اب بتاؤ تمہارا اعتراض ہے؟

اب وہ چپ چاپ بیٹھے۔ وہ تو ان کا دل پکڑا گیا۔۔۔ سارا قصہ ختم ہو گیا۔ ساری بحث ختم ہوئی اور فتنہ ایک منٹ میں ختم ہو گیا۔۔۔ بہر حال مقصد یہ تھا کہ دیدار خداوندی کی تمنا ہر انسان کے دل میں ہے کہ میں اپنے معبود کو دیکھوں۔ اسی تمنا میں وہ نمازیں پڑھتا ہے۔ اسی تمنا میں وہ عبادتیں کر رہا ہے۔

دیدار خداوندی میں درجہ بدرجہ ترقی یہاں عقیدے کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور آگے بڑھا تو خواب کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور آگے بڑھا تو کشف کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ موت کے بعد جب

آگے بڑھے گا تو پھر اس آنکھ سے دیکھنا شروع کر دیگا تو درجہ بدرجہ اس کا ابھی سے دیدار شروع ہو گیا ہے۔ نماز کے اندر تصور اور عقیدے سے دیکھنا یہ دیکھنے کی ابتداء ہے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ چیز آنکھ کے سامنے آجائے گی۔ جو دل میں جم جاتی ہے۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ اگر آپ تصور سے کوئی چیز دل میں جمالیں تو چند دن کے بعد وہ آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آئے گی۔

ایک بزرگ سے کوئی صاحب بیعت ہوئے۔ شیخ نے انہیں بیعت کر لیا اور ذکر شغل بتلا دیا۔ محنت بھی کی مجاہدے بھی کئے۔ مگر یکسوئی نصیب نہیں ہوتی تھی کہ ہر چیز سے کٹ کے توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔ بہت علاج کئے مگر یہ نہیں ہوتی تھی۔

تو شیخ نے کہا تمہیں کسی چیز سے محبت بھی ہے؟

اس نے کہا جی! مجھے بھینس سے محبت ہے۔

۔۔۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔۔۔

فرمایا اچھا۔ بیٹھ کر چلہ کرو۔ چالیس دن بھینس کا تصور کرو۔

چلہ کر لیا۔ وہ حجرے میں بیٹھ گئے۔ طبیعت کا میلان تو بھینس کی طرف تھا ہی۔۔۔ تصور کیا تو وہ دل میں جمنے لگی۔۔۔ چالیس دن کے بعد شیخ نے فرمایا باہر آؤ۔۔۔ دروازہ کھولا۔

اس نے کہا باہر کیسے آؤں۔ بھینس کھڑی ہوئی ہے۔ راستہ رکا ہوا ہے۔ حالانکہ نہ بھینس تھی نہ کچھ تھا۔۔۔ مگر دل میں بھینس اتنی جم گئی تھی کہ آنکھوں سے وہی نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ بھینس دروازہ روکے کھڑی ہے۔۔۔ تو یہ ایک فطری چیز ہے کہ جو چیز آدمی کے دل میں جم جاتی ہے وہ مصور ہو کر آنکھ کے سامنے آنے لگتی ہے۔

تو جب دل میں جمائیں گے کہ میں اپنے پروردگار کو دیکھ رہا ہوں اور عقیدے کی آنکھ سے دیکھیں گے اور پھر ترقی کر کے خواب میں دیکھنے لگیں گے۔ تو ایک وقت آئے گا کہ اس آنکھ سے بھی اللہ کا دیدار ہو جائے گا۔ جس جس درجہ میں بھی ہو۔ بہر حال دیدار ہو گا۔ تو اصل نماز تو وہاں ہوئی۔

روح کا عروج اور عرش کے سامنے سجدہ جیسے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدمی انتقال کرتا ہے تو اس کی روح کو آسمانوں کی طرف چڑھا دیا جاتا ہے۔ صالح آدمی ہے تو لاکھوں ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو اس کی روح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ آسمان اول کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کے ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگلا آسمان آیا تو اس کے دروازے کھلتے ہیں تو وہاں کے ملائکہ اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اس جلوس کے ساتھ وہ عرش کے نیچے پہنچتی ہے اور وہاں جا کر سجدہ کرتی ہے۔ تو وہ سجدہ جو عین عرش کے سامنے ہے مرنے کے بعد نصیب ہو گا مرنے سے پہلے مشکل ہے۔

دینوی جذبات کا برزخ میں ظہور جس کے دل میں نماز کی لو لگی ہوئی ہے وہ برزخ میں بھی نماز کی لو لے کر جائے گا حشر میں بھی نماز کا جذبہ لے کر جائے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو وہ ملائکہ آکر اس سے سوال کرتے ہیں وہ پوری زندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور تین سوال ہوتے ہیں۔

من ربك؟ ______ تیرا رب کون تھا؟

وما دينك ؟ ______ تیرا دین کیا تھا؟

ومن هذا الرجل؟ ______ اور یہ کون ہے ؟

یہ نبی کریم علیہ السلام کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔۔۔ یہ سوال کرتے ہیں۔۔۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میت کو ایسا متمثل ہوتا ہے سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے۔ مغرب کا وقت قریب ہے۔ حالانکہ سورج وہاں نہیں ہوتا۔ مگر وقت کی صورت مثالی نمایاں ہوتی ہے۔۔۔ تو ملائکہ یہ پوچھتے ہیں کہ من ربك ؟ وہ کہتا ہے کہ دعونی اصلی میاں پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ غروب ہو جائے گا تو میری عصر کی نماز قضا ہو جائے گی۔۔۔ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے کیا رب کا سوال کرتے ہو۔ یہ تو رب پر اتنا مٹا ہوا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔۔۔ دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ جواب سچا دے گا مگر ہماری تو ڈیوٹی ہے ہمیں تو ادا کرنی ہے سوال کرنا ہی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جواب حق دے گا۔

مگر دعونی اصل پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ یہ کون کہے گا؟ جسے دنیا میں نماز کی عادت ہو گی۔۔۔ اور جو دنیا میں ٹلا تا رہتا ہے اسے دعونی اصلی کہنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس کی لئے تو دنیا میں روز وقت تنگ ہوتا تھا تو نہ نماز کا تھا نہ روزہ کا۔۔۔ تو دنیا میں جس چیز کی مشق کر لیں گے وہی سامنے آئے گی۔ جس چیز کی عادت ڈال لیں گے آخرت میں وہی متمثل بنے گی۔

دینوی جذبات کا آخرت میں ظہور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

تحشرون كما تموتون و تموتون كما تحيون

تمہارا حشر اس حالت پر ہو گا۔ جس حالت میں موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے۔۔۔ اگر لہو و لعب کھیل کود اور مختلف عیش و آرام کی حالتوں میں زندگی گزاری ہے موت کے وقت بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا اور قبر سے اٹھے گا تب بھی انہی چیزوں کو دھیان رہے گا۔

اور اگر اللہ کے ذکر اور اس نام لینے میں اور اس کے فرائض کے ادا کرنے میں زندگی گزاری ہے۔ وہی جذبہ موت کے وقت رہے گا کہ کسی طرح میری نماز قضا نہ ہو۔ کسی طرح میرا ورد اور وظیفہ قضا نہ ہو اور جب قبر سے اٹھے گا وہی جذبہ ہو گا کہ کہیں میرا ورد قضا نہ ہو جائے بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ میدان محشر ہے۔ مگر وہ یہی سمجھے گا کہ یہ دنیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاجی لبیک لبیک کہہ رہا تھا اور اتفاق سے اونٹ سے گر پڑا اور موت واقع ہوئی تو قیامت کے دن جب اٹھے گا تو لبیک لبیک اس کی زبان پر جاری ہو گا اور وہ سمجھے گا کہ میں میدان عرفات میں ہوں۔۔۔ بعد میں اس پر کھلے گا یہ میدان محشر ہے۔ میدان عرفات نہیں ہے۔

مگر جذبہ وہی رہے گا جو دنیا میں پیدا کیا تھا۔

تو موت حقیقت میں قاطع نہیں ہوتی کہ کسی چیز کو قطع کردے۔ متمم اور مکمل ہوتی ہے جو دنیا کی زندگی کے جذبات ہیں۔ ان کو حد کمال تک پہنچا کر نفس کا جوہر بنا دیتی ہے۔ تو جس حالت پر زندگی گزرے گی اسی حالت پر موت آئے گی اور جس حالت پر موت آئے گی اسی حالت پر حشر ہوگا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں جب نماز کی عادت تھی اور وقت ٹلا کر پڑھنے کی نہیں تھی بروقت پڑھنے کی تھی۔ وقت ٹلنے لگا اور تنگ ہونے لگا تو پریشانی اور اضطراب ہوتا تھا کہ کہیں میری نماز قضاء نہ ہو جائے۔ وہی قبر میں کہے گا دعونی اصلی　　پرے کو ہٹ۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ جسے دنیا میں عادت نہیں تھی، وہ وہاں بھی نہیں کہے گا اور آخرت میں بھی یوں ہی جذبہ رہے گا۔

سایہ عرش میں اشتیاق نماز　　ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ اقدس اللہ سرہ جو پوری جماعت دیوبند کے شیخ طریقت ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے قیامت کے دن پوچھا کہ امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے۔

تو میں عرض کروں گا کہ

"یا اللہ! نہ مجھے جنت کی ضرورت ہے نہ حوریں مطلوب ہیں نہ محلات مطلوب ہیں نہ باغات مطلوب ہیں۔ مجھے تو اپنے عرش کے نیچے ڈیڑھ گز کی جگہ دے دیجئے کہ کھڑا ہو کر نماز پڑھتا رہوں"۔

اللہ سے میں یہ مانگوں گا۔

تو اہل اللہ کی نماز میں وہ لطف میسر ہوتا ہے کہ سلطنتیں بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہیں مگر نماز چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

لطف نماز　　حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ:

جعلت قرة عيني في الصلوة

"نماز مری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے"۔

نماز پڑھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ دل میں سرور اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔۔۔ بہر حال نماز ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے دل میں سرور اور فرحت اور دیدار خداوندی کی صلاحیت اور دار کی تڑپ کہ کسی طرح میں اپنے معبود کو دیکھ لوں پیدا ہوتی ہے۔۔۔ یہ نماز کی خاصیت ہے۔

تو ایک زکوٰۃ کی خاصیت تھی کہ حسن معاشرت پیدا ہو　　ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں۔ ایک زکوٰۃ کی خاصیت نفس کے اندر سے بخل کا رذیلہ مٹ جائے۔ اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدار خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے تو عبادات میں اللہ تعالیٰ کو خاص تعلق نماز ہی سے ہے۔

حقیقی عبادت　　حقیقت میں اگر حقیقی عبادت ہے تو نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے

عبادت بن گئی ہیں۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔

اس لئے کہ عادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا۔۔۔ کیونکہ اللہ کی ذات وہ ہے کہ انتہائی عزت میں ہے کہ عزت کا کوئی مقام نہیں ہے کہ اس کے پاس نہ ہو۔ اس لئے اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ جو بندہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش نہ کردے۔

اب ظاہر بات ہے کہ زکوۃ ہے اسمیں غایت تذلل کہاں ہے؟

زکوۃ میں تو آپ غریب کو عطاء کرتے ہیں۔ تو عطاء کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مشابہت پیدا کررہے ہیں۔ وہ بھی معطی ہے۔ آپ بھی عطا کررہے ہیں تو اس میں ذلت کیا ہوئی؟ یہ تو عین عزت کی چیز ہوئی۔ جب اس میں ذلت کا نشان تو عبادت کیسے بنی؟

آپ روزہ رکھتے ہیں کھانا چھوڑ دیا پینا چھوڑ دیا بیوی چھوڑ دی۔ یہ تو حق تعالیٰ کی شان ہے کہ کھانے سے بھی بری پینے سے بھی بری بیوی سے بھی بری۔ یہ اللہ کے ساتھ مشابہت ہوئی۔ اس میں ذلت کہاں ہے۔ یہ تو عین عزت کا مقام ہے۔۔۔ غرض روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں اس میں غایت تذلل ہی نہیں۔۔۔ لیکن نماز وہ ہے کہ اول سے لے کر آخیر تک سوائے اظہار ذلت کے اور کوئی چیز نہیں۔

ابتداءً آپ نوکر چاکروں کی طرح سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور غلاموں کی طرح گردن جھکا دیتے ہیں۔ یہ ذلت کا ابتدائی درجہ ہے جو آپ اپنے رب کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ اس کے بعد آگے بڑھے۔ سر جھکایا، رکوع کیا۔ اس میں پہلے بھی ذلت کا برا درجہ۔ اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ ناک اور پیشانی زمین پر رگڑتے ہیں جو انتہاء ذلت کا مقام ہے اسکے بعد پھر اور ہے کہ آپ تشہد میں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں کہ یا اللہ مجھے یہ دے۔ بھیک مانگنا سب سے زیادہ ذلت کی چیز ہے۔۔۔ تو نماز میں جتنے افعال ہیں قیام ہو رکوع ہو سجدہ ہو تشہد ہو سب میں اپنی نیاز مندی اور ذلت کا اظہار ہے۔۔۔ اس لئے حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔۔۔ دوسری چیزیں دوسری وجوہ سے عبادت بنی ہیں۔ زکوۃ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔۔۔ پھر کیوں عبادت بنی؟ تعمیل حکم کی وجہ سے۔ حکم خداوندی ہے کہ زکوۃ دو۔ تعمیل کی۔ تو تعمیل ارشاد کی وجہ سے یہ عبادت بن گئی۔

روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا ہے۔ حکم ہے کہ روزہ رکھو۔ تعمیل کی وجہ سے عبادت بن گیا۔ لیکن نماز اپنی ذات سے عبادت ہے اس لئے کہ جتنی ہیئتیں ہیں سب اظہار ذلت کی ہیں۔

پھر نماز کے اندر جو بھی آپ پڑھیں گے تسبیح و تہلیل میں یا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہے یا اپنی فدویت کا اظہار۔۔۔ یا اللہ کی عظمت کا اظہار کریں گے کہ الحمد للہ رب العلمین ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں وہ رحمٰن ہے رحیم ہے یوم الدین کا مالک ہے یا اپنی فدویت کا اظہار ہے کہ وَاِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم آپ ہی کی عبادت کریں گے اور ہم تو آپ ہی سے مانگتے ہیں۔ غرض یا تو اللہ کی عظمت کا اظہار یا اپنی ذلت کا اظہار۔۔۔ اس کے سوا نماز میں اذکار ہوں یا اعمال

ہوں، سب کی یہی حیثیت ہے۔۔۔ تو حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو وہ نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادتیں بنی ہیں۔ یہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔۔۔ تو ظاہر بات ہے کہ عبادت کرنے والے عابد کا جذبہ ہوگا کہ معبود میرے سامنے ہو تا کہ میں دیکھوں میں جس کی عبادت کر رہا ہوں۔۔۔ تو یہ جذبہ لے کر کھڑا ہوا ہے۔

جذبۂ عبادت کی تسکین اللہ نے اس جذبے کی تسکین کا سامان کر دیا کہ دنیا گندی جگہ ہے۔ دیدار خداوندی یہاں نہیں ہو سکتا۔ تو عقیدے کی آنکھ سے اللہ کو دیکھو دل میں یقین کے ساتھ تصور بندھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔ اس کے بعد ہم مزید روشنی دیں گے کہ تمہارے اوپر کچھ انکشاف ہوگا انوار ربانی کچھ نظر پڑنے لگیں گے۔ اس کے بعد میں اور انکشاف ہوگا۔ آنکھوں سے بھی تجلیات اسی دنیا میں نظر آسکتی ہیں۔ اس کے بعد مزید انکشاف ہوگا۔ مگر وہ موت کے بعد قیامت کے دن ہوگا کہ ذات کے ہم پلہ تجلی سامنے آئے گی اور بندے آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ تو نماز کی ایک خاصیت ہے تو بات اس پر چلی تھی کہ دواؤں کی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔ اسی طرح سے عبادات کی بھی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔

مجموعۂ شریعت پر عمل کی تاثیر اور جیسے دواؤں میں ایک مقدار ہے جو فلاں طبیب مقرر کرتا ہے کہ یہ دوا تین ہی ماشے ہوگی اور یہ ایک تولہ ہوگی۔۔۔ ایسے ہی تسبیحات کے عدد بھی شارع علیہ السلام نے متعین کئے ہیں کہ رکوع میں سبحان ربی العظیم کہو تو کم سے کم تین مرتبہ ہو۔ تین سے کم نہ ہو۔ پانچ دفعہ کہو لو۔ سات دفعہ کہہ لو۔ مگر تین سے کم سنت کے مطابق نہیں ہوگا۔ تو مقدار تین بتلائی گئی۔ اسی طرح سبحان ربی الاعلی کم سے کم تین دفعہ۔۔۔ فاتحہ پڑھو تو ایک دفعہ اس میں تکرار نہیں۔ تو ہر چیز میں کہیں تکرار ہے، کہیں تکرار نہیں۔ جہاں تکرار ہے وہاں عدد معین ہے کہ اتنے عدد میں پڑھو۔ دو دفعہ یا تین دفعہ۔

اسی طرح نمازوں کی رکعات کے اعداد متعین کر دیئے صبح کی نماز دو رکعت کی، مغرب کی نماز تین رکعت کی، بقیہ نمازیں چار چار رکعت کی۔ تو کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ کہے کہ یہ چار رکعت والی کی پانچ رکعات کیوں نہ کر دیں؟ اور تین والی کی دو دو رکعات کیوں نہ کر دیں؟

جو جواب طبیب دنیا میں فن کی رو سے دے گا کہ جو مقدار فن کی رو سے ضروری ہے وہی میں معین کی مریض کو کمی زیادتی کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہی انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جواب ہے کہ اللہ نے یہ اذکار کی دوائیں مقرر کی ہیں۔ اس کی مقداریں بھی خود مقرر کی ہیں۔ ہمیں اس میں کمی زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جتنی مقدار آئے گی اتنی استعمال کریں گے۔ زیادہ کریں گے ہلاکت واقع ہوگی۔۔۔ اگر کوئی ظہر کی نماز پڑھے اور یہ خیال کرے کہ نماز تو اچھی چیز ہے لاؤ آج آٹھ یا بارہ رکعات پڑھ لوں۔ وہ منہ پر ماری جائے گی اور ہلاکت کے قریب ہو جائیگا۔ حالانکہ اس نے زیادتی ہی تو کی ہے۔۔۔ مگر زیادتی بھی ناجائز، کمی بھی ناجائز۔ یہ مقدار شارع حقیقی کی طرف سے معین ہے، وہی مقدار رکھنی پڑے گی۔ اس واسطے جب مجموعۂ شریعت پر عمل ہوگا پھر روحانی صحت کامل نصیب ہو جائیگی۔۔۔ جیسا کہ گل بنفشہ پیام تو زکام دفع ہو گیا۔ ملیٹھی کھائی تو کھانسی رفع ہو گئی یا قوتی

کھائی تو دماغ میں طاقت پیدا ہو گئی ' مفرح بار دکھایا تو قلب میں فرحت پیدا ہو گئی اور اگر ان سارے چیزوں کا مجموعہ معجون مرکب نا کر کھاؤ تو صحت کامل بنجاتی ہے۔۔۔ یہی صورت شریعت کی ہے کہ الگ الگ اعمال کی بھی خاصیتیں ہیں اور مجموعۂ شریعت کو استعمال کرو تو مکمل طریق پر روحانی صحت حاصل ہو گئی تو آدمی چاق وچوبند ہو گا۔

تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ ہماری اور آپ کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی شریعت کے اتباع پر موقوف ہے۔ ہم اور آپ سب مریضان نفوس ہیں۔ کوئی شہوتوں میں گرفتار ہے، کوئی شبہات میں گرفتار ہے، کسی میں عقائد کی خرابی ہے، کسی میں کبر کی خرابی، کسی میں عمل کی خرابی ہے، ان ساری چیزوں کو رفع کرنے والی چیز قرآن وحدیث اور شریعت ہی تو ہے جب آپ سب کو استعمال کریں گے تو نہ عاقئد کا فتنہ باقی رہے گا نہ عمل کا فتنہ باقی رہے گا کوئی روگ باقی نہیں رہے گا۔ سلامتی پر آجائیں گے۔

علم و عمل کی بنیادیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترکت فیکم الثقلین... لن تضلوا بعدی ابدًا ان تمسکتم بهما. کتاب الله وسنتی

میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ کسی فتنے میں مبتلا نہیں ہو گے۔

اور وہ دووزنی چیزیں کیا ہیں؟

اللہ کی کتاب اور میری سنت۔۔۔ یعنی میرا اسوۂ حسنہ۔

علم حاصل کرو قرآن سے اور عمل حضور ﷺ کی ذات برکات سے حاصل کرو۔ علم وعمل جب درست ہو گا تو علمی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے۔ جو عقائد کو برباد کرتے ہیں اور عملی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے جو اتباع سنت کو برباد کرتے ہیں اور منکرات و بدعات میں لوگوں کو مبتلا کرتے ہیں۔ تو منکرات و بدعات ختم نہیں کر سکتے۔ جب تک قرآن کو سامنے نہ رکھا جائے۔ انہی دو کے مجموعے کا نام شریعت ہے، شریعت کی یہی دو بنیادیں ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ: تو ایک سے علم حاصل کرو ایک سے عمل حاصل کرو، ایک سے فکر صحیح کرو، ایک سے اخلاق درست کرو، اخلاق و کمالات کا مجموعہ حضور ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ اعمال صالحہ کا مجموعہ حضور ﷺ کی ذات اقدس ہے، علوم کاملہ کا مجموعۂ قرآن کی ذات ہے۔ ان . کات ہے۔ اعمال صالحہ کا مجموعہ حضور ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ علوم کاملہ کا مجموعۂ قرآن ن. ت ہے، ان دونوں ذاتوں کو اگر آپ ہاتھوں میں تھام لو تو کبھی فتنے میں گرفتار نہیں ہو گے، جب ... ن تباہ ہوئے ہیں انہیں دو چیزوں کے ترک کرنے سے تباہ ہوئے ہیں، جب انددو کو اختیار کر لیں۔ جب ہی نجات پا گئے اور عروج پا گئے۔

بہر حال یہ چند کلمات میں نے عرض کئے میں تو بہت تھوڑی دیر چاہتا تھا کچھ دماغ میں قوت نہیں تھی 'اور صلاحیت بھی نہیں رہی تھی ضعف بھی بہت تھا۔ مگر خیر بات بڑھ گئی۔

صدق طلب تو مقصد اصلی یہ تھا کہ اتباع شریعت کو اصل سمجھا جائے۔ اتباع سنت کو اصل سمجھا جائے۔ اس کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے۔ وہ معلومات حاصل کی جائیں۔۔۔ اگر آپ

خود عالم ہیں تو اپنے علم کی روشنی میں آپ سنت کی پیروی کریں۔۔۔ اگر آپ عالم نہیں ہیں تو قرآن کریم نے طریقہ بتلایا کہ :

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

تم اگر نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔۔۔ اور ان سے سوالات کر کے 'استفتاء کر کے فتویٰ لو۔ پھر اس کے اوپر چلو۔ تو یا ان علم پر چلو یا دوسرے کے علم پر اعتماد کر کے اس سے پوچھ پوچھ کر چلو۔۔۔ اگر دل کے اندر نُوہ رہے گی تو یا خود علم حاصل کر کے یا علم والوں سے پوچھ کر چلنے پر مجبور ہوں گے اور اگر دل میں طلب نہیں ہو گی تو پھر کچھ بھی نہیں۔۔۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ پانی کی تلاش زیادہ مت کرو۔ اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس پیدا ہو گئی تو پانی خود آپ کے پاس آجائے گا۔۔۔ پیاس ہی نہیں طلب ہی نہیں۔۔۔ جیسا کہ ہمارے ڈاکٹر اقبال مرحوم جو "شکوہ جواب شکوہ" ان کی مشہور نظم ہے۔ اس میں ایک موقع پر کہتے ہیں۔

راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

ہم تو راہ دکھلانے کے لئے موجود ہیں۔ مگر کوئی چلنے والا بھی تو ہو ؟

راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی ' وہ گل ہی نہیں

وہ مٹی ہی باقی نہیں رہی جس سے آدمی کی تعمیر ہوتی تھی خدا جانے لوگوں میں مٹی کہاں کہاں سے آگئی ہے کہ اتباع شریعت اتباع سنت اور اتباع دین کا کوئی رجحان نہیں آرہا۔۔۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مٹی ہی خراب ہو گئی ہے کہ

جس سے تعمیر آدمی کی ' وہ گل ہی نہیں

تو خوب کہا ہے کہ ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

حدیث میں ہے کہ روزانہ حق تعالیٰ کی تجلیات آسمان دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں جیسا ہاتھ ان کی جناب اقدس کے لائق ہے اور فرماتے ہیں :

انا الرازق من ذالذی یسترز قنی انا الغافر من ذلذی یستغفرنی

"میں رزق دینے والا ہوں کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں کوئی ہے مغفرت کا طلب کرنے والا؟"

اخیر شب میں تہائی رات میں طلوع فجر یہ آوازیں لگی رہتی ہیں۔ جن کو اللہ توفیق دیتے ہیں وہ مانگتے ہیں دعائیں کرتے ہیں۔ ورنہ ہم جیسے پڑے ہوئے سوئے رہتے ہیں۔ تو یہی کہا جائے گا کہ ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ اتباع شریعت اور اتباع سنت آسان ہو جائے گا اپنے

اندر پیاس پیدا کرلو۔ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم متبع بن کر رہیں۔ مبتدع اور مخترع بن کر نہ رہیں کہ ایجاد کر کے رواج کو دین بنادیں۔ جو رواج پڑ گیا وہ دین' جو رسم پڑ گئی وہی دین' بلکہ ہر معاملہ میں دیکھوں کہ اللہ کے رسول نے کیا فرمایا۔ اس کے اوپر صحابہؓ کا کیا عمل تھا۔ جو صحابہؓ کے تعامل سے ثابت ہو حضور علیہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہو اس پر چلو جو بے غل و غش راستہ ہے شادی ہو بیاہ ہو غمی ہو خوشی ہو ہر ایک میں دیکھو کہ میرے پیغمبر نے اس کے اندر کیا نمونہ دکھلایا ہے اس کے مطابق کرو۔ اس میں کوئی گھاٹا نہیں کوئی خسارہ نہیں۔ آسان راستہ ہے' حقیقت میں دُنیا طلبی مشکل ہے۔ دنیا میں جھگڑوں میں پڑ کر ہزاروں طوق و سلاسل آپ نے اپنے گلے میں ڈال لئے ہیں اور اپنے کو گویا زنجیروں میں باندھ لیا۔ شریعت ان زنجیروں کو کھولنے کے لئے آتی ہے کہ آزادی اور سہولت کے ساتھ عمل کر کے دنیا بھی کمالو اور اللہ تک بھی پہنچ جاؤ۔۔۔ اس لئے میں نے یہ چند جملے عرض کئے کہ

آب کم جو تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو۔ پیاس پیدا کرو۔ پانی خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ اتباعِ حق شریعت پر عمل کرنے اور آخرت کی نجات کی پیاس ہونی چاہئے' اپنی موت کو یاد کرو۔ اس عالم کے ختم ہونے کو یاد کرو تو جب ایک دن ختم ہونا ہے تو ایک دن جواب وہی کا بھی آنا ہے۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ تو تیاری کی ضرورت ہے۔

حکیمانہ بات حدیث میں آپ علیہ ﷺ نے کیسی حکیمانہ بات فرمائی اور انبیاء علیہم السلام سے زیادہ حکیمانہ بات کہہ کون سکتا ہے۔۔۔ فرمایا،

اعمل للدنیا بمقدر بقائك فیها واعمل لاخرة بمقدار بقئك فیها

"دنیا کے لئے اتنا کام کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کام کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے"۔

یہاں چند دن رہنا ہے تو تھوڑا کام بھی کافی ہے' وہاں ابدالآباد تک رہنا ہے تو بہت سے کام کی ضرورت ہے۔

احترام جلسہ بہر حال یہ چند جملے میں عرض کئے۔ ہمت اور طاقت تو تھی نہیں مگر جلسے کے احترام نے مجبور کیا۔ اب جب لوگ جمع ہوں' لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا جائے اور ایک شخص کو لا بٹھلا دو اور تواضعاً یہ بھی کہہ دیں کہ ہم بالکل تقریر کرنے کی درخواست نہیں کرتے چاہتے۔ آپ تقریر کریں چاہے نہ کریں۔ یہ بڑے عمدہ پیرائے میں تقریر کے لئے مجبور کرنا ہے جب ہیئت جلسہ کی بن گئی' لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا گیا تو آدمی جھک مارے گا اور تقریر کریگا۔

آپ تو بری ہو گئے کہ دیکھئے ہم نے تو فرمائش نہیں کی تھی نہ مجبور کیا تھا۔ آپ دعا کر کے اٹھ جاتے ہم اس پر بھی راضی تھے۔ مگر ہیئت ایسی بنا دیں کہ میں کچھ عرض کرنے پر مجبور تھا۔۔۔ ارادہ تھوڑا تھا مگر بہر حال ہو گیا کچھ زیادہ۔۔۔ بہر حال نفع ہی کی چیزیں بیان ہوئی۔ مسائل ہی علم میں آئے۔۔۔ اب دعاء کریجئے کہ حق

تعالیٰ شانہ توفیق عطا فرمائیں۔ اپنی مرضیات پر چلائے۔ اپنے رسول پاک کی سنتوں پر چلنے کی ہیں توفیق عطاء فرمائے۔ ہمارے دلوں میں دین کی محبت عطا فرمائے۔ ہمارے دلوں کے اندر موت کی یاد اور قیامت کی حاضری کا جذبہ رہے اور حق تعالیٰ کے سامنے جواب وہی کا جذبہ تازہ رہے۔

اللھم ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین.

اللھم ربنا اتنا من لدنک رحمته وھھئی لنا من امرنا رشدا

اللھم ربنا اتنا فی الدنیا حسنته و فی الاٰخرة حسنة وقنا عداب لنار

وادخلنا

الجنة مع الابرار یا عزیز یا غفار.

برحمتك یا رحم الرحمن

آداب دعاء

دعاء عبادت کا مغز ہے۔۔۔اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا۔ یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے اور اتنی ذلت اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلت کا باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت عبادت ہے تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا تو بندے کا فرض ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہائی ذلت اس ذات کے سامنے اختیار کی جاسکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو۔ جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو۔۔۔ تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی کہ جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعاء مانگنے میں انتہائی ذلت ہے۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآ فَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا............ .....اَمَّابَعْدُ.....................

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ہ

سید الایام

بزرگان محترم!

اتنا وقت نہیں ہے کہ کوئی مستقل مضمون شروع کیا جائے۔ جمعہ سے قبل جو تھوڑا سا وقت

ہے۔ اس میں چند مختصر باتیں منتشر طریق پر گزارش کرنی ہیں۔ جس وجہ سے ہم جمع ہیں وہ جمعہ ہے۔ تو جمعہ نے موضوع متعین کر دیا۔ جمعہ ہی کے متعلق چند باتیں عرض کر دی جائیں گی۔

جمعہ کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ یہ سید الایام ہے۔ یعنی تمام دنوں کا سردار اور تمام دنوں کا بادشاہ یہ دن گنا گیا ہے۔۔۔ اور اس کو "عید المومنین" بھی فرمایا گیا ہے۔

شان جامعیت

"جمعہ" لغت عرب میں اس کا مادہ جمع ہے۔ یعنی جمعہ کے اندر جمع کرنے اور جامعیت کی شان موجود ہے۔ کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔

جب سے اللہ نے اس دن کو پیدا کیا۔ اس دن سے اس کا کام برابر یہی ہے کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کرتا رہتا ہے۔ جتنے بڑے بڑے کام اور عظیم امور دنیا میں پیش آئے ہیں جمعہ کے دن پیش آئے اور سب میں جمعیۃ کی شان موجود ہے۔

اجزائے انسان کی جمعیت

سب سے پہلے اسی دن میں انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کیا گیا، جن سے انسان تیار کیا گیا۔۔۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کو جمعہ ہی کے دن حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ

زمین کی مٹی میں ہر ہر موقع سے اجزاء جمع کر کے ایک مٹھی بھر کر لے آؤ تا کہ میں ایک نئی مخلوق تیار کروں۔ اس کا واقعہ طویل ہے۔ وہ سنانا مقصود نہیں ہے۔۔۔ جبریل علیہ السلام پہنچے اور زمین نے معذرت کی کہ میں اپنے جزاء نہیں دینا چاہتی کہ میرے ذریعے ایسی مخلوق تیار ہو جو جہنم میں جائی جائے۔ تو خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے مصیبت میں کیوں گرفتار ہوں۔ اس لئے آپ مجھے معاف کریں۔ انہیں رحم آیا اور چھوڑ کر چلے آئے۔۔۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام بھیجے گئے ان کے سامنے بھی زمین نے معذرت کی اور فریاد کی۔ انہیں بھی رحم آیا وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے۔۔۔ عزرائیل علیہ السلام ملک الموت بھیجے گئے۔ ان کے سامنے بھی زمین نے فریاد کی۔ انہوں نے کہا تیری فریاد کے سننے کی بہ نسبت مالک کا حکم ماننا زیادہ اونچی چیز ہے۔ اللہ کا مجھے یہ حکم ہے کہ میں مٹی جمع کروں مجھے ہر صورت میں جمع کرنی ہے۔ چاہے کوئی جنت میں جائے چاہے کوئی جہنم میں جائے۔ مجھے اس سے بحث نہیں مجھے تعمیل حکم کرنی ہے۔ انھوں نے تمام اجزاء جمع کئے اور لا کر پیش کئے۔ حضرت آدم علیہ السلام بنا دیئے گئے اور ان کا پتلا تیار کر دیا گیا اور ملک الموت کو فرمایا گیا کہ موت پر ہم نے تم ہی کو مقرر کیا۔ اس لئے کہ موت میں ایک منٹ کی تاخیر اس سے نہیں ہو سکتی جس کا جو وقت مقرر ہے اگر آپ بھی اس طرح فریاد سنتے تو مرنے کے وقت ہر شخص فریاد کیا کرتا کہ خدا کے لئے چند منٹ کی مہلت

اور دے دو۔ تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا تو ایسا ہی فرد موت کے لئے مناسب ہے۔ لہذا تم ہی موت کے اوپر مقرر کئے گئے۔۔۔ بہر حال حضرت آدم علیہ السلام کے اجزاء جمعہ کے دن جمع کئے گئے اور پتلا تیار کیا گیا تو جامعیت کی شان ابتداء سے چلی کی منتشر اجزاء اس میں جمع ہوئے۔

جمع شرائع

پھر جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اتارے گئے ہیں وہ بھی جمعہ ہی کے دن اتارے گئے اور یہ وقت انسانی اعمال کے جمع کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ جن عملوں سے سعادت میسر آتی ہے' جن اعمال شریہ سے انسان کو ترقی دی جاتی ہے وہ دنیا ہی میں پہنچ کر ممکن تھے۔ تو شریعتوں کی آمد جبھی ممکن تھی کہ انسان دنیا میں آتا' جنت میں نہ شریعت کی ضرورت تھی نہ احکام و قوانین کی ضرورت تھی' دنیا ہی میں احکام شرعیہ کی ضرورت تھی اور احکام ایک دو نہیں ہزاروں تھے۔ دین اور شریعتیں مختلف رنگوں میں آئیں تمام انبیاء علیہم اسلام مختلف شریعتیں لے کر تشریف لائے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب دنیا میں پیغمبر تشریف لائے۔ دین بے شک ایک ہی رہا' اصول ایک ہی رہے۔ مگر شریعتیں مختلف ہوئیں۔ ان تمام شریعتوں کا اجتماع دنیا میں ہوا اور اس کا سبب حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہے۔ تو منتشر شرائع کو جمع کرنے والا دن بھی در حقیقت جمعہ کا دن ہے۔ تو پہلے اس نے اجزائے آدم کو جمع کیا' پھر اجزاء احکام کو اس نے جمع کیا اور اسی دن میں حضرت آدم کی حضرت حوا سے ملاقات ہوئی ہے۔ تو وہ بھی اسی دن میں جمع ہوئے۔

اجتماع قیامت

قیامت قائم ہوگی وہ بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔ اس دن اولین و آخرین کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا۔ یہی زمین جس میں اونچ نیچ ہے' پہاڑ ہیں' دریا ہیں تو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ اس دن زمین ایسی بنادی جائے گی جس میں نہ اونچ ہوگی نہ نیچ ہوگی' پہاڑ ہوں گے نہ دریا ہوں گے کانھا طبق فضۃ جیسے چاندی کی ایک پلیٹ ہوتی ہے۔ بالکل ہموار زمین۔۔ تمام بنی آدم قبروں سے نکال کر اس پر جمع کئے جائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد اولین و آخرین جمع ہوگی۔

یوم مجموع لہ الناس۔۔۔ جس دن سارے انسان جمع کر دیئے جائیں گے۔ تو وہ بھی جمعہ کا دن ہوگا۔ جس دن قیامت قائم کی جائے گی۔۔۔ غرض حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی جمعہ کے دن جمع ہوئی۔ احکام شرعیہ کے جمع ہونے کا سبب جمعہ کا دن بنا۔ پھر تمام انسانوں کو ایک جگہ ایک میدان میں اسی دن نے جمع کیا تو اس جمعہ کے اندر جامعیت کی شان موجود ہے کہ بکھرے ہوئے کو جمع کردے۔

اسی واسطے اس کو "عید المومنین" کہا گیا ہے جس میں ایک محلہ یا ایک شہر کے منتشر افراد جمع

ہو کر ایک جگہ آجاتے ہیں۔ ان کو جمعہ کا دن جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے اس میں جمع کرنے کی یا جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔

تعیین جمعہ میں اقوام کا امتحان

یہی وہ دن ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کی بڑی قوموں کا امتحان لیا گیا ہے اور اس میں صرف مسلمان کامیاب ہوئے۔

اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ' کی نگاہ میں یہ دن متعین تھا کہ اس میں اس کی عبادت کی جائے۔ تمام کام چھوڑ کر دن کا زیادہ حصہ عبادت خداوندی میں لگایا جائے۔ لیکن ابھی حق تعالیٰ نے ظاہر نہیں فرمایا تھا۔

یہود کی امت جب دنیا میں آئی تو فرمایا کہ عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو! اگر تمہارا انتخاب اس دن تک پہنچ گیا جو ہمارے علم میں ہے تو تم کامیاب قوم سمجھے جاؤ گے۔ ورنہ نہیں۔ یہود نے اٹکل لڑائی تو یوم السبت یعنی شنبہ (ہفتہ) کا دن عبادت کے لئے منتخب کیا۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم الراحت ہے۔ یعنی اتوار کے دن سے عالم کی پیدائش شروع کی گئی اور جمعہ پر ختم کی گئی۔ تو شنبہ کا دن فارغ رہا۔ یہ یوم الفراغ ہے۔ لہٰذا یہ خوشی کا دن ہونا چاہئے۔ اس دن یہود نے عید منائی اور عبادت کے لئے اس دن کو منتخب کیا۔۔۔ لیکن وہ اس نکتے تک نہیں پہنچے جو حق تعالیٰ کے علم میں مرکوز اور مقدر تھا۔

نصاریٰ کی امت آئی تو ان سے کہا گیا کہ ایک دن عبادت کے لئے منتخب کرو۔ اگر ہمارے علم کے مطابق تمہارا انتخاب ہو گیا تو تم امتحان میں کامیاب سمجھے جاؤ گے۔ انہوں نے اتوار کا دن منتخب کیا اور اسے یوم العید قرار دیا۔

اور بناء یہ قرار دی کہ "یوم الافتتاح" ہے۔ یعنی دنیا کی پیدائش کا آغاز اتوار کے دن سے کیا گیا ہے اور یوم افتتاح خوشی کا دن ہوتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اتوار کا دن متعین کر دیا اور اس کی عبادت کے لئے رکھا۔

مسلمان دنیا میں آئے تو حق تعالیٰ نے یہی سوال ان کے سامنے ڈالا کہ ہفتے میں ایک دن عبادت کے واسطے منتخب کرو! جس میں زیادہ حصہ تم عبادت میں صرف کرو گے۔

مسلمانوں نے اپنی تخمین و انتخاب سے جمعہ کا دن متعین کیا کہ اس دن ہم عبادت کریں گے۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم تکمیل ہے۔ یعنی اتوار کے دن عالم کی تخلیق شروع ہوئی ہے اور جمعہ کے دن ختم ہوئی اور جمعہ کی آخرت ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔

جمعہ میں قبولیت دعا کی گھڑی

اس واسطے جمعہ کی آخری ساعت اللہ کے ہاں مقبول ہے کہ اس میں جو شخص بھی جس مراد کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھے گا' وہ دعا قبول کی جائے گی اور وہ ساعت آخری ساعت ہے۔۔۔ یعنی غروب سے پہلے پہلے کا جو گھنٹہ ہوتا ہے جس میں غروب واقع ہوتا ہے۔ وہی آخری ساعت ہے۔ اس ساعت کو مقبول قرار دیا گیا کہ اس میں جو بھی دعا مانگی جائے گی حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ بعض دفعہ ہم دعا مانگتے ہیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ حالانکہ نص حدیث ہے کہ ہم قبول کریں گے۔ ہم نے تو بارہا ایسا دیکھا کہ ایک دعا مانگی۔ لیکن وہ قبول نہیں ہوئی۔ مہینہ بھر انتظار مگر قبولیت کے کچھ آثار ظاہر نہیں ہوئے۔

قلبی دعا قابل قبول ہے

اول اس پر غور کرنا چاہئے کہ دعا کی کچھ شرائط ہیں اور کچھ آداب ہیں۔ ان شرائط اور آداب کو پورا کر کے آدمی دعا مانگے تو ممکن نہیں کہ قبول نہ ہو۔ ان شرائط و آداب کو اگر چھوڑ دیا جائے اور پھر قبول نہ ہو تو اس میں ساعت مقبولہ کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قصور ہمارا ہوگا۔

مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ:۔

ان اللّٰہ لا یستجیب دعاءً عن قلب لاہٍ

لہو ولعب میں پڑے دل کی دعا ہرگز قبول نہیں کی جاتی۔ اللہ سے دعا مانگ رہا ہے اور خیالات دوسری طرف ملتفت ہیں۔ کہیں بیوی میں' کہیں بچوں میں' کہیں تجارت میں اور کہیں مکان میں۔ تو خیالات بٹے ہوئے ہیں' قلب میں وساوس آرہے ہیں اور ہاتھ دعاء کے لئے اٹھائے ہوئے ہیں۔ تو یہ دعا قبول نہیں کی جاتی دعا وہ قبول کی جاتی ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا:۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ

مضطر اور بے قرار ہو کر جب آدمی مانگتا ہے۔ کبھی ممکن نہیں ہے کہ وہ دعا رائیگاں ہو اور قبول نہ کی جائے۔ لیکن جب دل کے اندر اضطرار نہیں رسمی طور پر مانگ رہا ہے' دل کے اندر بے چینی نہیں ہے۔ خیالات منتشر اور بٹے ہوئے ہیں۔۔۔ فرماتے ہیں وہ دعا ہم قبول نہیں کرتے وہ الفاظ کی دعا ہے اور ہم دل کی گہرائی کی دعا قبول کرتے ہیں۔ دل کی گہرائی سے آدمی مانگے تو ممکن نہیں ہے کہ قبول نہ ہو۔۔۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے۔

مال حرام قبولیت دعا میں منع ہے

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا' یارسول اللہ ﷺ! بعض لوگ دعائیں مانگتے ہیں

مگر قبول نہیں ہوتیں۔

فرمایا:-

مطعمہ' حرام و ملبسہ' حرام یقول یا رب یا رب فانیٰ یستجاب لہ'

کھانا دیکھو حرام' پینا حرام کا' لباس حرام کا اور کہہ رہا ہے یارب یارب دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی' یعنی دعا کی قبولیت کے لئے لازمی ہے کہ پاکیزہ بن کر جائے۔ کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں۔ تو قاعدہ ہے کہ کپڑے بدلتے ہیں' بدن کو صاف ستھرا کرتے ہیں' غسل کرتے ہیں' عطر لگاتے ہیں' معطر اور معنبر ہو کر جاتے ہیں۔ دربار کے آداب کے یہی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص میلے کچیلے کپڑے پہن کر چلا جائے اور اوپر سے عطر کے بجائے گندگی بھی لگالے تو کیا اس کو دربار میں بیٹھنے بھی دیا جائے گا۔ اس کان پکڑ کر نکال دیں گے کہ اس نے دربار کے آداب کے خلاف کیا۔ بات سننا تو بعد کی چیز ہے۔ اسے بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا کہ یہ بے ادب ہے۔ آداب دربار کی اسے کوئی رعایت نہیں۔۔۔ تو حرام کا کپڑا پہننا یا حرام کی غذا کھا کے جانا ایسا ہی ہے جیسا کپڑے اور بدن کے اوپر نجاست لگا کر جانا۔۔۔ بلکہ یہ تو ظاہری نجاست ہے جو پانی سے دھل جاتی ہے' گناہ کی نجاست معنوی نجاست ہے جسے پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ وہ زیادہ گندی چیز ہے۔ حق تعالیٰ کے دربار میں آدمی جائے اور گندہ بن کر جائے۔ تو بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا چہ جائیکہ اس کی دعاء قبول کی جائے۔ اسی کی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ:-

معطعمہ' حرام و ملبسہ' حرام یقول یا رب یارب فانیٰ یستجاب لہ'

لباس حرام کا' کھانا پینا حرام کا۔ اور یارب یارب کہتا ہے۔ کہاں سے دعا قبول کی جائے گی؟ وہ تو گندگی لگا کر گیا ہے۔

جیسا کہ یہ ادب تھا کہ دل میں لہو ولعب نہ ہو۔ خیالات بٹے ہوئے نہ ہوں۔ ویسے ہی یہ بھی دعا کے آداب میں سے ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے۔ نیت کو صاف کر کے جائے۔ لباس حلال کمائی کا پہن کر جائے۔ انشاء اللہ قبولیت ہو گی۔

دعا بالقیود

پھر دعا مانگنے میں بعض لوگ قیدیں لگاتے ہیں۔ یا اللہ مجھے مکان دیجیو' جو اس رنگ کا ہو ایسے ڈیزائن اور ایسے نقشے کا ہو۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک دیہاتی نے دعا مانگی:-

اللّٰھم انی اسئلك القصر لابیض فی الجنۃ

یا اللہ میاں! مجھ جنت میں محل دیجیو' مگر سفید رنگ کا ہو' اتنا بڑا ہو' ایسی منزلیں ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دعا مانگنے کا کیا طریقہ ہے تم تو مطلق دعا مانگو۔۔۔ اگر جنت میں داخلہ بھی ہو گیا یہ عظیم

ترین نعمت ہے۔ یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ تم نے جو قیدیں لگائیں کہ محل ایسا ہو۔ پیمائش اتنی ہو۔ رنگ ایسا ہو۔

یہ تو معاذ اللہ! اللہ کی ذات کے اوپر واجب کرنا ہے۔ کہ دیکھئے یہ یہ چیزیں دینی پڑیں گی۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ آدمی مطلق سوال کرے اور مانگے۔۔۔ اگر کوئی سائل۔۔۔ آپ کے دروازے پر آکر یوں کہے مجھے آپ پلاؤ پکا کر دیں۔ چینی کی رکابی ہو اور اس کا رنگ سبز ہو اور پھول سنہرے بنے ہوئے ہوں۔ تب تو میں قبول کروں گا۔۔۔ تو مالک کہے گا چلا جا نا معقول میرے گھر سے' میں کہاں سے لاؤں۔ میرے بچوں کے پاس بھی نہیں ہے کہ میں ایسی رکابی استعمال کروں تیرے لئے کہاں سے لاؤں؟ اور یہ مانگنے کا کون سا ڈھنگ ہے؟۔۔۔ تو وہ اس کو نکال دے گا۔

تو اس سے زیادہ گستاخی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جناب میں مانگے اور قیدیں اور شرائط لگائے۔ جو واقعی مراد ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان ہے' معذور اور مجبور ہے اسے مانگ لے۔ اس میں قیدیں اور شرائط لگانا یہ ادب کے خلاف ہے ممکن ہے کہ دعاء رد ہو جائے۔

وسعت رحمت کے منافی قید سے بھی دعا رد ہو جاتی ہے

یا یہ کہ آدمی (دعا میں) کوئی ایسی قید لگائے جو اللہ کی وسیع رحمت کے خلاف اور منافی ہو۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے دعا مانگی۔

اللّٰھم ارحمنی ولا ترحم علی احد

"یا اللہ! مجھ پر رحم کر' اور کسی کے اوپر رحم نہ کر"۔

تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

لقد تحجرت واسعاً

بندۂ خدا! تو نے ایک لامحدود' وسیع چیز کو کم کر کے رکھ دیا۔ اللہ کی رحمت تو وہ ہے کہ سارے جہانوں پر بٹے' جب بھی شمہ برابر کمی نہیں آسکتی اور تو کہتا ہے کہ مجھ پر تو رحم ہو اور کسی پر رحم نہ ہو۔ تو یہ اس سے بھی زیادہ گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے۔۔۔ تو لہو ولعب میں پڑے ہوئے دل سے دعا مانگنا وہ بھی قبول نہیں ہوتی۔۔۔ دعا مانگنا اور اس میں اپنی طرف سے قیدیں اور شرائط لگانا وہ بھی مقبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا اور رحمت کے دائرے کو تنگ کر کے مانگنا یہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کے کچھ آداب اور ڈھنگ ہیں۔ آدمی اس طریق پر مانگے تو ملتا ہے۔ سائل قیدیں نہیں لگایا کرتا وہ تو مراد پیش کرتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ مجھے عطاء کر دیجئے آپ کے دربار سے مجھے کچھ نہ کچھ مل جائے۔

مانگنے کا ڈھنگ

تو ہم دعا کے آداب پورے نہیں کرتے اور جب قبولیت کے اثرات

ظاہر نہیں ہوتے تو حدیث پر سوال کرتے ہیں کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی۔ مگر ہمارے حق میں تو کچھ بھی قبول نہ ہوا۔۔۔ سوال یہ ہے کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی مگر تم نے مقبولیت کا ڈھنگ بھی اختیار کیا؟ تم نے قبولیت کے آداب بھی اختیار کئے یا نہیں؟۔۔۔ تو انسان کی نظر اپنی کوتاہی پر نہیں ہے۔ وہ اللہ کے احکام اور قوانین پر الزام ڈال دیتا ہے۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اگر قبولیت کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اپنے اندر غور کرے کہ آیا میں نے کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟ کوئی غلطی تو نہیں کی؟

فوری قبولیت

اچھا! پھر یہ کہ اگر آپ نے سارے آداب پورے کئے‘ ساری شرائط آپ نے جمع کیں اور دعا مانگی انشاء اللہ ضرور قبول ہو گی۔ لیکن قبولیت کے طریقے مختلف ہیں۔۔۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ منہ مانگی مراد فوراً ہاتھ کے ہاتھ مل گئی اور آدمی کہا کرتا ہے کہ بھئی! عجیب قبولیت کی گھڑی تھی کہ جو مانگا وہی مل گیا۔ کاش میں اس وقت فلاں چیز مانگ لیتا۔ تو وہ بھی مل جاتی تو بعض دفعہ تو منہ مانگی مراد ہاتھ کے ہاتھ مل جاتی ہے اور انسان دعا مانگ کر کامیاب اٹھتا ہے۔

ازدیاد قبولیت

اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ شے تو نہیں ملتی۔ مگر اس سے بڑی چیز مل جاتی ہے۔ تو بعد میں خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا وہ چیز نہ ملی جو مانگی تھی۔ مجھے تو اس سے بھی بڑی چیز مل گئی۔ ایسی چیز ملی کہ اس کے ملنے سے جو چیز مانگی تھی‘ اس جیسی ہزاروں چیزیں خود بخود آ جاتی ہیں۔ تو انسان خوش ہوتا ہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں مراد کی قبولیت نہ ہوئی اس سے بڑی چیز مجھے مل گئی۔

تاخیر قبولیت

بعض دفعہ منہ مانگی ہی مراد ملتی ہے۔ مگر ذرا دیر سے ملتی ہے۔ مانگنے والے میں کچھ کھوٹ ہوتا ہے۔ انتظار کیا جاتا ہے کہ وہ کھوٹ رفع ہو اور اس مراد کے لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تب اس کو دیتے ہیں‘ انسان سمجھتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کی مصلحت کی وجہ سے قبولیت میں تاخیر کی جاتی ہے۔

مصلحت تاخیر

اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بچہ ہو اور بچے سے زیادہ کون محبوب ہوتا ہے‘ اولاد سے زیادہ کس سے محبت ہوتی ہے؟ محبوب ترین اولاد ہے اور اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے‘ آپ لاکھ پتی ہیں۔ اگر سو روپے روز بھی جیب خرچ دیں تو آپ پر بھاری نہیں۔ آپ کا بیٹا مانگتا ہے کہ مجھے سو روپے دے دیجئے تو بھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فوراً ہو وہ جیب سے نکالا

اور سو روپے کا نوٹ اس کے حوالے کیا۔ بیٹا بڑا خوش ہوا کہ باپ محبت والا بھی ہے' کریم النفس بھی' جو میں نے مانگا فوراً دے دیا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے کہ مجھے بیس یا دس روپے ہی روز دے دیجئے اور آپ نہیں دیتے۔ مہینے گزر گئے یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے اور وہ یہ خیال کر رہا ہے کہ شاید باپ کے دل میں میری محبت باقی نہیں رہی ورنہ لکھ پتی ہے۔ اگر دو سو بھی روز دیتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی اور میں تو دس ہی روپے روز کے مانگتا ہوں۔۔۔ مگر نہیں دیئے۔۔۔ اب وہ کڑ رہا ہے۔۔۔ چھ مہینے کے بعد دس روپے روز کے حساب سے آپ نے کئی سینکڑوں کی تھیلی حوالے کی اور کہا کہ لو بیٹا!۔۔۔ میں نے اس لئے نہیں دیئے تھے کہ تم مریض تھے۔ معدے کے۔ معدے کی مریض تھے۔ جگر بھی خراب تھا اور تمہارا علاج ہو رہا تھا۔ اگر میں تمہیں دس روپے روزانہ دیتا تو تم کھانے پینے اور چاٹنے میں اڑا دیتے تو اس سے روپیہ بھی ضائع ہوتا' صحت بھی برباد ہوتی۔ تو میں نے انتظار کیا کہ جب تمہیں پوری تندرستی حاصل ہو جائے تمہارا معدہ ہر چیز کے ہضم کرنے کے لائق ہو جائے جب میں تمہیں دوں تاکہ جو بھی کھاؤ' ہضم ہو جائے۔ صحت میں قوت پیدا ہو۔ اب طبیب نے کہہ دیا ہے کہ تم اچھے ہو گئے۔ لہٰذا اب یہ روپیہ موجود ہے۔ اب بیٹا خوش ہو گا اور باپ کو دعائیں دے گا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وقت پر منہ مانگی مراد پوری نہ کی۔ اگر باپ پوری کر دیتا تو میں بدپرہیزی کرتا اور ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا۔ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا بروقت منہ مانگی مراد مجھے نہ ملی۔

تاخیر قبولیت پر تشکر

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برس گزر گئے اور بیٹا مانگ رہا ہے اور آپ نہیں دیتے۔ اس کے دل میں برائی پیدا ہو گئی کہ باپ بے انتہا بخیل ہے اور باپ کے دل میں شفقت باقی نہیں رہی' دوسروں سے شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ مگر باپ کوئی خیال نہیں کرتا اور اس کی رعایت نہیں کرتا۔ بدستور جما ہوا ہے کہ بھئی! کچھ نہیں ملے گا۔

جب دس پندرہ برس گزر گئے۔ تو اس وقت اس نے بیٹے کو جو اس نے مانگا تھا' جمع کر کے ایک بیس ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ میں نے اس لئے نہیں دیا تھا کہ اگر سو روپے روز دوں تو محض فضولیات میں اڑا دیتا۔۔۔ میں نے تیرے لئے جمع کیا۔ آج دیتا ہوں تاکہ اس سے جائیداد خریدے اور جائیداد خریدنے کے بعد اتنی آمدنی روزانہ تجھے ہو جائے کہ جتنی تو مانگا کرتا تھا بلکہ اس سے دوگنی ہو جائے۔ تیرے کام آئے گی۔ ورنہ فضول بیس ہزار روپیہ ضائع ہو جاتا۔ اب یہ بیس ہزار تیرے ہی نہیں بلکہ تیری نسل کے بھی کام آئیں گے۔

اس وقت بیٹا دعا دیتا ہے کہ واقعی باپ نے بڑی خیر خواہی کی کہ نہ دیا۔۔۔ اور اس صورت سے مجھے دیا کہ نہ صرف میرے ہی بلکہ میری نسل کے بھی کام آئیں گے۔۔۔ تو دیکھئے تاخیر بھی ہوئی۔ لیکن اس تاخیر پر مانگنے والا اخیر میں جا کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ جب حقیقت حال کھلتی ہے اور جب

حقیقت حال سامنے نہیں تھی' شکایتیں کرتا پھرتا تھا کہ باپ کو محبت نہیں رہی۔

ٹھیک یہی صورت یہاں بھی سمجھئے کہ بندہ حق تعالیٰ سے مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے ایک جائیداد دے دیجئے۔ مجھے اتنے ہزار یا اتنے لاکھ دے دیجئے۔

کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ منہ مانگی مراد مل گئی۔ بندہ بڑا خوش ہوا کہ اللہ نے مانگتے ہی وہ چیز دے دی۔ اگر میں اس سے چوگنا مانگتا وہ بھی مل جاتا۔ وہ تو مقبولیت کی گھڑی تھی۔۔۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ مانگ رہے ہیں۔ مگر نہیں مل رہا۔ دو یا تین مہینے یا برس دن گزر گئے۔ برسوں کے بعد اسباب ایسے ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہ' نے وہ مراد پوری کی اور دل میں آپ کے القاء کیا اور آپ کے اوپر واضح کر دیا کہ معصیت اور گناہوں کا مادہ موجود تھا۔ اگر ایسے ہم جائیداد دے دیتے تو تم سینما دیکھتے' لہو ولعب میں خرچ کرتے اور زیادہ اللہ کی حجت تمام ہوتی۔ لیکن ایک دم ہم نے پیسے بند کر دیئے اس کی وجہ سے تمہارے ہاتھ پلے کچھ نہیں رہا۔ تم میں پریشانی بڑھی۔ اس پریشانی کا اثر یہ ہوا کہ اخلاقی حالت درست ہونی شروع ہوئی' وہ جو لہو ولعب میں بالکل آزاد تھے' وہ آزادی ختم ہوئی۔ اب جب حالت درست ہو گئی' حق تعالیٰ نے مراد پوری کر دی تاکہ بے جا مصرف میں رقم صرف نہ ہو۔ گناہ انسان کے نہ بڑھیں۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ بڑھے۔ اس وقت بندہ خوش ہوتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھ برس دن پہلے یہ جائیداد نہ دی۔ میں تو واقعی اڑا دیتا۔ برس دن کے بعد دی جب کہ میرے قلب کی رفتار صحیح ہو گئی' دل کی کلیں درست ہو گئیں۔

دعا کا اخروی ذخیرہ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ مانگ رہا ہے'۔ عمر گزر گئی' مرتے دم تک کچھ نہیں دیا گیا۔ اسی افلاس اور پریشانی میں مبتلا ہے اور کہتا ہے کہ معلوم نہیں کون سی مجھ سے ایسی غلطی ہو رہی کہ کسی طرح میری دعا قبول نہیں ہوتی۔ عمر بھر مانگتا رہا اور نہ ملا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں موت بھی آگئی انتقال کر گیا۔۔۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ بندہ میدان محشر میں حاضر ہو گا دیکھے گا کہ اجر و ثواب کے بے انتہا ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے تو کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کا اجر اتنا بڑا ہوتا یہ نعمتیں کہاں سے میرے لئے جمع ہو گئیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے وہ جو تو دعائیں مانگا کرتا تھا ہم تیری دعاؤں کا ذخیرہ کرتے رہے۔ تیرے پاس عمل کا ذخیرہ نہیں تھا۔ لیکن تو ہم سے مانگتا تھا ہم نے اسی کو تیرے لئے ذخیرہ بنایا۔ عمر بھر کی دعائیں جمع کر کے آج اتنی بڑی نعمت جمع کی کہ اب تو ابدالآباد تک جنت میں چین اڑا اور آرام کر۔

اس وقت بندہ خوش ہو گا کہ اے اللہ! تیرا شکر اور احسان ہے کہ اس وقت تو نے دعا قبول نہ کی اور اب وہ قبولیت کا ذخیرہ مجھے عطاء کیا۔

دعا میں تفویض

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ دعا تو مانگے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے کہ اگر میں مانگ رہا ہوں تو یوں ہونا چاہئے۔ یہ مالک کے اوپر چھوڑ دے۔ کبھی ہاتھ در ہاتھ ملے گا۔ کبھی دیر سے ملے گا۔ کبھی مرنے کے قریب ملے گا، کبھی مرنے کے بعد ملے گا۔ مگر مضطرب ہو کر جو دعا مانگی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ رائیگاں چلی جائے۔ ضرور قبول ہوگی۔

دعا کا مقام عبادت

اور میں کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ نہ دنیا میں ملا نہ آخرت میں ملا۔ کچھ نہیں ملا۔ مگر دعا مانگنا خود عبادت تو ہے تو عبادت کی توفیق ہوئی یہ آپ کو تھوڑا نفع ہے؟

حدیث میں ہے کہ ؂

الدعاء مخ العبادة

دعا عبادت کا مغز اور خلاصہ ہے۔

اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا' یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے۔ اتنی ذلت آدمی اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلت کا باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت عبادت ہے۔ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہے۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے۔ اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا بندے کا حق ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہا ذلت، اس ذات کے سامنے اختیار کی جا سکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو۔ تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے، ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی کہ جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعا مانگنے میں انتہائی ذلت ہے

مثلاً آپ نماز پڑھتے ہیں تو کانوں تک ہاتھ اٹھا کر ہاتھ باندھتے ہیں۔ یہ اظہار ذلت کا ابتدائی درجہ ہے کہ نوکروں چاکروں اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ مگر یہ انتہائی ذلت نہیں بلکہ ابتدائی ذلت ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ رکوع میں سر جھکا دیتے ہیں تو رکوع میں بہ نسبت قیام اور ہاتھ باندھنے کے زیادہ ذلت ہے۔ رکوع میں گردن جھک گئی اور جھک گیا۔ لیکن یہ بھی انتہائی ذلت نہیں۔ ایک درمیانی قسم کی ذلت ہے۔ جب آپ سجدے میں جاتے ہیں تو ناک اور پیشانی خاک پر رگڑتے ہیں۔ یہ انتہائی ذلت ہو گئی۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی انتہائی ذلت نہیں ہے۔ انتہائی ذلت اخیر میں رکھی گئی ہے کہ سلام پھیر کر ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے دعا یا سلام پھیرنے سے پیشتر وہ دعائیں پڑھو جو شریعت

نے تلقین کی ہیں۔ تو دعا کا مانگنا اور بھیک مانگنا یہ انتہائی ذلت ہے۔

سوال کی ممانعت

اسی واسطے سوال کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے کہ آدمی آدمی سے سوال کرے یعنی بھیک مانگے۔ سوائے اس کے کہ مضطر ہو جائے' مخمصہ کی حالت ہو کہ اگر نہیں مانگوں گا تو جان جانے کا خطرہ ہے۔ اس وقت اجازت دی گئی ہے کہ مانگ لو۔ عام حالات میں بھیک مانگنے کی اجازت نہیں۔

سوال محبت

ایک ہے سوال محبت اور سوال تعلق۔۔۔ وہ اس سے خارج ہے۔ جیسے بیٹا باپ سے مانگنے لگے یا دوست احباب میں باہم گہرا تعلق ہے اور وہ مانگے کہ بھئی! ہمیں چند پیسے دے دو یا کھانا کھلا دو یہ سوال نہیں۔ یہ سوال تعلق ہے۔ یہ سوال ذلت کا نہیں بلکہ یہ سوال محبت کا ہے۔ اس سوال کی اجازت ہے۔

بلکہ بعض اوقات شریعت نے تلقین کی ہے۔ کہ بعض مواقع میں جا کر خود مانگ کر کھاؤ تا کہ تعلق میں اضافہ ہو جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ.

تمہارے اوپر کوئی نہیں گناہ اگر تم اپنے گھر میں مانگ کر کھالو۔ اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ فلاں چیز مجھے دے۔ یہ سوال ذلت کا تھوڑا ہی ہے۔ یہ حق کا سوال ہے اور تعلق کا سوال ہے۔ تو آدمی اپنے گھر سے بلا کسی دعوت کے کھائے اسے یہ حق ہے بلکہ کھانا ہی چاہئے۔۔۔ اگر اپنے گھر میں بھی یہ انتظار کرے کہ مجھے دعوت دی جائے۔ تو میں کھاؤں۔ تو بھوکا مرے گا گھر میں بیٹھ کر روز کون اسے دعوت دے گا۔

اسی طرح فرمایا کہ 'یا تمہارے باپ کا گھر ہو' بیٹے کو الگ کر دیا ہے۔ باپ کا گھر الگ ہے۔۔۔ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی مانگ کر کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یعنی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جانا چاہئے اور مانگ کر کھانا چاہئے تا کہ تعلق میں اضافہ ہو باپ یہ نہ سمجھے کہ بیٹا مجھ سے اجنبی ہو گیا یا مستقل اپنی بارگاہ بنالی کہ اس میں بیٹے ہونے کی شان باقی نہیں رہی۔ کبھی کبھی باپ کے سامنے اپنے بیٹے ہونے کی اور اپنی محتاجگی کی شان ظاہر کرنی چاہئے تا کہ اس کی بڑائی واضح ہو ہماری خوردی واضح ہو۔ اس لئے

فرمایا کہ باپ کے گھر میں جا کے مانگ کر کھالو۔

یاماں کا گھر جدا ہے۔ تو وہاں جاؤ اور مانگ کر کھالو یا پھوپھی اور خالہ' ان کے گھروں میں جاؤ اور مانگ کر کھالو۔ اس لئے کہ خالہ بھی ماں کے برابر ہے پھوپھی بھی ماں کے برابر ہے۔ وہ باپ کی بہن ہے

یا فرماتے ہیں کہ :۔

اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهٗ

یا تمہاری باندی کا گھر ہے یا تمہارے غلام کا گھر ہے جو تمہارا زر خرید ہے۔ وہ تمہارا مملوک ہے تمہاری اولاد کی مثل ہے۔ اس سے اگر مانگو گے تو یہ مانگنا ذلت کا نہیں بلکہ ازدیاد تعلق کا ہے۔

اَوْ صَدِيْقِكُمْ یا دوست احباب ہوں یا تم میں میل جول ہے۔۔۔ اپنے کسی دوست کے گھر جا کے کہے کہ بھئی! آج تو تمہارے گھر سے کھانا کھائیں گے۔ تو یہ ذلت کی بات نہیں بلکہ اس سے تعلق بڑھتا ہے۔ اس کے دل میں یہ گنجائش پیدا ہو گی کہ اس نے مجھے اپنا سمجھا تو آکر مانگا۔ آدمی کسی اجنبی کے ہاں جاکر تھوڑا مانگ لیتا ہے۔

خود فرمائش حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔۔۔ تو بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی باندی اور مملوکہ ہیں۔ بے چاری غریب تھیں۔ آپ نے جا کے خود فرمائش کی کہ بریرہ کوئی چیز کھانے کی رکھی ہے؟

انہوں نے عرض کیا' ہے تو مگر آپ کے کھانے کی نہیں۔

فرمایا کیا ہے؟

عرض کیا۔ کچھ گوشت رکھا ہوا ہے مگر وہ آپ کے لئے نہیں۔

فرمایا' کیوں؟

عرض کیا وہ صدقے کا میرے پاس آیا ہے۔

فرمایا لك صدقة ولنا هدية

فرمایا صدقہ تیرے لئے ہے۔ جب تو ہمیں دے گی تو ہمارے لئے ہدیہ بن جائے گا۔ آپ نے تناول فرمایا تو معاذ اللہ یہ ذلت کا سوال نہیں تھا۔ محبت بڑھانے کا سوال تھا۔ تعلق بڑھانے کے لئے آپ نے مانگا تھا تو تعلق میں اضافہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت آدمی مانگتا ہے۔ دوسرا سمجھتا ہے کہ ہمیں اپنا سمجھا ہے۔

ترک تکلف میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں ترکستانیوں میں ایک رواج دیکھا جو ترکستان

سے مہاجرین آئے ہوئے تھے' خود کابلی افغانیوں میں بھی ہے۔ شہر کابل میں گویا یہ ایک عام تمدن ہے کہ بیٹھے بیٹھے چند دوست احباب جمع ہوئے کہ آج فلاں دوست یا بھائی کے ہاں کھانا کھائیں گے تو دس بیس آدمی اکٹھے پہنچ گئے۔ وہ بہت خیر مقدم کرے گا۔ دعائیں دے گا اور استقبال کرے گا کہ آیئے بیٹھیے اور کھانا پکنا شروع ہو جائے گا۔ دس بیس اور احباب جمع ہوئے۔ وہ ہمارے گھر آ گئے کہ ہم تو کھانا کھانے آئے ہیں۔ تو ہر شخص وہاں دس بیس آدمی کے کھانے کا بندوبست رکھتا ہے۔ ایک عام رواج ہے کہ بے بلائے دس دس' بیس بیس آدمی پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب دوستوں میں بھی یہ تکلف ہو کہ آدمی دعوت کا انتظار کرے تو وہ دوستی کیا ہوئی؟ وہ بے تکلفی کیا ہوئی؟ وہاں یہ ایک عام رواج ہے جس سے وہاں تعلقات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تعلقات مضبوط ہیں۔

اسلامی بے تکلفی

کسی بزرگ کا واقعہ ہے وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ تواضع کریں گے۔ انہوں نے کوئی تواضع نہیں کی ان کے دل میں بڑی گرانی ہوئی کہ بزرگ آدمی ہیں کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ تو اخلاقی بات بھی ہے ور ایک مسلمان کا حق بھی ہے کہ یوں کہے کہ بھئی! کھانا کھالو۔۔۔ بلکہ اگر کسی کو نہیں بھی کھلانا ہوتا تو ظاہر داری کے طور پر ہی کہہ دیا کرتا ہے کہ بھائی! کھانا کھایئے اور جب دوسرا کہتا ہے کہ میں تو کھا کے آیا ہوں۔ تو دل میں شکر کرتا ہے کہ اچھا ہوا کھا آیا۔۔۔ تو ظاہر داری تو کی۔۔۔ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کم از کم ظاہر داری کے طور پر ہی تواضع تو کر لیتے۔ یہ تو ایک اسلامی تعلق ہے۔ تو کچھ منقبض اور گھٹے گھٹے سے رہے۔

وہ بزرگ کھانا کھا کے فارغ ہو گئے۔ تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے شکایت کی کہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ بزرگ ہیں اور اسلامی تعلق کا مقتضی ہے اور اسلامی بے تکلفی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کہتے کہ کھانا کھاؤ۔ تو انہوں نے حیرت سے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں؟

کہا کہ الحمدللہ میں مسلمان ہوں جیسا کہ آپ مسلمان ہیں۔

فرمایا اسلامی بے تکلفی کے تو یہ معنی تھے کہ آپ نے اپنا گھر سمجھا تھا تو کھانا کھانے بیٹھ جاتے۔ یہ انتظار کرنا کوئی تمہیں دعوت دے' تواضع کرے۔ معلوم ہوا تمہارے ذہن میں تکلف موجود ہے۔ بے تکلف تعلق نہیں رکھتے۔ تمہاری محبت کامل نہیں تھی۔

یہ انہوں نے جواب دیا:

خیر یہ بات اب عام تو نہیں ہے مگر بعض جگہ واقعی یہ ہوتا ہے کہ اس کا انتظار کیا کہ ہماری تواضع کی جائے۔ تب بیٹھیں گے یہ داخل تکلف ہوتا ہے۔ بے تکلف آ کے بیٹھ جایئے۔ اب باپ بھائی بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں' شیخ یا استاذ کھانا کھا رہے ہیں جن سے نہایت بے تکلفی کا اور نیاز

مندانہ تعلق ہے۔ اگر آدمی بے تکلف آ کے بیٹھ جائے کہ صاحب! مجھے تو کھانا کھانا ہے۔ تو وہ اور شکر گزار ہوں گے کہ نہایت بے تکلف آدمی ہے۔ تعلق مضبوط ہے۔۔ حاصل یہ نکلا کہ شریعت کے ہاں یہ مطلوب ہے کہ بعض جگہ تواضع اور دعوت کا انتظار مت کرو تا کہ تعلق واضح ہو۔ اس میں اپنا گھر ہے' ماں کا گھر ہے' باپ کا گھر ہے' پھوپھی اور خالہ کا گھر ہے۔ ان میں آدمی جا کے مانگے اور بے تکلف کھائے تا کہ تعلق بڑھے۔۔۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً کھانے اور پینے کی چیز کا سوال کرنا ممنوع نہیں ہے۔

ذلت سوال

بلکہ سوال ذلت ممنوع ہے جس میں بھکاری بن کے جائے اور ذلیل النفس بن کے جائے۔۔۔ اور اگر عزیز النفس بن کے جائے' محبت کے بڑھانے کے لئے سوال کرے یہ سوال اس سے مستثنیٰ ہے۔۔۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذلت انسان کو سوال کرنے کے وقت پیش آتی ہے اور سوال کرنے والا جب سوال کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے منہ کی آب جاتی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر جو ایک رونق ہوتی ہے۔ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ خود اپنے ذہن میں اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے کہ میں نے بہت برا کام کیا۔ تو سب سے زیادہ ذلت سوال کے وقت پیش آتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن وہ لوگ جو دنیا میں بے وجہ محض طمع اور لالچ سے سوال کرتے تھے اور ذلیل النفس بنتے تھے۔ ان کا حشر اس حالت میں کیا جائے گا کہ ان کے چہرے کا گوشت اڑا ہوا ہوگا۔ کچھ ادھر لٹک رہا ہے کچھ ادھر لٹک رہا ہے۔ ہڈیاں نمایاں ہیں۔ نہایت ذلیل صورت ہوگی یہ گویا عمل کے مطابق جزا ہے۔ اس لئے کہ جب بھیک مانگتا ہے تو چہرے کی آب و تاب جاتی رہتی ہے۔ چہرے کی رونق اڑ جاتی ہے اس بے رونقی کو اس شان سے ظاہر کیا جائے گا کہ گوشت کچھ ادھر لٹکا ہوا اور کچھ ادھر لٹکا ہوا ہے اور ہڈیاں نمایاں ہیں۔۔۔ یعنی ایسا چہرہ لے کر آئے گا کہ دنیا اس چہرے کو دیکھ کر نفرت کرے گی۔ وہ جو ذلت نفس اسکے اندر تھی اس ذلت کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ وہ ذلت اس صورت میں جھلکے گی کہ چہرے پر عزت کے کوئی آثار باقی نہیں رہیں گے اور چہرے کی رونق اڑ جائے گی۔

تو قیام میں انسان اللہ کے سامنے ذلت اختیار کرتا ہے مگر یہ ابتدائی مرتبہ ہے' رکوع میں اس سے زیادہ ذلت ہے' سجدے میں اس سے زیادہ ذلت ہے اور مانگنے میں اس سے زیادہ ذلت ہے۔

بندہ کے سال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ سوال کرنے سے جتنے خوش ہوتے ہیں اتنے کسی چیز

سے خوش نہیں ہوتے۔۔ فرماتے ہیں کہ اگر سوال نہیں کرے گا تو ہم اس سے ناراض اور ناخوش ہیں۔۔۔ دنیا میں اس کے برعکس قصہ ہے اگر آپ کسی کے آگے سوال کرنے لگیں تو وہ خوش نہیں ہوگا بلکہ ناخوش ہوگا۔ محبت بھی ہوگی تو ختم ہو جائے گی اور حق تعالیٰ کے ہاں اگر نہ مانگے تب ناخوش ہوتے ہیں' مانگنے پر خوش ہوتے ہیں۔

اس کی بناء یہ ہے کہ دنیا میں آپ جس سے بھی مانگیں گے' چاہے وہ ارب پتی ہو۔ مگر اس کا خزانہ پھر بھی محدود ہے جتنا دے گا اتنا خزانے میں کمی پڑ جائے گی۔ اللہ کے خزانے لامحدود ہیں اگر عالم بھی بخش دیں تب بھی کمی نہیں پڑے گی۔ اس لئے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں البتہ یہ امتحان ہے کہ کون بندگی اختیار کر کے آتا ہے۔ کون بندہ کی صورت سے آتا ہے۔ تو بندہ وہی ہے جو پوری بندگی نمایاں کرے اور بندگی کے معنی اظہار ذلت کے ہیں۔ اس واسطے مانگنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ خوب مانگا جائے۔۔۔ مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کی جائے۔ اس میں قیدیں اور شرائط لگانا یا جس سے آپ مانگ رہے ہیں' اسے آپ کہیں آپ کو یوں کرنا ہوگا تو یہ حق تعالیٰ کے ہاں بے ادبی اور خلاف تہذیب ہے۔ تو مانگنے میں کسر نہ چھوڑے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے۔ جتنا مانگے گا اتنی ہی ادھر خوشی بڑھے گی اور رضا کا تعلق بھی اتنا ہی ہوگا۔

تعلیم دعا

مجھے مکہ معظمہ کا ایک واقعہ دیا آیا جن لوگوں کو حج کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں حجاز اور مکہ میں غرباء بہت زیادہ ہیں۔ بے چارے مانگتے ہیں اور لیچڑ بن کر مانگتے ہیں۔ حرم شریف میں باوجودیکہ حکومت انتظام کرتی ہے کہ سائل نہ آئیں مگر پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک کے آگے ایک قرش دو قرش مانگتے پھرتے ہیں۔۔۔ اور اس طرح سے مانگتے ہیں کہ دینے والا اگر دے دے تو تھوڑی دیر میں پھر لوٹ کے آجائیں گے۔۔۔ پھر لوٹ کے آجائیں گے۔ نہ دے تو وہ کھڑے رہیں گے یا وہ انکار کرے یا وہ منہ پھیرے۔ غرض لوگ مانگنے والوں سے زچ آجاتے ہیں اور تنگ آجاتے ہیں۔ تو بعض لوگ جھنجلائے ہوئے میرے پاس آئے کہ صاحب! یہ عجیب بے وقوف قسم کے سائل ہیں۔ انہوں نے ہماری تلاوت بھی ختم کر دی' نوافل بھی ختم کر دیئے جہاں تلاوت کرنے بیٹھے وہ آکے کھڑے ہوگئے۔ اب یا تو دے یا جب تک زبان سے یوں نہ کہے "اللہ کریم" آگے جاؤ اس وقت تک ٹلتے نہیں۔ اب تلاوت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ چند آیتیں پڑھیں پھر کہا' اللہ کریم۔ چند آیتیں پڑھیں پھر دوسرا آگیا پھر اس سے کہا اللہ کریم آگے جاؤ۔۔۔ تو ہم عاجز آگئے اور پریشان ہیں اور آپ یہ کہتے ہیں کہ سائل کو جھڑکو بھی نہ۔ آپ کیا کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ کہ سائل کو مت جھڑکو۔ اب نہ کہیں یا نہ جھڑکیں تو انہوں نے تو عاجز کر دیا' کیا کریں؟۔۔۔ غرض بہت ہی غصے اور خفگی میں تھے اور

کئی آدمی تھے۔

میں نے کہا آپ نے غور نہیں کیا۔ یہ سوال کرنے والے آپ کے معلم ہیں۔ آپ کو تعیم دینے آئے ہیں۔

کہنے لگے کہاں کی تعلیم؟

میں نے کہا یہ آپ کو مانگنا سکھانے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح لیچڑ ہو کے مانگو کہ ہم تو لے ہی کے اٹھیں گے۔۔۔ خیر وہ اس پر ٹھنڈے ہو گئے اور بہت خوش ہو کے واپس ہوئے۔ پھر انہوں نے نہ کسی سائل کو برا بھلا کہا نہ جھڑکنے کی نوبت پیش آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ واقعی یوں ہی مانگنا چاہئے۔ مانگنے کا ڈھنگ یہی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ انہوں نے غلطی یہ کی کہ آدمی سے اس طرح مانگنا شروع کیا حالانکہ اس طرح اللہ میاں سے مانگنا چاہئے کہ آدمی گھٹنے ٹیک دے کہ میں لئے بغیر نہیں اٹھوں گا۔ میں رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور محروم چلا جاؤں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو اس عزم سے آدمی مانگے تو کبھی محروم نہیں ہو سکتا۔

علامت قبولیت

اور بعض علامتیں بھی ایسی ہیں۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی بوڑھا آدمی جس کی داڑھی سفید ہو اور وہ اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے کہ اس سفید ریش کو خالی ہاتھ واپس کروں۔ یوں تو میں کریم ہوں ہی' لیکن میری کریمی اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی سفید ریش' سفید بال والا مانگتا ہے کہ اس بوڑھے کو میں محروم واپس کروں۔ اس کے چہرے پر ایک ہیبت کا اثر ہے اور ایک وقار ہے تو میں اس کو ذلیل کر کے واپس کروں تو حق تعالیٰ اس کی بات تھامتے ہیں۔ فرماتے ہیں میں اس کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا اور اس کی مراد پوری کرتا ہوں۔

اہل قبولیت سے مشابہت کا اثر

اور اس میں بعض بزرگوں نے تو لطیفہ کیا۔ یحیٰی ابن اکثمؒ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ اور صاحب فنون ہیں۔ نحو یا صرف کے غالباً امام ہیں۔ بہر حال بڑے لوگوں میں ہیں جس وقت ان کے انتقال کا وقت آیا۔ تو انہوں نے ایک دوست کو وصیت کی کہ جب مجھے قبر میں اتاریں تو میری داڑھی کے اوپر سفید میدہ یا چونا کوٹ کر رکھ دینا کہ میری داڑھی سفید ہو جائے۔ کس لئے رکھنا؟ تجھے اس سے بحث نہیں۔ اس نے تعمیل حکم کی کفن دیتے ہوئے کوئی میدہ اور چونا ایسا مل دیا کہ داڑھی کے بال بالکل سفید ہو گئے اور ڈھانپ دیا اور نماز پڑھ کے دفن کر دیا۔۔۔ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور عرض کیا کہ میری مغفرت فرما دیجئے۔

فرمایا! او بوڑھے! تو نے فلاں حرکت نہیں کی؟

فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں گناہ نہیں کیا؟

عرض کیا جی ہاں! سب کچھ کیا کہ پھر تو اس قابل ہے کہ تیری مغفرت کی جائے۔ مانگنے کو تو آیا ہے؟ کیا تیری مراد پوری کی جائے؟

عرض کیا کہ یا اللہ! میری داڑھی سفید ہے۔ اسے تو دیکھ لیجئے آپ ہی نے تو فرمایا ہے کہ ہم سفید داڑھی رکھنے والے کو واپس نہیں کرتے۔۔۔ تو میں سفید داڑھی نہیں رکھتا تھا تو میں نے سفید داڑھی رکھنے والوں سے کم از کم مشابہت پیدا کرنے کے لئے چونا لگایا اور داڑھی کو سفید کر لیا۔ تو رنگ تو سفید ہو گیا۔ چاہے عارضی طور پر ہو چاہے اصلی طور پر ہو اور آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ سفید وہ ہو جو اصلیت سے سفید ہو۔ سفید داڑھی کے معنی سفید بالوں کے ہیں اور میں سفید بال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ وعدہ کے مطابق بخش دیجئے۔۔۔ فرماتے ہیں کہ۔۔۔ حق تعالیٰ شانہ' نے فرمایا۔ او بڈھے جا ہم نے تجھے بخشا اور معاف کر دیا۔

تو بعض بزرگ وہاں بھی جا کر مذاق کرتے ہیں مگر اس قسم کا مذاق جو اصول شرعیہ سے ماخوذ ہو۔ حق تعالیٰ اس کی رعایت فرماتے ہیں۔ چنانچہ یحیٰ ابن اکثم کو بخش دیا۔ جس شخص نے انہیں خواب میں دیکھا تو اس کو انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ میں نے تو اپنی سفید داڑھی سامنے کر دی تھی اور عرض کیا کہ آپ ہی کا وعدہ ہے کہ ہم سفید ریش کو واپس نہیں کرتے۔ میں تو مغفرت مانگتا ہوں۔

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ سفید داڑھی تو وقار ہے ہی اور نیکی اور تقویٰ کی علامت ہے اس کے ساتھ اگر مشابہت ہی پیدا کر لی جائے وہ آدمی بھی محروم نہیں رہتا تو کم سے کم اس لئے ہی مشابہت پیدا کر لیجئے اگر ہماری داڑھی نہیں ہے تو ہم اس لئے رکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ ہو جائے جو داڑھی والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسلامی صورت

نیز یہ کہا گیا کہ قیامت کے دن داڑھی کو نور بنایا جائے گا۔ داڑھیاں نور کی صورت اختیار کریں گی۔ یعنی اس روشنی میں آدمی راستہ طے کرے گا۔ تو اس لئے رکھ لے کہ بھائی! میرا راستہ ہی طے ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ میرا نور بجھ جائے۔ اس اندھیرے میں کس طرح قدم اٹھاؤں گا تو کم سے کم یہ رعایت کرے۔

اور مسلمان کی صورت تو داڑھی ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور واقعہ یہ کہ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ داڑھی نہ ہو۔۔۔ آپ خود غور کریں۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن میں منفعل بھی ہیں کہ کچھ سوسائٹی اور ماحول کی مجبوری سے ایسا کر لیتے ہیں۔۔۔ یہ صحیح ہے مگر مجبوری تو وہ پیش نظر رکھنی چاہئے جس کا کوئی جواب نہیں ہوگا اور وہ قیامت کے دن کی مجبوری ہے

یہاں کی مجبوریاں تو سہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہاں کوئی ایسی بات سامنے آئے تو کسی صورت میں بھی تدارک ہی نہیں وہاں تو پھر بھگتانے ہی کی صورت ہے۔ تو کم سے کم اسی نیت سے کرے۔

تشبہ باسم محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثمرہ

اور کچھ نہیں تو یہی نیت کرے کہ میری جو محبوب ترین ذات ہے وہ میرے رسول نبی ﷺ ہیں۔ ان کی صورت پاک ایسی تھی کم از کم میں ان سے ہی مشابہت کروں۔۔۔ تشبہ میں بڑی برکتیں ہیں اگر نام بھی رکھ لے اس میں برکت ہے۔۔۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب میدان محشر میں لوگ جمع ہوں گے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبر کو یا محمدؐ کہہ کر پکاریں گے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جتنے لوگوں کے نام محمد ہوں گے ہر ایک یہی سمجھے گا کہ مجھے پکارا ہے تو لاکھوں آدمی کھڑے ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تو اپنے پیغمبر کو پکارا تھا۔ جنہیں ہم نے جنت میں بھیجنا تھا۔ لیکن جب تم کھڑے ہو گئے تو تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ اب ہم تمہیں بٹھانا نہیں چاہتے۔ اس نام کی برکت سے نجات اور مغفرت ہو جائے گی تو جن کے نام پاک کے نام کی نقل اتارنے کی یہ برکت ہے اگر ان کی صورت کی نقل اتار لی تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ اگر ان کی سنتوں کی ہم نقل اتارنے لگیں تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ بہرحال اتباع سنت میں خیر ہی خیر ہے کوئی برائی نہیں اور ترک سنت میں برائی ہی برائی ہے۔ چاہے وہ آج واضح نہ ہو کل کو واضح ہو جائے گی یا قبر میں واضح ہو گی یا محشر میں واضح ہو گی۔

میں تو یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر مولویوں کی سی داڑھی نہ رکھیں تو کم سے کم اتنی رکھ لیں کہ دور سے نظر آئے کہ بھئی! داڑھی ہے۔ مسلمان ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ نور کا کام دے گی انشاء اللہ ضائع نہیں جائے گی یہ فعل بھی اکارت نہیں جائے گا۔۔۔ اتباع سنت کے لئے ایک قدم بڑھے گا ایک ہی قدم کا اجر ملے گا۔ دو بڑھیں گے دو کا اجر ملے گا لپک کر چلیں گے اس کا اجر ملے گا۔ جتنا بھی آپ بڑھیں گے۔ خیر کی طرف بڑھیں گے خیر دنیا و آخرت دونوں اس میں ظاہر ہوں گی انشاء اللہ برکات نمایاں ہوں گی۔

مشابہت کا تمدنی فائدہ

مصر میں میں نے ایک واقعہ سنا اس سے واقعی مجھے عبرت ہوئی وہاں عام طور سے لوگ داڑھی نہیں رکھتے بلکہ جو رکھ لیتا ہے اسے پکارتے ہیں کہ یہ تو یہودی ہو گیا۔ یہ اس کو طعن دیتے ہیں۔۔۔ مگر جن لوگوں کے داڑھی ہے ان سے پوچھ تم نے کیا فائدہ سوچا؟۔۔۔ یعنی شرعی بات تو الگ ہے اس سے قطع نظر کر کے تمدن کی حیثیت سے تم نے کیا بات سوچی جو تم داڑھی رکھتے ہو؟۔۔۔ یہ جواب تو صحیح ہے کہ اتباع سنت کرتے ہیں پیغمبر علیہ السلام

کی صورت سے مشابہت بے شک برکت ہی برکت ہے۔ لیکن تم پر جو ملامتیں پڑتی ہیں۔ اس کے مقابلہ کے لئے تمدنی حیثیت سے داڑھی رکھنے میں تم نے کیا مصلحت سوچی؟

انہوں نے کہا کہ ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ یہاں پردہ بالکل نہیں۔ نوجوان لڑکیاں پھرتی ہیں اور بہت زیادہ بالکل آزاد ہیں' داڑھی والا جوان کے سامنے آتا ہے' منہ پھیر کے چلی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی طرف رجوع نہیں کرتیں۔۔۔ تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے لئے تقویٰ کا راستہ صاف ہو گیا۔ اگر ہم نہ بچنا چاہیں تو وہ ہم سے بچتی ہے۔ ہم برائی میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔۔۔ میں نے کہا الحمد للہ دنیا میں کم سے کم یہ مصلحت تو نمایاں ہوئی کہ داڑھی والے کی طرف آزاد اور لوباش قسم کی عورتیں متوجہ نہیں ہوتی۔ اگر متوجہ ہو گی تو اپنی ہی بیوی متوجہ ہو گی۔ یعنی حلال ہی کام اس سے سرزد ہو گا' حرام سرزد نہیں ہو گا۔۔۔ یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

اور پھر یہ کہ اگر آپ نے مولویانہ صورت بنالی تو آپ کو کبھی جرات نہیں ہو گی کہ سینما میں جا کے بیٹھیں لوگ یوں کہیں گے کہ نامعقول مولویانہ صورت سے تم یہاں آئے؟۔۔۔ دنیا طعن دے گی۔

تو اس داڑھی کی وجہ سے آدمی بہت سے مصائب اور برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ تو ایسی چیز تو محبت کرنے کے قابل ہے جو بہت سی برائیوں سے بچانے کا ذریعہ بن جائے۔۔۔ تو ایک تو اتباع سنت ہے وہ تو عظیم چیز ہے۔ دنیا میں بہت سے منافع بھی ہیں اور فوائد و برکات بھی ہیں۔

سنت نبوی ﷺ سے کمال عشق و محبت

اور اصل یہ ہے کہ محبت کی کمی ہے۔ اگر جناب رسول ﷺ سے محبت تام اور پوری ہو جائے۔ پھر اس قسم کے معاذیر اور عذرات کچھ پیش نہیں چلتے۔ محبت ناقص اور عشق ناتمام میں اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں کہ ملامت کرنے والے یوں ملامت کریں گے تو ہم کیا کہیں گے اور فلاں عیب لگا دے گا تو ہم کیا کہیں گے۔۔۔ جب عشق قلب میں تام ہو جاتا ہے تو پھر کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ باقی نہیں رہتی۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ' جب ایران فتح ہو گیا' بغداد میں تشریف رکھتے تھے اور کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر گر پڑا۔ انہوں نے فوراً جھک کر زمین پر سے لقمہ اٹھایا اور خاک وغیرہ اڑا کر صاف کیا اور تناول کر لیا۔۔۔ وہ فارسی غلام جو کھڑا ہوا تھا' اس نے کہا کہ یہ آپ نے کیا حرکت کی؟ یہاں بڑا تمدن ہے۔ بڑے متمدنوں کا ملک ہے اور بڑے معزز لوگ ہیں؟۔۔۔ زمین پر پڑی ہوئی چیز اٹھا کر کھا لینا' یہاں بڑی بدتہذیبی سمجھی جاتی ہے۔ لوگ آپ پر طعن کریں گے کہ یہ بڑے حریص

ہیں کہ انہوں نے ایک گری ہوئی چیز اٹھا کر کھالی۔۔۔ تو اس کو عیب اور ذلت سمجھا جاتا ہے۔ آپ حضرات کو اپنا وقار تھامنے کے لئے ان باتوں کی رعایت رکھنی چاہئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں:

الترك سنة حبيبى لهولاء الحمقاء.

کیا میں اپنے حبیب پاک ﷺ کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے ترک کردوں؟ کہ یہ ملامت کریں گے۔۔۔ ان کی ملامت مجھ پر کیا اثر کرسکتی ہے؟ سنت کے فوائد میرے سامنے ہیں اور اس ملامت کا کوئی ضرر مجھ تک دنیا و آخرت میں نہیں پہنچ سکتا۔ تو جو چیز کہ کوئی ضرر نہ پہنچا سکے' اس کی وجہ سے میں وہ فعل اختیار کرلوں جو دنیا میں بھی میرے لئے مضر ہو اور آخرت میں بھی مضر ہو۔۔۔؟ تو فرمایا کہ میں ان ملامت گروں کی ملامت کی وجہ سے سنت حبیب ﷺ کو ترک نہیں کرسکتا۔

اس میں گویا روٹی کا ادب ہوا اور اتباع سنت بھی ہوا اور عظمت سنت بھی ہوئی اور سنت کے مقابلہ میں کسی ملامت اور لومتہ لائم کی پرواہ بھی نہ ہوئی۔ تو اس سے حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کا کمال عشق اور کمال ایمان واضح ہو جاتا ہے۔

عطیۂ خداوندی کی قدر و منزلت

اور روٹی کی عزت کرنا یہ خود شرعاً فی نفسہٖ واجب ہے۔ صریح حدیث میں فرمایا گیا:

اكرمو الخبز

"روٹی کا اکرام کرو"۔

اس لئے کہ روٹی اللہ کا تبرک ہے اس کو عزت کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اس کو استعمال سامان مت سمجھو کہ کھائی اور جو باقی بچی اٹھا کر پھینک دی۔۔۔ جیسے ہم بعض دفعہ ریلوں میں دیکھتے ہیں۔ یہاں تو الحمد للہ دیکھنے میں نہیں آیا مگر ادھر کہ روٹی کھائی اور جو بچی اس سے منہ صاف کیا اور اسے لپیٹ کر باہر پھینک دیا۔ یہ نہایت ذلیل حرکت ہے۔ میں نے تو بعض کیا ملامت کو حالانکہ وہ غیر مسلم تھے۔ میں نے کہا یہ کیا طریقہ ہے۔۔۔؟ کہنے لگے کہ اب یہ کام کی نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ یہ کرتہ پاجامہ میلا ہو گیا۔ اسے بھی اتار کر ذلت سے پھینک دو۔ کام کا نہیں رہا۔ اس لئے کہ میلا ہو گیا۔ اس وقت کھانا تمہارے کام کا نہیں رہا۔ شام کو تمہارے کام آجائے گا۔ تمہارے کام کا نہ ہو کسی غریب کے کام آجائے گا۔ یہ تو خدا کا دیا ہوا رزق ہے' اسے ذلیل کر کے پھینکنا' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روٹی سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ روٹی کا ادب سکھلایا گیا ہے۔ اس کی بے ادبی جائز نہیں رکھی گئی' اس کا احترام واجب ہے۔ اسی طرح اگر دانے زمین پر گر جائیں۔ انہیں چگ لینا چاہئے یہ نہیں کہ انہیں جوتیوں میں روند دیا جائے۔ وہ اللہ کا عطیہ ہے اور حق تعالیٰ شانہ کا تبرک ہے۔

احترام رزق

ہمارے اساتذہ میں سے حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے محدث تھے۔ ان کی وفات ہو گئی۔ بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے اور صاحب حال لوگوں میں سے تھے۔ ان کا عجیب طریقہ تھا۔ جب کوئی مہمان آتا اور کھانا باہر آیا تو جب مہمان کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے۔ تو کچھ تو روٹیوں کے ٹکڑے بچ جاتے ہیں' کچھ چھوٹے موٹے کنے بچ جاتے ہیں اور کچھ ریزے ہوتے ہیں جو دستر خوان پر پڑے ہوتے ہیں۔۔۔ تو میاں صاحب مرحوم کا عجیب طریقہ تھا' روٹیوں کے جو بڑے ٹکڑے بچ جاتے' انہیں جمع کر کے احتیاط سے گھر میں بھیجتے کہ یہ مہمان کا تبرک ہے۔ یہ گھر والوں کو کھانا چاہئے وہ جو کنارے اور چھوٹے چھوٹے کنے رہ جاتے' ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے فرماتے کہ انہیں چھت پر پھیلا دو' یہ چڑیوں اور کوؤں کا حق ہے۔ ہمارے رزق میں اللہ نے ان کا بھی حصہ رکھا ہے۔۔۔ اور وہ ریزے جو چھوٹے چھوٹے بھورے ہوتے ان کو جمع کر کے جہاں چیونٹیوں کے سوراخ ہوتے وہاں ڈال دیتے کہ چیونٹیاں انہیں لے جائیں کہ ان کا بھی ہماری غذا کے اندر حق ہے۔۔۔ تو ادب بھی ہوا اور ٹھکانے بھی لگا۔۔۔ تو روزی اور رزق اسی قسم کی چیز ہے۔ پرانے بزرگوں میں اس کا بڑا احترام کیا جاتا اور کہا جاتا کہ ۔

"روزی کا مارا ہوا اور روٹی کا مارا کہیں نہیں پنپتا"۔

یعنی جو روٹی کے ساتھ بے ادبی کرے' رزق کے ساتھ گستاخی کرے۔ وہ محروم الرزق بن جاتا ہے اس لئے شریعت اسلام نے روٹی کا ادب سکھلایا کہ اس کی توقیر کرو' اس کو کوڑے میں مت ڈالو' اس کو خاک پہ مت ڈالو' اسے منہ پونچھنے کا رومال مت بناؤ' بلکہ جتنا بچ جائے' ادب کے ساتھ احتیاط سے رکھو خود تمہارے کام آئے گا۔ تمہارے کام نہیں آئیگا کسی فقیر کے کام آئے گا' کسی غریب کے کام آئے گا۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو نان شبینہ کے محتاج ہیں۔ انہیں کھانے کو ٹکڑا نہیں ملتا اور تم سینکڑوں ٹکڑے ضائع کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ خود بے ادبی کا ثبوت دیا اور دنیا کو رزق سے محروم کیا۔ جو دنیا کو رزق سے محروم کرے کہیں اس پر یہ اثر نہ پڑے کہ اللہ اسے رزق سے محروم کر دے وہاں تو ادل بدل ہے۔۔۔ بہر حال روٹی کا اکرام بھی واجب قرار دیا گیا۔ رزق کا احترام بھی واجب قرار دیا گیا۔ ذرا ذرا سی چیزوں میں ادب سکھلایا گیا۔

احترام لباس

یہی ادب کپڑے پہننے میں ہے۔ مثلاً رات کو آدمی سوتے وقت کپڑے اتارتا ہے۔ اچکن اتارا' کرتہ اتارا' لنگی باندھی۔۔۔ فرمایا گیا کہ ان کپڑوں کو زمین پر مت ڈالو۔ فرش پر بکھرا ہوا مت چھوڑو' یعنی بے ادبی اور بے توقیری سے پھیلا ہوا مت چھوڑو۔۔۔ اول تو یہ ادب کے خلاف ہے۔ جب یہ عطیہ خداوندی ہے تو جس اللہ نے دیا ہے اس کی نعمت کا احترام کرتے تہہ کر کے سرہانے رکھ دو یا کسی کھونٹی پر ٹانگ دو۔ زمین پر پڑا ہوا مت چھوڑو اور اس میں یہ بھی فرمایا

گیا کہ اس میں دنیوی مضرت بھی ہے فرماتے ہیں کہ

اطوو اثیابکم ترد الیھا ارواحھا

کپڑوں کو لپیٹ کر احتیاط سے رکھو۔ بکھرے ہوئے چھوڑ دو گے تو ممکن ہے اس کے اندر چیونٹیاں گھس جائیں اور جب پہننے لگو تو ایذا پہنچائیں۔ ممکن ہے کوئی بچھو گھس جائے اور تکلیف پہنچائے کپڑے کو پڑا ہوا مت چھوڑو۔ بے ادبی بھی ہے اور دنیوی مضرت بھی ہے۔ بلکہ اس تہہ کر دیا کھونٹی پر ڈالو' ہر چیز کے اندر شریعت نے آداب سکھلائے ہیں کھانے کا ادب بتلایا' لباس پہننے کا ادب بتلایا' لباس پہننے کا ڈھنگ بتلایا کہ ڈھنگ بھی بے ادبی کا مت اختیار کرو کہ وہ اللہ کا عطیہ ہے۔

ہیئت احترام | کوئی بادشاہ اگر کسی کو کوئی عطیہ دے' اور آدمی نے منہ ادھر کو پھیر کر بائیں ہاتھ سے لے لیا وہ انعام سے محروم کر دیا جائے گا کہ شاہی عطیہ کی اس نے قدر نہیں کی۔ دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں یا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ادب کے ساتھ لیتے ہیں کہ شاہی عطیہ ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ جب کھانا کھانے بیٹھو دائیں ہاتھ سے روٹی کھاؤ' دائیں ہاتھ سے پانی پیو۔ گویا حق تعالیٰ ایک ایک لقمہ تمہیں پہنچا رہے ہیں۔ ہر ہر منٹ پر انعام ہو رہا ہے اور تم لیتے جا رہے ہو تو بائیں ہاتھ سے مت لو کہ یہ بے ادبی ہے۔

جھک کر کھاؤ' متکبر بن کر مت کھاؤ' چوکڑی مار کر مت کھاؤ کہ یہ متکبروں کا طرز ہے۔ سوائے اس کے کوئی معذور ہو۔ بعض دفعہ آدمی لحیم شحیم اور موٹا تازہ ہے۔ اب اس غریب سے اکڑوں نہ بیٹھا جائے۔ نہ یہ کہ ایک پاؤں کھڑا کر کے ایک بچھا کے بیٹھا جائے۔ چوکڑا ہی مار کر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ معذور ہے۔ تو معذور کا باب الگ ہے۔ لیکن اصل حکم یہ ہے کہ تربع یعنی چوکڑا مار کر کھانا مکروہ ہے۔ لیٹ کر کھانا مکروہ ہے کہ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے اور طبی اصول کے بھی خلاف ہے۔ تو یہ سارے آداب اس لئے سکھلائے گئے کہ دنیا کی بھی منفعت حاصل ہو اور اخروی نفع بھی حاصل ہو اور رضائے خداوندی بھی حاصل ہو۔

احکام شریعت میں فوائد اخروی و دنیوی | شریعت کے ہر حکم میں جہاں آخرت کے منافع ہیں وہاں دنیا کے بھی منافع ہیں۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا

السواك مطهرة للفم و مرضاة للرب

مسواک کرنے میں منہ کی پاکیزگی اور خوشبو ہے اور آخرت کا ثواب ہے اور حق تعالیٰ کی رضا ہے۔ تو مسواک کرنے میں دو فائدے حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منہ کی صفائی اور منہ کی

صفائی کا صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ دانت صاف رہیں گے تو پائیوریا نہیں ہوگا تو معدہ نہیں بگڑے گا۔ معدہ نہیں بگڑے گا تو صحت اچھی رہے گی گویا جسمانی صحت بھی اچھی ہوئی اور صحت روحانی بھی حاصل ہوئی کہ رضائے حق میسر آ گئی۔ تو چیز ایک ہے' ایک حکم ہے۔ اس سے دنیا کا فائدہ بھی اور آخرت کا فائدہ بھی۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب زخمی ہو چکے اور مرض الوفات میں تھے تو ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ مزاج پوچھا اس سے بات چیت فرمائی۔ وہ واپس ہو گیا۔ جب تھوڑی دور گیا تو غلام سے کہا کہ اس نوجوان کو بلاؤ۔۔۔ وہ آیا۔۔۔ لنگی پہنے ہوئے تھا جو ٹخنوں سے نیچے زمین پر گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ تو آپ نے نہایت ہی محبت سے فرمایا یا فتی! (اے نوجوان)

ارفع ازارك فانه انقى لثوبك واتقى لربك

اس کپڑے کو اٹھا۔ اس میں تیرے لئے دو فائدے ہیں انقی لثوبك سب سے پہلی بات تو وہ ہے کہ تیرا کپڑا صاف ستھرا رہے گا۔ یہ جو زمین پر گھسٹتا ہوا آ رہا ہے' تو کہیں جگہ پاک ہے کہیں ناپاک ہے۔ پاکی لگی' ناپاکی لگی۔ کپڑا بے اعتبار بن گیا۔ نہ عبادت کے قابل رہا نہ نماز کے قابل رہا۔ تو انقی لثوبك دنیوی فائدہ تو یہ ہے کہ کپڑا پاک رہے گا۔ واتقی لربك اور پروردگار کے لحاظ سے دیکھیں تو تیرے اندر تقویٰ پیدا کرے گا۔ خوف خدا پیدا کرے گا۔۔۔ اس لئے کہ کپڑا زیادہ گھسٹتا ہوا ہوتا ہے تو دل میں رعونت پیدا ہوتی ہے اور کبر کا مضمون دل میں پیدا ہوتا ہے اور اگر کپڑا ٹخنے سے اونچا ہوتا ہے تو تواضع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

آثار لباس

اسی واسطے سلاطین اور بادشاہوں کا لباس آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کے لباس تین تین گز ادھر ادھر پڑے ہوتے ہیں۔ کندھے پر قباء ہے اور دو دو گز ادھر ادھر بکھری ہوئی پڑی ہے۔ یہ انتہائی کبر و نخوت اور رعونت کی دلیل ہوتی ہے۔ شریعت نے اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا کہ بندے کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ بندگی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام جو منافی بندگی ہو کرے۔ لباس کا زمین پر پھیلا ہوا رہنا کبر کی علامت ہے اور لباس کا اونچا رہنا یہ تواضع کی علامت ہے اس میں تزئین کم ہوتا ہے۔ اس میں زینت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی زینت بڑھائے گا تبختر اور اتراہٹ پیدا ہوگی' کبر و نخوت پیدا ہوگی' کبر و نخوت کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

اور اگر زینت میں کمی ہے' یعنی جمال تو ہے' تزئین نہیں ہے۔ جمال کے معنی صفائی ستھرائی' موٹا کپڑا' لیکن آدمی اگر بناؤ اور سنگھار میں لگ جائے اسی سے کبر نفس کی طرف طبیعت جاتی ہے۔۔۔ عورت چونکہ محل زینت ہے' اس واسطے عورتوں میں تکبر زیادہ ہوتا ہے۔ مرد چونکہ زینت کم اختیار

کرتے ہیں' اس لئے عورتوں کی نسبت متکبر کم ہوتے ہیں۔ متواضع زیادہ ہوتے ہیں۔ تو عورت میں ناز و نخرہ اور کبر و نخوت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ محل زینت ہوتی ہے۔ اور مرد محل شجاعت اور محل ہمت ہے۔۔۔ اگر مرد بھی محل زینت بننے لگے تو مرد اور عورت میں فرق نہیں رہے گا۔ اگر مرد اسی طرح بناؤ سنگھار کرنے لگے جس طرح عورتیں کرتی ہیں تو ان میں کبر نفس پیدا ہوگا' جتنا زینت کو چھوڑ کر تجمل اختیار کریں گے' اتنی تواضع پیدا ہوگی۔ تزین بناؤ سنگھار کو کہتے ہیں اور تجمل صفائی و ستھرائی ڈھنگ اور طریقے کو کہتے ہیں۔ تو شریعت نے تجمل کا حکم دیا ہے۔ یعنی موٹا کپڑا پہنو مگر صاف ستھرا ہو اور جمال کی شان ہو اور ایک زینت ہے یعنی بناؤ سنگھار کرنا' یہ عورتوں کے لئے مخصوص کی گئی۔ تو عورتیں متکبر زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کا علاج دوسرے ڈھنگ سے بتلایا گیا۔ عورت سے زینت ترک نہیں کرائی بلکہ زینت کا حکم دیا گیا۔۔ اس واسطے کہ زینت سے محبت کا تعلق ہے۔ اور یہ مطلوب ہے کہ عورت خاوند کی محبوب بنے۔ اس کو محبت اور تعلق رہے۔ اگر خاوند میں بیزاری پیدا ہوئی تو گھر اور معاشرت منزلی تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے مرد کو عورت کا محب بنانا چاہا ہے اور عورت کو مرد کا محبوب بنانا چاہا ہے۔ اس لئے عورتوں کے لئے زینت کا حکم دیا ہے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت سارے سفید کپڑے پہن لے تو یہ مکروہ ہے کوئی نہ کوئی کپڑا رنگین ہونا چاہئے تاکہ زینت کی شان اس کے اندر پیدا ہو۔

حرف آخر

بہر حال شروع میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ کوئی منضبط بات تو ہے نہیں منتشر چیز ہے۔ مگر مختلف مسائل آگئے۔ اب وقت بھی پورا ہو گیا۔ جمعہ پر بات چلی تھی کہ جمعہ یوم جامع ہے۔ معلوم نہیں ادھر کس طرح نکل آیا۔ بس اللہ کا حکم تھا ادھر نکل آیا۔ جمعہ کے متعلق جو بیان کرنا تھا وہ رہ گیا۔ پھر کبھی آنا ہوا تو اس کی تقریر ہو جائے گی۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم

دین کا بقاء علم دین کے بقاء سے ہوتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت و شوکت باقی ہو تو قابل اعتناء نہیں تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا ادارہ ضروری ہے ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے۔ دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو۔۔۔ تو ایک رسمی صورت نہ تھی بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی' الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چنانچہ اہام خداوندی کے تحت اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُوْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا............اَمَّابَعْدُ..................

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قیام دارالعلوم' اسباب و محرکات

بزرگان محترم!

دارالعلوم دیوبند جس کا نام جس کا نام آپ کل سے بار بار سن رہے ہیں اور یہ تمام اکابر جو ان [illegible] (دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ اجلاس میں) آپ حضرات کے سامنے جمع ہیں۔ [illegible] [illegible] دیوبند کے اجزاء و اعضاء ہیں۔ دارالعلوم کے ارکان ہیں۔ ان ہی حضرات کے اجتماع کا نام [illegible] دیوبند ہے' خواہ وہ دارالعلوم دیوبند کے اندر ہوں یا باہر ہوں۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام رسمی طور سے عمل میں نہیں آیا کہ چند آدمی شہر کے ذمہ دار حضرات جمع ہوئے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ صورت نہ تھی بلکہ صورت یہ تھی کہ انگریزوں کا [illegible] و اقتدار ہندوستان میں آیا۔ دین کی کسمپرسی کا حال سب کے سامنے ہوا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اسلام شاید اب باقی رہے یا نہ رہے۔ تو اس وقت جتنے اولیاء اور اکابر تھے۔ یک دم ان کے قلوب میں وارد ہوا

کہ آیا کوئی ادارہ ہونا چاہئے جس کے ذریعہ سے دین اور علم دین باقی رہے۔ دین کی حفاظت کی جائے۔ اگر یہ باقی رہے تو تمام چیزیں اسلام اور مسلمان کی باقی رہ سکتی ہیں اور اگر دین باقی نہ رہے تو خدانخواستہ مسلمان مسلمان نہ رہ سکیں گے۔

دین کا بقاء علم دین کے بقاء سے ہو سکتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت و شوکت باقی بھی ہو تو قابل اعتناء نہیں۔ تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایک ادارہ ضروری ہے۔ ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے۔ دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو۔ تو ایک رسمی صورت نہ تھی۔ بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی، الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چنانچہ الہام خداوندی کے تحت اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مولانا یاسین صاحب دیوان جی حضرت قاسم العلومؒ کے خادم خاص اور معتمد علیہ تھے۔ جب حج کو گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں جانا ہوا جو پورے مشائخ کے شیخ اور مرشد طریقت تھے۔ تو رخصت کے وقت عرض کیا کہ ہمارے مدرسہ کے لئے بھی دعا کریں۔ حضرت حاجی صاحب نے یہ سن کر تعجب سے جواب میں فرمایا چہ خوب پیشانیاں تو برسوں ہم نے رگڑیں، راتوں بھر سجدے ہم نے کئے۔ دعائیں ہم نے مانگیں اب جب مدرسہ قائم ہوا تو مدرسہ آپ کا ہو گیا اور پھر فرمایا کہ ہمارا خیال مدرسے کا تھانہ بھون یا نانوتہ میں قائم کرنے کا تھا ہمیں کیا خبر تھی کہ دیوبند والے یہ غنیمت لے اڑیں گے۔ تو مدرسہ دیوبند کا قیام ہنگامی حالات اور مشورہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ اکابر کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ سجدے کئے جا رہے تھے۔ راتوں کو دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ حق تعالیٰ نے قبول فرمایا معلوم ہوا کہ الہام غیبی سے مدرسہ قائم ہوا۔

خشت اول اس ادارہ کی عمارت کی سب سے پہلی اینٹ حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دارالعلوم کے جلیل القدر استاد کے نانا میاں جی منے شاہ نے رکھی ان کا نام محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ میاں جی مرحوم کے بارے میں حضرت مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ میں آج پہلی اینٹ ایک ایسے شخص سے رکھواؤں گا کہ جسے کبھی بھی عمر بھر صغیرہ کے درجہ میں بھی گناہ کا تصور نہیں ہوا۔ استغراق اور ربودگی کی یہ کیفیت طاری تھی کہ اپنی اولاد تک کو نہ پہچانتے۔ ان کے داماد تھے، اللہ بندہ نام تھا۔ جب ان کی خدمت میں آتے تو پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے۔ اللہ بندہ پھر پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے آپ کا داماد ہوں دس منٹ بعد پھر وہی استغراق۔ یہ کیفیت استغراق کی جاری رہتی نہایت ہی پاک طینت بزرگ تھے۔ جب انتقال ہوا اور غسل کے لئے تختے پر لٹائے گئے۔ تو چشم دید واقعہ مولانا محمد یٰسین صاحب نے سنایا، جو میرے فارسی کے استاد تھے اور آپ کے پاکستان کے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے والد ماجد تھے۔ انہوں نے خود سنایا کہ تختے پر لٹاتے ہی میاں

صاحب ایک دم کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ شور مچ گیا تو لوگ دوڑ پڑے۔ جب مجمع زیادہ ہوا تو ہنسا بند ہوا تو اس قماش کے لوگ تھے۔ جنہوں نے دارالعلوم کی پہلی اینٹ رکھی۔ پھر حضرت گنگوہیؒ حضرت نانوتویؒ حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوریؒ اور دوسرے اکابر نے بعد میں اینٹ رکھی۔ ظاہر ہے کہ اینٹ رکھنے والے ایسے اولیاء اللہ اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ایسے لوگ ہوں تو اس مدرسہ کی بنیادیں کتنی مضبوط ہوں گی۔ آج بحمد اللہ اس پر سو برس کے قریب زمانہ گذر گیا ہے۔ ہزاروں مصائب آ آ کر ختم ہوئے اور وہ مدرسہ ترقی کرتا گیا۔ برابر بڑھتا جا رہا ہے اور آج تک اسی آب و تاب سے قائم ہے۔ یہ ایک رسمی بات ہے کہ فلاں شخص وہاں کا مہتمم ہے' عہدیدار ہے یا مدرس ہے اور اسے ترقی دیتا ہے یہ غلط اور محض ایک تہمت ہے۔ ترقی دینے والی غیبی طاقت ہے' سب کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ کرتا ہے۔

مرکز روحانیت

میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے سنا فرماتے تھے کہ دارالعلوم آدمیوں کو بناتا ہے۔ آدمیوں نے دارالعلوم کو نہیں بنایا۔

یہ ایک کسوٹی ہے' پرکھ ہے یہاں دارالعلوم کے ہزاروں فضلاء ہیں اور مدارس قائم کئے ہوئے ہیں میں برما گیا تو دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود۔۔۔ افغانستان گیا تو سینکڑوں علماء موجود اور قصبہ قصبہ آباد ہے۔ مدارس قائم کر چکے ہیں۔ یہاں کثرت سے فضلاء سرگرمی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں ان سب کا رجوع دارالعلوم کی طرف ہے۔ یہ اس ماحول کے آثار ہیں۔ وہاں کی غیبی طاقت ہے کہ سب کا تعلق اور رجوع اس مرکز کی طرف ہے۔ وہاں کے فضلاء کہتے ہیں کہ جب ہم دارالعلوم سے جدا ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ماں کی گود سے جدا ہونے کی حالت ہے گویا ایک جاذبیت ہے' روحانیت ہے اور دارالعلوم مرکز روحانیت بن گیا ہے۔

دارالعلوم کی شان تجدید

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے ؂

ان اللّٰہ یبعث لہذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا.

(الحدیث)

ہر ایک صدی میں کوئی نہ کوئی مجدد آئے گا۔ جو دین کو نکھارے گا۔ عقائد و اعمال اور کلیات دین میں لوگ جو فرق و خرابی ڈالیں گے۔ مجدد ہر صدی میں آکر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دے گا تو فرمایا کہ مجدد کے لئے فرد واحد ہونا شرط نہیں۔ جماعت بھی مجدد بن سکتی ہے اور فرمایا کہ دارالعلوم کے بانی حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ ان سب کی حیثیت مجدد کی سی ہے اور ان حضرات کا مظہر اتم دارالعلوم ہے۔ گویا دارالعلوم کی حیثیت مجدد کی سی ہے۔ جس نے بدعت و سنت کو الگ الگ کیا۔ دین کو خلط ملط' غل و غش سے پاک صاف کر دیا۔ مسائل میں جو خلط لوگوں نے کیا تھا' اسے نکھار' نکھار کر پاک صاف کر دیا۔ یہ ایک کیفیت ہے دارالعلوم کی۔

مرکز اتحاد

مادی چیزوں میں تغیر اور انتشار ہوتا ہے۔ روحانیت میں قدرتی طور پر اجتماع ہوتا ہے اور دارالعلوم کی بنیاد روحانیت پر ہے۔ مادہ کا خاصہ ہی تغیر ہوتا ہے اور روحانیت میں ایسا نہیں ہوتا ایک شیخ کے مرید' ایک استاد کے شاگرد قدرتی طور پر مجتمع رہتے ہیں۔ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح دارالعلوم کے فضلاء کے قلوب ایک مرکز سے وابستہ ہیں اور حقیقی طور سے وابستہ ہیں۔

جو اتحاد کا مرکز ہے تو قدرتی طور پر ان کا آپس میں اتحاد قائم ہے۔ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ جب تک حیات تھے' ان کی سرپرستی دارالعلوم کو حاصل تھی۔ تو کیفیت یہ تھی اور ہماری حالت یہ تھی کہ لوگ اختلاف کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے دلوں میں افتراق کا خیال بھی نہیں آتا تھا اور جب ان کی وفات ہوئی اور حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی آئی تو اگر کچھ اختلافات اٹھتے بھی۔ مگر حضرت گنگوہیؒ کی روحانیت کی وجہ سے ختم ہو جاتے۔ ان کی روحانی طاقت انہیں دبا دیتی اور قوت مجتمع رہتی۔

تنظیم کی ضرورت

پھر خلفاء کے زمانے میں مراکز الگ الگ ہوئے۔ مرکز خلفاء بن گئے۔ مگر قوت مجتمع تھی۔ مریدین آپس میں مجتمع تھے۔ اس وقت سوال پیدا ہوا کہ مراکز کے اختلافات کی وجہ سے رسمی طور سے تنظیم ہونی چاہئے تاکہ رسمی طور پر بھی ایک اتفاق پیدا ہو جائے۔ ایک نظام اور تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مرکز پر سب متحد رہیں۔ ورنہ مشائخ کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے صورت اختلاف تشتت و ظاہری پراگندگی کی نمایاں ہو جاتی ہے۔ گو وہ درحقیقت مذموم نہ ہو۔

اس وقت بزرگوں کے دلوں میں وارد ہوا کہ تنظیم ابنائے دارالعلوم دیوبند ہونی چاہئے۔ یہ تنظیم ابنائے قدیم آج کی نہیں ہاں زیادہ قوت اس تنظیم میں ابھی چند سال ہوئے کہ پیدا ہوئی ورنہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے زمانے میں جب کہ دارالعلوم ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی ضرورت محسوس کی۔ زیادہ قوت سے اس کی ضرورت اب محسوس کی گئی۔ یہ تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں نہ سیاسی مقاصد اس کے ساتھ متعلق ہیں۔

مقصد تنظیم

بلکہ اس تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ فضلاء دینی علمی قابلیتوں سے عظیم کام انجام دے رہے تھے۔ ان کو منظم کیا جائے تاکہ زیادہ مؤثر ثابت ہو سکیں۔ آج ہزاروں کی تعداد میں دارالعلوم کے فضلاء ہیں' فیض یافتہ ہیں جو دین کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک میں اس کے فضلاء پھیلے ہوئے ہیں۔

جہاں تک مدارس کا تعلق ہے کوئی قصبہ ایسا نہیں جو ان سے خالی ہو۔ ان سو برس میں جتنی خدمت اس ادارے نے کی کوئی نظیر اس کی نہیں۔ جہاں تک تصنیف کا تعلق ہے۔ ہزارہا ہزار تصانیف اس جماعت کی مختلف مسائل پر موجود ہیں۔ ایک حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کو دیکھا جائے

تو ایک ہزار تصانیف اپنے ترکے میں چھوڑ گئے۔ ہر زبان میں تصانیف' ہر علم میں' ہر فن میں تصنیفات موجود ہیں۔ نظم میں موجود ہیں' نثر میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہزار کے قریب مواعظ الگ چھوڑ گئے۔ کچھ چھپ گئے ہیں' کچھ باقی ہیں۔ گویا ایک ایک فرد نے ایک ایک امت کے برابر کام کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے مرید و متوسل ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اسی طرح حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے ہزارہا شاگرد' مریدین اور متوسلین ملک کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے مریدین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لگ بھگ پھیلے ہوئے ہیں۔ سب اپنے رنگ میں دین کا کام کر رہے ہیں۔ حدیث' فقہ فتویٰ' تفسیر' عمل جہاد ہر میدان میں اس جماعت کے لوگ نمایاں نظر آئیں گے غرض یہ کہ ہزاروں لاکھوں افراد کے ایمان کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کام سب سے بڑھ کر' خدمت کے میدان میں تمام جماعتوں سے آگے اور زیادہ۔ ہر دیہات میں کوئی نہ کوئی فاضل موجود ہے۔ شہرت نہیں' اخباروں اور رسالوں میں نام نہیں۔ مگر ہزاروں کے ایمان کو سنبھالے اور خود بھی سنبھلے ہوئے ہیں۔ اب آپ کے اکوڑہ خٹک میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب سلمہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہی شخصیت نے دارالعلوم قائم کیا۔۔ یہ ہزاروں لوگو علماء و مشائخ جو اس وقت یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) نظر آرہے ہیں۔ یہ ان کی نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کی خدمت ہے۔ ایک شخص کے ساتھ ہزاروں لوگوں کا دین وابستہ ہے۔ مگر رسمی طور پر اگر کسی نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے فارغین کیا کیا کام کر رہے ہیں۔ تو چونکہ انتشار ہے۔ منظم نہیں ہیں۔ تو صحیح خدمات آپ نہیں بتلا سکتے۔ اگرچہ خدمتیں بے شمار ہیں۔ آپ اجمالاً بیس ہزار کی تعداد کہہ سکیں گے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان بیس ہزار علماء و فضلاء نے کیا کام کر دکھایا۔ مؤرخ بھی اجمالاً ذکر کر دے گا۔ مگر تفصیلی طور سے اسے کچھ معلوم نہ ہوگا۔ دنیا کو اجمالاً بھی پتہ نہ چل سکے گا۔

تنظیم خدمات

لہٰذا اسی مقصد کے لئے شعبہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تا کہ دارالعلوم کی روحانی ذریت کے کارنامے منضبط ہو سکیں۔ مقصد خدمات کی تنظیم ہے۔ افراد کی تنظیم نہیں۔ اس کے لئے ایک فارم تیار کیا گیا جس کی سرخیاں میں نے خود لکھیں کہ ہر فاضل اس کی خانہ پری کر کے بھیج دے اس کی مدت فراغت اور کہاں اقامت ہے۔ تصنیف وتالیف کے کیا اور کون سے کام کئے۔ جائے سکونت اور بیعت وارشاد کے بارے میں سوالات لکھے گئے۔ الحمد للہ کہ ڈھائی تین ہزار فارم پر ہو کر آگئے اور یہ خدمات اور کارنامے اگر کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ ان حضرات نے دنیا کو دین وایمان سے بھر دیا ہے اور پھر ان حضرات کے وعظ وارشاد' تعلیم و تبلیغ سے اور ہزاروں متکلم' خطیب' شیخ طریقت' واعظ مبلغ تیار ہوئے۔ اب اسی مقصد کے لئے یہ ادارہ قائم کیا جارہا ہے۔ کہ ماہنامہ دارالعلوم کے چار صفحات اسی غرض کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں کہ ان میں دارالعلوم کے فضلاء کا ذکر ہو۔ سن وار ان کے حالات اور کارنامے بیان کر دیئے جائیں۔ یہ دین اور علم دین اور علماء کی ایک عظیم الشان تاریخ ہوگی۔

وسعت دار العلوم

دار العلوم اس چار دیواری کا نام نہیں۔ اس تمام نظام مسلک تحریک اور خدمات کا نام ہے۔ جو ہندو بیرون ہند میں قائم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ذکر کیا کہ بریلی میں ایک مدرس ہیں۔ جو دار العلوم کے نمایاں فاضل ہیں۔ انہیں دار العلوم میں بلالیں مولانا خاموش رہے' چپ ہوئے۔ تین دفعہ عرض کیا گیا' پھر عرض کیا کہ آپ کیوں رکاوٹ کرتے ہیں فرمایا! ان کو بلانا غلط ہے۔ اس لئے کہ جو فاضل جہاں بیٹھا ہے وہاں دار العلوم دیوبند قائم ہے اسی طرح گویا ہر شہر و قصبہ میں دار العلوم قائم ہے۔ یہ دار العلوم دیوبند کی وسعت ہے' آپ فاضل کو بلا کر دار العلوم کے دائرے کو سمیٹ کر محدود کر رہے ہیں اور میں سمیٹنا نہیں چاہتا یہ ساری روحانی اولاد اسی دار العلوم کی ذریت ہے۔ کسی کا ایک بچہ رہ جاتا ہے کسی کے دو کسی کے تین۔ دار العلوم کے لاکھوں بیٹے ہیں۔ لاتعداد اولاد ہے اور جائز اولاد ہے۔ ترکے اور میراث کے وارث ہیں۔ اور یہ ترکہ اخلاق ہیں' اعمال ہیں علوم ہیں' معارف ہیں جو انبیاء کا ترکہ ہوتا ہے۔ اور اس ترکہ میں ہر ایک کو بقدر ظرف حصہ ملا ہے۔

معیار اہتمام

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب جو دار العلوم کے مہتمم اور امی محض تھے' منقطع عن الخلائق' صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ حضرت نانوتوی نے بلا کر مجبور کیا۔ دار العلوم کے اہتمام کے لئے فرمایا! میں تو محض امی ہوں نہ لکھنا جانتا ہوں نہ پڑھنا فرمایا اس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے نہیں بلکہ قلب سے اس چیز کا تعلق ہے۔ چنانچہ مولانا اہتمام کے لئے بیٹھ جاتے اور جو کچھ لکھواتے لکھ دیا جاتا اور اس پر مولانا کی مہر لگائی جاتی تھی۔ بہرحال نانوتویؒ سے فرمایا کہ ادارہ بڑا ہے میں اس ذمہ داری کو کس طرح سنبھال سکوں گا اور اتنا تحمل کس طرح کر سکوں گا۔

معیار طلباء

اس واقعہ سے پہلے ان کا ایک اور واقعہ سنئے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے اہتمام کے زمانے میں دار العلوم میں پچاس ساٹھ طالب علم تھے۔ چوبیس پچیس طلبہ مطبخ سے کھانا لیتے تھے۔ یہ کل کائنات تھی۔ حضرت مولانا دار العلوم کے احاطہ مولسری میں کھڑے تھے۔ ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ لایا' اور غصہ سے مولانا کے سامنے پٹخ دیا اور کہا یہ سالن ہے یا پانی ہے۔ یہ کھانا مطبخ سے کھلاتے ہو؟ بے ادبی کے الفاظ بھی استعمال کئے۔ کہا کہ یہ ہے آپ کا اہتمام؟ مولانا نے تین مرتبہ سر سے پاؤں تک اس طالب علم کو دیکھا اور فرمایا یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ لوگوں نے کہا مدرسہ کا طالب علم ہے' یہاں مقیم ہے' مطبخ سے کھانا لیتا ہے فرمایا کچھ بھی ہو مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ طلبہ چپ رہے دو تین دن کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعی مدرسہ کا طالب علم نہیں تھا۔ اس نام سے دھوکہ دے کر مدرسہ سے کھانا لینے کے لئے داخل ہوا تھا۔ اہل مدرسہ نے آپ سے پوچھا۔ حضرت آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ فرمایا کہ جب مدرسہ کا اہتمام میرے سپرد ہوا پریشانی ہوئی کہ کس طرح یہ کام سنبھالوں گا۔ اس عالم میں رات کو

خواب دیکھا۔ صاحب دل اور عارف ربانی تھے اور صاحب دل کا خواب، آدھا خواب اور آدھا کشف ہوتا ہے۔

تو فرمایا کہ میں نے مولسری کے کنویں کو دیکھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور حضور نبی علیہ السلام اس کی من پر بیٹھ کر دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ کسی کو لوٹا بھر کر دے رہے ہیں کسی کو دیگ میں کسی کو بالٹی میں مل رہا ہے اور کوئی پیالہ بھر کے لے جا رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد ہے آنکھ کھل گئی تو میں نے مراقبہ کیا تعبیر کے لئے منکشف ہوا کہ یہ کنواں صورت مثالی ہے علم کی اور حضور اقدس علیہ السلام صورت مثالی ہیں قاسم العلم کی جو تقسیم کر رہے ہیں علم کو اور یہ لے جانے والے طلبہ ہیں جو بقدر ظرف لیتے جا رہے ہیں۔ اب اس سے زیادہ عجیب بات یہ کہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ جب شوال کا داخلہ ہوتا ہے تو میں فوراً طلبہ کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ طلبہ کے اس مجمع میں موجود تھا۔ اب جب یہ طالب علم آیا تو میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں نہیں تھا۔

الہامی طریقے سے اس کا علم ہوا۔ معلوم ہوا کہ دار العلوم کے طلبہ کا انتخاب بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے جہاں بھی کام کرتے ہیں غالب آتے ہیں۔ غلبہ پر ایک واقعہ یاد آیا۔ مولانا تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں چودہ طالب علم دورہ حدیث میں تھے۔ دستار بندی کی تجویز ہوئی یہ دار العلوم کا دوسرا جلسہ تھا۔ ہمیں بھی پگڑی باندھنے کا ارادہ کیا گیا تو ان چودہ طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جلسہ کو رکوانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ ہم امیوں کو پگڑی بندھوائی جائے گی اور ہم اہل نہیں جس سے مدرسہ کی بدنامی ہو گی۔ غرض ان چودہ طالب علموں نے مولانا تھانوی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ جا کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب دار العلوم کے اول صدر مدرس تھے، حضرت تھانوی جب ان کی خدمت میں پہنچے تو مولانا محمد یعقوب صاحب مطالعہ فرما رہے تھے کتابوں کا۔ حضرت تھانوی نے ہیئت بھی اس وقت کی بتلا دی کہ میں جب حجرہ میں گیا تو ڈیسک پر کتاب رکھی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور بہت گہرے طریقے سے مطالعہ کر رہے تھے کتابوں سے نگاہ اٹھائی ان کا رعب اتنا تھا کہ ہر ایک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پوچھا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں نے درخواست پیش کی کہ دیوبند میں جلسہ دستار بندی ہو رہا ہے اگر یہ حکم ہو تو تعمیل سے انکار نہیں اور اگر کہنے کا موقع ہو تو ہماری درخواست ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں، نالائق ہیں پورا مدرسہ اور ہمارے اکابر و اساتذہ بدنام ہو جائیں گے۔ جلسہ روک دیا جائے اور ہماری نالائقیوں سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عیوب پر پردہ ڈالا جائے یہ سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو جوش رحمت آیا فرمایا یہ تمہاری نالائقی کا احساس تمہاری سعادت مندی کی علامت ہے۔

جب آدمی میں اپنی نالائقی کا احساس آجائے تو یہ اس کے کمال و فضیلت اور سعادت مندی کی دلیل ہے اور ہم جو یہ جلسہ کریں گے تو وہاں اعلان کریں گے کہ فیما بیننا و بین اللہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہمارے نزدیک اہل ہیں قابل ہیں اور جس کی مرضی ہو ان کا کسی فن میں بھی امتحان لے لے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ ہم لوگ اور بھی ڈر گئے کہ آئے تھے جلسہ رکوانے کے

لئے اور یہاں امتحان دینے کا انگ کھا گیا۔ بہر حال ہم وہاں سے چلے گئے۔ جاتے وقت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک جملہ فرمایا کہ دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بھی تم جاؤ گے وہیں تم ہی تم ہو گے تمہارا ہی غلبہ ہو گا۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ ہم نے تجربہ کیا کہ جہاں گئے ہم ہی ہم نظر آئے جہاں گئے غالب ہی غالب رہے کیونکہ حق ہی کا غلبہ ہے۔ الحق یعلوا ولا یعلی غالبیت کے لئے حق ہے اور مغلوبیت کے لئے باطل ہے۔ بہر حال یہ ہے فضلاء دیوبند کی تنظیم جو دراصل خدمات کی تنظیم ہے۔

تنظیم کے فوائد

دوسرا فائدہ اس میں یہ ہے کہ کچھ خدمات مرکز کی ہیں' کچھ فضلاء کی۔ دونوں کے سامنے خدمات ہیں۔ اس واسطے بھی تنظیم ہونی چاہئے کہ مرکز کی فضلاء کی خدمات کا پتہ لگے اور فضلاء کے سامنے مرکز کو خدمات آتی رہیں۔ اگر فضلاء کو کسی مدد کی ضرورت وحاجت ہو تو ادھر مرکز کو پتہ لگے اور اس کے لئے سوچے اور مرکز کی ضرورتوں کا غم فضلاء کو ہو۔ غرض جانبین سے ایک رابطہ قائم رہے گا۔ ہندوستان میں دیکھا گیا کہ فتنے اٹھتے ہیں' مقامی فتنے' اور ہر قسم کے اٹھتے ہیں۔ فضلاء دیوبند نے مقامی طور پر ان فتنوں کو مقابلہ کیا اور ان فتنوں کو مغلوب کیا۔ مرکز کو پتہ نہیں کہ فضلاء نے کیا خدمات انجام دیں اور فضلاء کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہم بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ لیکن مرکز ہماری خبر نہیں لیتا' ہماری تحسین نہیں کرتا۔ تو اس غرض سے تنظیم کا سلسلہ قائم کیا گیا کہ اگر ضرورت پڑے گی تو آپس میں اجتماعی آواز ہو گی ان کی حمایت میں آواز اٹھے گی یا مرکز کوئی شخص ان کی امداد کے لئے بھیج سکے گا۔ جماعتی آواز کا اثر اور طاقت ہو گی' دین کا فائدہ ہو گا' قوم کو فائدہ ہو گا تو یہ تنظیم خدمات کی ہے افراد کی نہیں۔ اس صورت میں خدمات زندہ جاوید رہیں گی۔ منظم ہونا قوم کو ہر حیثیت سے مفید رہے گا۔ باہمی تعاون جاری رہے گا۔ خدمات کا انضباط کیا جا سکے گا کہ کہاں کہاں اور کیا کیا خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے دعوے بہت کئے اور کام بڑے تھوڑا کیا یا بالکل نہیں کیا معمولی خدمات مگر نمائش زیادہ۔ ہمارے ہاں کام ہوتا ہے۔ مگر نہ اخبارات نہ اشتہارات اور دعویٰ یہ لوگ کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ہم نے سنبھالا ہے ہمارے اکابر کے ہاں کام ہے نام نہیں' پروپیگنڈہ نہیں لوگ چھوٹی چھوٹی خدمات اخبارات میں دیتے ہیں' میں سوچا کرتا ہوں کہ دارالعلوم میں روزانہ جلسے ہوتے ہیں لیکن کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ جتنے لوگ اشتہارات منصوبوں اور پروگرام کے بعد کسی جلسے میں جمع ہوتے ہیں۔ وہاں بلا کسی منصوبہ آئے دن اتنے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں مگر پروپیگنڈہ بہت ہے کام کے درجہ میں صفر ہوتے ہیں۔ کئی لوگ دارالعلوم کو جاننے والے نہیں کہ کیا خدمات انجام دیں۔ اس تنظیم میں ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ مرکز میں بھی انبساط ہو گا اور فضلاء کا دل آگے بڑھے گا۔ خدمتیں نمایاں ہو کر سامنے آئیں گی اور بھی کئی قسم کے فوائد ہیں۔ یہ صورت پیش آئی کہ تنظیم ہونی چاہئے اس کے لئے کئی قواعد وضوابط منضبط کئے گئے۔ تنظیم کو صوبہ وار پھر ضلع وار رکھا گیا کہ فضلاء دارالعلوم علاقہ وار جمع ہو کر ایک ذمہ دار مقرر کریں'

صدر بنائیں۔ سیکرٹری منتخب کریں۔ یہ خیال زیادہ اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اکابر نے ارادہ کیا۔

اجلاس صد سالہ

ایک جلسہ دستار بندی کا بھی ہو جائے تقریباً پچاس برس سے جلسہ دستار بندی نہیں ہوا۔ ۱۳۲۸ھ سے لے کر اب تک درج رجسٹر فضلاء کی تعداد چھ ہزار تک ہے۔ ان چھ ہزار علماء کی دستار بندی کرائی جائے۔ اس واسطے اشتہارات جاری کئے گئے۔ ایک مستقل دفتر قائم کیا گیا کہ اس تنظیم کے نظم ونسق کو سوچیں۔ ترتیب دیں۔ اس کے اعلانات جاری کئے گئے تو ملک میں اس کا شہرہ ہوا۔ ملک میں اس کا شدید انتظار ہے۔ بیرون ملک کے لوگ بھی منتظر ہیں۔ کیونکہ ان میں حجازی بھی ہیں' ایشیا' سماٹرا' ملایا' چینی' ترکستانی' ایسٹ افریقہ' افغانستان کے فضلاء ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ تو ہزاروں کی تعداد میں جب جلسہ ہوگا۔ تو ایسی صورت میں گورنمنٹ کے سامنے ویزوں کے لئے درخواست دینی ہوگی۔ متعلقہ حکومتوں سے اجازت لینی ہوگی' اس کے ساتھ مصارف کا تخمینہ اور ساتھ ہی ساتھ آمدنی کا اندازہ وغیرہ اہم امور ہیں۔ کیونکہ حاضرین کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ سے کم نہ ہوگا' پورے ملک میں انتظار ہوگا۔ ہم لوگ اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ دیوبند کی آبادی تیس ہزار ہے' اور اگر دو لاکھ آدمی آجائیں تو اس مختصر آبادی میں کس طرح سما سکیں گے۔ کہاں بسیں گے۔ ہر ایک فاضل کو پگڑی باندھنی ہوگی اور اگر دس روپے فی پگڑی ہوگی اور اگر دس روپے فی پگڑی ہو تب بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے صاف پگڑیوں کے مصارف ہوں گے اور اگر یہ بھی آسان ہو جائے تو اس کے باندھنے کا مسئلہ ہے۔ کل یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) ۳۰'۳۵ طلبہ کو پگڑی بندھوانی تھی۔ تو بڈھے بزرگ تھک گئے' ہاتھ تھک گئے۔ مگر ختم نہیں ہو رہے تھے۔ تو یہ تقریباً پانچ ہزار پگڑیاں باندھنا آسان کام نہیں۔ کل دستار بندی کے وقت ہمارے مولانا عبدالحنان صاحب (ہزاروی) نے خوب جملہ چسپاں کیا کہ یہ پگڑیاں ہیں۔ یا سوٹہ بازی ہے۔ میں نے کہا کہ پگڑیاں بھی کلف دار ہیں اور باندھنے والے بھی مکلّف ہیں اور پگڑیاں بھی ذرا مکلّف ہونی چاہئیں۔ کلف لگا ہوا ہو۔ یہ بھی صورت ہے کہ اس وقت پیچ و خم نہ ہو۔ بلکہ پہلے سے باندھ کر رکھ دی جائیں۔ (یہ جملے حضرت نے مزاحاً فرمائے) خیر ان حالات کی وجہ سے یہ جلسہ ذرا مؤخر کیا گیا۔ مجلس شوریٰ میں یہ بھی بحث میں آیا کہ دارالعلوم کے سو سال پورا کرنے میں ایک سال باقی ہے تو پورا ہونے پر سو سالہ جشن منایا جائے۔ بہر حال منصوبہ ہے' تجویز ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد پر منحصر ہے۔ وسائل جمع کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں کہ ہندو بیرون ہند کے دو ڈھائی لاکھ افراد جمع ہو سکیں اور انعقاد کیا جا سکے۔ یہ تنظیم کی غرض و غایت ہے۔

یہ چند باتیں تنظیم کے بارے میں ذکر کی گئیں یہاں آج اس مجلس میں اس صوبہ کے فضلاء اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ ان مقاصد پر غور کیا جائے۔ میں تو دیکھ کر خوش ہونے والوں میں ہوں گا۔ اب کام کرنا ان حضرات کو ہوگا۔ کام آپ حضرات ہی کا ہے۔

واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سائنس اور اسلام

یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلت نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہ روحانی تصرفات یعنی صدقہ و مجاہدہ جن سے استغناء و عزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام کا موضوع عمل ہیں تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلت نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام انجام کار اسے عزت اور فلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے۔۔۔ پہلی صورت یعنی مادیات کا غلو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے، جس سے عزیز تو ذلیل اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے، جو قلب موضوع اور دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہے۔۔۔ اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سربلندی اور مادہ کی محکومی ہے جس سے عزیز مسند عزت پر اور ذلیل اپنی حد ذلت و مقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عین عدل اور دونوں کے لئے دارین میں موجب فلاح و بہبود ہے، بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی ماہیتوں کا اجمالی خاکہ۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

تقریظ

از حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمتہ اللہ علیہ صدر مہتمم

(دار العلوم دیو بند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر محترم! مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیو بند نے چند ماہ پیشتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک معرکتہ لآراء تقریر کی تھی جسے بعد میں منضبط کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا اور اس کا نام ''سائنس اور اسلام'' رکھا گیا۔

چھپنے سے پہلے برادر ممدوح نے مجھے بھی اس کا کے مطالعہ کا موقع دیا۔ میں اس مضمون کے مطالعہ سے بے حد محظوظ و مسرور ہوا اور دل سے مؤلف کے حق میں دعاء نکلی۔

یوں تو اس موضوع پر مختلف مذاق کے لوگ سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں اور لکھیں گے ہیں گے لیکن یہ مضمون اپنی نوعیت میں نرالا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب مضمون، حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ علیہ کی صرف نسبی اولاد ہی نہیں، ان کے علمی وارث بھی ہیں۔ جدید تعلیم کے اس بڑے مرکز علی گڑھ میں صحیح اور موزوں تبلیغی خدمت کا جو گہرا اور خوشنما نقش آپ کی اس تقریر نے چھوڑا وہ مسلمانوں کے اصلاح کی ایک خوش آئند اور درخشاں علامت ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے نو تعلیم یافتہ بھائیوں کو بار بار اس طرح کے افادات سے استفادہ کی توفیق بخشے۔

(شبیر احمد عثمانی، ۳ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تقریظ

از حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب' سابق شیخ الادب والفقہ (دار العلوم دیوبند)

حامداً و مصلیاً و مسلماً. اما بعد

اس رسالہ کے اوراق اس مقبول عام تقریر کے حامل ہیں جو عالی جناب مولانا الحاج المولوی محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم نے "اسلام اور سائنس" کے خشک مگر ضروری عنوان پر بمقام علی گڑھ کالج اسٹریچی ہال میں فرمائی تھی۔

خالص علمی اور خشک عنوان پر تقریر اور ایسے شخص کی تقریر جس کو کتب عربیہ کا مطالعہ عربی طلبہ کے ہجوم میں عربی الفاظ و مصطلحات کے مزاولت سے فرصت ہی نہ ملتی ہو اور وہ بھی ایسے مجمع میں جہاں اس کے برعکس انگریزی زبان اور اس کے محاورات مادری زبان کے حکم میں آگئے ہوں۔ یقیناً اضداد کے اجتماع کے حکم میں تھی اور اگر ضب (گوہ) اور نون (ماہی) کی ضدیت اور بعد مکانی کا صحیح مشاہدہ ہو سکتا تھا تو یہاں ہونا چاہئے تھا لیکن بیان کی سلاست' مضامین کے ارتباط اور دقائق علمیہ ظاہرانہ انداز سے روزمرہ کے محاورہ میں ادا کرنے نے ایسا سہل الحصول بنا دیا ہے کہ اس کے شروع ہو جانے کے بعد ختم کلام سے پہلے سیری ہی نہیں ہوتی تھی۔

پھر یہی نہیں کہ صرف سائنس اور اسلام کے ہر ہر گوشہ پر مقرر ممدوح نے روشنی ڈال کر اس پتھریلے اور سنگلاخ زمین کو طریقہ بینا و بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے معارف اور دقائق علمی و اسلامی بھی نہایت سہولت کے ساتھ اہل بصیرت اور ارباب نظر کے پیش نظر کر دیئے اور قابل تحسین یہ امر ہے کہ جس جگہ کوئی ایسا دقیقہ علمیہ سمجھانا ہو جس کو سمجھنے کے لئے علوم قدیمہ سے واقفیت مصطلحات فنونیہ کا تداول شرط تھا فی الحقیقت اس میں مقرر کے لئے دلچسپی پیدا کر لینا ضروری تھا تاکہ اذہان میں انشاط پیدا ہو۔ اس کو اگر ایک جگہ معمولی معمولی مثالیں دے کر کالشمس فی نصف النہار کر دیا تو دوسری جگہ ادیبانہ تشبیہات، استعارات' لطائف و ظرائف سے مزین بنا کر ذہن نشین کر دیا۔

پس یقیناً یہ تقریر اگر ایک جانب حقائق اسلامیہ' معارف شرعیہ کا آئینہ ہے تو دوسری طرف ادبی دلچسپیوں کا ذخیرہ بھی ہے۔

درکفے جام شریعت درکف سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

پس اگر یہ امر قابل تعجب نہیں کہ مشک ان دماغوں کو معطر کر دیتا ہے جو ماؤف نہ ہوں تو یہ

بھی شایان تعجب نہیں کہ نزدیکان بے بصر کے علاوہ تمام قلوب اس تقریر سے مستفید ہوئے ہوں اور اگر یہ لائق حیرت نہیں کہ آفتاب افق مشرق سے طلوع کرنے کے بعد اپنے مقابل زمین کے ہر ہر گوشہ کو منور کر دیتا ہے، تو یہ بھی موجب حیرت نہیں کہ اس تقریر نے مسئلہ مجوث عنہا کے کسی گوشہ کو روشن کئے بغیر نہ چھوڑا اور اگر یہ صحیح ہے کہ ٹھنڈا اور میٹھا خیر ملکہ پانی پیاسوں کی پیاس کا ازالہ اس طرح کر دیتا ہے کہ ان کے رونگٹے رونگٹے سے تشنگی کی اذیت، یبوست کی تکلیف زائل ہو جاتی ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اس تقریر نے عنوان بالا سے متعلق تشنگان کمال کی تشنگی اسی دلچسپی کے ساتھ زائل کر دی جو پیاسے کو پانی سے ہوتی ہے۔ قاسمی فیضان کی وجہ سے میرے نزدیک تو نہ یہ تقریر قابل تعجب ہے اور نہ مقرر ممدوح کی دوسری تقریریں یا تالیفات اگر کسی ناواقف کو تعجب ہو تو وہ جانے اس کا کام ہے۔

عجیب　　فی　　الزمان　　وما　　عجیب
اتی　　من　　ال　　سیار　　عجیبا

محمد اعزاز علی غفر لہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تقریظ

از جناب ڈاکٹر محمد زکی الدین صاحب شیخ الطبعیات

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام مسلمانان ہند کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے سائنس اور اسلام کے اہم موضوع پر ایک نہایت عالمانہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کے سامنے فرمایا اب وہی خطبہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ لوگ اس سے استفادہ حاصل کریں۔

سائنس اور مذہب کی بحث اور فلسفہ اور مذہب کی بحث مدت سے چلی آتی ہے سائنس اور مادیات کی وجہ سے مذہب کو (اسلام اور عیسائیت کو خاص طور پر) سخت نقصان پہنچا۔ ساتھ ساتھ علماء کی یہ کوشش رہی کہ ان نقصانات کی تلافی کی جائے۔

ڈریپر نے ایک کتاب سائنس اور مذہب کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور سائنس کے متعلق مختلف سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے علامہ جمال الدین افغانیؒ نے پیرس جا کر مشہور معروف فلسفی رینان سے بحث کی اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام سائنس کی مخالفت نہیں کرتا اس کے بعد وہ اس موضوع پر کچھ مضامین بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کے بعد ان کے شاگرد علامہ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا نے مسلسل اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

ہندوستان میں سر سید نے اسلام اور سائنس کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ اسلام ریویو میں خواجہ کمال الدین نے بہت سے مضامین شائع کئے۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی اور دیگر علماء نے متعدد خطبات اور مضامین اس سلسلہ میں دیئے۔ علماء کی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ:-

۱　سائنس اسلام کے مخالف نہیں۔

۲　جب مسلمان عروج پر تھے تو انہوں نے بہت سی سائنس کی ایجادات کیں جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ سائنس اسلام کی مخالفت نہیں کرتا۔

مصر میں علامہ طنطاوی نے ”تفسیر جواہر“ ۲۲ جلدوں میں شائع کی ہے اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کا تعلق سائنس سے دکھایا جائے اور ایک حد تک اس میں علامہ موصوف کو کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلی صدی میں یہ ایک شوق پیدا ہو گیا تھا کہ سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو قرآن

مجید کی آیتوں سے ثابت کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی فاش غلطی علماء سے سرزد ہوئی‘ وہ یہ کہ انہوں نے سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو ابدی سمجھ لیا اور وہ بالکل بھول گئے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے سائنس کے نظریوں اور اصولوں کی خامیاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان میں وقتاً فوقتاً زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ساتھ ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن شریف خدا کا پیغام ہے جو ہمیشہ کے لئے آیا ہے جو دو متضاد چیزیں ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ فاضلانہ خطبہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سے پورے طور پر مستفید ہوں گے اور یہ خطبہ ہماری ان نوجوان کے لئے جن کے دماغ میں سائنس اور الحاد مترادف ہے‘ مشعل ہدایت ہوگا۔

(زکی الدین)

☆☆☆☆☆☆☆☆

الحمدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.................اَمَّابَعْدُ.................

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِیْدُ فَخَلَقَ الْجِبَالَ فَقَالَ بِھَا عَلَیْھَا فَعَجِبَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ مِنْ شِدَّۃِ الْجِبَالِ فَقَالُوْا ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ قَالَ نَعَمْ! اَلْحَدِیْدُ فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْحَدِیْدِ؟ قَالَ نَعَمْ اَلنَّارُ! فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ نَعَمْ اَلْمَآءُ! فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْمَاءِ؟ قَالَ نَعَمْ اَلرِّیْحُ! فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الرِّیْحِ؟ قَالَ نَعَمْ! اِبْنُ اٰدَمَ تَصَدَّقَ صَدَقَۃً بِیَمِیْنِہٖ یُخْفِیْھَا مِنْ شِمَالِہٖ

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو کانپنے اور ڈولنے لگی تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور ان سے زمین پر جم جانے کے لئے فرمایا۔ ملائکہ نے پہاڑوں کی شدت وصلابت پر تعجب کیا اور کہنے لگے کہ اے پروردگار!۔۔۔ تیری مخلوق میں کوئی چیز پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا ہاں لوہا ہے۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا اے پروردگار تیری مخلوق میں لوہے سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں آگ ہے پھر عرض کرنے لگے کہ الٰہی آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں پانی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں پانی سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں ہوا ہے۔ تو پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں آدم کی اولاد ہے جو دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو"

تمہید

صدر محترم بزرگان قوم و برادران عزیز طلبہ! مجھے اس وقت جس موضوع پر تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کا عنوان "سائنس اور اسلام" ہے۔ مجھے جس طرح اس پر تعجب ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں جس میں ایک مرکزی جگہ پر قوم کے منتخب فضلاء مختلف علوم وفنون کے ماہر اور مخصوص ارباب کمال جمع ہیں تقریر کے لئے مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم اور ناکارہ علم و عمل کا انتخاب کیا گیا اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدرجہا زائد اس پر تعجب ہے کہ تقریروں کے اہم موضوعات میں سے اس اہم تر بلکہ مشکل ترین موضوع کو مجھ ناچیز کے سر پر عائد کیا گیا ہے۔ عنوان مذکور حقیقتاً ایک غیر معمولی عنوان ہے جس کیلئے معمولی قابلیت کافی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ عنوان "سائنس اور اسلام" اپنی لفظی حیثیت میں جس قدر سہل اور مختصر ہے اسی قدر اپنی معنوی وسعت اور وقت کے لحاظ سے طویل اور صعب ترین ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ عنوان تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک سائنس، دوسرے اسلام تیسرے ایک درمیانی عطف اس لئے قدرتی طور پر اس کے ماتحت تین امور کی تشریح مقرر کے ذمہ عائد ہو جاتی ہے۔ ایک سائنس کا مفہوم اور اس کی حقیقت دوسرے اسلام کا مفہوم اور اس کی حقیقت، تیسرے ان دونوں کی باہمی نسبت اور اس کا حاشیتین سے ارتباط اور پھر ایک چوتھی چیز ان تین سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان تین امور کا مقتضی ہے، یعنی اگر سائنس اور اسلام اور ان کی درمیانی نسبت واضح ہو جائے تو یہ ایک واقعہ کا اثبات ہوگا۔ مگر ہر واقعہ محض ایک واقعہ کی حیثیت سے ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اس سے کوئی عمل کوئی حکم اور کوئی طلب نہ پیدا ہو۔ اس لئے چوتھا مقصد یہ ہوگا کہ ان تین ثابت شدہ حقائق کا ہم پر تقاضا کیا ہے اور یہ واقعات ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے موضوع سے تین مقصد پورے ہو جاتے ہیں جن پر اس مضمون کی بنیاد ہوگی اور سائنس اور اسلام کی حقیقت، سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت اور اسلام اور سائنس سے پیدا شدہ موعظت۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور جس قدر اہم ہیں اسی قدر میری نسبت سے صعب اور مشکل ہیں، اول تو اسلامی حقائق و مقاصد ہی پر سیر حاصل روشنی ڈالنا ایک بے مایہ طالب علم کے لئے یقیناً دشوار گزار ہے۔ تاہم اگر اس حیثیت سے کہ مجھے علماء کی ایک مرکزی جماعت (علماء دارالعلوم دیوبند) کی جوتیوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور هم القوم لایشقی جلیسهم کے قاعدے کے مطابق کوئی ایک آدھ جملہ اسلام کے مقاصد کے متعلق کہہ بھی دوں تو بہر حال سائنس تو میرے لئے ہر صورت میں ایک نئی چیز اور اجنبی ہے، نہ میں اس کے اصول سے واقف ہوں نہ فروع سے باخبر اور نہ فنی حیثیت سے مجھے اس کے مبادی اور مقاصد سے کوئی تعرف حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ جملہ کے اطراف میں سے اگر ایک طرف بھی گوشہ چشم سے ایک

طرف رہ جائے تو طرفین کی درمیانی نسبت پر روشنی ڈالنا کس قدر مشکل ہے؟ تاہم جب کہ ایک محترم جماعت کی طرف سے مجھے مامور کیا گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ من اللہ ایک طلب ہے اس لئے غیبی امداد کی توقع پر جرات ہوتی ہے کہ عنوان زیر نظر پر اپنی بساط کے موافق کچھ کلام کروں اور سامعین سے اپنی اغلاط کے سلسلہ میں عفو و مسامحت کی درخواست کر کے امیدوار تسامح رہوں۔

حضرات! اس وقت جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے وہ عنوان مذکورہ کی تینوں جہات پر انتہائی جامعیت کے ساتھ حاوی ہے اور اس میں میرے علم وفہم کے مطابق پہلے سائنس کی جوہری حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ گویا اس کا مغز اور لب لباب کھول کر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسلام کی اصلیت واشگاف فرمائی گئی اور پھر ان دونوں چیزوں کی باہمی نسبت اس انداز سے آشکارا کی گئی ہے۔ جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے مقصودیت کی شان کس کو حاصل ہے اور وسیلہ محض ہونے کی کس کو؟ اور پھر یہ کہ اس وسیلہ سے اس کے مقصود کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور پھر حصول مقصد کے بعد اس پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں جن کی توقع پر تحصیل مطلوب کی سعی کی جائے۔

ہاں مگر حدیثی حقائق کھولنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میں سائنس کا موضوع متعین کردوں تاکہ اس پر انضباط کے ساتھ بحث ہو یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ فن سائنس کے موضوع کی تعین فن کی حیثیت سے میری قدرت میں اس لئے نہیں کہ میں نے اس فن کی تعلیم نہیں پائی۔ البتہ اس کے مشہور اور زبان زد آثار کو سامنے رکھ کر اپنی ذہنی سعی سے سائنس کا جو کچھ موضوع متعین کر سکتا ہوں اسی کو عرض کروں گا مجھے امید ہے کہ اگر میں اس میں غلطی کروں گا تو اس مرکز کے اہل فن اور سائنس دان استاذ مجھے اس غلطی پر قائم نہ رہنے دیں گے۔

فن سائنس کا موضوع

حضرات! اس دور ترقی میں جب تمدنی ایجادات اور مادیات کے نئے نئے انکشافات کا چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دور حاضر نے اپنی اعجازی کروٹ سے دنیا کو دیوانہ بنادیا۔ مثلاً وسائل خبر رسانی کے سلسلہ میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ریڈیو اور لاسلکی اور دوسرے ایسے ہی برقی آلات سے عالم کو مبہوت کر دیا تو ساتھ ساتھ سائنس کا ذکر بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے سنہری آثار ہیں یا مثلاً وسائل نقل وحرکت کے سلسلہ میں جب ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور دوسری بادپا سواریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی سائنس کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا طفیل ہے یا مثلاً صنائع وحرفت کے سلسلہ میں لوہے لکڑی کے خوشنما اور عجیب وغریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی

ترکیبیں اور انجینئری کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آتے ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں۔ اس طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات، پھل اور پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے نئے نئے آثار خواص کے متعلق انکشافات کا نام جب لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے ساتھ زبانوں پر آجاتا ہے۔

اسی طرح حیوانی نفوس میں مختلف تاثیرات پہنچنے کے ترقی یافتہ وسائل اور آپریشنوں کی عجیب و غریب پھرتیلی صورتیں، کیمیاوی طریق پر فن دواسازی کی حیرتناک ترقی، تحلیل وترکیب کی محیر العقول تدبیریں بجلی کے ذریعے معالجات کی صورتیں زبانوں پر آتی ہیں کہ یہ سب اسی کے درخشندہ آثار ہیں۔ اس سے میری ناقص عقل نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ موضوع عمل موالید ثلاثہ، جمادات، نباتات اور حیوانات کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

پھر چونکہ ان ہر سہ موالید کی ترکیب عناصر اربعہ، آگ، پانی، ہوا، مٹی سے ہوتی ہے جو تقریباً ایک مسلمہ چیز ہے اور اس کے لئے اس پر کسی استدلال کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے گویا سائنس کا موضوع بلحاظ حقیقت عناصر اربعہ ٹھہر جاتے ہیں۔ جن کی خاصیت اور آثار کا علماً سمجھنا اور پھر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل وترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردہ ظہور پر لاتے رہنا سائنس کا مخصوص دائرہ علم و عمل ہو جاتا ہے، پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعمیریں در حقیقت انہیں چار ستونوں (عناصر اربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اگر اس تفصیلی حقیقت کا مختصر عنوان میں خلاصہ بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کا موضوع "مادہ اور اس کے عوارض ذاتیہ" پر بحث کرنا ہے اور بس جو بھی مادیت میں زیادہ سے زیادہ منہمک رہ کر ان کے خواص و آثار سے کام لینے والا ثابت ہوگا وہی سب سے بڑا سائنس داں اور بہترین ماہر سائنس کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

موضوع متعین ہو جانے کے بعد اب سائنس کے اس چورنگ مادہ، آگ، پانی، ہوا مٹی پر جس کا مرتب بیان حدیث زیب عنوان میں کیا گیا ہے، ایک ذرا سا غور فرمایئے تو محسوس ہوگا کہ

عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اس کا اصولی معیار

ان چاروں عنصروں کے خواص و آثار اور ذاتی عوارض یکساں نہیں بلکہ کافی حد تک متفاوت ہیں اور نہ صرف عوارض و آثار ہی میں تفاوت ہے بلکہ خود ان کی جوہری طاقتیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ ان میں کوئی عنصر ضعیف ہے، کوئی قوی کوئی قوی تر اور کوئی اقویٰ تر ہے۔ اور پھر یہ قوت وضعف کا تفاوت بھی بے جوڑ یا اتفاقی نہیں، بلکہ معیاری ہے، وہ معیار

یہ ہے کہ ان عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے اسی قدر اس کی طاقت بھی بڑھتی ہے اور پھر طاقت ہی کے اندازہ سے اس میں غلبہ و تسلط اور اقتدار کی شان قائم ہوتی گئی ہے اور جس حد تک لطافت کم ہو کر کثافت کے لئے جگہ خالی کرتی گئی ہے اسی قدر اس عنصر میں کمزوری آتی ہے پھر کمزوری کی قدر اس میں بے بسی مغلوبیت اور ذلت و پستی بھی نمایاں ہوتی گئی ہے۔

اب راز اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطافت ایک وصف کمال ہے جو کثافت کی ضد ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود کی ذات بابرکات ہے۔ اس لئے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے اور اسی قاعدہ سے بوجہ لطافت طاقتوں کا منبع بھی وہی ہے۔ چنانچہ اس کی بے انتہا لطافت کا عالم تو یہ ہے آنکھوں سے اوجھل حواس وخیال کی حدود سے بالاتر اور وانکشاف کی حد بندیوں سے وراء الوراء ہے پھر ان کی بے انتہائی طاقت کا کرشمہ یہ ہے کہ تمام جہانوں پر اپنی اور صرف اپنی ہی کا نظامِ محکم کئے ہوئے ہے۔ اس لئے جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہے وہ در حقیقت اسی کی ذات وصفات کا کوئی پرتو ہے۔ جس کا اثر بمقدار استعداد اس نے قبول کر لیا ہے اور جب کہ قبول اثر بغیر کسی مناسبت کے نہیں ہوتا اس لئے یہ کہا جانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ہر لطیف شئی کو بقدر لطافت حق تعالیٰ سے مناسبت ہے اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی کسی چیز کو ذات بابرکات کے ساتھ قرب و تناسب قائم ہوگا وہ اسی قدر قوی، غالب اور با اقتدار بنتی جائے گی ادھر کثائف کو اس کی ذات سے بے انتہا بعد اور بیگانگی ہے کہ وہاں کثافت کا نشان نہیں۔ اس لئے جو چیز بھی بقدر کثافت اس لطیف و خبیر سے دور پڑتی جائے گی اسی وجہ سے پست و مغلوب اور ذلیل ہوتی جائے گی اور اس میں سے غلبہ واستعلاء کی شان نکلتی جائے گی۔ بلکہ اسی طرح جس طرح پانی سے کوئی چیز قریب ہو جائے تو اس میں پانی کے آثار برودت ورقت وغیرہ سرایت کرتے چلے جائیں گے۔ آگ سے قریب ہو جائے تو حرارت ونخوت وغیرہ آثار راسخ ہو جائیں گے۔ مٹی سے قریب ہو جائے تو پیوست اور خشکی کے آثار گھر کر جائیں گے۔

اسی طرح جو چیز کسی وصف کے ذریعہ بھی ذات بابرکات حق سے قرب و مناسبت پیدا کرے گی۔ وہ اسی حد تک بقدر استعداد شئون ربانی اور صفات کمالیہ کا مرکز و محور بنتی چلی جائے گی اور ضرور ہے کہ اس میں استعلاء واستغناء کا ظہور ہو اور وہ قوی تر غالب تر اور رفیع المنزلت ہوتی جائے۔ فرق اگر ہے تو حسیات میں قرب بھی حسی ہوتا ہے اور آثار قرب بھی محسوس طریق پر نمایاں ہو آتے ہیں۔ مگر اس کی بارگاہ رفیع میں حس کی [illegible] نہیں اس لئے اس کا قرب بھی حسی نہ ہونے کی جائے وصفی ہوتا ہے یعنی جو چیز اخلاق واوصاف کے لحاظ سے قرب و مناسبت کا درجہ حاصل کرے گی وہی اس کے کمالات سے بقدر استعداد حصہ پانے لگے گی اور اسی حد تک غلبہ و تسلط اور استغناء واستیلاء اس کے حصہ میں آجائے گا۔

عنصر خاک

اس معیار کے ماتحت جب ہم عناصر اربعہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے زیادہ کثیف عنصر ''مٹی'' نظر آتا ہے، جس کا مخزن یہ زمین ہے، یہ خاک کا ڈھیر کثیف ہی نہیں بلکہ کثافت آور بھی ہے۔ ساری چیزوں میں اگر کثافت و غلاظت آتی ہے تو اس مٹی ہی کی بدولت آتی ہے، آگ نے آج تک کسی چیز کو گندہ اور غلیظ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگ پر پکانے کی وجہ سے کسی چیز میں غلظت آجائے۔ سو یہ غلظت آگ میں سے نہیں آتی بلکہ آگ اس شے کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے جس سے اس کا اصل مادہ غلیظہ باقی رہ کر نمایاں ہو جاتا ہے اور شے غلیظ معلوم ہونے لگتی ہے، سو آگ اس میں کوئی چیز ڈالتی نہیں بلکہ اس سے کچھ نکال لیتی ہے، پس یہ غلظت آگ میں سے نکل کر نہیں آتی بلکہ خود اس شے کی ذات سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے، جب کہ آگ اس کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے، اسی طرح پانی کسی چیز کو مکدر اور غلیظ نہیں بناتا بلکہ اس کی بدولت تو غلاظتیں اور کدورتیں صاف کی جاتی ہیں کہ اس کی اصلیت پاکی اور پاکبازی ہے۔

اسی طرح ہوا بھی کسی چیز کو مکدر اور گندہ نہیں کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہوا میں غیر محسوس طریقہ پر اجزاء ارضیہ ملے ہوئے چلے آئیں اور کسی شے کو مکدر بنادیں تو پھر یہ کدورت بھی زمین ہی کا فیض ہوگا نہ کہ ہوا کا۔ اس لئے انجام کار ساری کثافتوں کی جڑ یہ خاک دھول بنتی ہے۔ جس کو لطافت سے دور کی بھی کوئی مناسبت نہیں۔ اس لئے عام عناصر میں اسکی کوئی وقعت نہیں۔ آپ ساری ہی زمین کے اس طویل و عریض کرہ کو لے لیجئے اس میں بجز پامالی اور ذلت و مسکنت کے اور کوئی جوہر دکھائی نہیں دے گا۔ یہ زمین رات دن روندی جاتی ہے۔ مگر ذلت و پستی کا یہ عالم ہے کہ چوں تک نہیں کر سکتی نہ اس میں ادراک ہے نہ احساس نہ غلبہ ہے نہ اقتدار اگر غلبہ ہے تو دوسرے تمام عناصر کا خود اسی پر ہے۔ گویا سارے ہی عناصر کا قدم اس کے سر پر ہے اور ہر ایک عنصر کا یہ کھلونا ہے، ہوا اسے اڑائے پھرتی ہے، پانی اسے بہائے پھرتا ہے' آگ اسے جھلساتی رہتی ہے مگر یہ ذرا بھی زور نہیں دکھا سکتی کہ زور ہو تو دکھائے۔ طاقتیں تو اسکی کثافت مطلقہ نے سلب کر رکھی ہیں' زور آئے تو کہاں سے آئے؟ پھر فقدان لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس کا مادہ بھی کثیف اور صورت بھی کثیف' اسے کتنا ہی صیقل کرو مگر سطح پھر بھی کرکری ہی رہے گی۔ نہ چکناہٹ قبول کرے گی نہ چمکاہٹ۔ پھر نہ صرف کثیف المادہ اور کثیف الصورت ہی ہے، بلکہ کثیف الطبع بھی ہے، ایک ڈھیلے کو کتنا ہی زور سے اوپر پھینکو۔ جب تک پھینکنے والے کا عارضی زور اس کے ساتھ رہے گا وہ اونچا ہوتا جائے گا۔ لیکن جب اسکی اصلی حالت اور عرضی طبیعت عود کرے گی تو پھر نیچے ہی آپڑے گا۔ بہر حال جب کہ زمین کے مادہ صورت اور طبیعت میں کسی جہت سے بھی لطافت نہیں' گویا اسے ذات اقدس سے اس وصف میں بعد مطلق حاصل ہے تو ضعف مطلق اور ذلت مطلقہ بھی اسی عنصر کے حصہ میں آنی چاہئے تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے زمین کو ذلیل ہی نہیں، بلکہ ذلول فرمایا ہے جو ذلت کا مبالغہ ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا.

ہاں اس زمین کا ایک جزء پہاڑ بھی ہیں۔ جن کی مٹی یعنی ریت نے بہ نسبت غبار کے کچھ لطافت و ستھرائی قبول کر کے کدورت و کثافت سے قدرے بعد پیدا کر لیا تو اس کی شان اسی حد تک مٹی سے فائق ہو گئی۔ چنانچہ خشک ریت کو اگر جھاڑ دو تو بکھر جاتی ہے۔ پانی ڈالو تو کیچڑ نہیں بنتا۔ اس کے ذرات کو دیکھو تو چم بھی اٹھتے ہیں۔ اس پر نظر ڈالو خاک کی بہ نسبت نظر فریب بھی ہے۔

حتی کہ بعض اوقات اس کی صاف ستھری صورت اور اس کی آب و تاب دیکھ کر پانی اور دریا کا بھی شبہ ہو جاتا ہے غرض جس حد تک اس میں لطافت و ستھرائی آئی تھی۔ اسی حد تک وہ بہ نسبت غبار کے عزیز الوجود بھی ہو گیا۔ اس کی قدر و قیمت بھی بڑھ گئی اور پھر اس کی ترکیب سے اگر پتھر اور پتھروں کی ترکیب سے پہاڑ بنے تو ان کی عظمت و شان اور قدر و قیمت زمین کی سطح سے کہیں دو بالا ہو گی۔ چنانچہ مٹی کی نسبت سے پتھروں کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں بلکہ مٹی کی پختہ سے پختہ اینٹوں کو ایک پتھر سے چکنا چور کر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن مٹی کے تودے پتھروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر پہاڑ کی کوئی چٹان زمین پر آگرے تو زمین دہل جاتی ہے اور دب جاتی ہے اور اس میں گہرا غار قائم ہو جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف مٹی کا منوں ڈھیر بھی اگر کسی سنگین چٹان پر آپڑے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے شکستہ بنائے نہ وہ ہلتی ہے نہ اس میں غار پڑتا ہے پھر انہیں پتھروں میں بھی جوں جوں صفائی ستھرائی اور جلا بڑھتی جاتی ہے ان کی قیمت اور معنوی طاقت بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ سنگ خارا عام پتھروں سے قیمتی' سنگ مرمر اس سے زیادہ قیمتی' جوہرات اور لعل و یاقوت اس سے زیادہ قیمتی ہیرا اس سے قیمتی' فرق ہے تو وہی لطافت و کثافت اور غلاظت و صفائی کا ہے' زمین کی سطح تو اس حد تک کثیف تھی کہ اسے کتنا ہی صیقل کرو لیکن ہاتھ پھیرنے سے کامل چکناہٹ کبھی محسوس نہیں ہو سکتی۔ لیکن پتھروں میں بوجہ لطافت مادہ یہ قابلیت ضرور ہے کہ اگر انہیں صیقل کرو تو مسکہ کی طرح املس اور چکنے ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور بعض جھٹمٹا سا عکس بھی دکھلانے لگتے ہیں۔ پس پتھروں نے جس حد تک صفائی قبول کی اسی حد تک ان میں شدت و قوت پیدا ہو گئی بہر حال پہاڑ اور ان کا مادہ بہ نسبت زمین اور اس کے غبار کے لطیف ہے اس لئے طاقتور بھی ہے اور زمین سے کہیں زیادہ شدت و صلابت اور قوت کا مالک ہے پس وجہ شدت و قوت وہی لطافت و ستھرائی نکل آئی ہے۔

لیکن پہاڑ اور ان کے شدید القویٰ پتھر جن کی شدت کے سامنے زمین تھر تھرا بھی نہیں سکتی تھی اور پامال محض تھی' اسی وقت تک شدید ہیں جب کہ زمین کی خاک دھول سے ان کا مقابلہ ہوتا رہے' لیکن اگر کہیں پہاڑوں کی ان شدید و مدید چٹانوں کا سامنا لوہے سے ہو جائے تو پھر ان کی یہ ساری

سنگدلی ہوا ہو جاتی ہے۔ لوہے کی ایک بالشت بھر کدال بڑی بڑی چٹانوں کا منٹوں میں فیصلہ کر دیتی ہے۔ وزنی وزنی پتھروں کو چکنا چور ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ریل کی پٹریوں پر یہ دو طرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہوتے ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی کدالوں کو برکت سے مٹی اور لائن دبانے کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور اپنی بے انتہا رفعت سے گر کر اس سے بے انتہا پستی پر آئے تھے۔ ان پتھروں پر لوہے کی کھدالیں اس طرح پڑتی ہیں جیسے ایک بے دست وپا قیدی کے سر پر کوڑے اور بید پڑتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ لوہا پتھروں سے زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ کیوں؟ راز اس کا بھی وہی لطافت ہے لوہے کے اجزا خلقی طور پر پتھروں نے ریت سے زیادہ صفائی اور ستھرائی قبول کی ہے اور اس میں مٹی تو کیا ریت جیسی بھی کثافت نہیں ہے۔

لوہے کا برادہ اڑتا نہیں پھرتا کہ چیزوں کو آلودہ کر دے، ریت اگر پانی میں بھی پڑ جاتا ہے تو بہر حال اسے کسی نہ کسی حد تک مکدر کر دیتا ہے کہ آخر کار خاک ہی ہے۔ مگر لوہے کے اجزاء اگر برادہ کر کے بھی پانی میں ڈال دیئے جائیں تب بھی اس کی جلا اور رقت وسیلان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر لوہے پر پالش کر دی جائی تو چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے بلکہ اسے صیقل کر دو تو آئینہ بن جاتا ہے جو باریک سے باریک خدوخال تک کا عکس دکھلانے لگتا ہے لیکن پتھر میں نہ ایسی پالش قبول کرنے کی استعداد ہے اور نہ وہ اس طرح کے صیقل ہونے کی صلاحیت ہی اپنے اندر رکھتا ہے۔ بس اگر پتھر منجمد ہو کر اشیاء کی ذات کا سراپا کسی حد تک نمایاں کر سکتا تھا تو لوہا اس سراپا کی تمام باریک سے باریک خوبیاں بھی عیاں کر سکتا ہے۔ اس لئے لوہے کی لطافت پتھروں سے کہیں زیادہ نکلی۔ بس اسی لطافت کی بنا پر لوہا تو پتھروں پر گراں اور طاقتور ہے اور پتھر اپنی کثافت کی بنا پر اس کے سامنے ذلیل وخوار ہے۔ بس بڑے بڑا پہاڑ بھی اپنے اس نمایاں عظمت وہیبت کے باوجود ذرا سے لوہے کے سامنے ذلیل وخوار ہے اور ذرا سے لوہے کے سامنے اپنے عجز کو نہیں چھپا سکتا۔

عنصر آتش

لیکن یہی طاقتور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے۔ جب ہی تک طاقتور ہے جب تک پتھروں کے سر پر ہے لیکن اگر اسی لوہے کو کہیں آگ چھو جائے یا لوہے کا بڑے سے بڑا ٹکڑا کسی لوہار کی بھٹی میں پہنچ جائے تو اس کا رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی صورت نوعیہ اور ذاتی خاصیت تک کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ آگ اس کے جگر تک گھس کر اسے ہم رنگ آتش بنا کر ڈالتی ہے پھر اس غریب لوہے کو آگ کی بھٹی سے تھوڑی دیر اور نہ چھڑایا جائے تو آگ اسے گلا کر پانی کی طرح بہا دیتی ہے اور اس کی شدت وصلابت کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی۔ کوئی اب اس لوہے سے کہے کہ پہاڑ کی ایک چھوٹی سے چھوٹی ٹکڑی کا ہی سر کچل دے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ غور کرو تو اس کا راز بھی وہی عقلی اور طبعی اصول ہے کہ آگ میں لوہے سے بھی زیادہ لطافت موجود ہے اور لوہا اس کے مقابلے میں کثیف ہے، لوہے میں اگر اتنی لطافت تھی کہ وہ باوجود پتھروں کی طرح کثیف المادہ ہونے کے عوارض کے سبب رقت وسیلان قبول کر لیتا تھا تو آگ اپنی ذات سے کوئی ٹھوس جسم نہیں رکھتی، جس میں کوئی چیز گھس نہ سکے۔ ادھر تو ہر چیز آگ کے جگر میں گھس سکتی ہے اور ادھر آگ بھی ہر چیز کے جگر تک میں سرایت کر جاتی ہے جس کی صلاحیت لوہے میں نہیں پھر لوہا اگر کسی وقت چمک کر باہر سے نورانی شعاعیں قبول کر لیتا تھا تو آگ کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس میں خود بخود شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ یعنی لوہا دوسروں کی روشنی قبول کرتا ہے اور آگ اپنی روشنی خود دوسروں پر ڈالتی ہے۔ خود بھی روشن ہے اور دوسری تاریک چیزوں کو بھی روشن کر سکتی ہے، پھر صیقل شدہ لطیف لوہا جسے آئینہ کہتے ہیں اس لطافت صورت کے باوجود پھر بھی اتنا ثقیل الجسم اور کثیف المادہ ہے کہ اگر اس پر ہاتھ مارو تو اس کے متکاثف جسم سے ہاتھ ٹکرا کر واپس آجاتا ہے لیکن آگ کی جسمانی لطافت کا عالم یہ ہے کہ اس کے جسم میں سے ہاتھ آرپار نکل جاتا ہے اور پھر اس کا جسم بھی نہیں ٹوٹتا صیقل شدہ لوہا تو صرف عکس ہی قبول کرتا ہے لیکن آگ اصلی جسم ہی کو قبول کر لیتی ہے اور پھر بھی اس کے جسم پھٹن میں نہیں پائی جاتی اور وہ کسی دوسرے جسم کے تداخل سے مانع نہیں ہوتی اس لئے وہ لوہے سے زیادہ شدید اور زیادہ طاقتور ہے بلکہ اسی لطافت کی حد تک اسکا حلقہ اثر بھی کثیف اشیاء کی نسبت وسیع ہوتا گیا ہے۔ پتھر اور لوہا جہاں رکھا ہوا ہے اتنی ہی جگہ اس سے پر ہو جاتی ہے اور اس حد سے باہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آگ جس مکان میں ہے اس سے باہر تک اس کے اثرات نورانیت وحرارت پہنچتے ہیں اور اگر آگ اور اس کا مکان نگاہوں سے اوجھل بھی ہو تب بھی اس کے پھیلنے والے آثار اس کے وجود کی خبریں دور دور تک پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے آگ لوہے پر غالب ہے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار ڈالتی ہے۔

عنصر آب

لیکن یہی دہکتی ہوئی آگ اور اس کا یہ کروفر جب ہی قائم ہے جب تک اس کے آس پاس کہیں پانی کا نشان نہ ہو۔ اگر پانی کے چند قطرات بھی اس پر آگریں تو آگ کی چمک دمک اور یہ تعلّی وترفع سرنیچا ہی نہیں کرتی بلکہ سب ختم ہو جاتی ہے۔ پانی اس کے وجود ہی کو باقی نہیں چھوڑتا کہ وہ کچھ ابھر سکے۔ بلکہ جس لکڑی کو کچھ دے کر آگ سے اپنی جان بچانا ہے وہ پانی کی چادر اوڑھ لے کر یا نمناک ہی ہو جائے۔ آگ چمک مار کر رہ جائے گی لیکن اس کا گیلی لکڑی پر کوئی بس نہ چلے گا۔

بہر حال جہاں پانی موجود ہو آگ کے پر نہیں جم سکتے۔ خواہ پانی آگ پر چھڑک دو یا آگ

پانی میں گرا دو آگ کی خیر نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑا انگارہ پانی پر گرا دو تو اس کے گرتے ہی پانی ادھر ادھر ہٹ جائے گا اور پھر اچانک چاروں طرف سے سمٹ کر اس انگارے کو دبوچ لے گا تو وہ غریب روسیاہ ہو کر رہ جائے گا۔

غرض یہ اس کے سامنے آئے یا وہ اس کا سامنا کرے‘ ہر صورت میں پانی کی طاقت کے سامنے آگ کی شعلہ زنی کچھ کارگر نہیں ہوتی۔ جس سے پانی کی شدت و طاقت آگ پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس غلبہ و مغلوبیت کی روح یہاں بھی وہی اصول ہے جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں‘ آگ اپنی لطافت جسم کے سبب کسی شے کی ذات کو اپنے اندر کھپا لیتی تھی‘ لیکن اس کا چہرہ اتنا صاف نہ تھا کہ اشیاء کا عکس قبول کر سکے۔ مگر پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر کھپا لیتا ہے کہ وہ فقط لطیف المادہ ہی نہیں بلکہ لطیف الصورت بھی ہے۔

یعنی کچھ بھی اس میں ڈال دو ہر چیز اس کے قعر اور جگر میں سما جائے گی۔ پھر اس رقت و سیلان کے باوجود اس کا چہرہ یا سطح اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آئینہ کی صورت بھی دکھلا سکتا ہے۔ پانی کی یہ صفت کہ ہر چیز اس کے آر پار نکل جاتی ہے‘ گو آگ کو بھی میسر ہے۔ لیکن پانی کا کمال لطافت یہ ہے کہ نگاہ تک بھی اس سے پار ہو جاتی ہے۔ جو آگ میں ممکن نہیں۔ پس پانی لوہے کی تصور کشی اور آگ کے عدم تکاثف دونوں لطافتوں کا جامع ہے اس لئے اس کی قوت بھی آگ اور لوہے کی قوت سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تو آگ اور لوہے دونوں کو ختم کر سکتا ہے‘ لیکن یہ دونوں اس پر غالب نہیں آسکتے اور اسی لئے پانی کا حلقہ اثر بھی آگ سے زیادہ وسیع ہے۔ آگ کا اثر اگر اسے کسی بند اور محدود مکان میں روشن کیا جائے‘ اسی مکان کی چہار دیواری تک محدود ہو گا۔ لیکن پانی جس مکان میں مسدود ہے‘ اس سے باہر بھی دور دور تک نمی اور رطوبت کے آثار پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ شہر کے ارد گرد تالاب اور نہریں ہوتی ہیں‘ تو آب و ہوا ہی نہیں‘ لوگوں کے مزاج تک مرطوب ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب اس کی لطافت اور سرعت نفوذ کے کرشمے ہیں‘ لوہا اور آگ مسامات میں نہیں گھستے‘ لیکن پانی بوجہ لطافت خاص باریک سے باریک منفذ میں گھر کر لیتا ہے اور جب کہ غلبہ و طاقت بقدر لطافت ہے تو پانی کی طاقت بھی بلاشبہ آگ سے کہیں بڑھ کر رہی۔

عنصر ہوا

اب آگے چلو‘ یہی پانی جو آگ کو تہس نہس کر دیتا ہے‘ ہوا کے سامنے یہ مسکین بھی عاجز اور ناتواں ہے اور اس کی کچھ پیش بھی نہیں جاتی وہ چلتی ہوا میں اگر سکون سے رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا۔ ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ پانی کی موجیں بلکہ موجوں کی موجیں ایک دوسرے پر گرتی پڑتی ہیں۔ سمندر کے عظیم الشان کرہ کو باوجود عظمت و ہیبت قرار نہیں ہوتا۔ ٹھہرا ہوا پانی ہو تو ہوا اسے

خشک کر ڈالتی ہے اور اڑا دیتی ہے۔ اگر پانی کا کوئی مخزن و منبع نہ ہو جو اس کی مدد کرے تو پانی کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا پانی پر بھی غالب اور حکمران ہے وجہ وہی اصول ہے کہ ہوا سب عناصر سے بڑھ کر لطیف و شفاف ہے۔ چنانچہ اس کی جسمانی لطافت کا تو یہ عالم ہے کہ نگاہ جیسی لطیف چیز بھی اس کی لطافت کے سامنے لطیف ہے' جو اس پر جم نہیں سکتی اور ہوا کو دیکھ نہیں سکتی۔ بدن کو لگ کر گو ہوا محسوس ہو جائے جس سے اس کے جسم ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اور کوئی لطیف سے لطیف حاسہ حتی کہ تار نگاہ بھی جو الطف ترین اجسام ہے' نہ اس میں نفوذ کر سکتا ہے نہ اس کا ادراک ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہوا اپنی شدت لطافت کے سبب رنگ و روپ کو بھی قبول نہیں کرتی کہ یہ چیزیں بہر حال نگاہ و بصر ہی سے متعلق ہیں اور وہ بصر ہی کو قبول نہیں کرتی' تو محسوسات بصر تک کیا نوبت پہنچ سکتی ہے۔ ہاں آواز اور خوشبو جیسی لطیف اشیاء جن کی نہ کوئی حسی شکل ہے نہ ہیئت ہوا سے ساز کر لیتی ہے اور اپنی لطافت کی بدولت ہوا میں سما جاتی ہے۔ جنہیں ہوا قبول کر کے ادھر سے ادھر منتقل کر دیتی ہے۔

پھر اثر کا یہ عالم ہے کہ فوق و تحت کے گوشہ گوشہ اور ایک ایک منفذ میں موجود جہاں آگ کی روشنی اور پانی کی نمی نہیں پہنچ سکتی' وہاں ہوا قائم اور دائم ہے ذرا بھی کہیں خلا پیدا ہو جائے تو ہوا کو آتے دیر نہیں لگتی' پانی کو بھی لاؤ تو نالی بناؤ' نشیب پیدا کرو اور پھر بھی اس کی نقل و حرکت میں تدریج۔ لیکن ہوا کو نہ نشیب کی ضرورت نہ فراز کی' جگہ ہوئی اور وہ دفعۃً آئی۔ گویا پہلے سے موجود تھی۔ غرض ہوا لطیف تر تھی تو قوی تر اور غالب بھی ہوئی جو تمام عناصر پر حکمران سب سے بالا و فوق اور پھر سب میں ساری و جاری ہے۔

جامع العناصر انسان اور اس کی طاقت

لیکن اگر ان سارے عناصر اور ان کے تینوں موالید' اور موالید کی بھی بے انتہا شاخوں کو ایک طرف رکھ کر تنہا انسان کو ایک طرف رکھو تو نظر آتا ہے کہ انسان ان سب ہی سے زیادہ واشد' اقویٰ اور ان پر غالب و متصرف ہے۔ یہ سب عناصر اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج اور اس سے مغلوب ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کے زیر تصرف اور کسی سے مغلوب نہیں کیونکہ اولاً تو عناصر کی باہمی اور سبقی طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل آنے سے کھلتی ہے' اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہے۔ وہ خود بخود پتھروں کو کچلتا نہیں پھرتا۔ آگ جگہ جگہ لوہے کو خود گرماتی اور پگھلاتی نہیں پھرتی۔ پانی خود بخود آگ بجھانے نہیں جاتا۔ ہوا کی یہ جزوی متصادم حرکات خود بخود نہیں ہو جاتیں بلکہ انسان کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہی کھدالیں بناتا ہے اور پتھر توڑتا ہے' وہی بھٹیاں بناتا ہے اور لوہے کو تپاتا ہے' وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے' وہی ہوا کو قید کرتا ہے اور سیارات کو

اڑاتا ہے۔ پس عناصر کی یہ متغلبانہ کار فرمائی بہت حد تک انسانی افعال کی دست نگر ہے۔ اگر انسان ان میں دخل نہ دے تو عناصر اربعہ اپنے اپنے خزانوں میں پڑے ہوئے جیسے چاہیں اینٹھتے رہیں لیکن میدان مقابلہ میں پہنچ کر ان جزوی افعال میں اپنا تغلب نہیں دکھلا سکتے۔ پس جس پر کسی غالب کا موقوف ہو اور جس پر کسی قوی کی فتح و نصرت معلق ہو' ظاہر ہے کہ وہ ان سب پر غالب ہوگا اور اس کی اشدیت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

عناصر میں انسانی تصرفات

پھر یہی نہیں کہ انسان ان کی باہمی نسبت کھول دینے ہی کا ایک ذریعہ ہے نہیں بلکہ ان کی یہ تمام طاقتیں بھی اس کے پنجہ تصرف و تسخیر میں قید ہیں' زمین کا قلب و جگر چاک کر دیا' کنوئیں بنائے' راستے بنائے' تہ خانے تیار کئے' ارضی معدنیات' سرمہ' ہڑتال' سونا چاندی اور پیتل وغیرہ کے خزانے اس سے چھین لئے' پہاڑوں کو تراش کر تہ بتہ مکانات بنائے' پہاڑوں اور برفانی چوٹیوں کو جہاں درندوں کو بھی پناہ نہ ملتی تھی' اپنی بستی بنا کر ان میں راستے نکالے انہیں برما کر ان میں سرنگیں بنائیں' ان میں سواریاں دوڑائیں وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا زمین کے خزائن و دفائن کا راز فاش کر کے اثقال زمین کو عالم میں آشکار آکر دیا اور زمین اور اس کے اجزاء سے برابر نوکروں چاکروں اور غلاموں کی سی خدمت لے رہا ہے۔

پانی کو لو تو زمین کی تہہ میں سے اسے کھوج نکال' کنوئیں کھود کر ڈول رسی کے جال سے اسے پکڑا' نل لگا کر سینکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا۔ دریاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ نہروں اور نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے۔ مکانات ٹھنڈے کئے پی کر کلیجے ٹھنڈے کئے۔ جمنا اور گنگا جگہ جگہ ماری پھرتی ہے اسے واٹر ورکس کے ذریعہ گھر گھر رسوا کیا وہ مائی تھی تو جگہ جگہ اس بچہ نے اس سے گومت دھلوا کر چھوڑا۔ پانی جیسا آزاد عنصر ٹنکیوں میں قید نلوں میں بند اور نکلنے میں براس کاک کی حرکت کا محتاج۔ یہ سب انسان کی تسخیر کا نتیجہ ہے' وہ غریب اپنے طبعی میلان سے نیچے کو جاتا ہے یہ اسے بیس بیس منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھا لے جاتا ہے اور پھر وہاں سے ٹخ دیتا ہے۔ کبھی برف بنا کے اسے جما دیا' کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیا' کبھی آگ دکھا کر گرما دیا غرض وہی پانی جس سے آگ جیسا قوی عنصر بھی پناہ مانگتا تھا' انسان کے سامنے ایسا بے بس اور بے یار و مددگار ہے کہ اسے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ پانیوں کا سب سے بڑا گھر اور ابو المیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہ میکر موجوں کا لگاتار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرہ زمین کو نگل جائیگا۔ بایں ہیبت و عظمت بھی انسانی دست برد سے نہ بچ سکا۔ انسان نے سمندروں کے جگر چیر ڈالے۔ اس میں جہاز چلائے' تار دوڑائے۔

آبدوز کشتیوں سے اس کی گہرائیوں پر قبضہ کیا۔ اس کے مدفون مورچوں کے خزانے اگلوائے۔ اس کی تہہ کی چھپی ہوئی چیزیں بازاروں میں رسوا ہو رہی ہیں۔ خود سمندر کے نمکین پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا۔ اس کا نمک الگ کر دیا رطوبت الگ۔ گویا پانی کا خون تک پی گیا اور پھر اس کے سب نئے الگ کر لئے۔ غرض یہ قوی تر پانی زمین کی تہہ میں جا کر چھپتا ہے تو اسے پناہ نہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو اس کو رستگاری نہیں۔ مجبور بھی ہے، قید بھی۔ پھر ذلیل سے ذلیل خدمتیں اس سے لی جا رہی ہیں۔ نجاستوں کا دھونا، ظروف صاف کرنا، میلے کپڑے پاک کرنا وغیرہ اس کے سر ہیں جس سے اندازہ کر لیا جائے کہ انسانی خلقت نے کس درجہ اس لطیف عنصر کو اپنا غلام اور پابند قیدی بنا دیا ہے۔ آگ جیسے خونخوار عنصر کو دیکھو تو وہ انسان کے سامنے ایک خاکسار غلام کی طرح مجبور ہے۔ وہ لوہے اور پتھروں میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو ٹکرا کر آگ کی مخفی چنگاریاں چن لیتا ہے۔ وہ آفتاب میں جا کر چھپتی ہے انسان نے آتشی شیشوں کے ذریعہ ان کو گرفتار کیا اور پھر جب خود اسے چھپانے اور قید کرنے پر آیا تو ایک ذرا دیا سلائی کے سرے پر رتی برابر مسالہ میں قید کر دیا۔ جب چاہا دیا سلائی کا سر ارگڑا اور اس قیدی کو نکال باہر کیا۔ گویا وہ آگ جو سر نیچا ہی نہ کرتی تھی انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی وہ رفعت و تعلی خاک میں مل گئی کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کر رہی ہے، کہیں انگیٹھیوں میں محبوس ہے۔ کہیں اس کا تزکیہ نفس کیا تو آگ کا گیس بنا دیا جس کا دھواں اور دخان سب رخصت ہو گیا۔ غرض آگ کا عنصر بھی انسان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے جب چاہا اور جس طرح چاہا الٹ پلٹ کر دیا۔ جسے کسی حالت میں بھی چین نہیں۔

ہوا بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی، جس پر انسان کی نگاہ تک بھی نہ پا سکی تھی، مگر اس کی یہ پردہ نشینی بھی انسان کی زد سے اسے نہ بچا سکی اور اس اڑتے ہوئے پرندوں کو بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا ہی بننا پڑا۔ ہوائی فضا میں انسانوں کے جہاز اڑ رہے ہیں اور اپنے کندھوں پر انہیں سوار کئے پھر رہی ہے ہوا کیا ہے انسان کا ایک ہوائی گھوڑا ہے جس پر سب کام اس نے سواری کس رکھی ہے۔

انسان کی خبر رسانی کی خدمت پر جدا مجبور ہے۔ مشرق سے مغرب تک انسان کے افسانے دور رہے ہیں اور ہوا اپنی مخفی طاقتوں سے انہیں لئے پھر رہی ہے۔ گویا انسان کی ایک چٹھی رساں ہے جو بلا اجرت غلامی کر رہی ہے۔

ادھر برقی پنکھوں کو حرکت میں لانے کے لئے جدا چل رہی ہے تاکہ انسان کا پسینہ خشک کرنے کی خدمت انجام دے۔ غرض خدمت گزاری کے فرائض میں چاکروں کی مانند مصروف ہے اور چوں و چرا نہیں کر سکتی پھر انسان اسے قید کرنے میں اترا تو موٹروں کے پہیوں میں وہ بند، سائیکلوں کے ٹائروں میں وہ قید، برتنوں میں وہ گرفتار اور ربڑ کی گیندوں میں وہ محبوس۔

غرض یہ تینوں طاقت جس نے سمندروں کو تہ و بالا کر رکھا تھا، پھنسی تو ایسی پھنسی کہ انسان

کے ہاتھ میں ایک قیدی محض بن کر رہ گئی جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

عناصر میں انسانی ایجادات

پھر اس ظالم انسان کو اسی پر قناعت نہیں کہ عناصر کو باقی رکھ کر ہی ان سے کام لیتا رہے، نہیں اپنی ایجاد پسندی کے جذبہ میں انہیں فنا کر کے اور انہیں باہم ٹرالڑا کر بھی ان سے نئی نئی چیزیں عالم آشکارا کرتا رہتا ہے تاکہ کائنات کے دوسرے مدفون خزانوں سے بھی اپنی غلامی کرائے۔ آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کر کے آگ کو دھونکا۔ آگ تو جوش میں پانی کو اڑا دینا چاہتی ہے اور پانی کھول کھول کر آگ کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہے۔ دونوں اپنی جگہ غیظ وغضب میں ہیں اور انسان ان کے جوش وخروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا کر کے انجن اور مشینیں چلا رہا ہے، لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کی مخفی طاقت پر ناچ کر رہا ہے۔ مل چل رہے ہیں، مشینیں گھوم رہی ہیں، انجنوں میں کوئلہ کی کانیں پھنک رہی ہیں، مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہے۔ گویا ساری کائنات پکی جارہی ہے۔ مٹ رہی ہے مگر اف نہیں کر سکتی کہ ایک انسان کا بچہ مشین کی کل دبائے کھڑا ہے جس کی انگلی کی ہر حرکت سے عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ پر یہ طوفان بپا ہو رہے ہیں۔

پھر پانی کو پانی سے ٹکرایا اور برق پیدا کر لی گویا پانی میں آگ لگا دی۔ پھر وہ بجلی جو سیکنڈوں میں اقلیموں کی خبر لیتی اور آسمان وزمین ایک کر ڈالتی ہے، اسے تانبے اور جست کے ایک پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ بایں زور وطاقت اس گرفت سے باہر نہیں جا سکتی۔ ایک ذرا سی پیتل کی گھنڈی جسے سوئچ کہتے ہیں اس کا قفل ہے۔ اسے نیچے کو ہٹا دو تو بجلی آموجود اور اوپر کو اٹھا دو تو غائب گویا برقی رو کی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی کی قید میں گرفتار ہے، اور وہ پوری فوج اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر یہ مصنوعی ہی بجلی نہیں، آسمانی بجلی کی گرفتاری کے لئے بھی انسان ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لئے تیار ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگوں پر پیتل کے تار چڑھائے ہوئے ہیں کہ اگر یہ جہاں سوز بجلی عمارت پر آپڑتی ہے تو یہی معمولی سا رتار اسے الجھا دیتا ہے۔ اور وہ عمارت کو ذرہ برابر آنکھ تک نہیں دکھا سکتی بلکہ اس تار میں غلطاں پیچاں ہو کر رہ جاتی ہے۔

پیٹرول جیسی سیال اور بہتی چیز میں آگ لگا دی۔ آگ اور تیل لڑ رہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہا ہے اور حضرت انسان کی موٹر چل رہی ہے، ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں۔

غرض ساری کائنات کے ناک میں دم ہے۔ ایک مشت استخواں سے کائنات کا ذرہ ذرہ عاجز ہے۔ عناصر نے باہم اپنی طاقتوں کے کیا جوہر کھائے تھے جو اس مجموعہ عناصر نے کر دکھایا۔ بحر وبر اور خشکی وتری کی ساری ہی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں اور انسان ہے کہ رات دن ان عناصر کے الٹ پھیر میں نت نئے طریق پر لگا ہوا ہے۔

جس سے ساری کائنات کا دم بند ہے اور سارے جماد وحیوان قید وغلامی میں مقید ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ ایک شیر نے اپنے خورد سالہ بچہ کو نصیحت کی تھی کہ انسان سے بچتے رہنا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ وہ انسان کے شوق دید میں تھا۔ کچھ شعور پا کر انسان کی تلاش میں نکلا کہ دیکھوں آخر یہ کیا بلا ہے جس سے سلاطین صحرا بھی اپنے دار السلطنت میں بیٹھ کر کپکپاتے ہیں' چلا تو پہلے اتفاق سے گھوڑے پر نظر پڑی۔ جس کی جسامت اور پھرتی وچالاکی کو دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ شاید یہ ہی انسان ہے' پوچھا تو گھوڑے نے کہا کہ مجھ بیچارے کی کیا مجال ہے کہ میں انسان کے سامنے ٹھہر سکوں چوبیس گھنٹے گلے میں رسی پیروں میں بیڑیاں اور اصطبل کا جیل ہے اور جب حضرت انسان کا جی چاہا تو میری پیٹھ پر سوار منہ میں لگام اور اوپر سے تڑاتڑ کوڑوں کی مار۔ جیسی مجھ پر گزرتی ہے میں ہی جانتا ہوں

شیر کا بچہ سہم گیا کہ یا اللہ کیا بلا ہے انسان کہ عناصر ہی نہیں۔ موالید بھی گرفتار بلا ہیں۔ آگے بڑھا تو اونٹ نظر پڑا جو گھوڑے سے دوگنا اور عجیب الخلقت تھا۔ اسے یقین آگیا کہ ہو نہ ہو یہی انسان ہے یہ گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے اس سے دریافت کیا تو اسے بھی انسان سے دوہائی دیتے ہوئے سنا' وہ بولا کہ میرے اس قد وقامت پر نہ جاؤ۔ انسان نے بایں جسامت وقامت میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ میں کیا سینکڑوں مجھ جیسے میرے بھائی بند' صرف ایک نکیل میں گرفتار اور ایک خورد سال بچہ ہمیں جنگل در جنگل لئے پھرتا ہے۔ منوں بوجھ کمر پر ہے۔ ہم بلبلاتے ہیں مگر شنوائی نہیں۔ انسانوں کے لئے ہماری گردنیں سیڑھیاں ہیں۔ جب چاہتا ہے کمر پر دھرا جاتا ہے۔ پھر ایک نہیں دو نہیں تین تین آدمی لد جاتے ہیں اور نہ صرف خود لدتے ہیں' بلکہ بڑے بڑے پلنگ ہماری کمروں پر کس کر براجمان ہوتے ہیں۔ ہم چپ چاپ کان دبائے منزلیں قطع کرتے رہتے ہیں' راتوں چلتے ہیں اور دنوں بلبلاتے ہیں۔ مگر کوئی مخلص نہیں نکلتا۔

غرض ہماری یہ ساری مصیبت وغلامی صرف اسی انسان کی بدولت ہے۔ بھلا ہم انسان تو کیا ہوتے' ہم تو اس کا نام بھی بے خوف ہو کر نہیں لے سکتے۔

شیر کا بچہ اور بھی زیادہ ہراساں ہوا کہ خدا جانے انسان کیسے ڈیل ڈویل کی چیز ہوگی جس سے ایسے عظیم الخلقت جانور پناہ مانگ رہے ہیں۔ آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی پر نظر پڑ گئی۔ جو ایک عظیم الشان بلڈنگ کی طرح سے سامنے سے آتا ہوا نظر پڑا۔ جس کی عمارت چار بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہوئی تھی' اسے یقین محکم ہوگیا کہ یہ بالضرور انسان ہے اور یہی ایسی ہستی ہے جو اونٹوں اور گھوڑوں پر غالب آسکتی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے کہا کہ غالباً جناب ہی کا نام نامی انسان ہے

ہاتھی نے نہایت حیرت سے بچہ شیر کو دیکھا اور کہا کہ بیٹا تم نا سمجھ ہو۔ کس بری بلا کا نام لے رہے ہو' مجھ ایسے لمبے ڈول کی جو گت اس ظالم انسان نے بنائی ہے' خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

گھوڑے کے منہ میں لگام تو دے دیتا ہے‘ اونٹ کی ناک میں نکیل تو پہنا دیتا ہے‘ لیکن مجھ پر تو بے ڈھانٹی سوار ہوتا ہے لگام میرے نہیں‘ نکیل میرے نہیں‘ مگر پھر بھی ایسا گرفتار اور مجبور محض ہوں کہ اس ظالم کے آگے چوں تک نہیں کر سکتا۔ ہر وقت میری گردن پر سوار لوہے کا آنکس ہاتھ میں ذرا چوں کروں تو سر پر اتنے پڑتے ہیں کہ کھایا پیا بھول جاتا ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ انسان کے سامنے اف بھی کر سکوں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل پیرا رہیں اور اپنی جنگل کی بادشاہت کی حرمت قائم رکھیں‘ اس انسان کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ ورنہ یہ شاہزادگی ساری کرکری ہو جائے گی اور کوئی پھر فریاد کو بھی نہ پہنچے گا۔

شیر کا بچہ حیران تھا کہ انسان آخر کس تن و توش کا ہوگا‘ جس کے غلبہ و تسلط کا چار دانگ عالم میں یہ شہرہ اور شور نشور برپا ہے۔ آخر کار اس نے بے نیل و مرام واپسی کا قصد کر لیا۔ لوٹ رہا تھا کہ ایک بن میں ایک بڑھئی کے بچہ کو دیکھا کہ وہ ایک بڑے شہتیر کو آرے سے چیر رہا ہے اور جتنا چیر چکا ہے اس میں ایک کھونٹی گاڑ رکھی ہے‘ بچہ شیر کا التفات بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہی انسان ہے لیکن پتہ لینے کے لئے اس سے سوال کیا کہ جناب انسان سے واقف ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے؟ کہا کہ میں اس کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا بندہ ہی انسان کہلاتا ہے۔ شیر نے حقارت و تعجب سے دیکھ کر کہا ارے کیا تو ہی وہ انسان ہے جس سے شیر‘ گھوڑا‘ اونٹ سب لرزتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں واقعہ تو یہی ہے‘ بچہ شیر نے کہا کہ اور دشمن تو ہے کیا؟ تیرا کام تو میں ابھی اپنے طمانچہ سے ختم کئے دیتا ہوں۔ بڑے ہی بیوقوف میرے آباؤ اجداد تھے جو تجھ سے کانپتے رہے اور بڑے احمق وہ تھے جنہوں نے راستے میں مجھے خوامخواہ سہما دیا۔ اس لاف زنی کے ساتھ بچہ شیر آگے بڑھا تاکہ قوت آزمائی کرے۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا کہ وقت آبرو ہوا۔ اب تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کہا کہ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں‘ میں بے چارہ کیا چیز ہوں‘ آپ جو چاہیں فرمائیں‘ اس وقت میرا ایک کام در پیش ہے جسے میں اپنے ضعف کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتا۔ خدا نے آپ قوی اور بہادر بھیج دیا۔ پہلے وہ کام کر دیجئے پھر میرے ساتھ جو چاہے سلوک فرمایئے اور وہ یہ ہے کہ اس شہتیر میں سے یہ کھونٹی سر کانا چاہتا ہوں۔ ذرا اپنا ہاتھ اس شہتیر کے شگاف میں ڈال کر اسے تھام لیجئے تاکہ میں کھونٹی سر کا دوں۔ شیر صاحب اس مدح و ثناء سے مسحور ہو کر بے تکلف آگے بڑھے اور ایک نہیں دونوں ہاتھ شگاف میں ڈال دیئے۔ بڑھئی کے بچہ نے کھونٹی نکال لی۔ کھونٹی کا نکلنا تھا کہ شہتیر کے دونوں پلٹ مل گئے اور شیر صاحب کے دونوں ہاتھ اس میں پھنس کر رہ گئے‘ اب شیر صاحب نے چیں چیں کرنا شروع کیا اور بڑھئی کے بچہ نے ہنسنا شروع کیا کہ فرمایئے انسان کو دیکھ لیا؟ اس وقت شیر نادم ہوا کہ واقعی تجربہ کاروں اور بڑوں کی نصیحت سے روگردانی کا انجام برا ہوتا ہے۔ مگر پھر سوچنے لگا کہ ظاہر میں تو یہ انسان بڑا ہی کمزور اور حقیر ہے۔ اس کا جثہ تو قطعاً طاقتور نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں کوئی اندرونی

طاقت ہے جس سے اس نے مجھے اس وقت بے بس کر دیا اور ساری کائنات کو پچھاڑے رکھا ہے۔ یہ حکایت عبرت اور انسانی طاقت سامنے لانے کے لئے بس کرتی ہے۔ ان مشاہدات کی رو سے ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ان عناصر سے کہیں زیادہ طاقت موجود ہے جب ہی وہ ایک چھوٹے سے جثہ میں کم سے کم ہونے کے باوجود بھی عناصر کے مخزنوں اور موالید کے جثوں پر بھاری ہو رہا ہے اور ان کے غلبہ کے ساتھ ہر قسم کے تصرفات اور حاکمانہ کارروائیاں کرنے میں کسی سے مغلوب نہیں' اور جب یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں لطافت بھی عناصر سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ کیونکہ پہلے یہ اصول ثابت ہو چکا ہے کہ طاقت در حقیقت لطافت ہی میں ہے کہ کثافت میں بجز ضعف و درماندگی کے اور کچھ نہیں۔

پس انسان میں جب ہوا سے بھی زیادہ طاقت ہے جو الطف العناصر تھا تو ناگزیر ہے کہ اس میں لطافت بھی ہوا سے کہیں زیادہ ہو تا کہ وہ اس پر اپنی یہ طاقتور حکمرانی برقرار رکھ سکے۔

انسانی طاقت و تسخیر کا راز اس کی روح میں مضمر ہے

مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان کے ظاہر میں تو کوئی لطیف چیز محسوس نہیں ہوتی نہ وہ صیقل شدہ آئینہ یا صاف پانی کی سی چمک رکھتا ہے کہ اس میں منہ نظر آنے لگے نہ وہ خود ہی ایسا روشن ہے کہ فضا میں اس سے شعاعیں پھوٹتی ہوں اور روشنی نکلتی ہو نہ وہ ہوا کی طرح غیر مرئی ہے۔ پھر اس میں یہ لطافتوں کو زیر کر دینے کی لطافت آخر کہاں مخفی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ طاقت اور لطافت اس کے بدن کی نہیں ہو سکتی کہ بدن تو وہی آگ' پانی' مٹی' ہوا کا مجموعہ ہے۔ اگر اس بدن میں کوئی طاقت بھی ہو تو پھر بھی وہ بے چارہ اس تھوڑے سے آگ پانی سے سارے جہان کے اس آگ پانی پر کیا غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔ یہ بدنی آگ پانی تو خود آفاقی آگ پانی سے لیا ہوا ایک قلیل سا جزء ہے اور جزء قلیل اپنے کل پر کیا غالب آسکتا ہے۔ ایک قطرہ دریا کو کیا مغلوب کر سکتا ہے؟ ایک چنگاری کرہ نار پر کیا تسلط جما سکتی ہے؟ ایک ذرہ کرۂ ارض پر کیا حکومت کر سکتا ہے؟ بلکہ اس صورت میں تو قصہ برعکس ہونا چاہئے تھا کہ یہ مادی جہان خود انسان پر ہر حیثیت سے غالب رہتا اور اسے دم بخود رکھتا' چہ جائیکہ اس مشت خاک سے ساری کائنات آب و گل مسخر ہو جائے اور خود اس کا دم اس ضعیف البنیان کے سامنے بند ہو؟ پس یہ تسخیر یقیناً اس کے بدن اور بدنی آب و آتش یا ہوائی لطافتوں کا کام نہیں ہو سکتی' بلکہ انسان کی یہ غلبہ پانیوالی قوت بلاشبہ ایسی ہونی چاہئے جو آگ پانی تو کیا ہوا سے بھی لطیف تر ہو کہ ہوا جیسی غیر مرئی چیز کی ٹکر تو انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے' اس کی لطافت وہ ہو کہ باوجود انسان کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہونے کے کبھی اس کا دھکا تک انسان کو نہ لگا ہو۔ بلکہ کبھی اس کی لمس و مس تک کا بھی اسے احساس نہ ہوا ہو۔ وہ متصل تو اتنی ہو کہ انسان اس سے

بغیر اپنی ہستی کو باقی نہ رکھ سے اور منفصل ایسی ہو کہ انسان کے کسی حاسہ کی رسائی اس تک نہ ہو۔ خود اس پر کوئی سرد وگرم نہ پہنچ سکے۔ اس لئے وہ فقط اپنے بدن پر ہی نہیں بلکہ جہان کے عناصر اربعہ پر غالب آجائے اور ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے سوا اور کون سی چیز ہو سکتی ہے، جس کی یہ صفات ہوں کہ ان دو ہی سے انسان مرکب ہے۔ یعنی انسان میں یہ طاقت نہیں۔

روح انسانی کی لطافت اور حسی نورانیت

یہ کرشمے ہیں تو دوسرے ہی جزو میں ہو سکتے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ روح عناصر اربعہ ہی نہیں۔ تمام مادی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے۔ پھر روح کی یہ لطافتیں نہ صرف معنوی اور غیر مرئی ہی ہیں بلکہ حسی طور پر بھی اس کی لطافتیں عالم آشکارا ہیں۔ خود عناصر میں جتنی اقسام کی لطافتیں تھیں، اگر غور کرو تو وہ بھی سب کی سب روح میں جمع ہیں۔

اگر صیقل شدہ آئینہ یا شفاف پانی صورتوں کا عکس اتار لیتا تھا تو انسان کی آنکھوں کو روح نے ایک ایسی چمک دے رکھی ہے کہ جدھر اٹھ جاتی ہے ادھر کے تمام نقشے، فوٹو اور سیزیاں اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ آئینہ کا فوٹو تو بے اصل محض ہے کہ پشت آئینہ خالی ہے، لیکن آنکھ کا فوٹو بے اصل نہیں کہ اس کے پیچھے حس مشترک میں اس کا پورا مصور علم قائم ہے۔

اگر آگ سے تار شعاع پھیلتے ہیں تو آنکھوں سے تار نگاہ منتشر ہوتے ہیں جو ان شعاعوں سے کسی طرح کم نہیں، کیونکہ تار شعاع سے تو چیز کی صورت محض آنکھ ہی کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں اور تار نگاہ سے یہ سب چیزیں دل کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں جو ان کی حقیقت پر بھی غور کر سکتا ہے۔

اگر پانی غایت لطافت سے اجسام میں نفوذ کر جاتا ہے اور سخت سے سخت جسم بھی اس کے سریان سے نہیں پہنچ سکتا، جب کہ اس سے اتصال قائم ہو جائے تو روح بھی جسم کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہوتی ہے حتی کہ سخت سے سخت ہڈیاں بھی اس سے تازگی لئے ہوئے ہوتی ہیں، پھر پانی تو اپنے سریان سے اپنے محل کو محض ٹھنڈا ہی کئے ہوئے رہتا ہے اور روح اپنے دوران سے اپنے محل کو زندہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

اگر ہوا غایت لطافت سے دکھلائی نہیں دے سکتی تو روح بھی اپنی لطافت بے غایت سے آج تک نادیدہ ہے، اور جیسے ہوا کا رنگ و بو غیر محسوس چیز ہے یا ہے ہی نہیں۔ ایسے ہی روح بھی ان خواص سے بری ہے۔

غرض عناصر میں لطافت کے جو جو کمالات اور لطافت کے جس قدر مراتب و درجات تھے، وہ سب روح میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر عناصر کو حق تعالیٰ سے جزوی مناسبتیں تھیں اور اس بناء پر وہ

قوی تھے تو روح کو بحیثیت مجموعی اس سے یہ ساری مناسبتیں قائم ہیں۔ اس سے وہ عناصر سے زیادہ قوی ہونی چاہئے اور جو کام عناصر کر سکتے ہیں وہ سب اس سے بے تکلف سرزد ہو جانے چاہئیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ عناصر کو تو۔۔۔ ان کی طاقتوں کی بناء پر درجہ بدرجہ اشد کہا جائے اور روح کو اشد ترین نہ کہا جائے۔ اس لئے عنصری اور مادی طاقتوں پر روحانی طاقتوں کے فوقیت لے جانے کی ایک یہی وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ عناصر جزوی لطافتیں رکھتے ہیں اور روح ان کی ساری لطافتوں کی جامع ہے اور انہیں ذات بابرکات سے جزوی مناسبتیں ہیں، تو روح کو کلی مناسبت ہے۔

روح انسانی کی معنوی لطافت وطاقت

لیکن اگر مزید غور کرو تو روح کو حق تعالیٰ سے محض عناصر کی سی مناسبت نہیں یا بالفاظ دیگر محض مناسبت ہی نہیں بلکہ ایک جہت سے ایسی مماثلت بھی حاصل ہے کہ وہ اس کے مخصوص اوصاف و کمالات کے لئے بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے اور عناصر اس کے لگ بھگ بھی نہیں رہ سکتے کہ وہ سرے ہی سے ان کمالات سے عاری اور کورے ہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ اگر غیر مرئی طریق پر تمام عالم کا قیوم اور مدبر ہے تو اسی طرز پر روح کائنات بدن کی قیوم اور مربی ہے۔ وہ ذرا اپنی توجہ ہٹالے تو کائنات بدن درہم برہم ہو جائے جیسا کہ موت کے وقت ہو جاتا ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کے انوار ساری کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ افروز ہیں اور ہر ہر خطہ اور اس کے ہر ہر جزو سے اس کے مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجود اس ظہور تام کے پھر بھی آج تک کسی آنکھ نے اسے نہیں دیکھا۔ اسی طرح روح کے انوار بدنی کائنات میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر ہر عضو سے اس کا مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجودیکہ بدن کی رگ رگ میں روح کا ظہور ہے، آنکھ کی چمک میں، رخسار کی سرخی میں، بالوں کی سیاہی، دانتوں کی سفیدی میں، بدن کی تازگی میں اسی کا جلوہ ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ سارے جلوے ایک آن میں ختم ہو جائیں۔ مگر باوجود اس ظہور تام کے پھر بھی آج تک ایسی نادیدہ ہے کہ خود اپنا نفس بھی اس کے دیدار سے محروم ہے ۔

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

پس جیسے وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ ایسے ہی روح ظاہر بھی ہے اور باطن بھی پھر جس طرح اس ساری کائنات کی زندگی اور زندگی کی ہر نقل و حرکت سے ذات حق اول اور اقدام ہے کہ وہی تو معطی وجود ہے اور وجود سے پہلے کوئی بھی اقدام ممکن نہیں۔ آپ عالم کا کوئی اقدام ایسا نہیں پیش کر سکتے کہ وہ ہو جائے اور ذات حق تعالیٰ اس کے بعد آئے۔ اس کے بغیر تو کائنات کی زندگی ہی نہیں اور بلا زندگی اس کی کوئی نقل و حرکت ہی ممکن نہیں، تو مخلوق خالق سے پہلے کیسے ہو سکتی ہے؟ ضرور

ہے کہ ہر مخلوق اور مخلوق کے ہر فعل سے خالق کی ذات مقدم ہو۔ پھر اسی طرح کائنات کی ہر نقل و حرکت کا منتہی بھی اس کی ذات ہے۔ آپ عالم کا کوئی اقدام بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ وہ ذات حق سے گزرتا ہوا آئے، پہنچ جائے اور ذات حق کو ادھر ہی چھوڑ آئے۔ کیونکہ جب ذات حق ہی سے اس کائنات کی زندگی قائم ہے۔ تو یہ دعویٰ ایسا ہوگا کہ کائنات اپنے افعال کرتی ہوئی زندگی کی حد سے گزر جائے اور پھر بھی اس کے افعال جاری رہیں جو عقلاً ناممکن ہے۔ پس عالم کے ہر حرکت و سکون کا منتہی بھی اس کی ذات نکلتی ہے۔ اس کے آگے اور بعد کچھ نہیں۔ وہی ہر چیز کا اول بھی ہے اور وہی آخر بھی۔ جیسے کہ وہی ظاہر تھا اور وہی باطن بھی۔ ٹھیک اسی طرح بدنی کائنات کی ہر نقل و حرکت بلکہ اس کی نفس ہستی ہی سے روح اول بھی ہے اور آخر بھی، کیوں کہ جب روح ہی بدن کے لئے باعث ہستی و حیات ہے تو کسی زندہ کا کوئی اقدام زندگی سے قبل کیسے ہو سکے گا۔ پس ہر کام بلکہ بدن کے ہر کام کے اول روح آتی ہے۔ اور اسی طرح جب کہ روح ہی بدن کے لئے باعث حیات ہے تو کائنات بدن کا کوئی اقدام بھی حیات سے مؤخر نہیں ہو سکتا بلکہ آخر اور منتہائے حیات بھی یہی رہے گی۔ پس روح ہی اس بدن عالم کے لئے اول بھی ہوئی اور آخر بھی۔ جیسے کہ وہی ظاہر تھی اور وہی باطن بھی۔ پھر جیسا کہ ذات حق عالم سے متصل تو اتنی ہی ہے کہ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ اور وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ اور پھر منفصل بھی اتنی کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء، مخلوق ظلمت محض اور وہ نور مطلق ۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان و وہم

ٹھیک اسی طرح روح بھی بدن سے متصل تو اتنی ہے کہ زندہ بدن کی کسی رگ کا کروڑواں حصہ بھی اس سے الگ نہیں ورنہ زندہ نہ رہے۔ لیکن دور بھی اتنی ہے کہ اس کی پاکیزگیاں بدن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتیں۔ لطیف و کثیف میں کیا تناسب اور کیا رشتہ؟ کجا یہ مشت خاک اور کجا دہ جوہر پاک، چراغ مردہ کجا نور آفتاب کجا؟

صفات روح سے الٰہیات پر استدلال

ان مماثلتوں کے سبب جس طرح ہم تشبیہ کے سلسلہ میں ادھر سے ادھر آئے ادھر سے ادھر بھی جا سکتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی روحانی کائنات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی یکتائی اور بے چونی پر استدلال بھی کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح یہ ہماری بدنی کائنات بلا اس غیر مرئی مدبر یعنی روح کے موجود اور باقی نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ ساری کائنات عالم بھی بلا کسی مدبر حکیم کے موجود اور بقاء پذیر نہیں ہو سکتی۔ پس روح کی بدولت وجود صانع پر ہمارے ہی اندر سے دلیل نکل آئی۔

پھر جس طرح بدن میں ایک ہی روح تدبیر بدن کر سکتی ہے۔ اگر دو ہوں تو کائنات بدن فاسد ہو جائے کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک اچکن میں دو انسان نہیں سما سکتے۔ اسی طرح

کائنات عالم میں ایک ہی واحد و قیوم اور حکیم و مدبر کی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے ورنہ لَوْ کَانَ فِیْهِمَا اٰلِهَةٌ" اِلاَّ اللّٰهُ لَفَسَدَتَا کا ظہور ہو جائے گا۔ پس روح کے طفیل ہمارے ہی نفوس میں سے توحید صانع کی دلیل بھی پیدا ہو گئی۔

پھر جس طرح بدن کے تعر تک میں گھس جانے سے روح کا کوئی کم و کیف کوئی لون و رنگ اور کوئی سمت و جہت نہیں دکھائی دے سکتی اسی طرح وہ ذات بابرکات بھی بے چون و بے چگون اور سمت و سمات سے مبرا اور رنگ و لون سے منزہ ہے کہ رنگ برنگ کے جلوے تو اس سے ہیں مگر وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے۔ پس روح کی بدولت اس کی شان تنزیہ تقدیس بھی ہمارے ہی اندر سے ہویدا ہو گئی۔

پھر جس طرح روح بدن کے ذرہ ذرہ میں موجود اور بدن کی رگ رگ سے اس کا تعلق وابستہ ہے۔ مگر تعلقات کی شدت و ضعف کا یہ تفاوت بھی نا قابل انکار ہے کہ جو تعلق قلب سے ہے وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے وہ کبد و معدہ سے نہیں اور جو ان سے ہے وہ عام جوارح بدن سے نہیں۔ اسی لئے قلب و دماغ کی ادنیٰ ایذاء یا توہین سے روح میں غصہ و جوش پیدا ہو جاتا ہے اور ان اعضاء رئیسہ پر ادنیٰ سی ضرب بھی پڑ جانے سے روح اپنی حیات کو سمیٹ لے جاتی ہے۔ بخلاف عام اعضاء کے کہ اگر ہاتھ پیر بھی کاٹ دیئے جائیں تو کمال زندگی خواہ چھن جائے مگر نفس زندگی مسلوب نہیں ہوتی۔

اس طرح ذات بابرکات کا جلوہ جہانوں کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر مواضع کے تفاوت سے تعلق کی شدت و ضعف میں بھی تفاوت ہے کہ جو تعلق اس کی ذات کو عرش عظیم سے ہے وہ اور مقامات سے نہیں کہ مرکز استواء ہے، پھر جو تعلق بیت المعمور سے ہے اور سماوی مواضع سے نہیں کہ وہ قبلہ ملائکہ ہے، پھر جو تعلق بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ یا حرم نبوی سے ہے وہ اور جگہوں سے نہیں ہے۔ اس لئے اگر ان کی کوئی توہین یا جارحانہ اقدام ہو تو روح اعظم کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ عالم میں ہیجان شروع ہو جاتا ہے اور دنیا کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کی اینٹیں اکھڑ جانے پر بھی اس عالم سے زندگی کھینچ لی جائے گی۔ پس روح کی بدولت ہم پر اللہ کے تعلقات کی نوعیت بھی منکشف ہو گئی۔

پھر جس طرح ہر شخص اپنی روح کی پکار اور حقانی دعوت کو دل کے کانوں سے بے تکلف سنتا ہے اور اس کی نصیحتوں کو قلب کے واسطہ سے ادراک کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے کلام میں نہ لفظ ہیں نہ آواز۔ یہی شان حق تعالیٰ کے کلام کی ہے کہ کلام بھی ہے، اس میں حقائق بھی ہیں، اس میں سماع بھی اور اسماع بھی ہے۔ اور مخصوص افراد بنی آدم (انبیاء علیہم السلام) جو بنی نوع انسانی میں مثل قلب کے ہیں، اسے سنتے بھی ہیں، پر نہ وہاں الفاظ کی حد بندیاں ہیں نہ اغاظ و تلفظ کی قیود گو ظہور کے حد

مخلوق میں پہنچتے پہنچتے یہ ساری تحدیدات نمایاں ہو جائیں۔ پس روح کی بدولت ہمیں ذات کے کلام نفسی اور کلام لفظی کا بھی فی الجملہ ادراک ہوا۔

پھر اگر تم آنکھ بند کر لو تو روح کا دیکھنا بند نہیں ہوتا اور کان بند کر لو تو اس کے سننے میں فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ آنکھ کان بند کر کے تصور کے لامحدود عالم میں یہی روح دیکھنے کی چیزوں کو اور زیادہ بے تکلفی کے ساتھ دیکھتی ہے اور سننے کی چیزوں کو اور زیادہ بے غائلہ سنتی ہے۔ حالانکہ نہ آواز روح سے ٹکراتی ہے اور نہ کسی صورت کا رنگ و روغن اور جسم اس کے آس پاس پھٹک سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ ذات بے چون و چگون ہر چیز کو سنتی اور دیکھتی ہے۔ مگر نہ وہاں رنگ و روپ اور مادیت کو قرب نصیب ہوتا ہے اور نہ آوازوں کے نغمے ہی اس کی سمع سے ٹکر کھاتے ہیں۔ پس اپنی ہی روح کی بدولت ہمیں اللہ کی سمع و بصر کے بے کیفی اور بیچونی کا بھی ایک گونہ اندازہ ہوا۔

اسی طرح جب ہم اس پر نظر کریں کہ بدن کی حیات تو روح کی زندگی سے قائم ہے۔ مگر روح کے لئے کسی اور روح کی حاجت نہیں۔ وہ خود اپنے ہی معدن حیات کی ایک موج ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عالموں کی زندگی تو ذات بابرکات کی حیات سے قائم ہے اور خود اس کی حیات کے لئے کسی اور ذات کی حاجت نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی حیات سے حی ہے جس میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور اس طرح ہم پر اللہ کی صفت حیات کے ذاتی اور خانہ زاد ہونے کا اندازہ بھی اپنے ہی اندر سے ہو گیا۔

بہر حال روح کو ذات بابرکات سے مناسبتیں ہی نہیں بلکہ فی الجملہ مماثلتیں حاصل ہیں جس سے حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات کی مثالیں ہمارے نفوس میں پہنچ گئی ہیں اور ہم اپنے اندر ہی سب کچھ عیاناً دیکھنے پر قادر ہو گئے اس لئے روح کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کچھ نہیں ہو سکتی، جو قرآن کریم نے فرمایا کہ:

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی وَمَا اُوتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلاَّ قَلِیْلاً۔

غرض روح اس ساری تفصیل سے ایک لطیفہ ربانی ثابت ہو جاتی ہے اور جسم محض ایک کثیفہ ظلماتی۔ لیکن جب یہ بدنی عناصر جو عالم خلق کی چیزیں ہیں اس روح سے تھوڑی سی مناسبت اور واجبی سا لگاؤ پیدا کر کے ایسے قوی ہو سکتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی طاقت پر ناچنے لگتی ہے تو خود روح جو عالم امر کی چیز ہے اور اس کی مناسبت مع اللہ بلکہ مماثلت کی گہرائیوں کی کوئی حد نہیں۔ اللہ جل ذکرہ سے اس قوی مناسبت و مماثلت کی بدولت کیا کچھ قوی اور غالب و متسلط نہ ہو گی۔ اگر ڈھنگ سے اس کی قوتوں کو استعمال کیا جائے تو کیا پھر کائنات اس کا تحمل کر سکے گی؟

پس بچۂ شیر کے قول کے مطابق انسان اگر پانی اور مٹی سے کہیں زیادہ قوی ہے تو وہ بدن کی بدولت نہیں کہ بدن تو وہی آگ پانی کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ یہ بے چارہ قلیل و حقیر بدن اپنے

عظیم و کثیر مخزن پر کیا غالب آسکتا ہے۔ بلکہ انسان کی یہ غیر معمولی قوت اور قوت کی یہ غیر معمولی کرشمہ آرائیاں درحقیقت اس کی روح کی بدولت نمایاں ہو رہی ہیں کہ روح کی طاقتوں کی کوئی حد نہیں اور وہ مجموعۂ لطافت لطافت سفلی وعلوی ہے، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ روح تمام مادیت اور تمام عناصر سے اقویٰ واشد ہے۔ پس جہاں ذات بابرکات حق نے عالم آفاق میں اپنی مثالیں رکھی تھیں تا کہ اس کے کمالات ظاہر در آیات بینہ کا کسی حد تک ادراک و احساس ہو سکے۔ اسی طرح بلکہ ان سے بدرجہا زائد، جو مخصوص مثالیں ہمارے انفس میں رکھ دیں تا کہ ان شئون باطنیہ اور کمال بطون در بطون تک ہم بقدر استعداد کچھ رسائی پا سکیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

”ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔ کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے“۔

غرض مادی سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں جن کی طرف تمہید میں میں اشارہ کر چکا ہوں دیکھنے میں بدن اور بدنی عناصر سے نمایاں ہو رہی ہیں۔ مگر بلحاظ حقیقت یہ سب کچھ روح کا طفیل ہے جس کی مخفی طاقتیں اس چورنگ مادہ کو نچاتی رہتی ہیں اور مزدور کی طرح چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔

روح کی طاقتوں کا غلط استعمال

لیکن سوال یہ ہے کہ روح نے اپنے یہ باطنی کمالات صرف کرنے میں جس قدر جدوجہد کی اور ترکیب و تحلیل کے ذریعہ آگ، پانی، ہوا مٹی کے جس قدر بھی عجائبات موالید ثلاثہ میں نمایاں کئے۔ اس سے خود روح کو کیا نفع پہنچا؟ اور روح کو بحیثیت روح اس جدوجہد سے کیا شرف حاصل ہوا۔

ظاہر ہے کہ اول تو ان تمام سائنسی ایجادات کا نفع روح کو کچھ نہیں، صرف بدن ہی کو پہنچا۔ بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا۔ سردی میں آگ کی حرارت، گرمی میں پانی کی تبرید، برسات میں ہوا تفریح بدن ہی کے لئے ہے، روح نہ سردی کی محتاج نہ گرمی کی حرارت و برودت روح کے اوصاف ہی نہیں، اسی طرح ہوائی جہاز نے اگر فضا میں اڑایا تو بدن کو، ورنہ روح جیسی لطیف چیز اڑانے کے لئے اس وزنی اور کثیف طیارہ کی حاجت ہی نہ تھی۔ مرنے کے بعد وہ تو معلوم کہاں کہاں اڑتی ہے تو کون سے ہوائی جہاز اس کے لئے جاتے ہیں، پھر سوچو کہ خود ہوا کو اڑانے کے لئے کسی ہوائی جہاز کی ضرورت ہے؟ ہوا تو خود ہی جہاز کو اڑاتی ہے۔ تو جو روح ہوا سے بھی لطیف تر ہے اور جس نے خود ہوا ہی کو مسخر اور قید کر رکھا ہے بلکہ ہوا کے خلاف طبع اسے جگہ جگہ اڑا رکھا ہے وہ اپنے اڑنے میں

اس کی کیا محتاج ہوتی ہے؟ اور جب اسکی محتاج نہیں تو اسکے بھی محتاجوں یعنی طیاروں کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے؟

اسی طرح ریلوں اور موٹروں سے روح کو کیا فائدہ؟ ریل اور موٹر اپنے وجود ظہور میں خود ہی روح کے محتاج ہیں تو روح کو ان کی احتیاج کیا ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان تمام مادی کرشمہ آرائیوں اور سائنسی ایجادات کا نفع اگر ہو سکتا ہے تو صرف بدن ہی کے لئے' نہ روح کے لئے۔ ریل اور موٹر میلوں کو منتقل کر سکتے ہیں تو بدن کو' برق اور گیس اگر ضیاپاشی کر سکتے ہیں تو اجسام پر' نہ کہ ارواح پر' جن کے نور سے خود ہی وہ ظہور میں آئے۔ گراموفون' ٹیلی فون' ٹیلی گراف اور لاسکی وغیرہ اگر منقطع کر سکتے ہیں تو اجسام کو' ورنہ روح اپنی حقیقی قوتوں کے لحاظ سے ان اپنے پروردوں کی کیا محتاج ہو سکتی ہے۔ پس ان تمام اسباب راحت کی راحت رسانی بدن تک محدود' نکلی اور بدن کیا ہے؟ وہی عناصر اربعہ کا مجموعہ اور آگ' پانی ہوا' مٹی کا گھروندہ' تو یوں کہو کہ آپ نے ان آگ پانی کی ایجادات کے ذریعہ آگ پانی ہی کو نفع پہنچادیا۔ بالفاظ دیگر آپ نے باہر کا آگ پانی لیا اور اندر کے آگ پانی تک پہنچادیا اور اب روح کا کام یہ رہ گیا کہ وہ اپنے علم و ادراک کا سرمایہ اس فانی آگ پانی پر خرچ کرتی رہے اور یہ بیرونی آگ پانی بدن کے آگ پانی کو دیتی رہے۔ یعنی جسم کی خدمت گزاری میں ہمہ وقت مصروف رہے' اس کے صاف معنی یہ نکلتے ہیں کہ آپ نے روح کو جوان عناصر سے لطیف تر اور بالاتر تھی اور جو ان پر حکمرانی کر رہی تھی' آپ نے دھوکہ دے کر اسے جسم جیسی کثیف چیز یا بعنوان دیگر عناصر کا غلام بنادیا۔ ایک لطیف چیز کو کثیف کے تابع کر دیا اور بہ تعبیر دیگر آپ نے لطیف روح کو خود اسکی لطافت مٹانے میں استعمال کیا جو قلب میں موضوع ہے' پس اب اس مسکین روح کی مثال ایسی ہو گئی' جیسے ایک عالم و فاضل بادشاہ جس سے ملک و قوم کو بڑے بڑے منافع کی توقع ہو اور جس کے حسن سیاست اور کمال تدبیر سے ملک کے دفاع و بہبود کی ہزار ہا امیدیں وابستہ ہوں' باوجود اس علم و فضل کے اس کے مزاج میں کوئی چالاک اور کمینہ غلام دخیل ہو کر رسوخ پالے اور اپنی ذاتی اغراض و منافع میں بادشاہ کو استعمال کرنے لگے اور ملک کا پیٹ کٹوا کر صرف اپنا تنور شکم بھرنے کی فکر میں لگ جائے ادھر بادشاہ غلام کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اسی کا کہا کرنے لگے' وزراء لاکھ سمجھائیں نصائح کریں اور منت و سماجت سے بادشاہ کو راہ راست لانے کی کوشش کریں لیکن یہ کمینہ غلام کسی کی نہ چلنے دے بلکہ اور الٹا وزراء سے بدظن کر دے اور بادشاہ کے وسیلے اور ذرائع معلومات کو چار طرف سے مسدود کر کے صرف اپنے ہی ڈھنگوں پر لگا لے یا گویا زمام سلطنت بظاہر تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن حقیقتاً بادشاہ کے پردہ میں یہ کمینہ غلام حکومت کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت کا قضیہ برعکس ہو جاتا ہے۔ جو حاکم تھا محکوم ہو گیا اور جو محکوم تھا وہ حاکم ہو گیا۔

اور سب جانتے ہیں کہ ایسی مملکت جس میں کمینے برسر اقتدار آجائیں اور اشراف دھکے

کھاتے پھریں دیرپا نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے ملک کی تباہی کے آثار جلد سامنے آنے لگیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بادشاہ معزول کر دیا جائے گا اس کی عمارت و سلطنت چھن جائے گی۔ ادھر آپ خود سمجھ لیں کہ انقلاب سلطنت کے بعد اس کمینہ ملازم کا کیا حشر ہوگا؟ وہی اس کے وسائل عمل اور اعضاء کارجوان خود غرضیوں میں اس کے ہمنوا اور مددگار تھے خود اسی کے خلاف گواہی دیں گے اور اپنے کو تباہ ہوتے دیکھ کر پہلے خود اسی کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہر صورت میں سب سے زیادہ یہی کمینہ قابل گردن زدنی قرار پائے گا اور اس کیلئے ملک کے کسی گوشہ میں پناہ نہ ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ روح ایک عالم فاضل ہے، جس میں محسوسات، معقولات اور وجدانیات کے پاکیزہ ملکات ودیعت ہیں جو کائنات بدن ہی میں نہیں، بلکہ اس کے واسطہ سے کائنات عالم پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل اس کا وزیر اعظم ہے اور نقل اس کا قانون ہے مگر ساتھ ہی اس کا ایک کمینہ اور بدذات خادم بھی ہے، جس کے واسطے سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں تاکہ وزراء و عمائدان کا نفاذ کریں۔ وہ کمینہ خادم یہ بدن ہے جو عناصر اربعہ کا مجموعہ ہے۔ کمینہ اس لئے ہے کہ جس قدر بھی اس کے اجزاء ترکیبی ہیں سب بے شعور، لایعقل، جاہل اور بے تمیز ہیں۔ جن میں اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں۔ کمینگی کی یہ حالت کہ جو ان سے زیادہ محنت کر کے ان کا قرب حاصل کرے اسی کے سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بن جاتے ہیں۔

ایک انسان مٹی کی مورتوں اور پتھر کے وزنی بتوں کے سامنے کتنے ہی طویل زمانہ تک سجدے کرتا جائے لیکن اگر وزنی مورت اوپر سے آگرے تو پہلے اپنے اس مقرب پوجاری کا سر پھوڑنے گی اسے قطعاً خیال نہ ہوگا کہ یہ میرا محبّ اور عبادت گزار بندہ ہے مجھے اس کا سر نہ چپنا چاہئے بلکہ میرا یہ معاملہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے جو مجھ سے بعید تر ہیں اور معبودانہ عظمت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اسی طرح ایک شخص اگر سینکڑوں برس بھی کسی دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے، ناک رگڑے اور عابدانہ التجائیں کرے کیونکہ جب بھی سیلاب کی رو آئے گی تو پہلے اسی کو غرق کرے گی جو اس سے زیادہ قرب حاصل کئے ہوئے ہوگا۔ اسے قطعاً یگانے اور بیگانے کی تمیز نہ ہوگی۔ ایک مجوسی برسہابرس بھی آتش کدہ میں سربجود رہے۔ لیکن آگ اس کی اعانت نہیں کر سکتی بلکہ اس کی پہلی لپٹ اپنے اسی مقرب کو پہلے پھونکے گی۔ ہواپرست ہزار ہوائی باتوں میں رہیں لیکن ہوائے نفس کے جھکولے پہلے صاحب ہوا ہی کو غارت کریں گے دوسروں تک نوبت کہیں بعد میں آوے گی۔

آپ تمدن کے سلسلہ میں ہی دیکھ لیں کہ جو زیادہ سے زیادہ مادیات کے عاشق ہیں وہی مادیات کے ہاتھوں میں زیادہ تباہ و برباد بھی ہیں۔ مشینوں کی لپیٹ میں وہی زیادہ آتے ہیں۔ جو مشینری میں رات دن مبتلاء عمل ہیں ہوائی جہازوں سے زیادہ وہی تباہ ہوتے ہیں جو ان سے زیادہ

مزاولت اور مقاربت رکھتے ہیں۔

ڈریڈناٹ اور وزنی آلات جنگ سے وہی لوگ زیادہ ختم ہو رہے ہیں' جو ان آلات کے سامنے سر بسجود ہیں' گیس اور زہریلے ٹینک رائفلیں اور ریوالور کارتوس اور بارود سے انہیں کا خاتمہ زیادہ ہو رہا ہے جو ان کے عشق میں جان باختہ ہیں اور کبھی بھی مادیات کے ان روشن آثار کو ادھر التفات نہیں ہوتا کہ جو ہمارے موجد اور غلام بے درہم ہیں اور جنہوں نے اپنی جانوں ہی کو نہیں بلکہ ایمانوں کو بھی ہم پر نثار کر دیا ہے' کم از کم انہیں تو اپنا نشانہ نہ بنائیں۔ انہی کو جا کر تباہ کریں جو بے لگاؤ رہ کر ہم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

پس اس سے زیادہ مادیات کی کمینگی اور سفلہ پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں نہ صرف دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہیں بلکہ جو ان کا زیادہ دوست ہے' اس کے زیادہ دشمن ہیں' سفلہ پن کی اسی پر حد نہیں بلکہ مزید برآں یہ بھی ہے کہ جو ان کا دشمن بنے الٹے اس کے قدموں میں پڑ کر دعوی دوستی کرتے ہیں پس ان کی اطاعت شعوری علم و شعور سے نہیں' فاضلانہ اخلاق سے نہیں' بلکہ جوتے کے زور سے ہی ادر یہ واضح رہے کہ اخلاق کے جہاں میں دباؤ کو اطاعت نہیں کہا جاتا پس جن عناصر کے سفلہ پن کی یہ حالت ہو ان سے مرکب شدہ بدن سے کب کسی خیر کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور ایسے بدن کے لئے اگر کمینہ کا لقب اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

قوائے روح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان و خسران ہے

بہر حال اس نالائق اور کمینہ غلام (بدن) نے اپنے ذاتی تعیش کی خاطر روح کو اپنے ڈھب پر لگا لیا عقل دور اندیش سے برسرِ پیکار کر دیا قانون نقل کو طاق نسیان پر پھینکوا دیا حظوظ نفس کی تحصیل اور عاجل منافع سے لاپرواہ بنا دیا اور اس غفلت زدہ روح نے اپنے تمام کمالاتی قوتوں سے وہ حظوظ حاصل کرنے شروع کر دیئے' جن کا نفع فقط اس چورنگ مادہ یا کمینہ غلام ہی کو پہنچ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدن کو تو کچھ مل گیا مگر روح خالی ہاتھ رہ گئی بلکہ جو کچھ بھی اس نے حاصل کرنے کا عزم باندھا تھا' اس میں بھی خود اس غلام ہی کی محتاج ہو گئی۔ وہ روح جو کہ کمالات ربانی کا نمونہ ہونے کے سبب استغناء کی اعلیٰ شان رکھتی تھی اور کسی کی محتاج نہ تھی وہ اپنے اس لایعقل بدن کی محتاج ہو گئی۔ جو ہر جہت سے خود اس کا محتاج تھا۔ وہ غنی روح جس سے ان تمام وسائل کار کا وجود تھا' وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی اور وہ روح جو کبھی مسجود ملائک بنی تھی آج عبد الاسباب بن کر اپنے ہی بندی غلاموں کو سجدے کرنے لگی اور اس درجہ عناصر کی غلام بن گئی کہ اگر مادی وسائل اس کے ہاتھ میں نہ ہوں تو وہ بیکار اور اپاہج ہے۔ اندریں حالات اس روح نے اپنی علمی طاقتوں سے مادی منافع کا ایک تمدن تو قائم کیا مگر اپنے ان جوہری کمالات کو کھو کر جو

اس کے جزو نفس ہوتے ہیں اور ہر موقع پر اس کے ساتھ رہتے ' وہ شہر میں ہوتی یا جنگل میں اسباب کے ہجوم میں ہوتی یا بے وسیلہ ہر جگہ اپنا جوہر نمایاں کر سکتی۔ لیکن یہ غلام اور غلام پسند روح محتاجگی کے اس درجہ پر آ گئی کہ اگر شہر میں ہے اور شہر بھی وہ جہاں بجلی سسٹم اور اسٹیم کی طاقت مہیا ہو تو باکمال ہے۔

ریڈیو سے خبر بھی دے سکتی ہے' ٹیلیفون کر سکتی ہے' ٹیلیگراف سے آواز بھی پہنچا سکی ہے' کیمرہ ہو تو فوٹو بھی اتار سکتی ہے' لیکن اگر وہ دیہات میں ہو' جہاں ان مادی وسائل کا وجود نہ ہو یا شہر ہی میں ہو مگر بجلی فیل ہو جائے یا دشمن بڑھ کر برقی تاروں کو کاٹ دے تو یہ پھر روح لاپاج اور نکمی ہے۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا نکلتا ہے کہ یہ روح اپنے اصلی اور جوہری کمالات لوہے پیتل کے حوالہ کر کے خود کوری ہو بیٹھی جو محتاجگی اور غلامی کی بدترین مثال ہے۔

حالانکہ روح تو وہ تھی جو شئون ربانیہ کی جامع تھی' وہ علم اور معرفت کا ایک حظ وافر لے کر آئی تھی' وہ لطافتوں اور طاقتوں کا خزانہ تھی' اس کا استغناء اور کمال غیرت تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے کسی فعل میں بھی اپنے باندی غلاموں اور ان بے شعور اور لاپاج مادوں کی محتاج نہ ہوتی۔ وہ اگر دیہات میں بیٹھ کر جہاں نہ بجلی نہ فون ہوتا نہ گیس کا خزانہ اگر وہ آواز نکالتی تو وہ آواز مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتی' وہ اگر ایسی جگہ نقل و حرکت پر آتی جہاں نہ ریل ہوتی نہ موٹر اور طیارہ تو سیکنڈوں میں ہزارہا میل کا سفر طے کر لیتی۔ وہ اگر دیکھنے پر آتی تو ایک تنگ و تاریک کونہ میں بیٹھ کر ساری دنیا ہی کی نہیں عرش عظیم تک کی کائنات کا معائنہ کر لیتی۔ زمین اس کے لئے سمٹ جاتی' ہوائیں اس کے لئے مسخر ہوتیں' زمانہ اس کے لئے سمٹ جاتا وہ سیرابی و تری میں دریاؤں کے رحم و کرم کی محتاج نہ ہوتی بلکہ دریا خود ہی اپنی روانی اور طغیانی میں اس کے اشاروں کو دیکھتے۔ وہ جنگ و قتال میں لوہے اور ہتھیاروں کی محتاج نہ ہوتی بلکہ جس پر ہاتھ ڈالتی وہیں اس کے لئے ہتھیار ہو جاتا اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ یہ مادی آلات جب کہ اس عنصر کی لطافت پر ایسی طاقتوں کے کام کر سکتے تھے تو روح نہ صرف ان سب لطافتوں کی جامع ہی تھی بلکہ ان سے ہزارہا گنا بڑھ چڑھ کر لطافتوں کا ایک عمیق خزانہ تھی اور انہی لطافتوں کے سبب اس مالک الملک کی ذات پاک سے مناسبت تامہ رکھتی تھی۔ جو اپنے کسی کام میں وسائل کی محتاج نہیں بلکہ وسائل ہی اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں' تو ضرور تھا کہ روح ربانی کی شان بھی ایسی ہوتی کہ وہ اپنے کاروبار میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان مادی وسائل کی محتاج نہ ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بجلی تو پل بھر میں آسمانوں پر چڑھ جائے اور روح بجلی کو مسخر کرنے کی طاقت رکھے وہ زمین سے ایک انچ بھی بجلی کی مدد کے بغیر اوپر نہ اٹھ سکے۔

کیا وجہ ہے کہ ایک انجن تو اپنی آگ' پانی اندرونی طاقت سے مشرق و مغرب کو ایک کر ڈالے اور جو انسان خود انجنوں میں یہ طاقت مہیا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ ایسی سریعانہ حرکتوں

میں ایک قدم بھی نہ اٹھا سکے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تار اور ٹیلیفون کی برقی رو تو ہزار ہا میل کی خبریں منٹوں میں لے آئے اور وہ انسان جو مشینریوں میں خود بجلی کی روح پھونکتا ہے ایک میل بھی از خود اپنی آواز نہیں پہنچا سکے۔

بہر حال اگر مادیات سے ایسے عجائبات کا ظہور ہو سکتا ہے اور وہ بھی بہ طفیل روح تو خود روح اور روحانیت سے تو ایسے ہی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر عجائبات کا کارخانہ کھل جانا چاہئے تھا تاکہ اس غیر محتاج روح کے استغناء و غیرت کا پورا پورا ظہور ہو سکتا ورنہ یہ کیسی الٹی بات ہے کہ مستعیر تو طاقت ور اور مالک کلیتہ ضعیف و لاچار غلام تو حکمران اور بادشاہ مجبور و بے بس۔

روحانی طاقتوں کے محیر العقول کارنامے

آپ اسے کوئی خیالی بات یا محض کوئی علمی نظریہ نہ سمجھیں، بلکہ حقیقتاً روح جب بھی اپنی اصل فطرت پر چلی ہے تو اس سے بلا واسطہ اسباب ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور اس نے مادوں سے اپنی غلامی کرا کر انہیں اپنی روحانیت کے بل بوتہ پر خوب خوب نچایا۔

فاروق اعظمؓ نے منبر نبویؐ پر خطبہ پڑھتے ہوئے اچانک "یا ساریۃ الجبل" کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہنچا دی حالانکہ اس وقت تک لاسلکی کا خواب بھی کسی کو نہ آیا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر اعلان حج کی ندا دی تھی وہ عالم کے گوشہ گوشہ میں ہی نہیں بلکہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچوں کے بھی کانوں میں گونج گئی حالانکہ وہ کسی مکبر الصوت آلہ کے ذریعہ نہیں دی گئی تھی۔

نبی کریم علیہ ﷺ نے آسمان کے ایک نئے دروازہ کے کھلنے کا تڑاکہ زمین پر بیٹھے بیٹھے سن لیا جو کہ یقیناً کسی برقی آلہ کے ذریعہ نہیں سنایا گیا تھا۔

آپ نے جہنم کے قعر میں ایک پتھر کے گرنے کا دھماکہ دنیا ہی میں سن لیا جو ستر برس میں اس کی تہ تک پہنچا تھا حالانکہ یہاں بھی کوئی حسی اور مادی آلہ صوت استعمال میں نہیں لایا گیا۔

حضور علیہ ﷺ نے حارث ابن ابی خرار کے فدیہ کے اونٹ اور لونڈیاں مع تعداد اس کے بتلانے سے پیشتر ہی بتلا دیں حالانکہ وائرلیس کے ذریعہ بعید کی خبریں دینے کی کوئی بھی ایجاد اس وقت تک نہیں نہ ہوئی تھی۔

آپ نے وحی الٰہی سے پتہ دیا کہ کسی بشر کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا کہ وہ محفوظ نہ کر لیا جاتا ہو۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ.

حالانکہ اس وقت ریڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ جو کی آوازیں جذب کرنے والوں اور ان کے نظریوں کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔

حضور ﷺ نے غزوۂ موتہ کے پورے نقشۂ جنگ کو مسجد نبویؐ کے منبر ہی سے معائنہ فرما کر حاضرین کو پتہ دے دیا حالانکہ وہاں آج کے آلات خبر رسانی کی بود و نمود نہ تھی۔

حضور ﷺ نے مکہ کے حرم میں بیٹھے ہوئے مسجد اقصیٰ کی محرابیں طاق تک دیکھ کر گن دیئے حالانکہ اس وقت تک دور بین کی کوئی ایجاد کسی کے حاشیہ خیال میں نہ تھی۔

اس سے آگے بڑھ کر صلوٰۃ خوف میں انہی عرب کی وادیوں میں آپ نے جنت و نار کا مشاہدہ فرمالیا۔

عرفات کے میدان میں شیطان کو ویل و ثبور کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یوم بدر میں ملائکہ مسومین کی فوجوں کے پرے مشاہدہ فرمائے اور ایک شب تار میں غیبی حقائق یعنی فتن و آلام کے نزول تک کا معائنہ فرمالیا حالانکہ وہاں مادی شیشوں کی کوئی دور بین درمیان میں نہ تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت سلیمانی پر فضا میں پروازیں کیں اور ہوائیں ان کے اشاروں پر چلیں حالانکہ آج کے ہوائی جہازوں کی ساخت کی طرف اس وقت کوئی ادنیٰ التفات بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

نبی کریم ﷺ نے نہ صرف فضاء آسمانی بلکہ سارے ہی آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرمالیا۔ حالانکہ وہاں کسی پٹرولی طیارہ کا واسطہ اس سیر میں نہ تھا کہ طیاروں کا تخیل بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا اور طیارے ہوتے بھی تو انہیں آسمانی سیر سے کیا علاقہ ہوتا۔ اس طرح ہزارہا واقعات انبیون تاریخ میں منضبط ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی قوتوں کے مالک مادوں کے غلام بھی نہیں ہوتے۔ بلکہ مادیت ہی نے ان کے اشارۂ خم ابرو ہمیشہ کام کیا اور ان کی غلامی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصل شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذات حق سے وابستہ رہ کر اور اسی کے ساتھ اپنی مناسبوں اور مماثلتوں کو بحال رکھ کر اپنے کسی فعل میں ان مادیات کی جو اس سے بدر جہا متر ہیں محتاج نہ ہو جیسا کہ اس کی فطری لطافتوں کا تقاضا ہے اور جس کی متعدد مثالیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کے کرامات و خوارق سے پیش کی گئیں جن میں ایک لمحے کے لئے مادیات سے کوئی مدد نہیں لی گئی بلکہ وہ محض روحانی آثار کے مظاہرے ہیں جن میں مادیات کو روحانیت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

مادی تصرف کوئی حقیقی کمال نہیں

بہر حال روحانی اقتدار کی ان ثابت شدہ نمونوں اور خوارق کی ان کچی مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک باکمال روح کا اصل کمال در حقیقت مادیات سے مستغنی ہونے اور مادی وسائل کی گرفت سے آزاد ہو جانے میں پنہاں ہے ورنہ کسی روح کا مادیات میں مادی وسائل کے ذریعہ تصرفات کرلینا خود

روح کا کوئی مخصوص کمال اور ممتاز کارنامہ نہیں ہے۔ یوں تو ایک مادہ بلاواسطہ روح تصرف کر لیتا ہے۔
کہیں مٹی اور غبار اڑاز کر بھی چند صدیوں میں دریا کو خشکی بنا دیتا ہے۔ رواں پانی نشیب میں نئے نئے نکاس نکال کر بر کو بحر اور بحر کو بر کر دیتا ہے۔ آتش فشاں پھٹ کر خنک فضاء کر کرۂ نار بنا دیتا ہے۔ ہوائیں چل چل کر تالابوں اور جھیلوں کو خشک کر دیتی ہیں۔ پس مادہ میں تصرفات کر لینا اگر کوئی کمال ہے تو یہ کمال تو خود مادی قوتیں بھی کر دکھاتی ہیں جہاں روحانیت کا کوئی توسط نہیں ہوتا پس اگر انسان کی انسانیت ان عناصر سے بدرجہا افضل ہے اور ضرور ہے اور اگر وہ عناصر کے تینوں موالید میں اعلیٰ واشرف ترین نوع ہے، بلا شبہ ہے تو اس کا مابہ الامتیاز کمال وہ نہیں ہو سکتا جو اس سے ارذل ترین اشیاء سے بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ روح کے یہ تصرفات بھی ان مادیات ہی کے واسطہ سے ہوں گویا روح ان کی وساطت کے بغیر اس تصرف پر بھی قادر نہ ہو تو پھر روح کے لئے یہ بے کمال ہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا عیب ہو گا کہ اپنے سے ارذل ترین اشیاء کی محتاج بن جائے اور اپنا کمال ان سے ڈھونڈنے لگے۔ کیونکہ کسی کے کامل کے لئے عیب کی جڑ استکمال بالغیر ہے۔ جب کہ وہ غیر اپنے سے ارذل اور کمتر ہو، ہاں اپنے سے برتر سے استکمال کرنا عیب کی بجائے ایک بہترین ہنر ہے۔ کیونکہ بلا استکمال بالغیر اپنی ذاتی سے خود بخود با کمال ہونا صرف ایک ذات بابرکات حق ہی کی شان ہو سکتی ہے جو ہر عیب سے منزہ اور ہر کمال کا منبع و مخزن ہے۔ مخلوق کسی حال میں بھی بے عیب محض نہیں ہو سکتی اور کچھ بھی نہیں تو مخلوقیت کا عیب تو اس سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ جس کی حقیقت عدم اصلی نکلتا ہے اور جب کہ مخلوق ذات کے درجہ میں معدوم نکلی تو ناگزیر ہے کہ درجۂ ذات میں کمالات سے عاری بھی ہو کہ عدم ہی تمام نقائص و عیوب کا منبع ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اس عیب دار کے باکمال بننے کی اسکے سوا کوئی صورت نہیں وہ اس منبع وجود ذات (یعنی حق جل مجدہ) کی طرف رجوع کر کے استکمال کرے، جو کمالات کا مخزن اور عیوب سے مبرا ہے۔ نہ یہ کہ حصول کمال کے لئے اپنے سے ارذل ترین چیز (مادہ) کی طرف جھکنے لگے کہ مادیت انسان کے لئے نہ مابہ الشرف ہے نہ مابہ الفخر، کیونکہ مادیت تو اس کی بھی وہی ہے جو گدھے اور بیل کی ہے۔ اس لئے واضح ہے کہ اگر وہ حصول کمال کے لئے اپنے بدن یا مادیت کی طرف جو مجموعہ عناصر ہے، رجوع کرے۔ گویا آگ، پانی، ہوا، مٹی سے کمال کا جویا ہو تو وہ استکمال نہیں بلکہ ازالۂ کمال اور استحصال نقص ہے کہ اپنے ارذل کی احتیاج و غلامی ہے اور گویا سلاطین کا غلاموں کی بندگی کرنا ہے جو خود ایک بدترین شرمناک عیب ہے، پس اگر سائنس کی حقیقت یہی ہے کہ انسان مادہ کے ذریعہ مادوں میں تصرفات کرنے پر قادر ہو جائے تو اس صورت میں انسان آگ پانی کے گھروندہ سے باہر ہی نہیں نکلتا کہ اسے حقیقی انسانیت کا حامل بھی کہا جائے بلکہ ایک ناقص اور عیب دار انسان ثابت ہوتا ہے، جس کا عیب بھی حد سے گزر کر شرمناک ہو، ورنہ کم سے کم کوئی ایسا ہنر تو کسی سے بھی ثابت نہیں ہوتا جس سے انسانیت کی کوئی

امتیازی شان ہویدا ہوتی ہو۔

انسان میں محتاجگی کی اصل مادہ ہے

ہاں اگر مادہ میں کچھ بھی استغناء کی شان ہوتی تب بھی ممکن تھا کہ اس کی غلامی سے تھوڑا بہت استغناء ہی ہاتھ لگ جاتا۔ لیکن جب کہ خود اس کی اصل اور ذاتی صفت ہی محتاجگی اور پابستگی ہے اور گویا مجبوریت ہی اس کی شان امتیاز ہے تو اس کی غلامی سے استغناء تو کیا حاصل ہوتا حاصل شدہ استغناء بھی فنا ہو جائے گا اور مجبوری در مجبوری پیدا ہو جائے گی جو تمام ذلتوں کی جڑ ہے، پس روح جیسے مستغنی جوہر کا مادہ جیسے مجبور و محتاج عنصر کی دہلیز پر جھکنا حقیقتاً اپنی امتیازی شان کو فنا کر دینا ہے۔

عناصر اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں

ہاں اب یہ معمہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس چورنگ مادہ میں ذاتی محتاجگی کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ہر چیز کی خیر و شر اس کے طبعی اخلاق سے پھوٹتی ہے 'اس چورنگ مادہ کے جبلی اور طبعی اخلاق ہی سراپا احتیاج و غلامی ہیں اس لئے انسانی نفس جس حد تک بھی مادہ اور مادیات کا شغل قائم رکھے گا۔ اسی حد تک محتاجگی اور غلامی کا اکتساب کرتا رہے گا چونکہ انسان کے نفس امارہ کا نشوونما اور امتزاج انہی عناصر اربعہ سے ہے۔ اس لئے وہ انسان کو پستی و دونانیت اور محتاجگی کی طرف لے چلتا ہے، جو درحقیقت عناصر کی طبعی اور خاموش رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر اس انسانیت پر روحانیت کا نور فائز نہ کیا جائے یا وہ اپنی روحانیت کی پناہ میں نہ آئے تو یہ چورنگ مادہ اور اس کی جبلی اخلاق ایک لمحہ کے لئے بھی اسے محتاجگی اور بے بسی کی دلدل سے نہیں نکلنے دے سکتے کہ مادہ کی خلقت و جبلت ہی بے بسی اور محتاجی ہے۔

مٹی اور اس کے جبلی اخلاق

چنانچہ اولاً مٹی ہی کو لے لیجئے اور غور کیجئے کہ اس کی جبلی اور بنیادی خاصیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی حسی خاصیت تو پستی اور تسفل ہے اور معنوی یا اخلاقی خاصیت قبض اور بخل ہے، چنانچہ جو چیز بھی زمین میں رکھ دی جائے اسے دبا لے گی اور جب تک آپ اس کا جگر چاک کر کے خود ہی نہ نکالیں 'نہ دے گی آدم کی اولاد کے نام کس قدر خزانے اور کتنے دفینے اس نے اپنے بطن حرص و آز میں چھپا رکھے ہیں اور اس کا پیٹ چاک کر کے نکال لو تو فبہا ورنہ از خود اطلاع نہ دگی۔ نہ چیز دے گی۔ آپ زمینی کشت زار کو دیکھ کر خیال نہ کریں کہ زمین تو بڑی فیاض ہے، جو ایک کے سو کر دیتی ہے اور کھیتوں کے ذریعہ اس کے جود و سخا کی داستانیں سنانے لگیں، کیونکہ دانہ خود آپ کا ہے جس میں زمین کا دخل نہیں اور اگر وہ

زمین سے حاصل شدہ بھی ہے تو وہ بھی کسی ڈالے ہوئے دانے کا طفیل ہے نہ کہ خود زمین نے دانے اور بیج کی ایجاد کی ہے واضح ہے کہ سب سے پہلی اور ابتدائی کھیتی کا بیج یقیناً باہر سے زمین میں ڈالا گیا ہے نہ کہ زمین نے ابتداء کی ہے، پس دانہ یقیناً آپ کا ہے نہ زمین کا اس لئے داد و دہش کی ابتداء زمین سے نہیں ہوئی بلکہ انسان سے ہوئی پھر دانہ ڈال کر اس کر محفوظ رکھنے، بڑھانے اور پھر نکالنے کے سامان بھی آپ ہی کی طرف سے ہیں اگر پانی نہ دیا جائے تو زمین اصل بیج کو بھی سوخت کر دیتی ہے، چہ جائیکہ اسے باقی رکھ کر بڑھائے پس پانی دینا در حقیقت بیج کو باقی رکھنا، بڑھنا نہ دیا بلکہ پانی کا لشکر بھیج کر آپ نے جبراً اس سے راس المال مع سود کے منگوالیا۔ اس لئے زمین کا ازلی خاصہ قبض و بخل بحالہ ثابت شدہ رہا۔

اب جب کہ یہی قابض اور بخیل مادہ انسان کا جزو اعظم ہے اور وہ مشت خاکی کہلایا۔ تو جبلی طور پر اس کے نفس میں پہلا خلق یہی قبض اور بخل کا سرایت کرتا ہے چنانچہ پیدا شدہ بچہ کو ذرا بھی ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی لینے اور ہضم کرنے کے لئے چیختا ہے نہ کہ دینے اور ترک کرنے کے لئے آپ جو چیز بھی بچہ کے سامنے ڈال دیں گے اسے اٹھائے گا اور طبعی تقاضا سے منہ کی طرف لے جائے گا تا کہ اسے قبض کر کے ہضم کر جائے، اسے دیتے رہو تو خوش رہے گا چھیننے لگو تو چلائے گا۔ پس جبلی طور پر اس کی طبعیت سخا اور ایثار کی طرف نہیں جاتی بلکہ قبض اور بخل کی طرف کہ اس میں عنصر خاکی کا غالب خلق یہی قبض و بخل ہے اور ظاہر ہے کہ قبض و بخل جس کا منشاء حرص و طمع ہے محتاجگی اور غلامی پیدا کرتے ہیں غنا و استغناء سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ بخیل اول تو خود اس شے کا محتاج ہوا جس میں بخل ظاہر ہوا پھر اس شخص کا محتاج ہوا جس کی شے ہے، پھر اس کی عطا کا محتاج جس کی بدولت یہ شے اس کے پاس آئے گی پھر اگر معطی اور عطا اور عطیہ نہ ہو تو بخیل اس درجہ محتاج ہے اور لینے کے بعد اس عطیہ کا محتاج ہو جاتا ہے کہ اپنے قلب و قالب کو اس سے جدا کر لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لئے بخیل کے لئے اول آخر محتاجی اور غلامی ہی نکلتی ہے اور زمین میں چونکہ یہی وصف ایک امتیازی وصف ہے۔ اس لئے اس کی محتاجگی و ذلت بھی سارے ہی عناصر سے زائد ہے، اس لئے یہ خاکی انسان خاکی رہتے ہیں جبلی طور پر بخل کے رذیلہ میں گرفتار رہتا ہے۔ جو سراپا احتیاج (نمایاں ہو) ذلت ہے اور قبض و بخل کے بجائے سخا و ایثار پیشہ بن جائے تو اس کا ثمرہ استغناء ہے جو سراپا عزت و محبوبیت ہے اور اس میں کسی غیر کی احتیاج و غلامی نہیں بلکہ غیر ہی سے اپنی غلامی کراتا ہے۔

آگ اور اس کے جبلی اخلاق

اسی طرح آگ کو لو تو اس کی طبعی خاصیت اور جبلیت ترفع ہے کہ سر نیچا ہی نہیں کرتی۔ کسی

واجبی مصلحت سے بھی دباؤ تو نہیں دیتی۔ گویا آگ خاک کی ضد ہے کہ وہ ہمہ تن پستی ہے اور یہ سر تاپا تعلّی، ناری شیطان نے یہی کہہ کر آدم کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا کہ خلقتنی من نار و خلقته من طین۔ ظاہر ہے کہ انسان میں آگ کا ایک کافی حصہ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کی بدنی حرارت اور بعض اوقات بخار کا ہیجان اس کی کافی دلیل ہے۔ اس لئے ہوش سنبھالتے ہی اس میں جبلی طور پر وہی ترفع و تعلّی شیخی اور انانیت کا جذبہ ابھرتا ہے جو حقیقت میں ناری اثر ہے، چنانچہ تعلّی اور شیخی سے مغلوب ہو کر جب انسان میں جوش و غضب اور غصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور چہرہ پر آگ کی سرخی آجاتی ہے، تو عرف میں یہی کہتا ہے کہ فلاں شخص آگ بگولا ہو گیا فلاں میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں میں غصہ کا پانی بہہ گیا یا غصہ کی مٹی بکھیرنے لگا بلکہ مٹی ہو جانا اس کے ٹھنڈے ہو جانے کی علامت شمار ہوتی ہے کہ مٹی در حقیقت آگ کی ضد ہے، بہر حال انسان کا یہ ترفع و تعلّی اور انانیت در حقیقت وہی ناری خلق ہے اب اس خلق پر غور کر تو یہ بھی سراپا احتیاج و ذلت نظر آئے گا کیونکہ تعلّی اور ترفع کا حاصل دوسرے پر بڑا بننے اور اپنے آپ کو ان کی نظروں میں بڑا دکھانے یا ان کے خیال پر نکلا جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر دوسرے ہی نہ ہوں یا ان کا خیال اس کی بڑائی کی طرف نہ آئے یا اگر ہٹ جائے تو اس کی بڑائی کی عمارت منہدم ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ محتاجگی اور کیا ہوگی کہ عزت ہماری ہو اور قابو میں دوسرے کے ہو رفعت ہماری ہو اور دوسرے کے خیالات کی بہنے والی رو میں بہتی جا رہی ہو کہ دوسرے کے پاس بھی اسے تمکن اور استقرار نصیب نہیں۔

اسی بنا پر تعلّی و تفاخر کے لئے مدارات ناس اور تملق بھی لازمی ہے تا کہ ان کا خیال بدلنے نہ پائے اور یہ ترفع کا بھوکا ان کی نظروں میں سبک نہ ہونے پائے۔

پس جو خلق ایک انسان کو ہزار ہا انسانوں کا محتاج بناتا ہو اس سے زیادہ ذلت آمیز اور احتیاج خیز خلق اور کونسا ہوگا؟ ہاں اس کے بالمقابل تواضع کا خلق ہے، جس کی حقیقت بلا مجبور و پابندی محض اپنے قصد و ارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ آپ جو کچھ بھی ہمیں سمجھیں وہ سمجھیں مگر ہم تو اپنی اصلیت پر ہیں جو آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کسی حال بھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ پس تواضع کا حاصل استغناء اور ترفع کا حاصل محتاجگی اور غلامی نکل آیا۔ نیز تواضع کے سلسلہ میں بلند اور رفیع ہوتے ہوئے قصد و ارادہ سے جھکنا اعتماد علی النفس کی دلیل ہے کہ اس پر خود کو قابو ہے اور وہ اپنی ناریت سے مرتفع ہونا چاہتا تھا اور ہم اسے حکمت سے جھکا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نفس پر قدرت اور قابو مالکیت کی دلیل ہے جو محتاجگی کے منافی ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ مملوکیت میں ہوتی ہے نہ کہ مالکیت میں ادھر شیخی میں انسانی کو اپنے اوپر قدرت نہیں رہتی جو مجبوری اور محتاجگی ہے، پس

تواضع سے استغناء اور ترفع ونخوت سے احتیاج وغلامی پیدا ہونا اس جہت سے بھی تواضع ہے۔

غرض جب تک انسان اس ناریت کے جال سے رہانہ ہو یہ ناری خلق اسے محتاج اور ذلیل ہی بنائے رکھتا ہے کہ احتیاج کی خاصیت ہی ذلت ومسکنت ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ آگ بھی اپنی جبلت سے محتاجگی کا ثمرہ پیدا کرتی ہے نہ کہ غناء کا۔

ہوا اور اس کے جبلی اخلاق

اس طرح ہوا کو لیجئے کہ اس میں انتشار اور پھیلاؤ کی خاصیت ہے کہ وہ ہر جگہ موجود رہے' ہر جگہ گھسی رہے' ہر جگہ بھری رہے' ذرہ ذرہ اس سے وابستہ رہے۔ گویا اسے پہچانتا رہے۔ انسان میں ہوائی جزو بھی ہے۔ جیسے ریاح اور سانس وغیرہ سے نمایاں ہے تو وہ بھی چاہتا ہے کہ میں ہر جگہ موجود رہوں ہر جگہ گھسا رہوں' ہر زمن اور ہر مکان میں میرا وجود رہوں۔ مگر چونکہ اس کا مادی نفس اتنا پھیلاؤ نہیں رکھتا کہ وہ خود ہر جگہ رہے۔ اس لئے وہ انتشاریت' شہرت اور ہوا بندی چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ میرا چرچا کریں۔ میرا ذکر پھیلائیں اور اپنے ذکر وتذکرہ کے ذریعہ میں ہر جگہ موجود رہے۔ پس ہوائے شہرت انسان میں اسی ہوائی جزو کا اثر ہے۔ غور کرو تو اس شہرت پسندی کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی ہے۔ کیونکہ انسان کی یہ خواہش بھی اس کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی کہ پہلے دوسرے ہوں پھر وہ اسے پہچانیں اور اس کے بعد اس کی ہوا بندی بھی کریں' اس کا پروپیگنڈہ بھی کریں اور چرچا بھی کریں اور اسے اڑاتے بھی رہیں۔ پس اس خلق کا حاصل بھی وہی غیروں کی احتیاج نکل آئی۔ اس لئے شہرت پسندی بھی کوئی عزت آفرین نہیں بلکہ ایک ذلت افزا ملکہ ہے جو اپنے مقاصد کو دوسروں پر معلق کر دیتا ہے' برخلاف شہرت پسندی کی ضد کے' جسے اخفاء وتستر کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت میں خود بخود مگن رہنا اور دوسروں سے ہمہ تن مستغنی اور بے پرواہ ہو جانا ہے حالانکہ اس غناء پر جو قدرتی شہرت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ اس مصنوعی اور جبلی شہرت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال ہوا کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی اور جگہ جگہ مارے مارے پھرنا آیا۔

پانی اور اس کے جبلی اخلاق

اس طرح پانی کو لو تو اس کا طبعی فعل ہے' عدم الکنف اور عدم الضبط' یعنی پانی میں اعتماد علی النفس کا نشان نہیں۔ وہ اپنے نفس کو خود نہیں روک سکتا۔ ہر طرف سے آپ روک لگائیں' رک جائے گا اور جہاں بند ٹوٹا برتن پھٹا' وہیں پانی بکھرا' سیدھا چل رہا ہے اور جہاں ذرا نشیب آیا وہیں بہ گیا ذرا کسی نے زمین کھود ڈالی' اور وہ اپنا مستقر چھوڑ کر وہیں آرہا۔ انسان میں بھی چونکہ پانی کا جزو موجود ہے' جیسا کہ تھوک سنک' بلغم' پیشاب وغیرہ سے واضح ہے۔ اس لئے اس میں بھی ضبط نفس کا پیدائشی طور پر نشان نہیں ہوتا ذرا کسی کی اچھی

چیز دیکھی بکھر پڑے، کسی کی عورت پر نظر پڑ گئی تو گھورنے لگے، کوئی قبول صورت چیز پڑ گئی اس کے پیچھے ہو لئے، کوئی عمارت اچھی دیکھ لی تو وہیں للچاتی نظروں سے اسے دیکھنے لگ گئے کہ کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی۔

غرض ذرا سا نشیب سامنے آنے سے بکھر پڑنے کا مادہ انسان میں آبی جزو سے آیا ہے۔ مگر اس کا حاصل بھی وہی احتیاج اور بے بسی ہے۔ کیونکہ غیر کو دیکھ کر قابو میں نہ رہنا اور اپنے نفس کو سنبھال نہ سکنا، عدم قدرت اور عجز کی دلیل ہے اور عجز جڑ ہے محتاجگی کی۔ ہاں ضبط نفس اور اچھی سے اچھی چیز دیکھ کر بھی اس سے بے نیاز رہنا خود کو قابو میں رکھنا اور گرنے سے بچالینا قدرت کی دلیل ہے جس کا حاصل بھی وہی استغناء نکلتا ہے۔ اس لئے پانی کی طبعی خاصیت بھی وہی احتیاج اور غلامی نکل آئی۔

رذائل نفس کے چار اصول

پس اس طرح ان مادی یا رذائل نفس کے چار اصول نکل آتے ہیں۔ قبض، بخل، تعلّی و ترفع، شہرت پسندی اور انتشاریت، عدم ضبط نفس یعنی حرص و ہوا جو آدمی کو سراپا احتیاج و غلام بنا دیتے ہیں۔

فضائل نفس کے چار اصول

ہاں پھر یہیں سے استغناء و خودداری کے اصول پر روشنی پڑ جاتی ہے کہ وہ ان اخلاق چارگانہ کی ضد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قبض و بخل کی ضد سخاوت ایثار ہے، کبر و نخوت کی ضد تواضع و فروتنی ہے۔ شہرت پسندی اور نام آوری کی ضد اخفاء و تستر ہے۔ حرص و ہوا اور بکھر پڑنے کی ضد ضبط نفس اور قناعت ہے اور جب یہ چارگانہ اضداد مادہ کے چارگانہ اخلاق کی ضدیں ہیں تو یقیناً انہیں مادی اخلاق بھی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اس روح کے روحانی اخلاق شمار کئے جائیں گے جو مادہ کی ضد ہیں اور اس طرح اگر مادہ کے جوہر میں سے رذائل نفس کے چار اصول نکلے تھے تو روح کے جوہر میں سے فضائل نفس کے بھی چار ہی اصول نکل آئے، ایثار، تواضع، اخفاء، قناعت۔

اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں

لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اخلاق کے جبلی آثار افعال ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اگر ان اخلاق کے مناسب افعال سرزد نہ ہوں تو اخلق کے طبعی آثار ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتے جیسے اخلاق شجاعت کی تاثیرات بغیر فعل مقاتلہ و مقابلہ کے کبھی نہیں کھل سکتیں۔ خلق تواضع کی کیفیات بغیر انکساری کے اور جھکاؤ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ یہی حال اور تمام اخلاق کا بھی ہے۔ اس لئے ناگزیز ہے کہ ان مادی اخلاق کے اثرات محتاجگی اور روحانی اخلاق کے آثار کو ظاہر کرنے

والے افعال کون سے ہیں؟

مادی اخلاق کا مظہر فعل امساک ہے

سو مادی اخلاق کے آثار پر جہاں تک غور کیا' ان کا حاصل بجز خود غرضی اور خود طلبی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ بخل ہو یا حرص' شہرت پسندی ہو یا تعلّی' سب کی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال و جاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامن ہوس میں سمٹ آئے۔ گویا ہر چیز کو اوروں سے روک کر اپنے لئے مختص کر لینا ان نفسانی اخلاق کا مقتضیٰ ہے۔ چنانچہ قبض اور بخل میں اپنی مقبوضہ چیز اوروں سے روکی جاتی ہے۔ حرص و ہوس میں دوسروں کی مقبوضہ چیز ان سے روک کر اپنے لئے پسند کی جاتی ہے۔ تعلّی و ترفع میں ہر درجہ کمال کو دوسروں سے منفی کر کے اپنے سے مختص ظاہر کیا جاتا ہے۔

شہرت پسندی اور نام آوری میں اوروں کی نمود روک کر صرف اپنا نام چاہا جاتا ہے پس ان سب اخلاق میں کسی نہ کسی جہت سے اوروں سے رکاوٹ اور اپنا اختصاص کارفرما رہتا ہے۔

اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کے طبعی آثار کو جو فعل بطور قدر مشترک کے کھولتا ہے' وہ امساک ہے' بخل و حرص میں یہ امساک مالی ہوتی ہے اور تعلّی و نام آوری میں امساک جاہی۔ مگر حب جاہ ہو یا حب مال' دونوں کا مظاہرہ اس فعل امساک ہی سے ہوتا ہے۔

گویا ان اخلاق کے طبعی آثار خود غرضی و محتاجگی' بغیر فعل امساک کے نمایاں نہیں ہو سکتے۔

روحانی اخلاق کا مظہر فعل انفاق ہے

ادھر روحانی اخلاق چونکہ ہر ہیئت سے مادی اخلاق کی ضد ہیں اس لئے ان کے طبعی اثرات اور ان اثرات کو ظاہر کرنے والے افعال بھی مذکورہ افعال کی ضد ہی ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جیسے مادی اخلاق کا اثر خود غرضی تھا۔ روحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چنانچہ ایثار و تواضع ہو یا اخفاء و قناعت' ان میں سے کسی ایک خلق کی بنیاد بھی نفس کی اس خود غرضانہ خواہش پر نہیں ہے کہ سب کچھ تنہا اسی کو مل جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے۔ قناعت میں دوسروں کی چیز انہی کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ تواضع میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے اور اخفاء میں دوسروں کی عزت کے لئے پورا میدان دے دیا جاتا ہے۔

غرض ان تمام اخلاق کی بنیاد دوسروں سے روکنے یا چھیننے پر نہیں' بلکہ دوسروں کو دینے اور

عطاء ونوال پر ہے' اس لئے واضح ہوتا ہے کہ جو فعل ان روحانی اخلاق کے طبعی آثار کو کھوتا ہے وہ فعل امساک نہیں بلکہ اس کی ضد انفاق ہو سکتا ہے سخاوت وقناعت میں یہ انفاق مالی ہوتا ہے اور تواضع واخفاء میں انفاق جاہی مگر استغناء مالی ہو یا استغناء جاہی' بغیر انفاق کے کھل نہیں سکتا اور یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جاہ ومال سے یہ بے نیازی ایک طرف تو غیروں سے غنی بنادیتی ہے اور دوسری طرف اپنے میں بے غرضی مستحکم کر دیتی ہے' جس سے وسعت صدر اور فراخ دلی کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے اس لئے ان روحانی اخلاق کا اثر وسعت حوصلہ' استغناء' وقار' خودداری وبے نیازی اور بے احتیاجی نکلتا ہے' جس کے ظہور کا ذریعہ انفاق ثابت ہوتا ہے' شریعت کی اصطلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان ومال' آبرو اور قول وعمل کو مالک الملک کے لئے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں۔ پھر صدقہ کرنے میں چونکہ محبوبات نفس اور لذائذ طبع کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر بے حد شاق ہے اس لئے اس کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے۔ اس لئے خلاصہ یہ نکلا کہ طبعی امساک کے ذریعہ انسان میں جو محتاجگی اور تنگی قائم ہوتی ہے اس کے مٹانے اور اس کی جگہ استغناء وخودداری کی دولت جاگزین کرنے کا ذریعہ صرف صدقہ ومجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

گویا انفاق کا جو درجہ بھی امساک کے مقابلہ پر آتا رہے گا' اسی درجہ نفس انسانی میں محتاجی وغلامی مٹ کر استغناء کے مراتب قائم ہوتے رہیں گے کیونکہ صدقہ سے وہ مادی اخلاق منہمک اور کمزور پڑتے جائیں گے' جن کی بدولت امساک کے افعال نمایاں ہوتے تھے۔

صدقہ سے غنا کس طرح حاصل ہو سکتا ہے

چنانچہ ایک صدقہ دینے والا جب اپنے محبوب مال متاع کو اپنے سے کھو دیتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس نے قبض وبخل کی تو جڑ کاٹ دی' جو ادنیٰ خلق تھا' ورنہ غلبہ بخل کے ہوتے ہوئے یہ متاع جدائی کب کی جاسکتی تھی اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی قبض وبخل کا رذیلہ ست پڑے گا جو محتاجگی کی جڑ تھا' اسی حد تک سخاوایثار کا غلبہ راسخ ہوگا' جو ذریعہ استغناء ہے اور اس طرح استغناء کے ایک بڑے درجہ پر فتح ہو جائے گا۔

پھر جب کہ ایک صدقہ دہندہ کو عطاء ونوال میں لطف محسوس ہونے لگے تو ظاہر ہے کہ اب وہ دوسروں کی چیز کو پرنہ نگاہ حرص ڈال سکے گا نہ کسی چیز دیکھ کر بکھر سکے گا بلکہ اس کے عطاء وتصدق کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کم سے کم پر اپنے نفس کو تھامے رکھنے کا خواہشمند رہے' جسے قناعت کہتے ہیں۔ پس اسی صدقہ وانفاق کے ذریعہ حرص کا بھی خاتمہ ہو گیا جو ادنیٰ خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک دوسرا مقام طے ہو گیا۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر اپنی چیز کی محبت قطع ہوئی تھی' جس سے بخل ختم تھا

اور دوسرے مقام پر پہنچ کر غیر کی چیز سے محبت جاتی رہی جس سے حرص قائم تھی اور اس طرح ایک انسان مالی سلسلہ میں نہ اپنا غلام رہا نہ دوسروں کا' پھر جب کہ یہ صدقہ اخفاء کے ساتھ کیا گیا' جس میں نام و نمود کی کوئی خواہش نہیں ہو سکتی ورنہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی تو اس سے شہرت پسندی اور نام آوری کی جڑ کٹ جانے سے جس کی تفصیلات آ چکی ہیں استغناء کا ایک اور مقام میسر آ گیا۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ صدقہ دہندہ اپنے اس عمل کو چھپانے کی سعی جب ہی کر سکتا ہے جب کہ اسے اپنا یہ عمل دوسروں کے عمل سے کم نظر آئے اور وہ اپنے عمل کی دوسروں کے عمل کے مقابلہ میں کوئی برتری اور بڑائی اپنی نگاہوں میں محسوس نہ کرے۔ ورنہ وہ اس عمل کو مخفی رکھنے کی بجائے دوسروں کے عمل سے برتر اور فائق تر ظاہر کرتا اور جا بجا اس کا چرچا کرنا پسند کرتا' لیکن جب کہ وہ اپنے صدقہ کو دوسروں کے صدقات سے نسبت تک دینے سے رک رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے عمل کے تفوق و برتری کے خیال سے بھی جدا ہو چکا ہے اور اس طرح دوسروں کی نسبت خود اپنی ذات کی برتری اور تعلیٰ سے بھی بیزار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اخفاء صدقہ سے تعلیٰ اور ترفع کی جڑ بھی کٹ گئی' جو آتشی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک چوتھا مقام میسر ہو گیا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنی نیکی کے اخفاء میں مبالغہ اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کس کو دیا گیا خود اپنے نفس کو بھی خبر نہ ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نیکی پر خود اپنے ضمیر میں بھی اسے کوئی فخر و ناز محسوس نہ ہو' وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اس نیکی کی بمقابلہ غیر ہی نہیں بلکہ بحیثیت اپنے فعل ہونے کے بھی ذرہ برابر وقعت و عظمت نہ ہو' بلکہ وہ اسے محض ادائے فرض کہہ کر کرے' نہ کہ ادائے حق جان کر کرے' ظاہر ہے کہ صدقہ کے اس اخفاء تام سے خود پسندی اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جس سے استغناء کا ایک بہت ہی دقیق اور اہم مقام میسر آ جاتا ہے۔

استغناء کے یہ آخری تین مقامات جاہ کے سلسلے میں محتاجگی سے بچاتے تھے۔ ان تین مقامات میں باہمی فرق و تفاوت ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر صدقہ دہندہ دوسروں سے طالب جاہ نہیں رہتا۔ دوسرے مقام پر اپنے عمل سے کاسب جاہ نہیں رہتا اور تیسرے مقام پر خود اپنے نفس سے بھی تخیلی جاہ قائم کرنے کا روادار نہیں رہتا اور اس طرح ان پانچوں مقامات کے ذریعہ مال و جاہ دونوں کے سلسلہ میں اس محتاجگی اور وابستگی سے آزاد ہو کر جس نے اسے ذلت و پستی کے حضیض میں گرا رکھا تھا غیر سے بھی غنی ہو جاتا ہے اور خود اپنے سے بھی مستغنی

مادیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے

الحاصل اس مادہ پرست اور مادی نفس کے دور ذیلے بخل

اور حرص تو نفس صدقہ ہی سے ختم ہو گئے اور تین رذیلے، تملق، نام آوری اور خود بینی اخفاء صدقہ کی قید سے ختم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص بخیل نہ رہا، سخی ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنی دولت کی بھی پروانہ نہ رہی، حریص نہ رہا بلکہ قانع ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے غیروں کی دولت کی بھی پروانہ نہ رہی۔ شہرت پسند نہ رہا بلکہ عزلت پسند ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے لوگوں کی مدح وذم کی بھی پرواہ نہ رہی، شیخی پسند اور خود بین نہ رہا بلکہ خود گزار ہو گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنے نفس کی بھی پرواہ نہ رہی۔ تو اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی اخلاق کی بدولت جو اس نے صدقہ سے حاصل کئے ہیں عالم میں کسی کا غلام نہ رہا اور اسے ہر چیز سے کامل آزادی اور حریت میسر آگئی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ساری کائنات سے بے پرواہ ہو کر اب اگر اس کا رشتہ نیاز کسی سے جڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالق کائنات سے جس کی خاطر اس نے یہ اپنا مال، اپنی آبرو اور اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا اور جس کے اخلاق سے اس نے یہ تخلیق کیا، اندریں حالات اسے مناسبت پیدا ہوئی تو اس غنی عن العالمین سے اور لگاؤ پیدا ہوا تو صرف اسی ذات بے نیاز سے جو اپنے کاموں میں کسی کی محتاج نہیں، بلکہ ہر چیز اپنے وجود وظہور میں اسی کی دست نگر ہے۔

تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے

اور اس صورت میں ضروری ہے کہ اس مرد متصدق اور بندہ مجاہد یا تارک ماسوی اللہ سے بھی جس نے اس غنی مطلق سے نسبت قائم کرلی ہے۔ غناء کامل کا ظہور ہو اور وہ بھی اپنے کسی کام میں ان مخلوقاتی وسائل یعنی مادی ذرائع کا محتاج نہ رہے بلکہ خود یہ وسائل ہی اس کی چشم وآبرو کو دیکھنے لگیں، اسے تصرف بلا وسائل زمین تک ہی نہیں آسمانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ وہ اوپر جائے تو طیاروں کا محتاج نہ ہو اور زمینی مسافت طے کرے تو ریلوں او موٹروں کا پابند نہ ہو۔ وہ عالم میں اپنی صدا پہنچائے تو ہوا اور برق کا دست نگر نہ ہو اور عالم کی صدائیں سننا چاہے تو ریڈیو اور ٹیلیفون کا محتاج نہ ہو۔

غرض اس کے ہاتھوں پر وہ سب کچھ ظاہر ہو، جسے دنیا کے سارے فلسفی اور سائنس دان مل کر بھی ظاہر نہ کریں۔ ورنہ کم سے کم غنا کا یہ درجہ تو اسے ضرور حاصل ہو جائے کہ علم واعتقاد کے درجہ میں ان وسائل کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے اور عمل کے درجہ میں اسے ان اسباب ووسائل سے کوئی شغف باقی نہ رہے بلکہ عادت کے طور پر محض حیلہ کے درجہ میں وہ بھی امر خداوندی سمجھ کر انہیں استعمال میں لاتا رہے پس پہلا درجہ توکل وغنا کا اعلیٰ مقام ہے، جس میں ترک اسباب پر پوری قدرت محسوس ہونے لگے اور دوسرا درجہ ثانوی ہے جس میں گویا قدرت نہ ہو، مگر معرفت صحیح ہو جائے اور اختیار اسباب میں غلو اور انہماک باقی نہ رہے۔

بہر حال اب پوری طرح کھل گیا کہ مادہ میں بجز محتاجگی اور ذلت نفس پیدا کر دینے کے کوئی جوہر نہیں کہ اس کے اخلاق کی خاصیت ہی احتیاج وغلامی ہے جس کا ظہور فعل امساک سے ہوتا ہے

اور روح میں بجز عزت نفس پیدا کرنے کے دوسرا کوئی جذبہ موجود نہیں کہ اس کے فطری اخلاق کی طبیعت ہی استغناء و غناء ہے' منشاء عزت و عظمت ہے۔ جس کا ظہور فعل انفاق سے ہوتا ہے' جسے صدقہ کہتے ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مادی اور روحانی اخلاق ان کی زینوں اور ان کے خواص و آثار میں تضاد کی نسبت ہے کہ خود روح و مادہ ہی میں تضاد کی نسبت ہے۔

روح ایک لطیفہ' ربانی ہے اور جسم ایک کثیفہ ظلمانی' وہ مائل بہ علو ہے' یہ مائل بہ سفل' وہ انسان کو عرشی بناتی ہے یہ فرشی وہ اسے سربلند کرتی ہے' یہ سرنگوں گویا ان دونوں کی مثال ترازو کے دو پلوں کی سی ہے کہ جتنا ایک کو جھکا دیا جائے دوسرا اسی قدر اٹھ جائے گا۔ اس لئے آپ ان مادی تصرفات کے ذریعہ مادی اخلاق کو جس قدر بھی قوت اور رسوخ دیں گے' روحانی اخلاق اس قدر مضمحل ہوتے رہیں گے اور اسی حد تک استغناء نفس مٹ کر احتیاج و ذلت نفس کی زنجیریں مضبوط ہوتی رہیں گی جس کو دوسری تعبیر سے یوں سمجھ لیجئے کہ روح جیسا فاضل بادشاہ جس حد تک جسم جیسے کمینہ اور بے شعور غلام کے زیر اثر بسر کرتا رہے گا' اسی حد تک اپنی ساری فرمانروائی کی عزت و شوکت برباد کرتا رہے گا اور نتیجہ انجام کی تباہی و بربادی دونوں ہی کو گھیرتی رہے گی۔

لیکن اگر صدقہ و مجاہدہ یعنی مادیات اور مادی لذات سے بے نیازی کے ذریعہ ان روحانی اخلاق کو قوت و رسوخ کا موقع دیتے رہیں گے تو احتیاج و غلامی مٹ کر اسی حد تک استغناء و کمال کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی' جس سے کائنات بدن میں روح کی حکمرانی قائم ہو جائے گی اور بدن کا غلام ہر آن اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہ کر محض بجا آوری احکام کے لئے رہ جائے گا' جس سے دونوں اپنے اپنے منصبی کاموں میں بھی لگے رہیں گے۔ دونوں کی عزت بھی بقدر مرتبہ قائم ہوگی اور اقلیم جان کا عدل بھی استوار رہے گا۔

سائنس محض کبھی یہ غناء پیدا نہیں کر سکتی

اور جب کہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلت نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے' سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہ ہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ و مجاہدہ جن سے استغناء و عزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے' اسلام کا موضوع عمل ہے' تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلت نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام انجام کار اسے عزت و فلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے۔

پہلی صورت یعنی مادیات کا علو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے' جس سے عزیز تو ذلیل' اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے' جو قلب موضوع اور دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہے

اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سر بلندی اور مادہ کی محکومی کی ہے' جس سے عزیز مسند عزت پر اور ذلیل اپنی حد ذلت و مقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عین عدل اور دونوں کے لئے دارین میں موجب فلاح و بہبود ہے بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی نوعیت کا اجمالی خاکہ جو اپنی بساط علم کی قدر' میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اور یہی اس تقریر کے تین مقاصد میں سے پہلا مقصد تھا جو الحمد للہ کہ اتمام کو پہنچ گیا۔

سائنس اور اسلام میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے

اب اس پر غور کیجئے کہ یہ چورنگ مادہ ہے اور اس سے تیار شدہ بدن ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کی زندگی روح سے ہے اور روح اسے زندہ رکھ کر اپنے موہوب کمالات کو اسی کے ذریعہ عملاً نمایاں کرتی ہے پس بدن کمالات روح کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ چنانچہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہو کر جب اس مقام معلوم تک پہنچ جاتی ہے جو ازل سے اس کیلئے طے شدہ تھا جب ہی اس ڈھانچہ اور وسیلہ کو روح سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقتاً فاعل نہیں بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں محض وسیلہ ہے۔

اگر اس جسم کو بالاستقلال مقصودیت کا درجہ دے دیا جائے تو یہ فی الحقیقت لاشہ کو مقصود بنا لینا ہے' جس کا انجام سڑنے گلنے اور دماغوں کو پراگندہ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب کہ سائنس کا موضع محض یہ جسمانیات اور مادی چیزیں ہی ہیں اور مادیات ڈھانچہ اور وسیلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں' تو خود بخود حل ہو گیا کہ سائنس کے تمام کرشمے بھی اصولاً وسائل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے اور جب کہ اسلام کا موضوع بالاصالہ روحانیت اور روحانی افعال ہیں اور روح اصل ہے تو یہ بھی خود بھی واضح ہو گیا کہ اسلام کے تمام امور بھی مقصودیت کے درجہ سے کسی طرح نہیں گر سکتے۔ ان دو صورتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلہ عمل ہے ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے اس ایک وسیلہ و ذریعہ اور ایک ڈھانچہ ہو گی۔ جس کی زندگی اور روح اسلامی اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے اگر یہ روح اس ڈھانچہ ہو گی۔ جس کی زندگی اور روح اسلامی اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے اگر یہ روح اس ڈھانچہ میں نہ ہو تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیلات ایک لاشہ ہوں گی' جس کا انجام بجز پھولنے پھٹنے اور سڑ گل کر صحیح دماغوں اور سچے قلوب کو پراگندہ کرنے اور صاف فضاء کو خراب کر دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ایسی سائنس جس کا حاصل تعیش محض اور عناصر اربعہ کے خزانوں کو بلا دینی روح کے استعمال میں لانا ہے اور جسے اصطلاح میں دنیوی زندگی پکارا جاتا ہے قرآن کی زبان میں لاشہ بے جان

اور چند دن اپنی سطحی چمک دمک اور زینت دکھا کر خاک کا ڈھیر ہو جانے والا ایک لاشہ ہے۔ جس پر حقیقت سے بے بہرہ لوگ ہی ریجھ سکتے ہیں۔

اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرَاہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا۔

"تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو ولعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور وا موال واولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے' پھر وہ خشک ہو جاتی ہے' سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے' پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے"۔

اس غیر ضروری تعیش یا تعیش محض اور جمع وسائل کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے' جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف کہا جاتا ہے ؎

الدنیا دار من لادار له ولها یجمع من لاعقل له.

"دنیا نگھرے کا گھر ہے اور اس کی جمع پر وہی پڑے گا' جس میں عقل کا نشان نہ ہو"۔

بہر حال حسی' عقلی اور نقلی طور پر یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح جسم اور مادہ روح کیلئے وسیلہ عمل ہیں' خود مقصود واصل نہیں۔ اس طرح مادی تصرفات' جن کا نام سائنس ہے' روحانی تصرفات کے لئے جن کا نام اسلام ہے' اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کر سکتے ہیں' خود مقصودیت کی شان کبھی نہیں پیدا کر سکیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلہ مقصود میں معین ہو' یعنی بقدر ضرورت ورنہ بالاصالتہ اس میں انہماک رکھنا اس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا ہے' جو قلب موضوع اور خلاف عقل ہے' اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا ہو کر سائنس محض میں انہماک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل قرار نہیں پا سکتا بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدار ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہو گی۔

اس لئے دنیائے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبوی پر دی گئی ہے' جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے ؎

اعمل للدنیا بمقدار بقائك فیها و اعمل للاٰخرة بمقدار بقائك فیها.

"دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کروں' جتنا وہاں رہنا ہے"۔

خلاصہ

یہ ہے کہ سائنس کا درجہ وسیلہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا کہ اس کا معمول اصلی مادہ ہے اور مادہ روح کے لئے محض وسیلہ ہے اور اسلام کا درجہ مقصودیت سے گر نہیں سکتا کہ اس کا معمول اصلی روح ہے اور روح مادہ کے لئے اصل مقصود ہے۔

اس تقریر سے الحمد للہ پوری طرح' سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت'' بھی واضح ہوگئی اور کھل گیا کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے' جو موضوع تقریر کا دوسرا مقصد تھا' اور جس کا حاصل یہ ہے کہ سائنس کے کارنامے جب تک مذہب کے لئے بطور وسیلہ استعمال ہوں گے' خواہ ترقی کی کسی حد پر ہی پہنچ جائیں ان کا انجام خوش کن ہوگا اور جب اس سے جدا ہو کر خود مقصودیت کی شان لے لیں گے یعنی روحانیت ترک ہو کر مادیت محضہ مقصود کی جگہ لے لے گی خواہ وہ کم سے کم بھی ہو' جب بھی انجام خطرناک اور ذلت آمیز نکلے گا۔

سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا ہم پر تقاضہ کیا ہے

اسی سے آپ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ آپ کی ترقی کا میلان کیا ہونا چاہئے؟ جس کے شور سے آج فضاء دنیا گونج رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی وہی عقل سلیم کر سکتی ہے جس نے ان میں سے ایک کو وسیلہ اور ایک کو مقصود باور کرلیا ہے کہ آیا ترقی وسائل میں کی جاتی ہے یا مقصد میں؟ اور ترقی کی دوڑ راستہ کے لئے ہوتی ہے یا منزل مقصود کے لئے؟

پس اگر سائنس وسیلہ ہے اور بہ شہادت عقل و نقل ضرور ہے' جیسا کہ ثابت ہوگیا تو پھر عقل ہی کی شہادت سے وہ کبھی مطلقاً میدان ترقی بھی قرار نہیں پا سکتی کہ وہ تو راہ محض ہے' منزل مقصود نہیں اور اگر اسلام مقصود اصلی ہے اور ضرور ہے جیسا کہ عقل و نقل سے ثابت ہو چکا ہے تو اسی کو دوڑنے اور ترقی کرنے کا میدان بھی بنایا جا سکتا ہے کہ وہ راہ محض نہیں' شہر مطلوب ہے۔ جس میں پہنچنے کے لئے ساری جدوجہد تھی' چنانچہ قرآن کریم نے ترقی کو روکا نہیں بلکہ انسان کو دنیا میں بھیجا ہی ترقی کرنے کے لئے ہے۔ ہاں وسائل میں ترقی کرنے کو اضاعت وقت کہا ہے اور مقاصد میں جس کا عنوان خیرات و مبرات رکھا ہے' ترقی کرنا نہ صرف روا ہی بتلایا ہے بلکہ ضروری اور واجب قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ربانی ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ.

''ہر قوم کے لئے ایک قبلہ مقصود ہے' جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم ایک دوسرے سے بھلائیوں میں سبقت کرو!''

دوسری جگہ نعیم آخرت کا ذکر فرمایا جو تمام خیرات و مبرات کا مقصود اصلی ہے' ارشاد فرمایا:

وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ.

"اور حرص کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی حرص کرنی چاہئے"

پس ایک جگہ سبقت باہمی اور ایک جگہ حرص باہمی کے عنوان سے مسلمانوں کو ترقی کے لئے ابھارا گیا اور مامور کیا گیا ہے لیکن یہ ترقی اسی میدان کی ہے جس کی فطرۃً ہونی چاہئے' یعنی مقاصد کی' کیونکہ وسائل میں ترقی ترقی نہیں بلکہ بے عقلی ہے۔ اس اصولی حقیقت کے پیش نظر اب آپ اپنا جائزہ لیجئے کہ آپ نے کس طرح اس موضوع کو الٹ دیا ہے۔ مقصود کو وسیلہ اور وسیلہ کو مقصود' بادشاہ کو غلام اور غلام کو بادشاہ بنا دیا ہے' مقصود اصلی کو تابع محض اور رسمی وا سمی کر ڈالا ہے اور سائنس کو مقصود حقیقی اور مطلوب اصلی قرار دے لیا ہے۔ پھر ساتھ ہی اس کے انجام بد کو بھی پیش نظر رکھیے' کہ ان حالات میں یہ مادہ کا کمینہ غلام آپ کو حرمان وخسران کے کس گڑھے میں لے جا کر گرائے گا' جیسا کہ اب تک اقوام کو گراتا آیا ہے۔ اللہ کے نذیر مبین ﷺ نے اسی خالص نمائشی کروفر اور مادیات کی اسی چمک دمک پر جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں زینت اور زہرۃ ہے' خوف کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

والله ما اخشى عليكم الفقر ولكن مما اخشى عليكم من بعدى زهرة الدنيا تفتح عليكم فتهلككم كما اهلكتهم.

"خدا کی قسم' مجھے اپنے بعد تم پر فقر و فاقہ پڑ جانے سے کوئی خوف نہیں' خوف ہے تو اس کا کہ میرے بعد تم پر دنیا کی چمک دمک کھلے گی۔ اور تمہیں اسی طرح ہلاک کر ڈالے گی جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو ہلاک کیا ہے"۔

مادیات محضہ کی مضرتیں

ہاں مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقادات بگڑتے ہیں اور پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں۔ جس سے ہمت عمل ختم ہو جاتی ہے۔ علمی میدان میں اس طرح کہ مادیات خود بے شعور ہیں' چنانچہ آگ' پانی' ہوا' مٹی میں سے کوئی ایک مادہ بھی عقل وہوش نہیں رکھتا اور نہ انسانوں کے ہاتھ میں اسی طرح بے بس ہو کر مسخر نہ ہوتا۔ اس لئے ان جہالت کے کھلونوں سے رات دن کھیلنا' ظاہر ہے کہ جہل سے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ نیز یہ مادیات چونکہ خود محسوسات کی انواع ہیں' اس لئے ان کا دلدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرائیوں تک رسائی پا سکتا ہے اور حس کا تعلق حواس خمسہ آنکھ' ناک' کان وغیرہ سے ہے۔ اس لئے ایک چشم وگوش کا بندہ مشاہدات چشم وگوش ہی میں گھرا رہتا ہے۔ علوم قلب اور علوم ارواح اور علوم حقائق تک اس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی ناواقف محض ہو اور نہ واقفی کے ساتھ ادھر کا رخ بھی نہ کرے تو اس کا مبلغ پرواز بجز اوہام وخیالات اور شکوک وشبہات کے علوم ومعارف کب ہو سکتے ہیں؟

اسی لئے مادی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک و شبہات ہی گھیرے رہتے ہیں' جو در حقیقت مادیات میں انہماک و شغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیت کی طرف رجوع کر کے جو منشاء علوم وادراکات ہیں' قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے جس سے اوہام ووساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہوں۔

طلبائے یونیورسٹی کو خطاب موعظت

مجھے معاف کیا جائے' اگر میں نیاز مندانہ طریق پر یہ عرض کروں کہ آج مسلمانوں میں اور آپ برانہ مانیں تو آپ جیسی نئی ذہنیت کے افراد میں اس علمی اور عرفانی روشنی کا سرے سے ہی پتہ نہیں ملتا جو شکوک و شبہات کا تریاق اور وساوس واوہام کا بدرقہ ہے بلکہ قلوب میں ریب وارتیاب اور تحیر نے جگہ پکڑ کر اصل حقیقت ہی سے بیگانہ بنا دیا ہے اور جب کہ ایمان کی وہ شفاف روشنی جو ظلمات جہل اور جہل سے پیدا شدہ شبہات کو دفع کرتی ہے اور مشاہدۂ حق کی وہ تجلی ریزی جو ہر سوال کا جواب بنتی ہے' قلوب میں پیوست ہی نہیں تو محض علمی تعبیرات سے آپ قلوب کو کب تک پھسلاتے رہیں گے؟

یہ علمی عجائبات جو تقریروں کے ذریعہ آپ سننا چاہتے ہیں' اس وقت کا مشغلہ ہیں' جب کہ اصل علم کا راس المال ہاتھ میں ہو' یہاں ایمان ہی کی خیر نظر نہیں آتی' تا بہ اسلام و عمل چہ رسد؟

مادیات کی مضرتیں رفع کرنے کا طریقہ

اس لئے میری صلاح تو یہ ہے اور نہ میری صلاح بلکہ اسلام کی حقیقت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ میرے عزیز بھائی اوپر کی ٹیپ ٹاپ اور مرہم پٹی کو چھوڑ کر اس مادہ فاسد کا تنقیہ کریں' جو مادی سائنس کے غیر ضروری انہماک اور غلو نے پیدا کر دیا ہے۔ اور فسلفیت کے علم نما جہل نے اس کی آبیاری کی ہے۔ ان حالات میں ان کا فرض ہے کہ وہ جسم کے بجائے روح کو ابھرنے کے قابل بنائیں کہ وہ ہی انسان میں علم کا منبع ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ہواء نفسانی اور مادی خواہشات کے بے شمار مقاصد سے ذرا ایک طرف ہو کر اس منبع جود و کمال ذات حق کی طرف رجوع کریں۔ جس سے علم معرفت کی روشنی چلتی اور شبہات و وساوس کی دنیا کو تنگ بنا دیتی ہے۔

استحکام توحید

گویا دوسرے لفظوں میں تعدد مطالب یا شرک کو چھوڑ کر توحید پر استقامت اختیار کی جائے جو اسلام کی روح اور اصل اصول ہے' اس کی تدبیر بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہی کہ کلمہ توحید کو بار بار اور بکرات و مرات دہرایا جائے تا کہ قول کا اثر قلب پر پڑے اور توحید راسخ ہو۔

ارشاد نبوی علیہ السلام ہے ۔

جددوا ایمانکم بقول الا اله الا الله

پھر لا اله الا اللّٰه میں ایک توحید ذات ہی کا تصور نہ کریں بلکہ توحید صفات کا دھیان بھی اسی کلمہ سے کریں۔ یعنی اللہ کے سو ناموں یا سو صفات کی توحید بھی اسی کلمہ سے حاصل کریں۔ گویا الوہیت کا اثبات و نفی اس ترکیب سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسی ہی رحمانیت' نافعیت' ضاریت وغیرہ کا اثبات و نفی بھی اس طرح کیا جائے۔ لا رحمٰن الا اللّٰه لا مالك الا اللّٰه لا نافع الا اللّٰه' لا ملك الا اللّٰه وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر جب قلب میں یہ ذہن نشین ہو جائے گا کہ مالک بھی ایک ہی ہے تو اس کا قدرتی ثمرہ یہ ہو گا کہ قلب سے سب عظمتیں مٹ کر صرف ایک ذات واحد کی عظمت رہ جائے گی اور یہی کسوٹی اور یک رخی قلب کی قوت ہے۔ ایک غلام دو آقاؤں کو بیک دم خوش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ متفکر متردد اور مذبذب رہے گا۔ جس سے قلب میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جو اس یقین پر ہے کہ میرا ایک ہی آقا ہے اور وہ بھی ایسا جو علی الاطلاق ہر چیز کا مالک اور اس پر قابض و متصرف ہے۔ تو وہ متردد رہنے کے بجائے متیقن اور مطمئن ہو جائے گا اور یقین و اطمینان ہی قوت قلب کی بنیاد ہے۔ جس سے اس کی قوت فکری سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور پھر اس سے عجائبات فکر اور غرائب علوم پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی بصیرت و معرفت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی قوت یقین کے ماتحت حضرات صحابہؓ اور سلف کے وہ محیر العقول کارنامے ہیں جنھوں نے متمدن دنیا کو آج تک حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

ان کی ترقیات اور طوفانی کارنامے روپیہ پیسہ اور دھن دولت کے رہین منت نہ تھے بلکہ دولتیں خود ان کے کارناموں سے بنتی اور بگڑتی تھیں۔ اس لئے سب سے پہلے اپنے توحیدی اعتقاد درست کیجئے کہ یہی ہر خیر کمال کی بنیاد ہے۔

یاد حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ

ہاں پھر اس توحیدی فکر کو پختہ اور راسخ کرنے کے لئے طمانیت قلب کی حاجت ہے۔ ورنہ وساوس وخطرات اور تشویشات فکر اس صاف حقیقت پر قائم نہیں رہنے دیں گے۔ اس لئے قرآن کریم نے طمانیت قلب پیدا کرنے کا موثر ذریعہ فرمایا کہ ۔

الا بذکر اللّٰه تطمئن القلوب

"یاد رکھو! اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں"

اس سے مقصود ذکر قلبی ہے۔ مگر ذکر قلب میں راسخ نہیں ہوتا' جب تک کہ زبان سے اس کا بار بار تکرار نہ کیا جائے۔ چنانچہ طالب علم اپنے سبق کی قلب میں محفوظ کرنے کے لئے زبان ہی سے

اس کو بار بار دہراتا ہے اور رٹتا ہے اس لئے اولاً زبان کو ذاکر بنانا چاہیے تاکہ قلب ذاکر بن جائے اور یہ ایمان و توحید دل میں اپنی جڑیں چھوڑ دے اور قلب اس پر قانع اور مطمئن ہو جائے۔

اس لئے شریعت نے ذکر حق کی مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج ان کا استعمال تو بجائے خود رہا ان کا علم تک بھی مسلمانوں اور اس طبقہ کو نہیں ہے' جو تعلیم یافتہ کہلاتا ہے۔

شریعت نے سب سے پہلے فرائض رکھے جو ذکر اللہ کا اعلیٰ مظہر ہیں اور ہر چھوٹے بڑے پر لازم کئے۔ اس لئے فرائض علوم وصلوٰۃ وغیرہ کی پابندی کیجئے پھر اوقات مخصوصہ کی دعائیں یاد رکھیں تاکہ چلتے پھرتے بھی خدا کی تسبیح و تہلیل آدمی کی زبان پر جاری رہے' اس لئے اس قسم کا اذکار کو یاد کرنے کی فکر کیجئے۔ پھر مختلف مواقع کلام کے محاورے اسلام زبان نے ایسے رکھے ہیں کہ ان میں بلا ارادہ بھی ذکر اللہ زبان پر جاری رہے۔

بسم اللّٰہ' الحمدللّٰہ' جزاك اللّٰہ' انا للّٰہ' ماشاء اللّٰہ' انشاء اللّٰہ' استغفر اللّٰہ' الا للّٰہ' سبحان اللّٰہ وغیرہ۔ آپ کی زبان کے رات دن کے محاورے ہیں۔ اگر آپ استعمال کریں اور اغیار کی زبانوں سے شغف پیدا نہ کریں۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا کام جس سے کلام کا تعلق ہو' ایسا نہیں ہے۔ جس کے متعلق کلام میں اللہ کا نام داخل محاورہ نہ ہو۔

گویا اسلامی معاشرت میں رہ کر کلام کرنے والا بے ارادہ بھی ہر وقت اللہ کا نام لینے پر مجبور ہے۔ لیکن آج مسلمان اپنی دینی زبان سے جس کی بدولت وہ ارادہ اور بے ارادہ ہر وقت خدا کا نام لینے کی توفیق پاتے تھے' نہ صرف بے پرواہ ہی ہیں بلکہ اس کے مٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ اسلام نے عربیت اور عربی محاورے قائم رکھنے پر اسی لئے کافی زور دیا تھا کہ زبان کا اثر تہذیب' کلچر' تمدن اور عام احوال زندگی پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار کے آغاز کے وقت علماء وقت اور خصوصاً اکابر دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کی فہمائش کی تھی کہ وہ اپنی عربیت کو تھامے ہوئے غیر زبان کی ترویج و تقویت پر اس ذوق و شوق سے زور نہ دیں کہ وہی زبان ان کی بنیاد اور قبلہ مقصود بن جائے' مگر مسلمانوں نے ان مبصروں کا کہنا نہ مانا اور بالآخر آج وہ اس کے نتائج بد سے دوچار ہوئے کہ ان کی تمدنی صورت و سیرت ہی مسلمانوں جیسی نہ رہی' چہ جائیکہ ان کا علمی دین اصلی رنگ میں محفوظ رہتا۔

مگر بہر حال رجوع کے لئے کسی وقت کی تخصیص نہیں۔ اگر آپ پوری تندہی سے آج ذکر اللہ کے پابند نہیں ہو سکتے تو کم از کم عربیت کی زبان ہی کی حیثیت سے باقی رکھنے کی سعی کیجئے اور اس کے دینی محاورات ہی کو زبان زد کرتے رہئے تاکہ اسی بہانہ سے خدا کا نام زبانوں پر جاری رہے۔ نام حق کی یہ زبانی مشق اگرچہ بے ارادہ بھی ہو پھر بھی انشاء اللہ قلوب میں ایک حد تک ذکر اللہ کو قائم کرتی رہے گی۔

صحبت صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ مگر ان امور کی توفیق اس کے بغیر مشکل ہے کہ اسباب توفیق

بھی اس کے ساتھ جمع کیے جائیں اور ان میں مؤثر ترین سبب سچوں کی صحبت و معیت ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ.

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیت اختیار کرو"

چنانچہ صحبت یافتہ جاہل بعض اوقات غیر صحبت یافتہ عالم سے بدرجہا زائد مقاصد دین کو سمجھتا ہے اور دینی رنگ سے رنگین اور متصبغ ہو جاتا ہے اس لئے اہل علم اور اہل اللہ کے پاس آمد و رفت کو ایک مستقل مقصد کی حیثیت سے قائم رکھیئے۔ بردیقین اور ثلج صدر استدلال سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اکبر نے خوب کہا ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

آگے حصول یقین و دین کی تدبیر کے بارہ میں کہتا ہے کہ۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس لئے میں نیاز مندانہ التماس کروں گا کہ میرے عزیز بھائی! اہل اللہ اور اہل دین سے بیگانہ نہ رہیں، بلکہ ان سے وابستگی پیدا کرنے کی صورتیں نکالیں تا کہ ان سے دولت دین و یقین حاصل ہو اور شکوک و شبہات یا ترددات کا مادۂ فاسدہ ختم ہو جائے۔ ورنہ محض تقریروں اور وہ بھی ایسے کلی مسائل کی تقریروں سے جو خالص علمی حقائق پر مشتمل ہوں، اصلاح نفوس کی راہیں استوار نہیں ہوتیں یہ اس وقت کا مشغلہ ہے جب ذوق یقین سے قلوب معمور ہو چکے ہیں۔ دین کا رنگ قوت عمل اور صحبت صلحاء ہی سے قلوب پر چڑھ سکتا ہے۔ بس آپ حضرات کا فریضہ ہونا چاہئے کہ مادیت کے اس ہجوم میں روحانیت کو فراموش محض نہ کر ڈالیں۔

خلاصۂ بحث

بہرحال اس تقریر سے اسلام کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی واضح ہو گئی کہ وہ انسان کو روحانی میدان میں دوڑا کر اسے دائمی رفعت و عزت اور طمانیت و بشاشت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے کہ دائمی رفعت و عزت روحانیت ہی میں ہے اور اور پھر ساتھ ہی سائنس کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی سامنے آگئے کہ وہ انسان کو مادی میدانوں میں چھوڑ کر انجام کار اسے ذلت و خسران کی طرف دھکیل دیتی ہے کہ محض مادیات کا انجام فنا و ذلت کے سوا کچھ نہیں اور آخر کار ایک سائنس زدہ نہ اپنے مادی منافع ہی کو باقی رکھ سکتا ہے اور نہ اسے روحانی منافع ہی نصیب ہوتے ہیں، نیز "سائنس اور اسلام" کی باہمی نسبت بھی واضح ہو گئی کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی

نسبت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لئے خادم اور ذریعہ تحصیل نہ بنیں گے ' ان کا انجام خوش کن نہ ہوگا اور اسی کے ساتھ بطور ثمرہ یہ مقصد بھی حل ہو گیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ ' تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع اور وسائل میں یعنی سائنس کے معمولات اسی حد تک اختیار کئے جائیں ' جس حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔

مباحث تقریر کا ربط حدیث زیب عنواں سے

یہی وہ مقاصد سہ گانہ تھے ' جن کی تشریح کا حدیث زیب عنوان کے دائرہ میں رہتے ہوئے میں نے ابتداء تقریر میں وعدہ کیا تھا کہ الحمد للہ ان مقاصد کی ایک حد تک توضیح و تشریح ہو چکی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد کی اس طولانی بحث کو سمیٹ کر اور حدیث عنوان پر منطبق کر کے یہ واضح کروں کہ تقریر کی یہ تمام تفصیلات جو عرض کی گئی ہیں ' اسی حدیث کے چند جامع اور بلیغ جملوں کی شرح ہیں اور صرف اسی کی تعبیرات سے مستنبط ہیں

سو بغور سنیئے کہ اس حدیث کی ابتداء میں اولاً تو ملائکہ کے سوال پر عناصر اربعہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ جو عالم کا مادہ اور اس کے موالید ثلاثہ (جمادات ' نباتات ' حیوانات) کی اصل ہے۔ جن سے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے۔ پھر یہ تذکرہ عناصر ایک ایسے بلیغ پیرایہ میں فرمایا گیا کہ ان کی شدت و ضعف کے باہمی مراتب پر بھی ایک سیر حاصل روشنی پڑگئی ہے کہ ان میں سے مثلاً مٹی سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ اس سے قوی لوہا ہے ' جو اجزاء ارضیہ میں سے ہے۔ اس سے اشد آگ ہے اس سے اشد پانی ہے اور اس سے اشد ہوا ہے۔ یہ بیان قال نعم الریح تک چلا گیا ہے۔

پھر ان مادی عنصروں سے منتقل ہو کر ان کے مرکب موالید کی طرف رخ فرماتے ہوئے موالید کے اعلیٰ ترین جزو انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ ان سب سے زیادہ اقویٰ اور اشد انسان ہے جس کا ذکر قال نعم ابن ادم کے جملہ سے فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے انسان کے افعال دکھلا کر واضح کر دیا ہے کہ انسان ہی وہ نوع ہے جس کے اشاروں پر تمام مادیت اور سارے ہی موالید ناچ رہے ہیں۔

پھر ان مادیات سے منتقل ہو کر روحانیت کی طرف حدیث مبارک کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ ابن آدم علی الاطلاق اشد اور اقویٰ نہیں بلکہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ روحانی بنے اور مادی نہ رہے یعنی مادیات کو ترک کرتا ہو جس کا بیان تصدق صدقۃ میں فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ صدقہ ہی ترک ماسواء یا ترک مادیات کا نام ہے۔

پھر روحانیت سے منتقل ہو کر روح کے بھی اعلیٰ مقامات تجرد خالص اور غوائل نفسانیہ سے

برات اور کثافت اخلاق سے پاکی' پھر لطافت اخلاق سے آراستگی کی طرف حدیث کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ انسان کا محض صدقہ دے دینا مادیات سے انقطاع کر لینا بھی کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس میں خلوص اور قطع ریاء نہ ہو اور اسی کا نام اخفاء صدقہ ہے۔ جس کا بیان یخفیھا میں فرمایا گیا ہے۔ یعنی محض صدقہ دہندہ سے وہ مخلص صدقہ دہندہ قوی اور شدید ہوتا ہے جس کے صدقہ میں ریاء و نمود کا دخل نہ ہو۔ گویا یہ صدقہ یا ترک مادیات محض حسبۃً للہ ہو اور یہ متصدق بجائے مادی ہونے کے روحانی بن کر صدقہ دے رہا ہو۔

پھر فرمایا گیا کہ مخلوق سے چھپا کر صدقہ کرنا بھی قوت و شدت کے لئے کافی نہیں جب تک کہ خود اپنے نفس سے بھی اس کو مخفی نہ رکھا جائے۔ یعنی اس میں خود بینی اور اعجاب و ناز بھی شامل نہ ہو اور خود اپنے نفس میں اس کو کوئی چیز بھی نہ سمجھ رہا ہو۔ گویا صدقہ دہندہ نفسانی ہونے کے بجائے خالص ربانی بن کر صدقہ کرے تو وہ تمام عناصر اربعہ' تمام موالید' تمام انسانوں' تمام صدقہ دہندہ انسانوں پھر تمام مخلص اور بے ریا صدقہ دہندوں سے بھی اشد و اقویٰ ہوگا۔ اسی مقام کی طرف یخفیھا من شماله میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اس درجہ مخفی صدقہ ہو کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کسے دیا؟

پھر ظاہر ہے کہ استغناء اور ترک کی یہ کامل شان کہ آدمی نے دنیا ہی کو نہیں خود اپنے نفس کو بھی چھوڑ دیا ہو۔ جب کہ دنیا اور اپنے نفس کے دکھاوے کے لئے نہیں' تو ظاہر ہے کہ بجز خدا کے اور کس کے دکھلانے کے لئے ہو سکتی ہے اور جب کہ خدا کی طرف لئے ہونے' یعنی اس کامل للّٰہیت نے یا بالفاظ دیگر صدق کی نسبت خدا کی طرف ہو جانے نے اس ضعیف البیان صدقہ دہندہ میں وہ غیر معمولی طاقت پیدا کر دی کہ اس نے ساری مادیات اور اس کے عناصر و موالید کو مسخر کر لیا۔ تو اس سے صاف واضح ہو گیا کہ حقیقتاً قوی مطلق اور شدید مطلق صرف خدا ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اسی کی طرف دوڑنے یا اسی کی نسبت پیدا کرنے میں ساری قوتیں اور شدتیں پنہاں ہیں۔

ادھر حدیث ہی کی ترتیب بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قوت و طاعت بقدر لطافت ہوتی ہے۔ تو یہ بھی حدیث ہی کی دلالت سے نکل آیا کہ جو خدا قوت و طاقت اور شدت کا مخزن ہے وہی لامحدود لطافت کا بھی مخزن ہے۔ چنانچہ اس کی لامحدود لطافت کا یہ عالم ہے کہ اسے نگاہیں بھی نہیں پا سکتیں۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ.

''اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے''۔

اس لئے حدیث سے گویا یہ اصول بھی مستنبط ہو گیا کہ قوی و متین صرف اللہ کی ذات ہے۔ پھر اس سے مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ مادیات سے ہٹ کر۔۔۔ روحانیت کی طرف آنا ہے' جس کا

طریق صدقہ ہے۔ چونکہ مخلص متصدق جو بلا اعجاب نفس اور بلا ریاء خلق صدقہ دے رہا ہے۔ اس سے کامل مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہی کامل لطافت کا حامل اور سب سے بڑھ کر طاقت در ہو جاتا ہے۔

مباحث حدیث کے لطیف نتائج

بہر حال حدیث کے اس مرتب بیان سے کہ ہر کثیف کو پہلے بیان کیا اور ہر لطیف کو اس کے بعد اور پھر ہر پچھلے کو پہلے سے اشد اور اقویٰ فرمایا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ معیار شدت و قوت یہ وصف لطافت ہی ہے اور اس کی ترتیب طبعی یہی ہو سکتی تھی کہ مٹی سے لطیف لوہا' لوہے سے لطیف آگ' آگ سے لطیف پانی' پانی سے لطیف ہوا' ہوا سے لطیف انسان' عام انسانوں سے لطیف تارک الدنیا اور عام تارکین دنیا سے وہ لطیف تارک مخلص اور زاہد بے ریا' انسان ہے' جس کا قلب شواغل دنیا سے پاک' مادیات کی محبت سے بالاتر' مادی کثافتوں سے نفور' روحانی لطافتوں کا محور ہو گویا وہ روحانی اور ربانی انسان ہی کامل لطافت کے حامل بن سکتے ہیں۔ جو بدنوں کی پالنے میں منہمک نہ ہوں بلکہ روحوں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہوں اور مادی تصرفات کے بجائے روحانی اعمال ان کا شعار بن گئے ہوں۔

لطافت روح مذہبی بننے میں مضمر ہے

اور یہ سب جانتے ہیں کہ ربانی بننے کے طریقے اور روحانی شعائر برپا کرنے کے ڈھنگ سکھلانا مذہب کا موضوع ہے نہ کہ سائنس کا۔ اس لئے اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ لطیف تر اور قوی تر انسان وہی ہو سکتا ہے جو مذہبی ہو اور جس کا اوڑھنا اور بچھونا مذہب ہی مذہب ہو چکا ہو۔ اس لئے حدیث سے جہاں قوت و شدت کا معیار مستفاد ہوا کہ وہ لطافت ہے وہیں حصول لطافت کا طریقہ بھی مستفاد ہوا کہ وہ مذہب ہے جو روحانیت کو مستحکم کر کے لطافت پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح روح بادشاہ ٹھہر جاتی ہے۔ جو اس کا حقیقی منصب ہے۔ نفس اس مملکت کا خاکروب ٹھہرتا ہے جو تقویٰ کے وسیلے سے سیئات کا کوڑا کرکٹ صاف کرے۔ چوریاں اور ڈکیتیاں کرتا نہ پھرے۔ عقل اس کا وزیر ٹھہر جاتی ہے جو مفید مشورے دے۔ وحی الٰہی اس کا حتمی قانون ٹھہر جاتی ہے جس سے راہ ملے اور اس طرح روح کی منظم حکمرانی سے روحانیت کا عدل چار دانگ اقلیم بدن میں پھیل جاتا ہے۔ چور اور ڈاکو مقید ہوتے ہیں' جن سے بدامنی پھیلتی تھی' پھر ایسے مامون اور مضبوط ملک میں جس کا فرمانروا بیدار' وزیر دانشمند' قانون روشن اور عدل وانصاف کے سبب پوری اقلیم منظم ہو' نہ تو بیرونی دشمنوں کو حملہ کی ہمت ہوتی ہے کہ اس اقلیم میں گھس کر فتنہ وفساد مچائیں اور نہ اندرونی خائنوں اور چوروں کی جرات ہوتی ہے کہ بدنظمی پھیلائیں بیرونی دشمن' یعنی شیطان کے بارہ میں تو قرآن نے فرمایا کہ :-

اَنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ.

''یقیناً اس (شیطان) کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں''۔

اور اندرونی دشمن یعنی نفس امارہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر خود ہی قانون کے تابع ہو جاتا ہے اور اسی پر مطمئن اور راضی بن جاتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے ۔

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً.

''اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تم اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش''۔

اسلام کی بنیادی حقیقت

اب اس تمام مضمون کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ یہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم شدہ ہے ''مادیت اور روحانیت'' یا سائنس اور اسلام'' اسلام اور روحانیت کی بنیاد بجوائے حدیث دو اصول پر ہے۔ ایک ترک ماسوی اللہ جسے صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے 'ایک اخلاق جسے۔۔۔ اخفاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے اصول کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے سوا دنیا ہو یا اپنا نفس اور ہوائے نفس سب کی وہ الفت قلب سے نکال پھینکنا جو الفت حق میں خلل انداز ہو اور دوسرے اصول کا حاصل یہ ہے کہ اس ترک ماسوی میں خالص اسی ایک محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا جذبہ کام کر رہا ہو جو اس ارض وسماء کی محفل کا خالق ہے۔ اس بارے میں نہ خود بینی ہو نہ خود نمائی نہ خودی ہو نہ خود ستائی۔

سائنس کی جڑ بنیاد کیا ہے؟

اس کے بالمقابل سائنس کی بنیاد جو اسلام کے متقابل ہے۔ خود بخود ان دو اصولوں کی ضدوں پر نکل آتی ہے۔ ترک ماسوی کی ضد حب ماسویٰ ہے اور اخلاص کی ضد نفاق ہے۔

حب ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ ہر غیر اللہ اور ہر باطل کی محبت ہو اور نہ ہو تو خدا اور حق کی محبت نہ ہو۔ چونکہ غیر اللہ کی محبت کے سلسلہ میں اپنا نفس سب سے مقدم ہے۔ اس لئے گویا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اپنے نفس سے ہو اور نفس کو چونکہ تمام مادی لذائذ سے محبت ہے۔ اس لئے بواسطۂ نفس سارے مادی لذائذ سے محبت ہو جس کا نام دنیا ہے۔ گویا حب ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ نفس جاہل بوجہ حقیقت ناشناسی کے انہی مادی لذائذ کو جن کی صورت آراستہ ہے اور انجام گندہ ہے 'اپنا منتہائے مقصود ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

لیکن جب کہ فی نفسہ یہ مادی لذائذ کسی برتری اور انجام کی خوبی نہ رکھنے کے سبب اہل بصیرت کی نگاہوں میں باوقعت نہیں بنتے اور وہ ایسے دنی مانوس کو قابل ملامت ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ نفوس اپنے خسیس مطلوبات پر اصول اور شائستگی کا پردہ ڈال کر انہیں معقول بور کرانے کی سعی کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے تمام نفسانی جذبات کو جن سے مذاق سلیم کتراتا ہے کمالات کا لباس پہنا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ اپنے ان خسیس مطلوبات کو عام نگاہوں میں کچھ باوقعت بنا سکیں۔ مثلاً عام لہو و لعب اور بازاری رقص و سرور کو فنون لطیفہ کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔ منظم عیاشیوں اور بدکاریوں کو قانونی رنگ میں لے کر تہذیب و تمدن کا عنوان دیتے ہیں۔ استعمار اور جوع الارض کو خوشنما الفاظ میں پیش کر کے ترقی کا عنوان دیتے ہیں۔ جنگی آلات کی بے پناہ خون ریزیوں اور تباہی انسانیت کو جنگ حق و صداقت اور قیام امن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

وسائل عیش و طرب کی فراہمی کو سوسائٹی کی بلندی اور برتری سے تعبیر کرتے ہیں پرستش اپنے نفس اور ہوائے نفس کی کرتے ہیں اور الفاظ کے چکر سے اسی کو حق کی پرستش دکھلاتے ہیں۔ عقیدت و اطاعت اپنے جذبات کی ہوتی ہے اور نام سچائی کی عقیدت کا لیتے ہیں۔

غرض یہ مادی نفوس اچھے عنوان سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہوسناکیوں کو چھپانے اور انہیں خوبصورت لباس میں دکھلا کر باوقعت بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں حالانکہ حقیقت اسکے خلاف ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ نفاق کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اندر کچھ ہو اور دکھلایا کچھ جائے' باطن گندہ ہو اور ظاہر کو آراستہ کیا جائے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو دھوکہ اور فریب دیا جائے۔

مادی تمدن کی انہی خوشنمائیوں اور گندم نما جو فروشیوں کو قرآن کریم نے زینت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے' جس کی حقیقت یہی ہے کہ اندر کچھ نہ ہو' مگر ٹیپ ٹاپ اور سطحی آرائش سے اس میں دلفریبی کافی پیدا کر دی جائے۔

ارشاد حق ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ.

"خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کی محبت' مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں' بیٹے ہوئے مویشی ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے' نمبر لگے ہوئے گھوڑے ہوئے' مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی۔ یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی

اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے"۔

اس میں شہوت پرستیوں، مالی ہوسناکیوں، اسباب مفاخرت وریاست غرض مالی تکاثر اور جاہی تفاخر کو زینت دنیا فرما کر بتلایا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں زن، زر، زمین وغیرہ میں محض سطحی عاجل اور ناپائیدار لذت ہے۔ ورنہ ان کی اندرونی حالت تیرہ وسیاہ ہے اور ان سب کی وابستگی کا انجام کدورت اور تلخی ہے۔ اگرچہ اس پر کتنے ہی پردے خوشنما اور دلفریب عنوانات کے لباس پڑے ہوئے ہوں۔ جس کا حاصل وہی بے حقیقت دکھلاوا ہے، جسے اصطلاحی لباس میں نفاق کہتے ہیں۔

اب اگر آپ غور کریں تو سائنس کے ان دونوں اصولوں، حب ماسوئی اور نفاق کی حقیقت باطل نکلتی ہے۔ نفاق کا باطل ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ دیکھنے میں بہت کچھ ہو اور حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو۔ اوپر سے چمک رہا ہو اور اندر سے تاریک ہو۔ پس جب کہ نفاق کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اندر کچھ ہو اور اوپر کچھ ہو تو نفاق کا باطل ہونا واضح ہے۔

ادھر ماسوی اللہ بھی باطل ہی کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ ہر ماسوئی اللہ کی ہستی ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے وجود دینے سے قائم ہوتی ہے۔ نہ وہ از خود قائم ہے اور نہ از خود موجود ہے۔

اس لئے حقیقتاً ماسوئی اللہ کی ذات میں کوئی وجود یا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ محض وجود حق اور کمالات حق کا مظاہرہ ہوتا ہے اور جب کہ ماسوی اللہ کا خواہ وہ نفس انسانی ہو یا دوسرے موالید عناصر اربعہ ہوں یا دوسرے اجزائے کائنات، خود ہی کوئی وجود نہ نکلا، تو وہ بظاہر تو موجود ہیں مگر کوئی ہستی ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کل کا کل ماسوی اللہ بھی اپنی ذات سے باطل ہی نکلا۔

الا کل شیئی ماخلا اللہ باطل

اور جب کہ سائنس کی بنیاد انہی دو باطلوں پر تھی ایک خدا سے قطع ہو کر ماسوئی اللہ پر جو آفاقی باطل ہے۔ ایک نفاق پر جو نفسی باطل ہے تو پوری سائنس کی حقیقت بجز باطل ہونے اور باطل پسندی کے اور کچھ نہ ہوئی جس پر سائنس دانوں کا یہ ناز اور شوروشغب ہے کہ اس سے ساری زمین اور آسمانی فضا گونج رہی ہے۔

ہاں اس کے بالمقابل اگر ماسوئی کو ترک کر کے اللہ کو اختیار کیا جائے تو وہ حق ہے اور نفاق کو ترک کر کے اخلاص کو اختیار کیا جائے تو وہ بھی حق پر نکلتی ہے جس میں باطل کا نشان نہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سائنس تو ایک شور بے بنیاد اور باطل کا نام ہے، اسلام ایک حقیقت ثابتہ اور حق کا نام ہے، جس کی جڑیں مستحکم اور دائمی ہیں۔ باطل کا کلمہ بے بنیاد، حق کا کلمہ اپنی بنیادوں پر راسخ ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ه وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ

اِجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ.

''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت سے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا اپنا پھل دیتی ہوں اور اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھیں اور گندے کلمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ وہ زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے اس کو کچھ ثبات نہ ہو''۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ میں نفس سائنس اور اس کی ایجادات کو روک رہا ہوں یا سائنس کی تعلیم پر حرمت کا فتویٰ دے رہا ہوں یا اس میں اشتغال کلیتہً باطل ہے بلکہ مقصود وہی ہے جو مختلف عنوانوں سے تقریر کے ذیل میں آچکا ہے کہ میں اسے قبلہ مقصود اور کعبہ مطلوب بنانے سے منع کر رہا ہوں۔ اگر یہ ساری جدوجہد جو آج سائنس کے سلسلہ میں کی جارہی ہے، کسی حقیقی مقصود کے لئے ہو وہ نہ صرف جائز ہی ہے بلکہ آج کے دور میں مطلوب ہے اور وہ مقصود نہ ساری دنیا ہے کہ وہ تو خود وسیلہ ہے نہ مادی راحت و آرام ہے کہ وہ بھی وسیلہ ہے بلکہ ایک مسلمان کے لئے آخرت اور اس کی مذہبی دیانت ہی مقصود ہو سکتی ہے کہ وہی مقصود اصلی ہے اور اسی کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔

پس سائنس مذہب سے بے تعلق رہ کر کلمہ خبیثہ ہے جس کے لئے کوئی ثبات و قرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور بطور ذریعہ مطلوب کے وابستہ ہو کر وہ بلاشبہ نافع اور کارآمد ہوگی اور کلمہ طیبہ ہی کے ذیل میں آجائے گی جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں

لیکن میں جہاں تک محسوس کرتا ہوں آج سائنسی جدوجہد ایک حقیقی مقصود کی سی نظر آرہی ہے، لوگ اس پر اسی کی خاطر جھک پڑے ہیں اور نہ صرف یہی کہ اس کے رد و قبول کا معیار مذہب کو نہیں بنایا گیا بلکہ بیشتر مواقع میں اسے مذہب کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں ہلادی ہیں۔ اور گویا سائنس ایک ایسا مقصود ہے کہ مذہب اس کا وسیلہ تک بھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ اس کا مقصود قرار پائے۔

بہت ممکن ہے کہ دنیا کے قدیم مذاہب کے لئے سائنس نے کوئی ایسا ہی تخریبی اقدام کیا ہو۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کے جس مذہب کے ایک ایک جزو کے ساتھ سائنس ساتھ رہ کر چل سکتی ہے وہ نہ صرف مذہب فطرت یعنی مذہب اسلام ہے۔ اگر اس کی تفصیلات دیکھنی

ہوں تو میں نے اس پر ایک مستقل رسالہ "تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام" لکھا ہے۔ جسے "ندوۃ المصنفین" دہلی نے شائع کیا ہے۔ جس میں دلائل واضحہ سے دکھلایا گیا ہے کہ سائنس کی تمام ایجادات درحقیقت اسلام کی معنویتوں کا مادی رخ ہیں اور اس دور میں اسلام کے تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لئے ہی تکوینی طور پر سائنسی ترقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوت پہنچائے گا اور جو اسے مستقلاً مقصود بناء کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہنچائے گا، مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

طلبائے یونیورسٹی کے لئے مقام عبرت

بہرحال جب کہ سائنس محض یعنی بلا توسط مذہب کلمہ خبیثہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اور اسلام کلمہ طیبہ ہے جس کی جڑیں مستحکم اور ہستی پائیدار ہے تو نیک نہاد اسلام فرزندوں کے لئے اس میں سے عبرت و موعظت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوقات عزیز کو سائنس محض کی معلومات میں اس طرح نہ گنوائیں کہ وہ مقصود اصلی قرار پائے اور اس کی فانی لذات اصل ہو جائیں کہ یہ انجام کی ندامت کا سبب ہوگا۔ نیز وہ ان اقوام کی ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ نہ ہوں جنہوں نے آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے گھروندوں میں سے کچھ چمکیلی چیزیں بنا کر دنیا کے لہو ولعب میں اضافہ کر دیا ہے کہ اس کی چمک دمک کی عمر بہت قلیل اور ہمیشہ قلیل ہی رہتی ہے۔

یہ سائنسی تمدن اور شہریت کی مکر چاندنی ایک متاع قلیل اور اس تمدن میں منہمک رہنے والی اقوام کی زندگی بہت محدود اور چندروزہ ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے کہ چمکیلی تہذیب اپنے ہی تمدن سے ٹکرائے اور اپنے ہی متمدنوں کو اس اندرونی تصادم اور ٹکر سے ختم کر ڈالے۔

لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ مَتَاعٌ ثُمَّ مَاْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ.

"تم کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے چند روز بہار ہے۔
پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور بری ہی آرام گاہ ہے"۔

دیکھنے میں عناصر اربعہ بھی نہایت نظر فریب ہیں۔ آگ نہایت چمکیلی با کروفر اور حرارت کے دورس اثرات کی مالک ہے۔ پانی دیکھنے میں چاندی کی طرح شفاف اور نمناکی کے پھیلنے والے اثرات کا حامل ہے۔ ہوا بظاہر لطافت کے سبب نہایت رقیق الجسم اور ہر جگہ بذات خود منتشر اور موجود ہے۔ کرہ زمین بحیثیت مجموعی نگاہوں میں نہایت باعظمت اور باشکوہ اور تاحد نظر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنے جبلی اخلاق و آثار کی بدولت یہ چاروں ہی عناصر محتاج پسماندہ اور بے حد ذلیل ثابت ہوئے اور ان کی یہ ظاہری چمک دمک ان کی جوہری پستی کو نہ مٹا سکی جیسا کہ مفصل ثابت ہو چکا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ جس قوم یا سوسائٹی یا فرد پر ان مادی اخلاق کا غلبہ ہو اور وہ رات دن مادیات ہی کے جوڑ توڑ میں لگی رہے تو وہ قوم یا سوسائٹی گو بظاہر آگ کی سی چمک' پانی کا سا گورا رنگ' ہوا کی سی دوررسی اور پھیلاؤ اور زمین کی سی ٹھوس عظمت کی مالک نظر آ رہی ہو۔ مگر اپنے ان مادی اخلاق کے سبب جو اس میں مادی اشغال کی بدولت رہ چکے ہوں اپنے کو انجام کی ذلت و خواری سے کسی طرح نہیں بچا سکتی جو آخرت سے پہلے دنیا میں اس کے سامنے آ کر رہے گی۔ کیونکہ جس مادہ کی قسمت میں بدء فطرت ہی سے کوئی عزت نہیں لکھی گئی' اس کی بنائی ہوئی قومی عمارتیں جتنی بھی زیادہ سربفلک ہوں گی' اتنی ہی جلدی منہدم ہو جائیں گی۔

خاتمہ کلام اور خلاصہ نصیحت

پس اے عزیزان ملت! آج کی نام نہاد متمدن اقوام کی ظاہری شوکت پر نہ جاؤ۔ ان کا ہلاکت آفرین انجام عنقریب ہی سامنے آنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خدانہ کرے ان کی نقالی ور تقلید سے تم بھی اس انجام کی لپیٹ میں آ جاؤ۔ ان اقوام کی طاقت آپ کے ضعف میں مضمر ہے نہ کہ ان کے کسی جوہر میں۔ روحانیوں نے میدان چھوڑ دیا تو مادیوں نے اسے آدبایا۔ ورنہ جب دور اسلاف میں روحانیوں کی کثرت اور روحانی قومیت قائم تھی تو دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے مادی عظمتوں کو کسی طرح نیچا دکھایا اور مادی رفعتوں کی کیا گت بنائی ہے۔ اگر آج بھی آپ اپنی حقیقت پہچان کر حقیقت پسند بن کر جائیں تو وہ سابقہ عظمت لوٹ سکتی ہے ورنہ یہ صورتوں کی نمائشیں زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکیں گی۔ بہر حال حدیث کی ایک حد تک شرح ہو چکی ہے اور سائنس اور اسلام کے موضوع کے عوارض یعنی دونوں کی حقیقت' دونوں کی غرض و غایت دونوں میں مقصود و وسیلہ کی تعیین' دونوں کے طبعی اخلاق و خواص' دونوں کا انجام اور پھر دونوں کا مقتضا میں نے اپنی بساط کے موافق اس حدیث سے استنباط کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور جس عنوان کا بیان آپ حضرات نے مجھ پر عائد فرمایا تھا۔ الحمدللہ کہ میں اس سے ایک حد تک عہدہ برآء ہو چکا ہوں۔ اس لئے دعائے توفیق واستقامت پر اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

والحمدللہ اولاً و اخراً

احقر محمد طیب غفرلہ ولوالدیہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند

۷ ر اگست ۱۹۳۸ء مطابق ۸ ر جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ (یوم یکشنبہ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆